جہدِ مسلسل

جلد دوم

امان اللہ خان

جہدِ مسلسل

جلد دوم

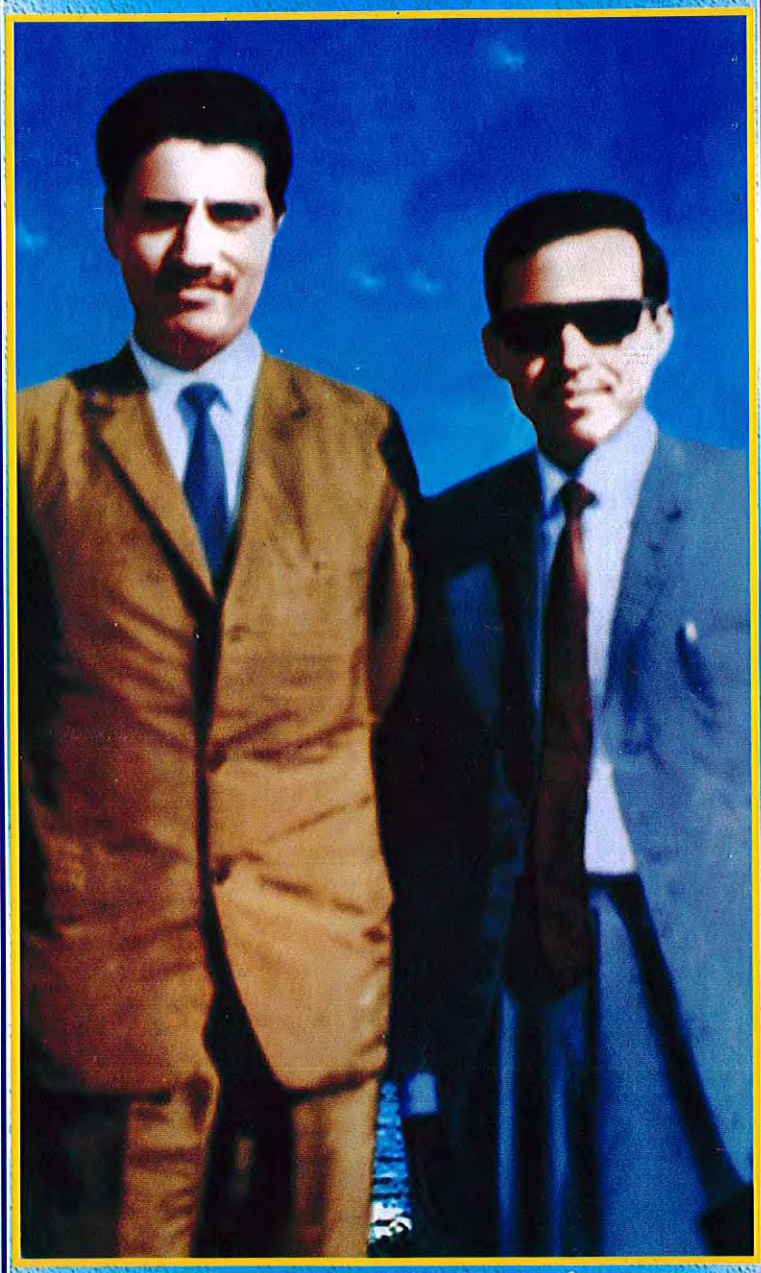
امان اللہ خان

(جملہ حقوق بحق مصنف امان اللہ خان، بیگم امان اللہ خان، اسما خان لون محفوظ ہیں)

نام کتاب۔ جہدِ مسلسل جلددوئم
مصنف۔ امان اللہ خان
سال اشاعت۔ مارچ 2005ء
تعداد۔ ایک ہزار
طباعت۔ ٹی-ایس پرنٹرز 4385/47 گوالمنڈی راولپنڈی
قیمت۔ Rs. 400-00

ذاتی تفصیلات (مصنف)

پتہ:-
B-144, Satellite Town Murree Road Rawalpindi.Pakistan
فون:- 92-51-4425689-4450414
موبائل:- 92-(0)300-5258339
ای میل:- jklf@isb.comsats.net.pk
ویب سائیٹ:- www.jklfworld.org



شہید کشمیر مقبول بٹ کے ساتھ۔ لاہور مئی 1973ء

اِنتساب

نظریۂ خود مختار کشمیر کے سلسلے میں کسی بھی قیمت پر نہ بِکنے، باطل کے سامنے نہ جُھکنے اور انتہائی نامساعد حالات میں بھی نہ رُکنے والے عزم واستقلال کے پیکر ہموطنوں (بالخصوص شہید کشمیر مقبول بٹ) کے نام خراجِ عقیدت وتحسین کے طور پر

مسلسل جہد

جلد دوم

مصنف 1999ء

پاکستان کے مشہور انقلابی شاعر احمد فراز کا شہید کشمیر مقبول بٹ کو خراج عقیدت

گو آنکھ سے دور جا چکا تو — روشن ہے مگر چراغ سا تُو
محروم لبوں کا حرف زندہ — مظلوم دلوں کا ہمنوا تُو
میں بھی تیرا ہمسفر تھا لیکن — میں آبلہ پا تھا برق پا تُو
زِنداں کے عذاب تک رہا میں — اور منزلِ دار تک گیا تُو
دشمن کے حصار میں اکیلا — لشکر کے مقابلے پر تھا تُو
کب قتل ہوئی ہے سچ کی آواز — خوشبو کی طرح ہے جا بجا تُو
اے جانِ جہاں سرفروشاں — لیلائے وطن کا دِلرُبا تُو
تھا تذکرۂ مسیح و منصور — بے ساختہ یاد آ گیا تُو
اے کُشتۂ شب فرازؔ کو بھی — مرنے کا ہُنر سکھا گیا تُو

ترتیب عنوانات

دیباچہ 11
اظہار تشکر 12
معذرت 13
ضروری نوٹ 14

حصہ اول۔ میری نجی زندگی

1۔ میرے اسلاف اور عزیز 18
(ا) میرے آباواجداد 18
(ب) میرے خویش واقارب 20
(ج) میرے خویش واقارب کی تاریخ ہائے وفات 30
2۔ عزیز واقارب اور احباب جنہوں نے میری خدمت اور مدد کی 33
3۔ میری اصل تاریخ پیدائش اور تعلیم 40
4۔ میری ملازمتیں 42
5۔ میرے تعلیمی ادارے 43

حصہ دوم۔ مجھ سے متعلق 1986ء تک کے اہم واقعات 47

حصہ سوم۔ جموں کشمیر لبریشن فرنٹ 52

1۔ نظریات، اغراض ومقاصد 53
2۔ تنظیمی ساخت 54
3۔ مرکزی تنظیم 54
4۔ علاقائی تنظیمیں 57
5۔ ذیلی تنظیمیں 59

6۔ تنظیم سے علیحدگیاں 65
7۔ عظیم نظریاتی ساتھیوں کی یاد میں 70

حصہ چہارم۔ نظریۂ خودمختار کشمیر 73

1۔ مختصر تاریخ 74
2۔ نظریۂ خودمختار کشمیر اور بھارت 75
3۔ نظریۂ خودمختار کشمیر اور پاکستان 76
4۔ نظریۂ خودمختار کشمیر اور عالمی برادری 87
5۔ نظریۂ خودمختار کشمیر اور کشمیری 88
6۔ کیا نظریۂ خودمختار کشمیر قابلِ عمل ہے؟ 94

حصہ پنجم۔ مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے ہمارا روڈ میپ 100

1۔ روڈ میپ کا مقصد 100
2۔ فارمولا 101
3۔ روڈ میپ کی بنیاد 101
4۔ پانچ مرحلے 102
5۔ روڈ میپ کی اہم خصوصیات 105
6۔ اعتراضات 106

حصہ ششم۔ ہماری جدوجہدِ آزادی 108

1۔ سیاسی جدوجہد 109
2۔ میڈیا کے اہم محاذ پر 135
3۔ ہماری مسلح جدوجہدِ آزادی 141
4۔ سفارتی محاذ کی سرگرمیاں 156
5۔ بیلجیم کانفرنس اور میری اسیری 174

حصہ ہفتم۔ کشمیریوں کو ابھی تک آزادی کیوں نہیں ملی؟ 188

1۔ بھارت کا طرزِ عمل 188

2۔ پاکستان کا طرزِ عمل 197
3۔ عالمی برادری کا طرزِ عمل 206
4۔ کشمیری قیادت کا کردار 209

حصہ ہشتم۔ گلگت بلتستان سے متعلق 218

1۔ علیحدہ باب کیوں؟ 221
2۔ 1947ء کے کارنامے نظر انداز کیوں؟ 221
3۔ حقوق کے لئے عوامی جدوجہد 222
4۔ تین تاریخی اجتماع۔ دو اہم فیصلے 229
5۔ ادب، شاعری اور صحافت 235
6۔ گلگت بلتستان والوں کے شکوے 243
7۔ میری ذاتی کارکردگی 246
8۔ ممبران کشمیر اسمبلی 253
9۔ ممبران این اے کونسل 254
10۔ گلگت بلتستان کے بارے میں معلوماتی کتابیں 257

حصہ نہم۔ دلچسپ متفرقات 260

1۔ فٹ پاتھ سے عالمی سطح تک 261
2۔ پاکستان کے دو وزرائے اعظم سے دو دلچسپ مکالمے 277
3۔ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے 284
4۔ تحریکِ آزادی میں میرے تعلیمی اداروں کا کردار 288
5۔ میری گھریلو زندگی 289
6۔ بھارت اور پاکستان کا میرے ساتھ سلوک 293
7۔ تحریکِ آزادی میں میرے رشتہ داروں کا حصہ 300
8۔ دو دلچسپ سبق آموز حقیقتیں 302
9۔ میری شاعری 309
10۔ میری بیٹی اسما کی تاریخی شادی 312

(ا) شادی کی تفصیلات 312
(ب) شادی سے متعلق دلچسپ واقعات وحقائق 328

حصہ دہم۔قصہ مختصر 331

1۔ کشمیریوں کی طویل غلامی کے ذمہ دار کون؟ 332
2۔ بھارت اور پاکستان کی کشمیر پالیسی کے نتائج 333
3۔ نظریۂ خودمختار کشمیر، کیا یہ قابلِ عمل ہے؟ 334
4۔ مسئلہ کشمیر کے جمہوری حل تک پہنچنے کا مختصر ترین راستہ 335
5۔ مسئلہ کشمیر کا بہترین قابلِ عمل حل 335
6۔ ہمارے جرات مندانہ اقدامات 336
7۔ ہماری مسلح جدوجہدِ آزادی کامیاب ہوجاتی اگر..... 340
8۔ کشمیریوں کی نظریاتی تقسیم 340
9۔ متضاد سیاسی کلچر 341
10۔ نظریۂ خودمختار کشمیر اور پاکستان کے حکمران 341
11۔ کشمیر میں مسلح جدوجہد کے مخالفین کی خدمت میں 342
12۔ بھارتی وزیرِاعظم کے گلے میں پھندا 343
13۔ زندہ امان اللہ اور اس کی لاش 344
14۔ بیلجیم جیل کے دلچسپ واقعات 345
15۔ گلگت بلتستان 346
16۔ میری زندگی کے نشیب وفراز 347
17۔ اور زحمتیں رحمتوں میں بدلتی گئیں 348
18۔ میں اپنی جدوجہد سے مطمئن ہوں۔ نتیجے سے نہیں 348
19۔ تاریخ کے دو اہم سبق 349
20۔ میری وصیت 350

دیباچہ

اگر چہ جہدِ مسلسل کی یہ دوسری جلد بھی بنیادی طور پر میری خودنوشت داستانِ حیات ہے لیکن میں نے کوشش کی ہے کہ کتاب کے قارئین کو میری ذات سے متعلق ہی معلومات حاصل نہ ہوں بلکہ مسئلہ کشمیر، تحریکِ آزادیِ کشمیر، گلگت بلتستان سے متعلق معاملات، نظریہ خودمختار کشمیر، میری تنظیم جموں کشمیر لبریشن فرنٹ اور اس کے نظریات کے علاوہ عام زندگی سے متعلق تلخ اور شیرین حقیقتوں کے بارے میں بھی ان کی معلومات میں اضافہ ہو جائے۔ میں نے حالات و واقعات کے تذکرے کے علاوہ مسئلہ کشمیر اور تحریکِ آزادیِ کشمیر سے متعلق اہم موضوعات کے بارے میں اپنے تفصیلی تجزیے بھی پیش کیے ہیں جن سے موجودہ قارئین کے علاوہ مستقبل کے محقق بھی مناسب استفادہ کر سکیں گے۔

اگر چہ میرا سیاسی تعلق جموں کشمیر لبریشن فرنٹ سے ہے لیکن کتاب میری ذاتی ہے اس کی یا اس کے مندرجات کی ذمہ داری کلی طور پر میری ذات پر عاید ہوتی ہے۔

جیسا کہ متعلقہ باب کے علاوہ ضروری نوٹ میں بھی واضح کیا گیا ہے، چند مجبوریوں کی وجہ سے کتاب کی اس دوسری جلد کو دو حصوں میں تقسیم کرنا پڑا جس کے نتیجے میں " کاروانِ آزادی میں میرے ہمسفر " کا باب تیسری جلد کے لئے رکھنا پڑا چنانچہ موجودہ جلد میں ایسے بے شمار اصحاب کے نام شامل نہیں ہو سکے جن کی نظریے، تحریک اور تنظیم کے لئے خدمات بے بہا ہیں اور چند ایسے موضوع اور واقعات بھی شامل نہیں ہو سکے جو میری زندگی کے علاوہ تحریکِ آزادی کے لئے انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ انشاءاللہ یہ کمی تیسری جلد میں پوری ہو جائیگی۔ متعلقہ حضرات سے دل کی گہرائیوں سے معذرت خواہ ہوں۔

مجھے امید ہے قارئین کرام میری اس کاوش سے مناسب استفادہ کریں گے اور وہی استفادہ میری محنت کا اصل صلہ ہوگا۔

امان اللہ خان

راولپنڈی
فروری 2005ء

اظہار تشکر

کتاب لکھنے کے سلسلے میں انسان کو ہر مرحلے پر احباب کی مدد کی ضرورت پڑتی ہے۔ گو میں اپنے ذاتی اور سیاسی معاملات میں زیادہ سے زیادہ کام خود کرنے کا عادی ہوں لیکن کتاب لکھنے کے سلسلے میں مجھے احباب کی مدد لینی پڑی۔

کتاب کے رف مسودوں کو فیئر کرنے کے سلسلے میں میری مدد برادرم سردار خادم حسین آف بن جونسہ راولاکوٹ، قاری عرفان مصطفےٰ آف (پتن شیر خان) منگ آزاد کشمیر خاص کر منظور احمد خان آف ہائی ہامہ کپواڑہ حال راولپنڈی اور کسی حد تک حافظ ممتاز آف تھوراڑ پونچھ اور سلیم بٹ آف باغ آزاد کشمیر نے بھی کی۔ سردار خادم حسین نے مسودوں کی تصحیح اور پروف ریڈنگ میں بھی سب سے زیادہ مدد کی۔ پروف ریڈنگ میں ان کے علاوہ اعجاز احمد لون آف اوڑی بارہ مولا، ڈاکٹر توقیر گیلانی آف کوٹلی، راجہ مظہر اقبال آف دھیر کوٹ، سردار محفوظ طاہر آف نکیال نے بھی مدد کی۔ جبکہ کمپوزنگ مسٹر آفتاب احمد عباسی نے (گو اجرت پر لیکن خلوص کے ساتھ) اور ایس ایم افضل ہمارے سینئر وائس چیئر مین اور انکے بیٹے سہیل افضل کے علاوہ دل محمد عباسی اور خاص کر اشرف لون آف پونچھ بھارتی مقبوضہ کشمیر حال راولپنڈی نے پرخلوص محنت کی۔ محمد فاروق آف مقبوضہ پونچھ نے ہر ممکن مدد کی نیز حبیب اللہ لون آف بارہ مولا نے بھی کسی نہ کسی طرح مدد کی۔ یہ سب حضرات میرے تنظیمی ساتھی ہیں اور میں اس مدد کیلئے ان سب کا انتہائی مشکور ہوں۔ سکیننگ وغیرہ میں قیمتی مشوروں اور مدد کیلئے میں راولپنڈی کے سلمان شجاع کا مشکور ہوں۔ جہد مسلسل کی پہلی جلد کی کتابت اور اشاعت میں ان کے والد مرحوم شیخ شجاع الحق نے کلیدی کردار ادا کیا تھا۔

گلگت بلتستان سے متعلق معلومات اور مواد کے سلسلے میں گلگت سے برادرانِ من جمشید خان دکھی، خوشی محمد طارق، عبدالخالق تاج اور شیر باز علی برچہ اور بلتستان سے قبلہ فدا حسین شمیم بلتستانی، شاکر شمیم، قاسم نسیم اور عباس کاظمی نے خاصی مدد کی جبکہ انکے قیام راولپنڈی کے دوران ''آزادی گلگت بلتستان اور حقائق'' کے مصنف حاجی غلام رسول صاحب سے خاصی معلومات حاصل ہوتی رہیں۔ میرے اپنے بھتیجے اسد اللہ خان نے بھی مختلف طریقوں سے خاصی مدد کی۔ میں ان تمام حضرات کا اس قدر قیمتی مدد کیلئے از حد مشکور ہوں۔ کتاب کی طباعت میں پرخلوص محنت کیلئے میں ٹی ایس پرنٹرز کے ملک عبدالعزیز صاحب اور انکے فرزند عامر عزیز کا مشکور ہوں اور کاغذ کی حصولی میں مدد کیلئے کشمیر پیپر مارٹ لیاقت روڈ کے جاوید ساغر صاحب کا۔

راولپنڈی
فروری 2005ء

امان اللہ خان

معذرت

جیسا کہ میں نے کتاب میں کہیں اور بھی ذکر کیا ہے ایک ایسی کتاب لکھنے کے لئے جس میں تذکروں اور تجزیوں کو بنیادی حیثیت حاصل ہو، دوسری طرز کی کتابیں لکھنے کی نسبت کہیں زیادہ سکون قلب، پُرسکون ماحول، گوشہ نشینی اور یکسوئی میسّر ہونی ضروری ہے لیکن کم از کم سال 2004ء کے دوران میں ان میں سے اکثر سے محروم رہا۔

مجھے عام حالات میں بھی نظریئے، تحریک اور تنظیم سے متعلق متعدد فرائض ادا کرنے ہوتے ہیں لیکن 2004ء کے سال کی ابتدا ہی ایک سانحے سے ہوئی یعنی 6 جنوری کے پاک بھارت مشترکہ اعلان سے جس میں نہ تو کشمیریوں کے حقِ خودارادیت کا کوئی ذکر تھا، نہ کشمیریوں کو مسئلہ کشمیر کا فریق تسلیم کیا گیا تھا نہ ہی ان کے مفادات کہیں نظر آ رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی سرینگر مظفر آباد بس سروس کا شوشہ چھوڑا گیا۔ یہ ساری باتیں جبری تقسیم کشمیر اور ڈیڑھ کروڑ کشمیریوں کو بھیڑ بکریاں سمجھنے کے مترادف تھیں۔ چنانچہ ہم نے اپنا قومی فرض ادا کرتے ہوئے پہلے بس سروس کے خلاف مہم چلائی جو اس وقت پاسپورٹ ویزا کے ساتھ تصور ہوتی تھی۔ اس کے بعد جماعتِ اسلامی آزاد کشمیر کی وحدتِ کشمیر کانفرنس کے سلسلے میں گلگت جانا ہوا جہاں تنظیمی اور دوسرے معاملات کے سلسلے میں کئی ہفتے صرف ہوئے۔ اگست میں تقسیمِ کشمیر کے خلاف ہماری تنظیم نے آزاد کشمیر کے جنوبی کونے بھمبر سے شمالی حصے تاؤبٹ تک مہم چلائی جس پر تقریباً ایک ماہ صرف ہوا۔ باقی عرصے میں بھی تحریکی اور تنظیمی معاملات کے سلسلے میں مصروفیت رہی اس لئے کتاب کے لئے مطلوبہ سہولیات میسر نہیں آئیں۔

چنانچہ جو لوگ اس کتاب کو ایک ادب پارے، گہری سوچ اور جامع تحقیق پر مبنی منفرد تخلیق یا خاکِ کشمیر میں موجود آتش کو زندہ کرنے والی نواہائے سحرگاہی کی عملی شکل میں دیکھنا چاہتے تھے انہیں خاصی مایوسی ہوگی جس کے لئے میں ان سے معذرت خواہ ہوں۔

راولپنڈی
فروری 2005ء

امان اللہ خان

قارئین کرام کتاب کا مطالعہ شروع کرنے سے پہلے یہ نوٹ ضرور پڑھیں

ضروری نوٹ

1- کتاب میں جہاں کہیں بھی لفظ ''کشمیر'' یا ''کشمیری'' استعمال ہوا ہے اسکا مطلب بالترتیب 15 اگست 1947ء والی ریاست جموں کشمیر (بشمول وادی کشمیر۔ جموں۔ لداخ۔ آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان) اور پوری ریاست کے باشندے ہیں۔

2- یہ کتاب 10 حصوں پر مشتمل ہے۔ تقریباً ہر حصہ کئی ابواب پر اور ہر باب کئی عنوانوں پر۔ ان میں سے ہر عنواں اتنا وسیع ہے کہ اس پر ایک کتاب لکھی جاسکتی ہے لیکن مجھے جملہ عنوانات کو ایک ہی باب میں سمونا تھا چنانچہ مجھے تقریباً ہر عنوان میں انتہائی اختصار سے کام لینا پڑا جسکے نتیجے میں بہت سے ایسے واقعات حقائق اور افراد کا ذکر نہیں ہوسکا ہے جنکا عام حالات میں ذکر ہونا چاہیے تھا۔ اس کیلئے میں متعلقہ اصحاب سے صدق دل سے معذرت خواہ ہوں۔

3- کتاب کا ایک پہلو مسئلہ کشمیر، تحریک آزادی کشمیر اور نظریہ خودمختار کشمیر کی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے۔ میں نے اس سلسلے میں اس مسلمہ اصول پر کاربند رہنے کی کوشش کی ہے کہ مورخ کو جج ہونا چاہیے وکیل نہیں۔ جج متعلقین کے بیانات اور دلائل سننے کے بعد اور ان میں پیش کی گئی دستاویزی اور واقعاتی شہادت کی بنیاد پر فیصلہ دیتا ہے۔ اسکی کوئی ذاتی خواہش نہیں ہوتی جبکہ وکیل کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنے دلائل کو صحیح ثابت کرے خواہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہوں۔

4- یہ کتاب 1987ء سے 2004ء تک کے میرے حالات زندگی پر محیط ہونے کے علاوہ مسئلہ کشمیر، تحریک آزادی کشمیر، ہمارے نظریے، ہماری تنظیم جموں کشمیر لبریشن فرنٹ اور ان سے وابستہ امور کے بارے میں حقائق اور میرے تجزیوں پر مشتمل ہے۔ اسلئے میں نے انہیں تاریخ وار کے بجائے مختلف عنوانات کے تحت قلمبند کیا ہے تاکہ قارئین کیلئے متعلقہ معاملات کو سمجھنے میں آسانی ہو البتہ نجی زندگی کا باب میرے اسلاف اور عزیز و اقارب کے علاوہ میرے غیر سیاسی کاموں سے متعلق ہے۔

5- میں نے کتاب میں درج اکثر واقعات اور حقائق سے متعلق اخباری سرخیاں اور فوٹو بھی کتاب کے متعلقہ صفحوں کے آس پاس شامل کئے ہیں۔ قارئین ان پر بھی ایک نظر ڈالیں۔ اس سے کتاب میں درج اکثر حقائق و واقعات کی تصدیق ہونے کے علاوہ قارئین کی معلومات میں خاطر خواہ اضافہ بھی ہوگا۔

6- کتاب کے اکثر باب جن میں میری ذات سے متعلق معاملات کی تفصیل درج ہے، کو سطحی طور پر پڑھنے سے سطحی سوچ کے مالک قارئین کو پہلا تاثر یہ مل سکتا ہے کہ میں خودستائی (اپنی تعریف کرنے) یا

مبالغہ آرائی سے کام لے رہا ہوں لیکن ذرا گہرائی میں جا کر ان واقعات اور معاملات پر سنجیدگی سے غور کریں تو قارئین کو اس میں بے شمار ایسی سبق آموز اور پوشیدہ باتیں ملیں گی جن سے وہ خاص کر نئی اور مستقبل کی نسل سے تعلق رکھنے والے بخوبی استفادہ کر سکتے ہیں اور کتاب میں اس معاملات کے تذکرے کا اہم ترین مقصد بھی یہی ہے۔

7- قارئین کو اس کتاب میں میری سوچ کہیں انتہائی سطحی یہاں تک کہ چھچھورے پن کی سرحدوں کو چھوتی محسوس ہوگی اور کہیں خاصی گہری، وسیع، سنجیدہ اور عالمگیر۔ یہ دونوں انتہا والے طرز ہائے عمل متعلقہ موضوعات کے تقاضوں کے مطابق اختیار کئے گئے ہیں۔

8- کتاب کے مطالعے کے دوران قارئین کے ذہنوں میں طرح طرح کے سوال اٹھیں گے آپ ان سوالوں کو ذہن میں رکھ کر مطالعہ جاری رکھیں۔ آپ کو مختلف عنوانات میں اپنے اکثر سوالوں کے جواب ملیں گے۔

9- کتاب کے کچھ ابواب میں موضوع سے متعلق افراد کی فہرستیں شامل ہیں ضروری نہیں کہ ان فہرستوں میں ناموں کی ترتیب متعلقہ افراد کی اہمیت کی عکاسی کرتی ہو۔

10- میں نے پوری کوشش کی ہے کہ کتاب میں کسی کی بے جا دِل آزاری نہ ہو۔ کشمیری لیڈروں کے کردار کے منفی پہلوؤں کی نشاندہی صرف ارفعہ قومی مفاد میں کی ہے کسی کی کردار کشی کے مقصد سے نہیں۔ کچھ حقائق اور واقعات کا ذکر ایک سے زیادہ عنوانات کے تحت ہوا ہے جو ظاہراً غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اگر ایسا نہ کیا جاتا تو متعلقہ موضوع میں خلاء رہ جاتا اور اسکی پوری وضاحت نہیں ہوتی۔

11- یہ کتاب موجودہ نسل سے کہیں زیادہ آئندہ نسلوں کی مسئلہ کشمیر، تحریک آزادئ کشمیر، نظریہ خودمختار کشمیر اور گلگت بلتستان سے متعلق معلوماتی ضروریات کو مدنظر رکھ کر لکھی گئی ہے اسلئے اس میں بہت سے ایسے معاملات بھی شامل ہیں جو آج زباں زد عام ہیں اسلئے ان کا یہاں اندراج ظاہراً غیر ضروری معلوم ہوگا لیکن آئندہ نسلوں کیلئے یہ حقائق انتہائی قیمتی معلومات ہونگے اس لئے انھیں یہاں شامل کیا گیا ہے۔

12- اگرچہ کتاب میں، تحریک آزادی کشمیر، مسئلہ کشمیر، نظریہ خودمختار کشمیر، جموں کشمیر لبریشن فرنٹ اور گلگت بلتستان سے متعلق خاصا مواد ہے بلکہ زیادہ مواد ان ہی سے متعلق ہے لیکن قارئین کو یہ حقیقت نظرانداز نہیں کرنی چاہیئے کہ کتاب بنیادی طور پر میری خودنوشت سوانح حیات ہے اور اس حیثیت سے یہ بات غیر مناسب نہیں کہ اس کے مندرجات کا خاصا حصہ میری ذات کے گرد گھومتا ہے۔

13- اگرچہ کتاب کے آخر میں قصہ مختصر کے عنوان سے کتاب میں درج اہم حقائق و واقعات کا خلاصہ اور تجزیہ درج ہے لیکن کتاب سے پورہ استفادہ کرنے کے لئے پوری کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

14- میں تحریک آزادی کشمیر میں سرگرم عمل دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے (مشرق میں ہانگ کانگ سے مغرب میں امریکہ) تک پھیلی ہوئی تنظیم جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کا سربراہ ہوں جسکی سیاسی، سفارتی اور تنظیمی سرگرمیوں اور مالی معاملات سے لیکر پالیسی سازی، منصوبہ بندی اور دیگر معاملات

کی نگرانی میرے فرائض میں شامل ہے اسلئے میری مصروفیات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں چنانچہ کتاب لکھنے کے لئے جو ذہنی فراغت، گوشہ نشینی اور پرسکون ماحول ضروری ہے، مجھے وہ میسر نہیں جسکے نتیجے میں نہ تو کتاب کے مندرجات میں ادبی سطح میرے معیار تک پہنچ سکی نہ ہی خیالات میں مطلوبہ تسلسل قائم رہ سکا جس کا مجھے انتہائی افسوس ہے۔

15- کتاب کی پہلی جلد میں نجی زندگی کے باب میں کچھ ضروری حقائق نظرانداز ہوئے تھے۔اب کے ان نقائص کو دور کر کے پوراباب دوبارہ لکھا ہے تاکہ غلطی کا ازالہ ہواور گلے گذاریوں سے چھٹکارا ملے۔

16- کتاب کے مسودے کی کمپوزنگ مکمل ہونے لگی تو معلوم ہوا کہ صفحوں کی تعداد 500 سے تجاوز کر جائے گی۔ دور جدید میں اس موضوع کی اتنی ضخیم کتاب خاصی نامناسب دکھائی دیتی تھی نہ ہی پوری کتاب کو مختصر کر کے یا کچھ عنوانات منہا کر کے شائع کرنا مناسب معلوم ہوتا تھا اسلئے میں نے فیصلہ کیا کہ کتاب کی تیسری جلد بھی شائع کی جائے چنانچہ کچھ اہم عنوانات مثلاً ''کاروان آزادی میں میرے ہمسفر'' ''میرے ریاستی پاکستانی، بھارتی اور عالمی سطح کے واقف کار'' ''ہمارے محسن'' ''میری تحریریں'' ''میں اور مذہب'' ''کچھ پچھتاوے'' ''گلگت بلتستان'' ''دلچسپ متفرقات'' ''جنگ بندی لائن پر چار تاریخی حملے'' ''میری ذہنی اختراعات'' وغیرہ تیسری جلد کے لئے رکھے۔ تیسری جلد کے فیصلے کی ایک انتہائی اہم وجہ یہ تھی کہ اکثر عنوانات خاص کر اولذکر جس میں بھارتی مقبوضہ کشمیر، آزاد کشمیر میں اور بیرون ریاست تحریک کیلئے جانی، جسمانی اور مالی قربانی دینے والے میرے تنظیمی ساتھیوں کی فہرستیں اور کوائف مکمل نہیں تھے اور ان نامکمل فہرستوں کو ہی شائع کرنا ایک بڑا اخلاقی جرم اور پرلے درجے کی فرض ناشناسی ہوتی۔ اسی طرح دوسرے عنوانات میں بھی تشنگی محسوس ہوئی تھی اسلئے ان کی کمی کو پورا کر کے انہیں تیسری جلد میں شائع کیا جائے گا۔ انشاءاللہ یہ اور کچھ نئے عنوانات مکمل ہوتے ہی کتاب کی تیسری جلد شائع ہوگی۔

17- جو اصحاب یہ سمجھتے ہیں کہ کتاب میں ان کے ساتھ کسی قسم کی ناانصافی ہوئی ہے وہ مہربانی کر کے مجھے اسکی تفصیلی اطلاع دیں۔ اگر شکایت صحیح ہو تو انشاءاللہ اس کا ازالہ تیسری جلد میں کیا جائے گا۔ اگر کوئی صاحب کتاب میں شامل میرے کسی استدلال کو غلط سمجھتے ہوں تو مجھے دلیل کے ساتھ اطلاع دیں۔

18- پوری احتیاط کے باوجود کتاب کی پروف ریڈنگ میں کچھ کمی رہ گئی ہے۔ معذرت خواہ ہوں۔

مجھے امید ہے قارئین کرام کتاب کے مطالعے کے دوران اس ضروری نوٹ کو مدنظر رکھیں گے اور کتاب کے جملہ مندرجات سے بھی پورا استفادہ کرینگے۔

امان اللہ خان

راولپنڈی

فروری 2005ء

حصہ اول

میری نجی زندگی

1- میرے اسلاف اور عزیز

(الف) میرے آباؤ اجداد

(ب) میرے خویش واقارب

(ج) خویش واقارب کی تاریخ ہائے وفات

2- عزیز واحباب جنہوں نے میری خدمت، مدد کی۔

3- میری اصل تاریخِ پیدائش اور تعلیم

4- میری ملازمتیں

5- میرے تعلیمی ادارے

کتاب کی پہلی جلد میں نجی زندگی کے بارے میں کچھ اہم معاملات شامل نہیں ہو سکے تھے اسلئے اب کے پورا باب اضافوں کیساتھ دوبارہ لکھا ہے امید ہے بہت سی گلہ گذاریوں سے نجات ملے گی۔

ا۔ میرے اسلاف اور عزیز

(الف) آباؤ اجداد

انیسویں صدی کے اواخر تک ریاست جموں کشمیر کے شمال مشرقی، شمالی اور شمال مغربی حصے یعنی لداخ بلتستان اور گلگت کے علاقوں کے ریاست کے باقی علاقوں سے بہت کم رابطے تھے۔ البتہ گلگت کے جنوب مشرق میں واقع علاقہ استور ریاست کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ علاقے وادیٔ کشمیر سے تقریباً ملحق ہونے کی وجہ سے دوسرے علاقوں کی نسبت خاصا ترقی یافتہ تھا۔ میری جائے پیدائش استور کا علاقہ پری شنگ ہے۔ استور کے نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ علاقہ ہونے کے باوجود وہاں کے دوسرے لوگوں کی طرح میرا بھی سو فیصد مستند شجرہ نصب موجود نہیں کیونکہ اس زمانے میں نہ تو وہاں اس کا رواج تھا نہ لوگ اتنے لکھے پڑھے یا باشعور تھے کہ لوگوں کے شجرہ ہائے نسب تیار کئے جاتے۔ البتہ میرے ماموں حاجی عبدالرحیم خان آف ڈوئیاں استور جو 1978ء میں انتقال کے وقت ایک سو سال سے زائد عمر کے تھے، اپنے علاقے کے اہم زعما میں سے تھے، وادیٔ کشمیر جاتے رہتے تھے اور استور کے اہم خاندانوں کے پس منظر سے کافی واقف تھے۔ ان کے علاوہ میرے والد نسبتی (سسر) عبدالحمید خان خاور (سابق اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل پولیس اور سابق ممبر گلگت بلتستان کونسل) نے پورے علاقہ گلگت بشمول استور کے اہم خاندانوں کے شجرہ ہائے نسب کے بارے میں تفصیلی تحقیق کی تھی۔

ان دونوں باخبر بزرگوں کے مطابق میرے آباؤ اجداد کا تعلق گلگت کے جنوب مغربی قبائلی علاقہ یاغستان (باغیوں کے مسکن) سے تھا۔ وہ غالباً اٹھارویں صدی کے اوائل میں وہاں سے ہجرت کر کے استور کے مغرب میں واقع چلاس کے علاقے تھور اور جلکوٹ میں آباد ہوئے جنکی اولاد آج بھی وہاں آباد ہے۔ اور منو کے کہلاتی ہے۔ آجکل ان میں سے نمایاں افراد میں سکندر خان، امیر حاتم، شمس الدین جعفر، عبدالباقی وغیرہ پسران شیر غازی بتائے جاتے ہیں۔ شیر غازی کے بھائی میر زمان رضا خان اور صبر خان تھے۔

یاغستان سے تھور آنے والوں میں سے کچھ لوگ کچھ مدت کے بعد وادیٔ کشمیر کی طرف چلے گئے جہاں وہ سرینگر کے جنوب میں واقع علاقہ پانپور، جو زعفران کی کاشت کیلئے مشہور ہے، میں آباد ہوئے۔ کچھ مدت بعد ان میں سے کچھ لوگوں نے شمال کی طرف ہجرت کی اور گریز کے علاقہ بکتور میں آباد ہوئے۔ بکتور میں اس خاندان کے تین بھائیوں دائم، قائم اور یوسف نے نام پیدا کیا۔ دائم بکتور میں ہی آباد رہے۔ اس نے اور اسکی اولاد نے علاقے کی زیلداری حاصل کی اور علاقے میں ہڑے کے نام سے مشہور

تھے۔اس خاندان کے کچھ لوگ 1947ء میں ہجرت کر کے آزاد کشمیر کے علاقہ تاؤبٹ (ضلع مظفرآباد کے انتہائی شمال میں) آباد ہوئے۔تاؤبٹ میں اس خاندان کی اہم شخصیت مرحوم قمرالدین کی تھی جو مقامی یونین کونسل کے چیئرمین بھی رہے۔ان کے تین بیٹے مشتاق احمد،عبدالحمید اور محمد یاسین ہیں۔قمرالدین کی ایک بھانجی مظفرآباد آزاد کشمیر میں ہے۔جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کے سرگرم کارکن (آجکل ضلعی سیکرٹری) مظفر بٹ اور عمران بٹ اسی خاتون کے بیٹے ہیں۔دائم کے دو بھائی قائم اور یوسف بکٹور (گریز) سے استور کی طرف منتقل ہوگئے۔ایک بھائی غالباً قائم استور کے علاقہ درلہ پائیں میں آباد ہوئے اور ان کی اولاد آج بھی وہیں ہے۔ان میں سے اہم شخص نمبردار عبدالکریم تھے۔موضع چورت استور کے نصراللہ خان کا کہنا ہے کہ انکا خاندان بھی ہمارے اسلاف (قائم) کی اولاد ہے۔بکٹور گریز سے آئے ہوئے دوسرے بھائی یوسف اور اس کا بیٹا (یا پوتا) یعنی میرا پردادا خلیل استور کے علاقے گوریکوٹ میں آباد ہوئے۔اس کے بعد وہ استور خاص کے شمالی مشرق میں واقع وادی پری شنگ کے موضع شیپہ میں آباد ہوئے۔اسی دوران خلیل نے مقررہ فیس (چالیس روپے) ادا کر کے پری شنگ کی نمبرداری حاصل کی لیکن انکی وفات کے بعد ان کے بیٹے نورخان (میرے دادا) کو پری شنگ کی بجائے پتی پورہ استور کی نمبرداری دی گئی۔ میرے والد صاحب کے دادا خلیل خاصی مدت تک استور کے نابالغ راجے کے سربراہ بھی رہے۔میرے دادا نورخان پری شنگ کیلئے استور کے راجے کے معتبر (نمائندے) بھی رہے یہ سارے حقائق نائب تحصیلدار استور کی اس رپورٹ میں درج ہیں جو اس نے 29 ماگھ 1979 بکرمی بمطابق 11 فروری 1923 عیسوی کو میرے والد صاحب کی پری شنگ کی نمبرداری کیلئے موزونیت کے سلسلے میں حکام بالا کو بھیجی تھی جسکی نقل میرے آبائی ریکارڈ میں میرے پاس موجود ہے۔

شیپہ میں کچھ سال رہنے کے بعد میرے دادا نورخان اور ان کے بھائی ستار نزدیکی گاؤں کھنگرول منتقل ہوگئے اور وہاں برلب دریا اپنا مکان بنایا۔اسطرح میرا خاندان گزشتہ تقریباً سوا سو سال سے کھنگرول میں رہائش پذیر ہے۔میرے والد صاحب 1870ء کی دہائی میں پیدا ہوئے اور انہوں نے بیسویں صدی کی ابتداء میں کھنگرول میں نئے طرز کا ایک عالیشان دومنزلہ مکان تعمیر کیا جو علاقے کا پہلا دو منزلہ مکان تھا اور انتہائی خستہ حالت میں ہونے کے باوجود آج بھی انتہائی پروقار ہے۔ہماری زمینیں پری شنگ کے مختلف دیہات کھنگرول شیپہ،رامکھہ،دیلنگ اور پچنپوت کے علاوہ موضع لوس کے دیہات اور اور پھوپل میں بھی ہیں۔

میرے دادا نورخان ایک دلیر اور دوراندیش انسان تھے۔اس دور میں پری شنگ کے نمبردار لاہورخان کا خاندان انتہائی طاقتور تھا۔میرے دادا کی شادی لاہورخان کی بہن سے اور لاہورخان کی شادی میرے دادا کی بہن سے ہوئی تھی۔میرے دادا نے دوراندیشی سے کام لیکر اپنے تین بیٹوں میں سے ایک یعنی میرے والد کو تعلیم دلوائی۔اور وہ پرائمری کی تعلیم (جو اس زمانے میں پورے گلگت میں اعلیٰ ترین تعلیم تھی) حاصل کرنے کے بعد پٹواری بن گئے جو اس زمانے میں استور کا سب سے بڑا مقامی عہدہ تھا۔

میرے والد صاحب شروع سے ہی دیانتداری اور پرہیزگاری کیلئے مشہور تھے۔ پورے استور میں انکی صاف گوئی اور دیانتداری کو مثال کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ وہ سرکاری ملازمت میں ترقی پاتے ہوئے گرداور اور قانونگو کے عہدوں پر رہے۔ کچھ مدت قائم مقام نائب تحصیلدار بھی رہے جو اس زمانے میں استور کا سب سے بڑا سرکاری عہدہ تھا۔

میرے والد صاحب کی سرکاری ملازمت کے اواخر کے دوران ان کے ماموں زاد اور پھوپھی زاد بھائی مولوی صمد خان (لاہور خان کے بیٹے) پری شنگ کے سات دیہات کے نمبردار تھے۔ صمد خان اپنی انتہائی سخت گیر طبیعت اور دوسری کچھ کمزوریوں کی وجہ سے عوام میں انتہائی غیر مقبول تھے اور حکومت بھی ان سے خاصی نالاں تھی چنانچہ حکومت نے میرے والد کو ریٹائرمنٹ سے پہلے ہی ایک سال کی چھٹی دیکر پری شنگ کے ساتوں دیہات کا نمبردار بنادیا جو ان دنوں کسی شخص کیلئے ایک بہت بڑا اعزاز تھا اور جس سے لاہور خان کا خاندان محروم ہوگیا تھا چنانچہ دونوں خاندانوں میں زبردست دشمنی پیدا ہوگئی۔ صمد خان کا خاندان انتہائی طاقتور تھا انہوں نے میرے والد پر متعدد ناکام قاتلانہ حملے کئے اور کرائے۔ انکی وفات (16 مارچ 1935ء) کے بعد میری جان لینے کی کئی کوششیں کی گئیں چنانچہ میرے بزرگوں نے مجھے بچپن میں ہی اپنی بہن کے ساتھ وادئ کشمیر کے ضلع کپواڑہ کے موضع ہائی ہامہ بھیج دیا جو پری شنگ سے ڈیڑھ سو کلومیٹر دور ہے لیکن اُس زمانے میں گھوڑے پر سات دن کا سفر تھا۔ میری ہمشیرہ وہاں کے ماسٹر ہاشم علی خان سے بیاہی گئی تھیں جو استور میں 14 سال ملازمت کرنے کے بعد تبدیل ہوکر 1939-40ء میں اپنے علاقے واپس گئے تھے۔

(ب) میرے خویش واقارب

میرے پردادا خلیل کے دو بیٹے نور خان (میرے دادا) اور ستار تھے۔ ستار ایک انتہائی سادہ انسان تھے اور کھیتی باڑی اور گھریلو کام کرتے تھے۔ انکا ایک بیٹا روزی خان تھا۔ روزی خان کا بھی ایک بیٹا غنی خان تھا۔ اس کا بھی ایک بیٹا جلیل تھا اور جلیل کے چار بیٹے جمعہ گل، صفت خان، نجم خان اور ثناءاللہ اور پانچ بیٹیاں ہیں۔

میرے دادا نور خان کے چار بیٹے نعمت خان، فقیر محمد، جمعہ خان اور اکبر خان اور تین بیٹیاں تھیں۔ نعمت خان اور ایک بیٹی ایک بیوی سے اور فقیر محمد، جمعہ خان، اکبر خان اور دو بیٹیاں دوسری بیوی سے۔ نعمت خان کا ایک بیٹا افضل خان اور ایک بیٹی تھی۔ افضل خان کے تین بیٹے محمد صغیر، دلاور خان، عبداللہ خان اور دو بیٹیاں تھیں اور اسکی پھوپھی زاد بہن کے چار بیٹے جمعہ سید، عبدالقدیر، میمون شاہ اور الیاس اور دو بیٹیاں تھیں۔ محمد صغیر کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ دلاور خان کے چار بیٹے مطیع الرحمٰن، سعید الرحمٰن، عبیداللہ اور شفیع اللہ ہیں۔ عبداللہ خان کا ایک بیٹا فاروق ہے۔

جمعہ سید کے پانچ بیٹے صوبیدار فضل احمد، مولوی عبدالحمید شہید، غلام نبی، نوشاد اور الیاس تھے۔

عبدالقدیر کی کوئی اولاد نہیں۔ میمون شاہ کا ایک بیٹا اقبال اور دو بیٹیاں تھیں۔ الیاس کا ایک بیٹا عبدالرؤف اور غلام نبی کے دو بیٹے آصف اور ثاقب اور پانچ بیٹیاں ہیں۔ انکی والدہ شاہدہ (بیگم غلام نبی) میرے چاچا زاد بھائی حاجی صاحب خان کی بیٹی ہے۔

میرے دادا نور خان کے دوسرے بیٹے فقیر محمد کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ تیسرے بیٹے یعنی میرے والد صاحب کی پہلی بیوی سے دو بیٹے اور آٹھ بیٹیاں تھیں اور دوسری بیوی سے ایک بیٹا (میں) اور ایک بیٹی تھے۔ پہلی بیوی کے بیٹے اور دوسری کی بیٹی بچپن ہی میں فوت ہوگئے۔ میری ایک ہی بیٹی اسماء ہے۔ اس کے دو بیٹے عماد اور عدنان ہیں۔

میری دو بہنوں عائشہ اور نسا کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ سب سے بڑے بہنوئی کھوکھر خان جو میرے والد کے گھر داماد تھے اور شادی کے بعد چالیس سال تک ہمارے گھر میں ہی رہے، کے تین بیٹے مولوی محمد صدیق، غلام رسول اور ڈاکٹر محبوب عالم اور پانچ بیٹیاں لالمرہ، منجہ، زبیدہ، خلیفہ اور زلفیہ تھیں۔ مولوی محمد صدیق ہمارے ہاں ہی پیدا ہوئے۔ والد صاحب انہیں نواسے کی بجائے بیٹا تصور کرتے تھے۔ مولوی صدیق کے تین بیٹے محمد حنیف، عبدالباقی اور محمد عارف اور چار بیٹیاں ہیں۔ غلام رسول کے تین بیٹے غلام رضا، غلام نور اور جمال ناصر اور ایک بیٹی ہے۔ غلام رسول کی اہلیہ میری خالہ ہے اسطرح یہ تینوں میرے خالہ زاد بھائی بھی ہیں۔ غلام رضا کا ایک بیٹا رضا ربانی، غلام نور کے تین بیٹے محمد عباس، غلام اللہ، وقار احمد اور پانچ بیٹیاں اور جمال ناصر کا ایک بیٹا یاسر جمال اور دو بیٹیاں ہیں۔

ڈاکٹر محبوب عالم کے تین بیٹے آفاق عالم، سعد عالم اور طلحہ عالم اور ایک بیٹی حاجرہ ایمن ہے۔ ڈاکٹر محبوب کی پہلی شادی ہائی ہامہ مقبوضہ کشمیر کے میجر امان اللہ خان اور میرے ہائی ہامہ والے بہنوئی ماسٹر ہاشم علی خان کی بیٹی گلدانہ بیگم کی بیٹی ممتاز مینا سے ہوئی تھی۔ جس سے کوئی اولاد نہیں ہوئی چنانچہ اسکی زندگی میں ہی اور اسکی مرضی سے ڈاکٹر محبوب کی دوسری شادی 1971ء میں میری چچازاد بھانجی ثریا (جو جان کاکی کے نام سے معروف ہیں) اور بونجی کے ظل اللہ خان (ڈی ایف او) کی بیٹی نصرت جہاں سے ہوئی۔ ممتاز مینا کا 1991ء میں انتقال ہوگیا۔

میرے دوسرے بہنوئی گرداور نعمت خان جو میرے والد صاحب کے انتہائی قریبی ساتھی بھی تھے نے چار شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی سے دو بیٹے منشی عنایت خان اور محمد انوار، دوسری بیوی سے ایک بیٹی (صاحب جان) اور چوتھی سے کوئی اولاد نہیں تھی۔ میری بہن کے بطن سے ان کے تین بیٹے شجاعت خان مرحوم (سابق آفس قانون گو) مرحوم محمد اشرف خان (بانی جنرل منیجر گلگت بلتستان کوآپریٹو بنک و بانی مینجنگ ڈائریکٹر چائنا ٹریڈ سنٹر یکیٹ گلگت) ماسٹر مشروف خان اور ایک بہن دُردانہ تھے۔ شجاعت خان جسکے نکاح میں میری سب سے بڑی بہن کی سب سے چھوٹی بیٹی زلفیہ تھی کے پانچ بیٹے ڈاکٹر رشید، عالمگیر، محمد عثمان، مقصود احمد، جہانگیر اور چار بیٹیاں شاہین، شمشاد، کلثوم، حمیرہ ہیں۔ ڈاکٹر رشید کا ایک بیٹا فہد رشید اور تین بیٹیاں ہیں۔ عالمگیر کے چار بیٹے عالم حسین، وکیل احمد، عبدالصبور، نعیم زبیر اور سات بیٹیاں ہیں۔

محمد عثمان کا ایک بیٹا انس ہے۔ مسز عثمان (پروین) میرے ایک ماں بھائی عبدالمناف کی بیٹی ہے۔

محمد اشرف کے تین بیٹے ڈاکٹر طارق اشرف، طاہر اشرف، حامد اشرف اور چار بیٹیاں منیرہ، ڈاکٹر پروین ابرار، لیلیٰ اشرف اور ڈاکٹر ہما اشرف ہیں۔ ڈاکٹر طارق کا ایک بیٹا مصطفےٰ طارق ہے۔

ماسٹر مشروف کے نو بیٹے مجیب الرحمٰن، مسعود الرحمٰن، سعید الرحمٰن، سیف الرحمٰن، تنزیل الرحمٰن، نوید الرحمٰن، شمس الرحمٰن، آصف الرحمٰن، مصباح الرحمٰن، اور تین بیٹیاں اختر شمیم اور نویدہ ہیں۔ مجیب الرحمٰن کا ایک بیٹا عادل مجیب اور ایک بیٹی ایمان ہے۔ مسعود الرحمٰن کی ایک بیٹی ساحرہ مسعود ہے۔ ماسٹر مشروف کی بڑی بیٹی اختر غلام محمد ساکن گدئی استور کے نکاح میں ہے اور مدت سے کراچی میں مقیم ہے۔ انکے چار بیٹے غلام مجتبےٰ، کلیم اللہ، سمیع اللہ، نعمان اللہ اور ایک بیٹی حرا ہے۔

میرے تیسرے بہنوئی مولوی نور محمد کا ایک بیٹا مولوی عبدالمنان اور ایک بیٹی بی بی ہے۔ عبدالمنان کے چار بیٹے ظفر، شمس الدین، شمس الرحمٰن اور صبیح الحق اور چار بیٹیاں ہیں۔

میرے چوتھے بہنوئی ماسٹر ہاشم علی خان آف ہائی ہامہ کے میری بہن کے بطن سے دو بیٹے الطاف علی خان شہید اور محمد نظیم خان اور پہلی بیوی سے تین بیٹیاں گلدانہ، گل نگار اور گل بہار ہیں۔ الطاف علی خان جو وسط 1990ء میں بھارتی فوج کے ہاتھوں شہید ہوئے، کے تین بیٹے جمشید علی خان، جاوید علی خان اور ارشد علی خان اور دو بیٹیاں دُردانہ اور فاطمہ ہیں۔ محمد نظیم خان کا ایک بیٹا خورشید عالم اور چھ بیٹیاں محبوبہ، صاحبہ، روبینہ، آسیہ، ناہیدہ اور شازیہ ہیں۔ خورشید عالم 1990ء سے کراچی میں ہے اور حصول تعلیم کے علاوہ میرے اداروں کی نگرانی کرتا ہے۔ اس کی دو بیٹیاں کائنات اور شوال ہیں۔ اسکی دوسری شادی جولائی 2004ء میں میرے بھانجے مولوی محمد صدیق کی بیٹی صنم سے ہوئی۔

میرے پانچویں بہنوئی منشی نعمت خان کے چار بیٹے محمد شیر، مرحوم انجینئر محمد نواز، ماسٹر شوکت علی خان اور سیف اللہ خان اور چار بیٹیاں ہیں۔ محمد شیر کے دو بیٹے محمد طارق، نصیر احمد اور چار بیٹیاں ہیں۔ نواز مرحوم کی 18 جون 1973ء کو اسکردو میں حادثاتی وفات کے وقت اسکی شادی نہیں ہوئی تھی۔ وہ ایک انتہائی دیانتدار اور فرض شناس انسان تھا۔ شوکت علی کا ایک بیٹا عامر اور دو بیٹیاں ہیں۔ سیف اللہ خان (منیجر زرعی بنک) جسکی شادی میری سب سے چھوٹی بہن کی اکلوتی بیٹی نسیم سے ہوئی ہے کے تین بیٹے دانش، عمیر، نعمت اللہ اور دو بیٹیاں منیزہ، سحر ہیں۔

میرے چھٹے بہنوئی ماسٹر فرض خان مرحوم (جو میرے ابتدائی استاد بھی تھے) کے آٹھ بیٹے ثناء اللہ خان، محبوب علی خان (سابق ممبر این اے قانون ساز کونسل)، ایگزیکٹو انجینئر خورشید عالم، فرید اللہ، عبدالوحید، ماسٹر فیض اللہ، عبدالمحیط، منور علی اور ایک بیٹی نسیم ہے۔ ثناء اللہ کے تین بیٹے احسان اللہ، ضیاء اللہ اور ظہیر اللہ اور تین بیٹیاں ہیں۔ محبوب علی خان کے تین بیٹے اظہر علی، مظفر علی، منظور علی اور پانچ بیٹیاں خالدہ، عقیلہ، نائلہ، انیلہ اور اسماء ہیں۔ خورشید عالم کے دو بیٹے آفتاب عالم اور نجم خان (المعروف عالیان) اور پانچ بیٹیاں صائمہ، ثمینہ، مریم، آمنہ اور منال ہیں۔ ان کی ماں ذلیخہ بھی میری بھانجی (منشی نعمت خان مرحوم

کی بیٹی) ہے فرید اللہ کے آٹھ بیٹے امیر اللہ، سمیع اللہ، نسیم اللہ، ابرار، اجلال، وسیم، نجم دین، وقار اور ایک بیٹی ہے۔ عبدالوحید جسکا ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہوگیا کے دو بیٹے سلیمان اور عدنان اور ایک بیٹی، عبدالمحیط کا ایک بیٹا عبدالباسط اور تین بیٹیاں ہیں۔ فیض اللہ کی دو بیٹیاں کرن اور عفت اور منور علی کا ایک بیٹا سلطنت علی خان اور ایک بیٹی نیہا علی ہے۔

میرے چچا اکبر خان مرحوم جو ایک انتہائی نیک اور پارسا انسان تھے، کے چار بیٹے عنایت خان، حاجی صاحب خان، عبدالجمیل اور ڈاکٹر نور جلیل اور چار بیٹیاں حلیمہ، سرجمہ، بازی اور رشیدہ تھیں۔ میرے والد صاحب کی وفات کے بعد میری والدہ کی شادی میرے چچازاد عنایت خان سے ہوئی۔ عنایت خان کے میری والدہ کے بطن سے چار بیٹے عطی اللہ خان، سابق سیکرٹری قانون ساز کونسل گلگت بلتستان، کرنل نیاز محمد، عبدالمناف اور عبداللطیف اور ایک بیٹی ذوالحجہ اور دوسری بیوی سے تین بیٹے اورنگزیب، حفیظ اللہ، منظور احمد اور دو بیٹیاں عالیہ اور نازنین ہیں۔ اسطرح عطی اللہ خان، کرنل نیاز، عبدالمناف، عبداللطیف اور ذوالحجہ میرے ماں ایک بھائی بہن بھی ہیں۔ عطی اللہ خان کے چار بیٹے اسداللہ، سعیداللہ، الطاف علی، کلیم اللہ اور چار بیٹیاں شکیلہ رانی، انیلہ کنول، افشاں خان اور حمیرہ ہیں۔ انکی والدہ صفیہ میرے ماموں زاد مرحوم محمد اسماعیل خان کی بیٹی ہے۔ کرنل نیاز محمد کے چار بیٹے محمد زبیر، محمد بلال، محمد شعیب، محمد عاقب اور ایک بیٹی کائنات ہے۔ ان پانچوں کی والدہ (نسیم) میرے چچازاد مرحوم حاجی صاحب خان کی بیٹی ہے۔ عبدالمناف کے سات بیٹے احسان اللہ، محمد طفیل، مقبول احمد، فیض احمد، معراج احمد، حشمت اللہ، رضوان احمد اور پانچ بیٹیاں تنویر، پروین، رفعت، نزہت اور نبیلہ ہیں۔ احسان اللہ کا ایک بیٹا ہشام اور ایک بیٹی شائزے ہے۔ بیگم احسان اللہ شکیلہ ہرچو کے سلطان ابراہیم کی بیٹی ہے۔ عبداللطیف کا ایک بیٹا زید بن لطیف اور دو بیٹیاں سمیعہ اور عروج ہیں۔ مسز لطیف (عابدہ) میرے خالہ زاد مرحوم مولوی محمد رضا کی بیٹی ہے۔ اورنگزیب نے جاپان میں شادی کی ہے اسکا ایک بیٹا اکبر خان ہے۔

دوسرے چچازاد بھائی حاجی صاحب خان کے چھ بیٹے ڈپٹی چیف انجینئر قدم خان ایس پی (اے ایس ایف) محمد سلیم، ظفر اللہ، محمد ایوب، ماسٹر نیک عالم، بشارت احمد اور آٹھ بیٹیاں گل شاء، حنیفہ، سعیدہ، شاہدہ، نسیم، نعیمہ، شاد اور خالدہ ہیں۔ قدم خان کی پہلی اہلیہ (میری ایک ماں بہن ذوالحجہ مرحومہ سے) چار بیٹیاں فوزیہ، عابدہ، راحیلہ اور نورین اور دوسری بیوی (مرحوم صفت خان آف ہرچو کی بیٹی شمیم) سے چار بیٹے ضیاء الحق، خاقان احمد، دانیال احمد اور غلام احمد ہیں۔ محمد سلیم کی شادی گودائی استور میں ہوئی ہے۔ اسکے دو بیٹے محمد فہیم، محمد وسیم اور پانچ بیٹیاں ثناء، حنا، عروسہ، وجیہہ، سعدیہ اور سلوا ہیں۔ ظفر اللہ کے دو بیٹے محمد حیات، طارق جمیل اور پانچ بیٹیاں ہیں۔ محمد ایوب حال ملیشیا کا ایک بیٹا عقیل خان ہے۔ نیک عالم کا ایک بیٹا سمیر عالم اور ایک بیٹی عتیبہ ہے۔ بشارت ابھی غیر شادی شدہ ہے۔ حاجی صاحب کی بڑی بیٹی سعیدہ کے دو بیٹے عرفان اور انعام اور تین بیٹیاں شفقت، نزہت اور راحت دوسری بیٹی نعیمہ کا ایک بیٹا ابرار اور پانچ بیٹیاں ندا، ملیحہ، سارا، زمیرہ اور مریم ہیں۔

میرے تیسرے چچازاد عبدالجمیل 1948ء میں گوریز میں بھارتی فوج کے ہاتھوں شہادت کے وقت غیر شادی شدہ تھے۔

میرے چوتھے چچازاد ڈاکٹر نور جلیل کے چار بیٹے محمد فاروق، ضیاء الحق، ریاض الحق، نوید الحق اور سات بیٹیاں طاہرہ، یاسمین، نیلوفر، نشاط، شمیم، شازیہ اور نادیہ ہیں۔ انکی والدہ بی بی حوا میرے ماموں زاد محمد یوسف آف ڈوئیاں کی بیٹی ہے۔

میرے سب سے بڑے چچیرے بہنوئی مرحوم حاجی عبدالغنی (فارسٹ رینج افسر جو میری بڑی والدہ کے بھتیجے بھی تھے) کے چار بیٹے انجینئر جمشید علی، جیالوجسٹ عبدالرحمٰن، ڈی ایف او عبدالقیوم اور مشتاق احمد ایڈووکیٹ نائب امیر جماعت اسلامی آزاد کشمیر اور دو بیٹیاں ثریا اور آسیہ مرحومہ ہیں۔ جمشید علی خان کی کوئی اولاد نہیں۔ عبدالرحمٰن کا ایک بیٹا شفیق احمد ہے۔ اور عبدالقیوم کے چار بیٹے شہاب الدین، زین العابدین، عمادالدین اور رحیم الدین ہیں۔ اور مشتاق احمد کی دو بیٹیاں طلوع اور خولہ ہیں۔

دوسرے چچیرے بہنوئی رحیم خان کے چار بیٹے محمد نظیم، محمد عیسےٰ، محمد حنیف، عبدالرؤف اور دو بیٹیاں تھیں۔ محمد نظیم کے دس بیٹے عبیداللہ، (عبدالقوی) یوسف علی، صادق، محمد قاسم، اقبال، حبیب، امتیاز، زمین خان، سلیمان، رمضان اور پانچ بیٹیاں ہیں۔ محمد عیسےٰ کے تین بیٹے نسیم اللہ، عبدالقیوم، کلیم اللہ اور چار بیٹیاں، محمد حنیف کے چار بیٹے عبدالواحد، عبدالباری، عبدالرزاق، احسان اللہ اور تین بیٹیاں اور عبدالرؤف کا ایک بیٹا عبدالودود اور دو بیٹیاں ہیں۔

تیسرے چچازاد بہنوئی بہادر خان کے چار بیٹے مسیح اللہ، ثناء اللہ، حبیب اللہ، اکرام اللہ اور دو بیٹیاں ہیں۔ مسیح اللہ کے پانچ بیٹے سلیمان خان، حبیب الرحمٰن، شفیق الرحمٰن، رفیق الرحمٰن، سعید الرحمٰن اور دو بیٹیاں ہیں۔ ثناء اللہ کے چھ بیٹے عبدالمبین، عبدالمقیم، مجیب الرحمٰن، عبدالمحیط، عبدالیقین، محمد ظاہر اور تین بیٹیاں ہیں۔ اکرام اللہ کے دو بیٹے محمد بن اکرام اللہ خان، حمزہ بن اکرام اللہ اور ایک بیٹی ہے۔ مسز اکرام اللہ میرے چچازاد ڈاکٹر نور جلیل کی بیٹی شمیم ہے۔ حبیب اللہ کی کوئی اولاد نہیں۔

چوتھے چچیرے بہنوئی سجاور خان کے میری چچازاد بہن رشیدہ کے بطن سے چار بیٹے محمد ابراہیم، سنگ علی، شیر عالم، نور عالم اور دو بیٹیاں ہیں اور میری بھانجی بی بی کے بطن سے تین بیٹے میر عالم، سید عالم، شفیع عالم ہیں۔ محمد ابراہیم کے آٹھ بیٹے اور تین بیٹیاں، سنگ علی کے چار بیٹے اور چار بیٹیاں، شیر عالم کے تین بیٹے شاہد، ساجد، ثاقب اور دو بیٹیاں ہیں۔ نور عالم کے دو بیٹے عمر عالم، عمیر عالم اور ایک بیٹی حمیرہ ہے۔ میر عالم کی دو بیٹیاں ہیں۔ نور عالم کی اہلیہ میرے چچازاد حاجی صاحب خان کی بیٹی شاد ہے۔

میری تین پھوپھیاں تھیں۔ ایک پھوپھی کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ دوسری پھوپھی (شوہر کا نام بہادر خان) کے چار بیٹے رحمت اللہ، محمد رمضان، محمد عبداللہ، عبدالخالق اور چار بیٹیاں تھیں۔ اس خاندان کو میرے والد صاحب نے موضع لوس سے لاکر رامکھ پری شنگ میں آباد کیا تھا اور ان کے نام زمین انتقال کرائی تھی۔ ان میں سے رحمت اللہ کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ محمد رمضان کا ایک بیٹا محمد حسین ہے۔ محمد حسین کا

ایک بیٹا جمعہ سید ہے۔ محمد عبداللہ کے چار بیٹے عبدالکریم، محمد یوسف، نواب خان، اسلم عبداللہ ہیں۔ عبدالکریم کے بیٹے مجید، اسماعیل، ابراہیم اور سات بیٹیاں ہیں۔ یوسف کے چار بیٹے شہید میجر عبدالوہاب ستارہ جرأت، محبت اللہ، محمد فاروق، ناہید اللہ اور تین بیٹیاں ہیں۔ نواب خان کا ایک بیٹا محمد جوہر اور دو بیٹیاں۔ اور اسلم عبداللہ کے تین بیٹے شاہ فیصل، اخلاق احمد، اوسامہ اور چار بیٹیاں ہیں۔ میجر وہاب شہید کے چار بیٹے صلاح الدین، جمال الدین، جلال الدین، عمادالدین اور ایک بیٹی ہے۔ عبدالخالق کے دو بیٹے محمد طیب، عبداللطیف اور ایک بیٹی ہے۔ طیب کے دو بیٹے الطاف اور زبیر اور دو بیٹیاں اور لطیف کا ایک بیٹا احمد ہے۔ طیب کی والدہ میری سب سے بڑی بہن کی بیٹی تھیں۔ میری تیسری پھوپھی کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا روزی خان تھا جو لاولد فوت ہو گیا۔ ایک بیٹی کی اولاد جمعہ سید وغیرہ تھے جنکا تذکرہ پہلے آ چکا ہے۔

میری سگی والدہ کے دو بھائی محمد یعقوب، عبدالعزیز اور دو بہنیں تھیں۔ ایک بہن لاولد فوت ہوئی اور دوسری میرے بھانجے غلام رسول سے بیاہی تھیں۔ جسکے تین بیٹے غلام رضا، غلام نور، جمال ناصر اور ایک بیٹی ہے۔ بڑے ماموں محمد یعقوب کے دو بیٹے مرحوم فقیر محمد، ڈاکٹر قاسم اور چار بیٹیاں ہیں۔ ان لوگوں کی والدہ یعنی یعقوب ماموں کی اہلیہ زبیدہ میری بڑی بہن کی بیٹی اور خود میری رضاعی بہن ہے۔ فقیر محمد کے دو بیٹے عزیز الرحمٰن، محمد شہاب اور ایک بیٹی ہے۔ ڈاکٹر قاسم کا ایک بیٹا حمزہ اور ایک بیٹی عریب ہے۔ دوسرے ماموں مرحوم عبدالعزیز کے تین بیٹے محمد دین، عبدالمحیط، عبدالقیوم اور تین بیٹیاں ہیں۔ محمد دین کے دو بیٹے صداقت دین اور شرافت دین ہیں۔

بڑی والدہ کے تعلق سے

میری بڑی والدہ (والد صاحب کی پہلی اہلیہ) کے تین بھائی حاجی عبدالرحیم (جو میرے والد کے قریب ترین ساتھی بھی تھے اور استور کے مغرب میں ڈویاں گاؤں کے نمبردار بھی) عبدالغفور اور عبدالخالق تھے۔ والدہ کی ایک ہمشیرہ بھی تھی۔ حاجی عبدالرحیم کے تین بیٹے حاجی عبدالغنی (میرے چچیرے بہنوئی) سابق فارسٹ رینج آفیسر، محمد حنیف روڈ انسپکٹر، محمد اسماعیل سابق ڈپٹی کمشنر اور چار بیٹیاں تھیں۔ حاجی عبدالغنی کی اولاد کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ محمد حنیف کے تین بیٹے محمد عباس، محمد فیاض، محمد اسرار اور چھ بیٹیاں تاج بیگم، دنیا ذات، اقلیمہ، زرینہ، روبینہ، نسیم ہیں۔ محمد عباس کے تین بیٹے محمد علی، محمد حسین، محمد احسن اور تین بیٹیاں ہیں۔ فیاض کے دو بیٹے وقاص، طٰہٰ اور بیٹی مہوش اور اسرار کے دو بیٹے عبداللہ اسرار، سلیمان اسرار اور دو بیٹیاں اوپل اسرار اور بختاور ہیں۔ محمد حنیف کی بڑی بیٹی دشکن میں بیاہی گئی تھی۔ دوسری میرے بھانجے محمد اشرف خان سے، تیسری مولوی عبدالمنان سے، چوتھی میرے بھانجے ماسٹر مشروف سے، پانچویں جج شیر افضل سے اور چھٹی میرے بھانجے مشتاق احمد ایڈووکیٹ سے بیاہی گئی ہیں۔

محمد اسماعیل خان کی دو شادیاں ہوئیں۔ پہلی بیوی (میری خالہ زاد بہن زلیخا) سے ایک بیٹا محمد سلیم اور چار بیٹیاں اختر، خورشیدہ، صفیہ اور کوثر ہیں۔ اور دوسری (ہائی ہامہ کپواڑہ کے راجہ سیف اللہ خان کی

بیٹی اور مرحوم میجر امان اللہ خان کی بہن) سے چھ بیٹے کیپٹن اقبال اسماعیل مرحوم، میجر ابرار اسماعیل، آفتاب اسماعیل، اشفاق اسماعیل، ارشد اسماعیل، اسحاق اسماعیل اور دو بیٹیاں آمنہ اسماعیل اور راحت اسماعیل ہیں۔ محمد سلیم خان کے چار بیٹے آیت اللہ، جید محمد، ذکاء اللہ، عامر سلیم اور تین بیٹیاں ہیں۔ میجر ابرار اسماعیل کا ایک بیٹا شیر دل اسماعیل اور بیٹی مہور اسماعیل۔ اشفاق اسماعیل کی دو بیٹیاں لبابہ اسماعیل اور افرا اسماعیل ہیں۔ اسحاق اسماعیل کے دو بیٹے ولی اسماعیل اور احمر اسماعیل۔ بیٹی آمنہ اسماعیل کی شادی نواب آف پٹوڈی خاندان کے مرحوم جنرل شیر علی کے بیٹے شہریار خان سے ہوئی ہے۔ انکی ایک بیٹی شیر بانو پٹوڈی ہے۔ اسماعیل خان کی دوسری بیٹی راحت اسماعیل کی شادی ابھی نہیں ہوئی۔

ماموں حاجی عبدالرحیم خان کی چار بیٹیاں تھیں۔ ایک بیٹی دشکن کے نمبردار سے بیاہی گئی تھی۔ انکی کوئی اولاد نہیں۔ دو بیٹیاں (ایک فوت ہونے کے بعد دوسری) ہرچو کے حاجی امیر خان کے بیٹے صفت خان کے نکاح میں تھیں۔ صفت خان کے تین بیٹے شاہ رئیس مرحوم، حبیب الرحمٰن مرحوم، عزیز الرحمٰن اور تین بیٹیاں ہیں۔ عزیز الرحمٰن میرے چچازاد بھائی عنایت خان کا داماد ہے۔ اس کے تین بیٹے عتیق الرحمٰن، شفیق الرحمٰن، خلیق الرحمٰن اور پانچ بیٹیاں ہیں۔ ماموں حاجی عبدالرحیم خان کی چوتھی بیٹی حاجی امیر خان آف ہرچو کے دوسرے بیٹے ٹھیکیدار حاجی مراد خان سے بیاہی گئی تھی جس سے ان کے چھ بیٹے سلطان ابراہیم، انجیر شوکت علی، محمد لطیف، حاجی خطیب، محمد اسلم، اجلال حسین اور چار بیٹیاں ہیں۔ ماموں عبدالغفور کے چار بیٹے صوبیدار امان اللہ خان، نصر اللہ خان، نصر الدین خان، ثناء اللہ خان اور چھ بیٹیاں ہیں امان اللہ خان کے تین بیٹے انعام اللہ، عرفان اللہ، ظفر اللہ اور دو بیٹیاں ہیں۔ نصر اللہ خان کے دو بیٹے نظام اللہ، ضیاء اللہ اور پانچ بیٹیاں ہیں۔ نصر الدین کے پانچ بیٹے صلاح الدین، معراج الدین، صفاط الدین، اعجاز الدین، وجاہت علی اور چار بیٹیاں ہیں۔ ثناء اللہ کے تین بیٹے عدنان اللہ، رضوان اللہ، محمد عادل اور دو بیٹیاں ہیں۔ تیسرے ماموں عبدالخالق کی پانچ بیٹیاں تھیں۔ ڈموٹ کے ڈاکٹر ابراہیم، ڈاکٹر شبیران کے نواسے ہیں۔ شیر محمد بھی ماموں عبدالغفور کے نواسے ہیں۔

میری بڑی والدہ کی ایک ہمشیرہ تھی جسکی دو شادیاں ہوئی تھیں۔ پہلی شادی سے دو بیٹے محمد یوسف، عبدالحمید اور دو بیٹیاں تھیں۔ محمد یوسف کا ایک بیٹا فضل الرحمٰن اور پانچ بیٹیاں تھیں۔ جن میں سے ایک میرے چچازاد بھائی ڈاکٹر نور جلیل کے نکاح میں ہے۔ عبدالحمید کے تین بیٹے عبدالصبور، مجیب الرحمٰن، نقیب الرحمٰن اور پانچ بیٹیاں ہیں۔ محمد یوسف کی بڑی بہن کے چار بیٹے ماسٹر فرقان، محمد نظیم، محمد عظیم، شاہ عالم اور میاں گل اور تین بیٹیاں تھیں۔ دوسری بہن کی چھ بیٹیاں تھیں۔ ماسٹر فرقان کے پانچ بیٹے ڈاکٹر انعام، وسیم کاشف، عاصم اور مظیم ہیں۔ خالہ کی دوسری شادی مولانا محمد دوست سے ہوئی تھی جس سے چار بیٹے مولوی محمد رضا، محمد عیسیٰ، مولوی عبدالمنان، ماسٹر اشرف اور تین بیٹیاں ہیں۔ مولوی محمد رضا مرحوم کے پانچ بیٹے ڈاکٹر عبدالحنان، عطاء الرحمٰن مرحوم (جو بڑی مدت تک کراچی میں میرے سکولوں کے منتظم تھے) حبیب الرحمٰن، ڈاکٹر عثمان اور انجینئر رشید اور چھ بیٹیاں ہیں۔ ان چھ بیٹیوں میں سے ایک میرے بھائی

عبداللطیف کے نکاح میں ہے۔ایک مرحوم ماسٹر فرقان کے نکاح میں تھی۔ایک بونجی کے ڈاکٹر محمد شریف اللہ کے نکاح میں، ایک مولوی عبدالمنان کے بیٹے عبدالنصیر کے نکاح میں اور ایک ڈاکٹر خلیل الرحمٰن کے نکاح میں ہے۔محمد عیسیٰ کے سات بیٹے محمد اسلم، عبیداللہ، فرید اللہ، زاہداللہ، ظفر اللہ، وقار اللہ، عاطف اللہ اور پانچ بیٹیاں ہیں۔جن میں سے ایک مرحوم عطاء الرحمٰن کے نکاح میں تھی۔انکا ایک بیٹا محمد ذکاء الرحمٰن اور چار بیٹیاں ہیں۔مولوی عبدالمنان کے چار بیٹے عبدالنصیر، عبدالبصیر، جاراللہ (فیصل)، عمر فاروق اور پانچ بیٹیاں ہیں۔محمد اشرف کے چار بیٹے حفظ الرحمٰن، ضیاء الرحمٰن، فہیم الرحمٰن، شمس الرحمٰن اور چھ بیٹیاں ہیں۔ خالہ کی مولانا محمد دوست سے تین بیٹیاں تھیں۔پہلی بیٹی ذلیخا (زوجہ محمد اسماعیل خان)۔خالہ کی دوسری بیٹی (خاوند نور محمد) کے دو بیٹے قاری سعید الرحمٰن، سراج عالم اور تین بیٹیاں ہیں۔خالہ کی تیسری بیٹی (شوہر کا نام شاہجہاں) کے سات بیٹے مرحوم محمد عالم، محمد ناصر، محمد طیب، غیور احمد، مقتولین سیف اللہ، محمد شعیب، ڈاکٹر احمد حسن اور دو بیٹیاں (بیگم قاری سعید الرحمٰن اور بیگم ضیاء الرحمٰن پسر ماسٹر محمد اشرف) ہیں۔

میرا سسرال

میری شادی ستمبر 1973ء میں گلگت بلتستان کے ریٹائرڈ اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل پولیس (اے آئی جی پی) اور سابق ممبر گلگت بلتستان کونسل مرحوم عبدالحمید خان خاور کی بیٹی زاہدہ پروین سے ہوئی۔ جولائی 1974ء میں میری واحد اولاد اسماء پیدا ہوئی۔میرے سسر ڈموٹ سئے کے شین قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔انکے والد بختاور شاہ کی وفات کے وقت ان کی عمر صرف چند سال تھی چنانچہ انہیں ان کے ماموں حاجی محمد طلحہ آف بونجی نے پالا۔انہوں نے انہیں اور ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر محمد نگین کو سرینگر میں تعلیم دلائی تھی۔سرینگر سے میٹرک پاس کرنے کے بعد مرحوم مختلف ملازمتیں کرتے رہے لیکن ذہن تحقیقی تھا چنانچہ راجہ پونیال کی وساطت سے وہ مہتر چترال کے ہاں پہنچے۔جس نے انہیں علاقے کی تہذیب وتمدن پر تحقیق کرنے پر معمور کیا۔اور اس سلسلے میں انہیں دہلی سمیت ہندوستان کے بہت سے شہر دیکھنے کا موقع ملا۔مہتر چترال ناصر الملک کی وفات کے بعد خاور صاحب کو انکے جانشین کی طرف سے وہ توجہ نہیں ملی جو انکی ضرورت تھی۔چنانچہ وہ دوبارہ سرینگر چلے گئے جہاں انہیں پولیس کوتوال کے عہدہ پر تعینات کر کے استور بھیج دیا گیا جو اس وقت وہاں پولیس کا سب سے اونچا عہدہ تھا جہاں سے وہ ترقی کرتے کرتے اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل پولیس کے عہدے سے ریٹائر ہوگئے جسکے بعد وہ استور سے ہی گلگت بلتستان کونسل کے ممبر منتخب ہوگئے۔یہ انکی شخصیت کا ایک پہلو تھا دوسرا اور اصل پہلو تاریخ وادب سے ان کی دلچسپی کا تھا۔ پاکستان کے صف اول کے مؤرخ اور آثار قدیمہ کے ماہر ڈاکٹر احمد حسن دانی (جن کے ساتھ خاور صاحب نے گلگت بلتستان کی تاریخ اور آثار قدیمہ پر کام کیا تھا) کے بقول خاور صاحب نے انتہائی اخلاص ولگن کے ساتھ گلگت بلتستان کی تاریخ وتمدن کی کھوج میں ساری عمر لگادی۔مرحوم کے پاس گلگت سے متعلق کتابوں کی ایک بڑی لائبریری تھی جو انکی بے وقت موت کی وجہ سے تتر بتر ہوگئی۔مرحوم نے گلگت ایجنسی

کے اہم خاندانوں کے شجرہ ہائے نصب بھی مرتب کئے تھے لیکن انہیں مناسب ترتیب دیکر شائع کرنے کا انہیں موقع نہیں ملا۔ خاور صاحب کا یکم نومبر 1986ء کو جب میں برطانیہ میں قید تھا انتقال ہوا۔ مرحوم ایک انتہائی صاف گو، نڈر اور ہمدرد انسان تھے۔ خاور صاحب نے تین شادیاں کی تھیں۔ پہلی شادی سے تین بیٹے عبدالوحید، شوکت رشید اور احمد سعید ہیں۔ خاور صاحب کی دوسری اہلیہ یعنی میری ساس کا تعلق گوریکوٹ استور کے دڑم خیل وزیر خاندان سے تھا ان کے والد وزیر محمد خان استور ہی نہیں پورے گلگت کی بھی اہم شخصیات میں سے تھے۔ وہ کشمیر اسمبلی کے ممبر بھی رہے۔ ایک روایت کے مطابق وزیر محمد خان کے والد وزیر روزی خان اور میرے دادا نور خان، خالہ زاد بھائی تھے۔ کہتے ہیں کہ استور کے ایک وزیر خاندان میں سات (ایک روایت کے مطابق نو) بہنیں تھیں۔ جو استور کے اس وقت کے سات (یا نو) اہم خاندانوں میں بیاہی گئی تھیں۔ جن میں سے ایک وزیر روزی خان کی والدہ اور دوسری میرے دادا نور خان کی والدہ تھیں۔ وزیر محمد خان کے چار بیٹے وزیر محمد شریف، وزیر محمد اسلم، وزیر فیض محمد اور وزیر محمد ہاشم تھے۔ وزیر محمد اسلم کے دو بیٹے محمد ایوب خان ڈی ایف او اور وزیر جاوید ہیں۔ باقی تین کی کوئی نرینہ اولاد نہیں ان کے بھائی وزیر احمد خان کے بڑے بیٹے وزیر محمد اشرف ایم اے علیگ ایک اعلیٰ پائے کے شاعر اور ادیب تھے اور دوسرے بیٹے کرنل یعقوب استور گلگت ہی نہیں بلتستان کی بھی اہم شخصیات میں سے تھے۔ ان کے بھتیجے وزیر افلاطون کونسل کے ممبر رہے اور وزیر افلاطون کے بھائی مرحوم محمد رشید ایک انتہائی مخلص اور ملنسار انسان تھے۔ انکا نومبر 1997ء میں اسلام آباد میں ایک حادثے میں انتقال ہوگیا۔ انکا ایک بیٹا ڈاکٹر آصف رشید اور ایک بیٹی عنبر رشید ہے۔ میرے سسر عبدالحمید خاور کے بڑے بھائی ڈاکٹر محمد نگین نے 1947ء کی جنگ آزادی میں اہم حصہ لیا تھا۔ انکی شادی نگر سٹیٹ کی اہم شخصیت وزیر سرور کے خاندان میں ہوئی تھی۔ ان کے تین بیٹے ڈاکٹر محمد نظیم۔ احمد ندیم، عزیز الرحیم اور تین بیٹیاں ہیں۔ ایک بیٹی شمیم حمزہ دو بار گلگت بلتستان کونسل کی رکن منتخب ہوئیں۔ دوسری بیٹی نور النہار ایگزیکٹو انجینئر محمد رشید خان کے نکاح میں ہے۔ ان کے تین بیٹے خاقان رشید، عدنان رشید اور جبران رشید اور پانچ بیٹیاں ہیں اور تیسری بیٹی شبنم ہے جس کے دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ خاور صاحب کے ایک اور بھائی کا بیٹا عبدالعزیز تھا جنکا ایک بیٹا طارق عزیز اور تین بیٹیاں ہیں۔ طارق عزیز کی ایک بہن میری اہلیہ کے بھائی شاہد حمید کے نکاح میں ہے اور دوسری بہن مہر النساء انجینئر رشید کے اور بڑی بیٹی پولیس آفیسر عبدالقدوس نیئر کے۔ خاور صاحب کے چار بیٹے ریٹائرڈ ایگزیکٹو انجینئر عبدالوحید، ایس ایس پی شوکت رشید، کرنل احمد سعید اور انجینئر شاہد حمید ہیں۔ عبدالوحید کے دو بیٹے عابد مجید، منصور شہید اور تین بیٹیاں عنبرین، سیما اور عمارہ ہیں۔ شوکت رشید کے چار بیٹے انجینئر عمر فاروق، عثمان حیدر، علی خاور، مامون الرشید اور تین بیٹیاں نجم السحر، آمنہ خاور، سارہ مریم ہیں۔ کرنل احمد سعید کے تین بیٹے ولید خاور، بختاور سعید، ضرار سعید اور ایک بیٹی حریم فاطمہ ہے۔ شاہد حمید کے دو بیٹے محمد اسماعیل، صہیب اور چار بیٹیاں اقصا خاور، تنزا خاور، خوش بخت خاور، اشرا خاور ہیں۔ خاور صاحب کی دوسری شادی سے تین بیٹیاں نسیم خاور، نشاط خاور، زاہدہ پروین اور ایک بیٹا شاہد حمید اور تیسری

شادی سے ایک بیٹی مہ جبین ہے۔ مہ جبین کی شادی طارق عزیز سے ہوئی ہے۔ میرے سسر نے اپنے سوتیلے بیٹے (میری ساس کی پہلی اولاد) ڈاکٹر لطیف مرحوم کو بھی پڑھایا تھا۔ ڈاکٹر لطیف مرحوم کے دو بیٹے ڈاکٹر خالد لطیف، راحت لطیف اور تین بیٹیاں نغمہ (للی)۔ مصباح اور نورالصباء ہیں۔ میرے بڑے ہمزلف بریگیڈیئر برکت علی خان کے دو بیٹے شفقت علی خان (آفیسر وزارت خارجہ)، میجر رفعت علی اور تین بیٹیاں ہیں جن میں سے دو (یاسمین ہدایت اور قدسیہ آصف) ڈاکٹر اور ایک حمیرہ ریاض ایم اے ہیں۔ شفقت علی خان کا ایک بیٹا محمد، حمیرہ کی ایک بیٹی فاطمہ اور ڈاکٹر قدسیہ آصف کی ایک بیٹی سمرن ہے۔ میرے دوسرے ہمزلف نشاط خاور کے شوہر علی احمد جان مرحوم کے چار بیٹے میجر وجاہت علی خان، شجاعت علی خان، فیصل، یاسر علی اور ایک بیٹی نفیس بانو (لُوبا) ہیں۔ تیسرے ہمزلف مہ جبین کے شوہر طارق عزیز کا ایک بیٹا محمد شائل ایک بیٹی اسماء ہے۔

یہ تھی میرے اپنے اور سسرال سے تعلق رکھنے والے بزرگوں اور عزیزوں کی تفصیل۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے اپنے اکثر عزیزوں کی (تعلیم کے سلسلے میں) حتی الامکان مدد کی۔ ان میں سے ایک بڑی تعداد آج معاشرے میں اچھی حیثیت کی مالک ہے۔ میرے دادا نور خان کے 19 پوتے پوتیوں میں سے آج صرف ہم تین یعنی میری سب سے چھوٹی بہن، میں اور ڈاکٹر نور جلیل زندہ ہیں۔ میرے والد صاحب کا کوئی سگا پوتا نہیں پوتی صرف ایک (میری بیٹی اسماء) ہے۔ میرے اکثر سگے اور چچیرے بھتیجے بھانجے استور سے نکل کر گلگت، راولپنڈی، کراچی یہاں تک کہ ملایشیا اور جاپان میں برسرروزگار ہیں۔ سات نسلوں میں ہماری یہ چھٹی نقل مکانی ہے۔

میرے بزرگوں اور عزیزوں کی تواریخ وفات

	موضع پری شنگ	تاریخ وفات
(1)	دادا نور خان	1900ء کے عشرے میں
(2)	دادا ستار برادر نور خان	1900ء کے عشرے میں
(3)	نانا حمزہ خان	1960ء کے عشرے میں
(4)	تایا نعمت خان	1920ء کے عشرے میں
(5)	والد صاحب	16 مارچ 1935ء
(6)	چچا اکبر خان	اکتوبر 1950ء
(7)	تایا روزی خان	1920ء کے عشرے میں
(8)	تایا زاد غنی خان	1960ء کے عشرے میں
(9)	تایا زاد افضل خان	1980ء کے عشرے میں
(10)	چچا زاد عنایت خان	جولائی 1979ء
(11)	چچا زاد صاحب خان	29 مئی 1997ء
(12)	چچا زاد شہید عبدالجمیل	مئی 1948ء

		تاریخ وفات
(13)	بڑی والدہ	1940ء
(14)	سگی والدہ	اپریل 1984ء
(15)	چچی زوجہ اکبر خان	1962ء
(16)	ماموں عبدالعزیز	31 مارچ 1994ء
(17)	پھوپھی زاد محمد عبداللہ	1950ء کے عشرے میں
(18)	پھوپھی زاد عبدالخالق	2001ء
(19)	ہمشیرہ والدہ ڈاکٹر محبوب	1981ء
(20)	ہمشیرہ زوجہ سخی محمد	1950ء
(21)	ہمشیرہ زوجہ منشی نعمت خان	8 جنوری 1989ء
(22)	ہمشیرہ زوجہ رحیم خان	1964ء
(23)	ہمشیرہ زوجہ بہادر خان مشکہ	1990ء
(24)	ہمشیرہ زوجہ سجاور خان	1970ء

(25)	بہنوئی والد ڈاکٹر محبوب	4 اپریل 1962ء
(26)	بہنوئی سخی محمد	1945ء
(27)	بہنوئی مولوی نور محمد	1991ء
(28)	بہنوئی منشی نعمت خان	24 اگست 1972ء
(29)	بہنوئی رحیم خان	2001ء
(30)	عبدالرحیم خان شیپہ	1996ء
(31)	بھانجا انجینئر محمد نواز	18 جون 1973ء
(32)	بھانجا محمد نظیم	1997ء
(33)	بھانجا سنگ علی خان	1999ء
(34)	شہید میجر وہاب	26 جون 1999ء
(35)	بہنوئی بہادر خان	ستمبر 2004ء
(36)	بھانجا غلام رسول	ستمبر 2004ء
(37)	بھتیجا عبدالجلیل	ستمبر 2004ء

موضع لوس

(38)	بہنوئی گرداور نعمت خان	2 جنوری 1962ء
(39)	ہمشیرہ زوجہ نعمت خان	15 مئی 1952ء
(40)	بہنوئی حاجی فرض خان	6 فروری 2001ء
(41)	بھانجا شجاعت خان	9 ستمبر 2000ء
(42)	بھانجا محمد اشرف خان	اپریل 1990ء

ہائی ہامہ وادیٔ کشمیر

(43)	بہنوئی ماسٹر ہاشم علی خان	1971ء
(44)	ہمشیرہ زوجہ ہاشم علی خان	1998ء
(45)	زوجہ اول ماسٹر ہاشم علی خان	1985ء
(46)	بھانجا شہید الطاف علی خان	اپریل 1990ء
(47)	جاوید علی ولد الطاف علی خان	1996ء

موضع ڈوئیاں

(48) ماموں حاجی عبدالرحیم خان — اپریل 1978ء
(49) ماموں عبدالغفور — 1946ء
(50) ماموں عبدالخالق — 1984ء
(51) خالہ زوجہ مولانا محمد دوست — 23 اپریل 1963ء
(52) خالو مولانا محمد دوست — نومبر 1956ء
(53) خالہ زاد محمد یوسف — 1990ء
(54) خالہ زاد عبدالحمید — 2002ء
(55) خالہ زاد مولوی محمد رضا — 9 جنوری 2004ء
(56) خالہ زاد محمد عیسےٰ — 2002ء
(57) ماموں زاد حاجی عبدالغنی — 1984ء
(58) ہمشیرہ زوجہ عبدالغنی — اپریل 1982ء
(59) ماموں زاد محمد حنیف — 1985ء
(60) ماموں زاد محمد اسماعیل خان — 16 جنوری 1980ء
(61) خالہ زاد زوجہ محمد اسماعیل خان — 1996ء
(62) زوجہ دوم محمد اسماعیل خان — 1982ء
(63) کیپٹن اقبال اسماعیل — 26 جون 1990ء

سسرال

(64) والد نسبتی عبدالحمید خان خاور — یکم نومبر 1986ء
(65) زوجہ نمبر 1 عبدالحمید خان خاور — 11 نومبر 1983ء
(66) زوجہ دوم عبدالحمید خان (میری ساس) — 9 نومبر 1966ء
(67) زوجہ سوم عبدالحمید خان — 10 دسمبر 1985ء
(68) ڈاکٹر محمد نگین برادر خاور — 20 دسمبر 1988ء
(69) ڈاکٹر محمد لطیف — 27 جولائی 2000ء
(70) ہم زلف ٹھیکیدار علی احمد جان — 1980ء

ہرچو

(71) حاجی محمد امیر خان — 1977ء
(72) صفت خان — 1962ء
(73) ٹھیکیدار مراد خان — 17 اکتوبر 2001ء
(74) شاہ رئیس خان — 1987ء
(75) حبیب الرحمٰن — 1991ء

2۔ عزیز و اقارب اور دیگر اصحاب جنہوں نے میری خدمت اور مدد کی

(الف) ذاتی عزیز و اقارب

میں اپنے آبائی گھر استور سے لڑکپن کے دوران ہی ہائی ہامہ ضلع کپواڑہ (وادیٔ کشمیر) منتقل ہوگیا تھا۔ جہاں مجھے اپنے بہنوئی ہاشم علی خان، بہن اور بہنوئی کی پہلی اہلیہ اور ان کے خاندانوں کے دوسرے افراد کی شفقت حاصل رہی لیکن پرائمری پاس کرنے کے بعد سے لیکر کراچی میں اپنے سکول قائم کرنے تک کے تقریباً بارہ سال کے دوران میں ایک خودکفیل طالب علم رہا۔ رہائش کبھی کسی کے گھر Paying Guest کی حیثیت سے رہی، کہیں ہوسٹل میں تو کہیں دوستوں کے ساتھ۔ 1956ء میں میں نے اپنے (ماں ایک) بھائی عطی اللہ خان کو تعلیم کے سلسلے میں کراچی بلایا۔ عطی اللہ خان نے ہمارے سکولوں کے قیام اور انہیں مضبوط بنیادوں پر منظم کرنے کے سلسلے میں اہم کردار ادا کیا۔ میری ذاتی طور پر بھی بہت خدمت کی۔ ایم اے، ایل ایل بی کرنے کے بعد اس نے گلگت میں سرکاری ملازمت اختیار کی لیکن اسے میرا بھائی ہونے کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ جسکی تفصیل متعلقہ باب میں ہے۔

1959ء میں اور اس کے بعد حصول تعلیم کے لئے کراچی آنے والے میرے عزیزوں کا تانتا بندھ گیا اور یہ سلسلہ 1976ء میں میرے برطانیہ جانے تک جاری رہا۔ ان عزیزوں میں عطی اللہ خان کے علاوہ جو عزیز آئے ان میں اب ریٹائرڈ کرنل نیاز محمد، انجینئر محمد نواز مرحوم، ڈاکٹر محبوب عالم، محبوب علی خان (سابق ممبر قانون ساز کونسل گلگت) انجینئر جمشید علی، بنک آفیسر کریم خان، جیالوجسٹ عبدالرحمٰن، ماسٹر محمد سلیم، ڈپٹی چیف انجینئر قدم خان، عبداللطیف (ٹی سی پی) سپرنٹنڈنٹ پولیس شوکت رشید، انجینئر شوکت علی، ایس پی محمد سلیم، بنک آفیسر سیف اللہ خان، ڈپٹی سیکرٹری اسلم عبداللہ، ماسٹر شوکت علی، ایگزیکٹو انجینئر خورشید عالم، انجینئر شاہد حمید، مشتاق احمد ایڈووکیٹ، اے ایس انٹر پرائزز کے مالک احسان اللہ، ماسٹر فیض اللہ، مقبول احمد، محمد طیب، غلام نبی، ڈاکٹر قاسم، جمال ناصر، عبدالباقی، نعیم جان، ڈاکٹر رشید، محمد عثمان اور خورشید عالم آف ہائی ہامہ وغیرہ شامل ہیں۔ ان عزیزوں میں سے عطی اللہ خان، شوکت رشید، مشتاق احمد، عطاء الرحمٰن، اسلم عبداللہ، احسان اللہ، فیض اللہ اور خورشید عالم میری غیر حاضری میں میرے سکولوں کے نگران بھی رہے۔ ڈاکٹر محبوب عالم گلگت ایجوکیشنل سوسائٹی کے سیکرٹری کی حیثیت سے سکولوں کے معاملات کی نگرانی بھی کرتے رہے۔ کچھ مدت تک میری اہلیہ اور بیٹی بھی ڈے سکول کی نگرانی کرتی رہیں۔ محبوب عالم، نیاز محمد، محمد نواز، محبوب علی، محمد عثمان، جمال ناصر، عبدالباقی اور عالم حسین کالجوں میں

پڑھنے کے دوران سکول کی نائٹ یا دوپہر کی شفٹ میں پڑھاتے رہے۔ غازی آباد، دھیرکوٹ، باغ آزاد کشمیر کے محمد حمید خان جو بعد میں عرب امارات (ابوظہبی) میں ٹیلی فون ڈیپارٹمنٹ میں ایک اونچے عہدے پر رہے اوران کے دو بھائی محمد آزاد اور عبدالرزاق اور ماموں زاد بھائی محمد اعتبار خان مرحوم، محمد نیاز خان بھی کئی سال تک کراچی میں میرے ساتھ رہے۔ گلگت کے مرحوم جوہر علی خان ایڈووکیٹ، الطاف حسین ایڈووکیٹ، پروفیسر محمود، نعمت خان انجینئر بھی میرے ساتھ رہے۔

میرے بہنوئی ماسٹر ہاشم علی خان آف ہائی ہامہ کی بڑی بیٹی گلدانہ کا کی اور انکی بیٹی ممتاز مینا (جو میجر امان اللہ کی بیٹی تھی) 1965ء سے 1971ء تک کراچی میں میرے ساتھ رہیں اور دونوں نے میرا بہت خیال رکھا۔ 1991ء میں ممتاز وفات پا گئیں ڈاکٹر محبوب نے ممتاز کی زندگی ہی میں دوسری شادی نصرت جہاں سے کی۔ نصرت جہاں نے اپنی ملنساری، حسن اخلاق اور دوسروں کے کام آنے کی عادت کی وجہ سے اپنے لئے خویش واقارب اور دوسرے متعلقین کے دلوں میں ایک مقبول اور معزز مقام حاصل کیا ہے۔ انکے بچے آفاق عالم، سعد عالم، طلحہ اور حاجرہ ایمن بھی مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔

1973ء میں میری شادی کے بعد میرے چچازاد بھائی نور جلیل کی بیٹی طاہرہ میرے ساتھ کراچی آئی اس نے ہماری بہت خدمت کی۔ خاص کر ننھی اسماء کا بہت خیال رکھا۔ اسکی شادی گدئی استور کے جان محمد سے ہوئی جو بنک میں ملازم ہیں اور لاہور میں مقیم ہیں ان کے پانچ بیٹے عمر، علی، ابوبکر، عثمان، حسن اور دو بیٹیاں فاطمہ اور خدیجہ ہیں۔ ہمارے قیام برطانیہ کے دوران میری اہلیہ کے تایازاد بھائی عبدالعزیز مرحوم کی بیٹی مہرالنساء نے ہماری بہت خدمت کی۔ اسکی شادی میرے خالہ زاد مولوی محمد رضا کے بیٹے انجینئر رشید سے ہوئی۔ ان کے دو بیٹے عمیر، عزیز اور دو بیٹیاں ہیں،۔

ہماری برطانیہ سے واپسی پر ڈاکٹر نور جلیل کی دوسری بیٹی نیلوفر اور بھائی عبدالمناف کے دو بیٹے احسان اللہ اور مقبول احمد کراچی میں ہمارے ساتھ رہے انہوں نے بھی ہماری بہت خدمت کی۔ نیلوفر کی شادی دبیر ضلع کوہستان کے ڈاکٹر منور سے ہوئی ان کے دو بیٹے فرجاد اور اسجد اور تین بیٹیاں لائبہ، مناہل اور پرسا ہیں۔ 2001ء سے 2002ء تک میری اہلیہ کے پھوپھی زاد بھائی عبدالقیوم کی بیٹی نسرین گل ہمارے ساتھ رہی۔ اس نے بھی ہماری بہت خدمت کی۔ اس کے بعد اسکی شادی ہوگئی۔ اسکے بعد سے ڈموٹ کے عبدالقدوس نیئر کی بیٹی رومانہ نیئر ہمارے ساتھ ہے رومانہ مہرالنساء کی بھانجی ہے۔

ان عزیزوں اور عزیزاؤں کے علاوہ ہمارے قیام برطانیہ کے دوران مرحوم ڈاکٹر لطیف اور انکے بیوی بچے ہمارے ساتھ رہے انہوں نے بھی ہمارا خاص خیال رکھا۔ کراچی میں خاصی مدت تک میری اہلیہ کے بھائی کرنل احمد سعید میرے گھریلو معاملات سنبھالتے رہے۔

ان کے علاوہ کراچی سے میری غیر حاضری کے دوران ڈاکٹر محبوب عالم اور اسکی اہلیہ نصرت جہاں، ساس گلدانہ کا کی کے علاوہ قدم خان، محمد سلیم، احسان اللہ، محمد ایوب، شیر عالم، نعیم جان، معراج عالم، محمد عثمان، فاروق، ضیاء الحق، ڈاکٹر قاسم، احسان اللہ، سیف اللہ، غلام محمد اور اہلیہ اختر، اسلم عبداللہ اور

ان سب کے اہلخانہ میری اہلیہ اور بیٹی کی مدد کرتے رہے۔اس سے پہلے میر ملک استور کے عبدالبشیر نے جواب سرکاری ملازمت کے ساتھ صحافت کے پیشے سے بھی وابستہ ہیں۔ میرے ہاں قیام کے دوران ہماری بہت خدمت کی۔ وہ اب مستقلاً کراچی میں مقیم ہے ان کا ایک بیٹا عبدالقدیر اور دو بیٹیاں ہیں۔ میری ایک بھانجی (گرداور نعمت خان مرحوم کی بیٹی) کا بیٹا برکت اللہ آف بولن استور بھی کچھ مدت ہمارے ساتھ رہا۔اس نے بھی ہماری خدمت کی۔اب وہ استور میں سکول ٹیچر ہے چھوگام استور کا محمد اقبال بھی کئی سال کراچی میں میرے ساتھ رہا۔اس نے بھی میری بہت خدمت کی۔انتہائی ایماندار انسان تھا۔

میں 1990ء سے راولپنڈی میں قیام پذیر ہوں۔ جہاں میرا بھانجا خورشید عالم واپڈا میں ایگزیکٹو انجینئر ہے۔اسکی اہلیہ زلیخا بھی میری بھانجی ہے۔میری ہمشیرہ (خورشید کی والدہ) ہر سال موسم سرما میں یہاں آتی ہیں اسلئے ان سے بزرگانہ شفقت ملتی ہے۔خورشید عالم کے والد ماسٹر فرض خان میرے اولین استاد بھی تھے۔انکا 2001ء میں اسلام آباد ہی میں انتقال ہوگیا۔خورشید زلیخا اور انکے بچے مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔گزشتہ ایک سال سے میرے خاندان سے متعلق نصف درجن بھر گھرانے راولپنڈی میں رہائش پذیر ہیں ان میں سے اکثر نے یہاں مستقل رہائش اختیار کی ہے۔ان میں کرنل نیاز محمد (جو ایک انتہائی اصولی اور خاموش طبع انسان ہیں)، ڈپٹی چیف انجینئر قدم خان، احسان اللہ، خورشید عالم، مسز اشرف اینڈ فیملی، میجر ابرار اسماعیل شامل ہیں۔ میرے چچازاد مرحوم حاجی صاحب خان کے تمام بیٹے بیٹیاں انتہائی محبتی، ہمدرد اور ملنسار ہیں۔ان سب کے بچے بھی بہت محبتی ہیں۔ چچازاد بھائی ڈاکٹر نور جلیل انکی اہلیہ اور بچے خاص کر بیٹیاں بہت محبتی ہیں۔ان کے داماد جان محمد، ڈاکٹر منور اور میجر ذاکر بہت محبتی اور مخلص لوگ ہیں۔ میجر ذاکر کے تین بیٹے راحیل، عنزہ، طلحہ اور دو بیٹیاں عزا اور علیزہ ہیں۔ عطی اللہ خان کے بچے بھی مجھ سے بہت مانوس ہیں۔ پکورہ استور کے وزیر سجاد (ریٹائرڈ ایس ایس پی) کا بیٹا زاہد علی بھی گھریلو کاموں میں میری اہلیہ کا ہاتھ بٹاتا رہا ہے اور میری بھی خاصی مدد کرتا رہا ہے۔

(ب) میرے خاندانی اور ذاتی محسن

اس موضوع کے تحت کتاب کی پہلی جلد میں تفصیل سے لکھا گیا ہے بہرحال کچھ باتیں دہرانے اور مزید وضاحت کی متقاضی ہیں۔

میرے والد صاحب اپنے زمانے میں استور کی اہم شخصیات میں سے تھے جن لوگوں نے والد صاحب کا زندگی بھر ساتھ دیا ان میں ڈوئیاں کے حاجی عبدالرحیم، لوس کے گرداور نعمت خان اور چچا اکبر خان سرفہرست تھے۔اس کے علاوہ ان کے داماد کھوکھر خان، حاجی عبدالغنی، ماسٹر ہاشم علی خان اور مولوی غلام نبی نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ ہوپک کے نمبردار اصغر علی، فینہ کے ڈاکٹر علی داد والد صاحب کے دوستوں میں سے تھے۔

ان کے علاوہ چچازاد بھائی افضل خان جنہوں نے دوسرے بزرگوں کے کہنے پر پولیس کی

ملازمت چھوڑ کر میرا سربراہ نمبردار بننا قبول کیا تھا۔ ان کے علاوہ میرے چچازاد عنایت خان، صاحب خان، پھوپھی زاد بھائی عبداللہ اور عبدالخالق بہنوئی منشی نعمت خان۔ رحیم خان اور بہادر خان۔ شیپہ کا عبدالرحیم اور ہوپک کے نمبردار محمد عیسیٰ، کھنگرول کے ایوب خان اور یوسف نے والد صاحب کی وفات کے بعد خاندان میں پیدا ہونے والے خلا کے اثرات سے خاندان کو بچانے میں اہم کردار ادا کیا۔ حاجی عبدالرحیم کی بیٹیاں ہرچوکے حاجی امیر خان کے دو بیٹوں صفت خان اور مراد خان کو بیاہی گئی تھیں، یہ دونوں پری شنگ کے سابق نمبردار صمد خان جن سے ہماری خاندانی دشمنی چل رہی تھی کے سگے بھانجے تھے لیکن ہمارے اس جھگڑے میں انہوں نے ہمیشہ اپنے ماموں کی بجائے ہمارا ساتھ دیا۔ ان دونوں (صفت خان اور مراد خان) کی اولاد بھی ہماری ہمدرد ہے۔

میرے ذاتی محسنوں میں سرفہرست ہائی ہامہ کے ماسٹر ہاشم علی خان میری ہمشیرہ اور ماسٹر ہاشم علی خان کی پہلی اہلیہ ہیں، ماسٹر صاحب نے میرے والد صاحب سے انکی زندگی کے آخری لمحوں کے دوران وعدہ کیا تھا کہ وہ میری تعلیم اور پرورش پر پوری توجہ دینگے اور انہوں نے اپنا وعدہ پوری طرح نبھایا۔ ہائی ہامہ میں ان کے رشتہ داروں نے بھی میرا بہت خیال رکھا۔ میرے دوسرے اہم محسن کراچی میں رہائش پذیر بلتستان کے محمد اسحاق صاحب تھے جنہوں نے مجھے کراچی میونسپل کارپوریشن کی بلڈنگ کرائے پر دلائی جس سے میری زندگی کا رخ ہی تبدیل ہوگیا۔ انکا جولائی 2003ء میں کراچی میں انتقال ہوا۔

مڈل سکول کاریہامہ میں طالب علمی کے دوران کاریہامہ کے دکاندار حبیب خان اور اساتذہ جیلانی صاحب، منیر صاحب اور ہیڈ ماسٹر بھگواندا س میرا بہت خیال رکھتے تھے۔ ہائی سکول ہندواڑہ میں ماسٹر گاش لعل، قاضی صاحب اور غلام احمد گنائی صاحب (جو میرے داماد سجاد لون کے نانا ہیں) نے میرا خاص خیال رکھا۔ سرینگر میں کالج میں داخلہ شہید مولانا محمد سعید مسعودی نے دلایا اور پروفیسروں میں سے پروفیسر سیف الدین، پروفیسر نصراللہ، پروفیسر یوسف، پروفیسر شرما، پروفیسر جان محمد اور پروفیسر محمود (جو پرنس محمود کہلاتے تھے) نے میرا خاص خیال رکھا۔ کشمیر سے پاکستان آتے ہوئے اسکردو کے مولوی عبدالخالق صاحب (تحصیلدار) انکی اہلیہ جو میری ساس کی چچازاد اور استور کے وزیر محمد اشرف خان اور کرنل یعقوب کی ہمشیرہ تھیں، انکے بیٹوں نثار حسین ریٹائرڈ جوائنٹ سیکرٹری، ڈاکٹر سکندر حیات اسلام آباد کے مشہور سرجن اور ڈاکٹر شجاع حال امریکہ اور خاص کر انکی والدہ نے میرا بہت خیال رکھا۔ ان کا 1977ء میں اسلام آباد میں انتقال ہوا۔ میں 1952ء میں تقریباً چھ ماہ تک پشاور میں ہائی ہامہ کے راجہ سیف اللہ خان کے ہاں رہا۔ انہوں نے بھی میرا بہت خیال رکھا۔ کراچی میں غلام محمد چینا، عبدالاحد (احدو) جی ایم لون، غلام حسن پنجابی، میر عبدالقیوم، میر عبدالمنان، میر عبدالغنی، ملک رشید، رشید شاہ، شیخ عبداللہ، عبداللہ خان، غلام محمد میر پہلوان، عبدالاحد راٹھور، اشرف بٹ، راجہ حاکم منہاس، غلام محی الدین بانکا، سعید حسن بلتستانی، شیریں خان، رضا حسرت، غلام رضا، ماما کشمیری ہوٹل کے حاجی صاحب اور محمد رمضان، محمد صدیق، ملک عبدالغنی نے میری مدد کی۔ کراچی کے پاکستانیوں میں سے داد المیٹڈ کے یوسف دادا، ڈاکٹر افتخار احمد اور

لی مارکیٹ کے چیئرمین محمد صدیق نے میری مدد کی۔ راولپنڈی میں میرے سب سے قریبی تعلقات ڈاکٹر فاروق حیدر رہے ہیں۔ میرپور کے عبدالخالق انصاری اور صابر انصاری اور برطانیہ خاص کر برمنگھم میں مقیم انکی برادری کا میں انتہائی احسان مند ہوں۔ برطانیہ ہی میں اولڈھم کے مرحوم افضل جاتلوی، لندن اور لیوٹن کے ساتھیوں ایم امین، ظفر شریف، صنوبر حسین، محمود احمد، ملک شفیع، ملک لطیف، ظفر خان، ملک تصدق، بشیر بیزام، ملک شاہنواز، ملک اعجاز، حاجی منظور، کمان افسر، راجہ رؤف، ملک اقبال، ایم اے حسین اور سلاؤ کے خان فاروق اور ساتھیوں نے ہمیشہ میری ذاتی حوصلہ افزائی کی۔ ہڈرزفیلڈ کے چوہدری حنیف، راسب کاشمیری، خواجہ رشید، مانچسٹر کے چوہدری اقبال، چوہدری صابر، بیڈفورڈ کے حاجی فضل الٰہی، محمد رفیق، چوہدری اقبال، چوہدری ولایت، برمنگھم کے ابتدائی ساتھیوں کا تفصیلی ذکر پہلی جلد میں ہے۔ ان کے علاوہ چوہدری سلطان محمود، رابہ حبیب خان، اسلم لون، نارتھمپٹن سے شبیر چوہدری، ہالینڈ سے سردار اشرف، راجہ گل بہار، وفی نسیم، ارشاد بخاری، کیانی برادرز، بشیر بھٹی، راجہ حفیظ برادرز، خلیل قیصر وغیرہ۔ روے سے فاضل مغل، چوہدری عجائب، زاہد خان، بیلجیئم سے کبیر کشمیری، امریکہ میں فاروق کاٹھواری، حلیم خان، منظور خان، نعمت خان، سردار حلیم، انیاز احمد، سلطان محمود بھٹی، چوہدری سلیم، چوہدری افتخار، ڈاکٹر فائی، یورپ میں فرانس، بیلجیئم، ہالینڈ اور ڈنمارک کے احباب کا مشکور ہوں جنہوں نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی۔ مشرق وسطیٰ میں میرے ذاتی محسنوں میں ابوظہبی کے حمید خان، سعودی عرب کے راجہ پرویز، خواجہ رشید، سردار ذوالفقار، راجہ حنیف، سردار شریف اور حاجی مشتاق فیق بیگ سرفہرست ہیں۔ الغرض میں متذکرہ بالا اصحاب کے علاوہ ان تمام حضرات کا بھی مشکور ہوں جنہوں نے میری کسی نہ کسی طرح مدد کی لیکن یہاں انکا نام فرداً فرداً درج کرنے سے قاصر ہوں انشاءاللہ تیسری جلد میں اس کا ازالہ ہوگا۔

گلگت بلتستان سے تعلق رکھنے والے میرے پرانے احباب کی تفصیلی فہرست پہلی جلد میں ہے اور نئے احباب کی فہرست انشاءاللہ تیسری جلد میں شامل ہوگی۔

(ج) میرے والد صاحب کے معاون

میرے والد صاحب کی زندگی میں خاندان سے باہر کے تین افراد نے انکی بہت خدمت کی۔ یہ تین غلام حیدر پیالو، خوش ملک اور لولو جان تھے۔

(i) غلام حیدر پیالو سالہا سال تک معہ اہل خانہ ہمارے ہاں رہے اور ہمارے والد اور والدہ کی خدمت کی۔ پیالو شینا زبان میں گڈریئے یعنی بھیڑ بکریوں کی رکھوالی کرنے والے کو کہتے ہیں۔ غلام حیدر گڈریا نہیں تھا بلکہ (بقول انکے عزیزوں کے) خاندان کی رکھوالی کرتا تھا اس لئے خاندان والے اسے پیالو کے نام سے پکارتے تھے جو بعد میں اس کا عرف بن گیا۔ والد صاحب جو گرداور تھے نے استور کے جنوب مشرق میں گودائی اور پکورہ کے درمیان واقع موضع کھومہ داس میں بہت ساری بنجر زمین ان کے نام انتقال کی جو زمین وہاں کے وزیر خاندان (وزیر علی رضا مرحوم کے بزرگوں) نے دی تھی۔ چنانچہ وہ ادھر

منتقل ہو گئے اور جب سے وہاں ہی رہ رہے ہیں۔ پیالو کی اولاد میں سے آج اخون غلام علی، نور شاہ، کھوکھر علی، انجینئر شیر محمد، غلام محمد، مصطفےٰ موسیٰ اور رضا قابل ذکر ہیں۔

(ii) خوش ملک میرے آبائی علاقے پری شنگ کے گاؤں مشکہ کا رہنے والا تھا۔ وہ والد صاحب کے دوروں پر ان کے ساتھ رہتا تھا اور انکی خدمت کرتا تھا۔ انتہائی مخلص اور دیانتدار انسان تھا۔ اس کا ایک بیٹا رمضان تھا۔ جسکے تین بیٹے شیر غازی، شاہجہان اور برکت علی ہیں۔

(iii) مولوی جان محمد جنہیں لوگ انکی گوری رنگت کی وجہ سے لولو جان (سرخ جان) کے نام سے جانتے تھے۔ والد صاحب کے انتہائی مخلص اور ہمدرد ساتھیوں میں سے تھے۔ وہ والد صاحب کی وفات کے بعد بھی باقاعدگی سے ہمارے گھر آتے رہے۔ ان کے چار بیٹے یوسف، خان، غلام رسول اور غلام نور ہیں۔ وہ پری شنگ کے گاؤں تھنگہ پائن اور بالا کی سرحد پر رہتے ہیں۔

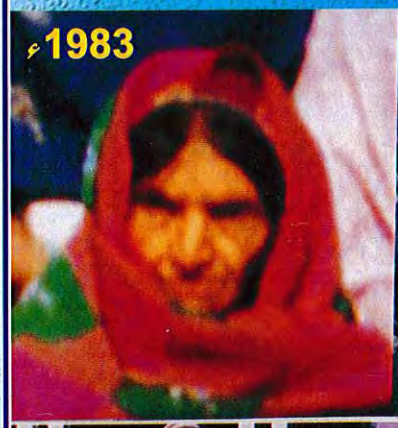
(د) میرے گھریلو ملازم

1973ء میں میری شادی سے پہلے میرے تین گھریلو ملازم رہے۔ ایک چترال کا رحمت علی تھا۔ اس کے بعد پونیال گلگت کا جہانگیر اور تیسرا نگر گلگت کا شفا علی تھا جنہوں نے میری اور میرے عزیزوں کی بہت خدمت کی۔ شادی کے بعد میں نے دس سال برطانیہ میں گزارے جہاں عوام کیلئے گھریلو ملازموں کا تصور ہی نہیں۔ برطانیہ سے واپسی کے بعد اپنے عزیز ہی گھریلو کام کرتے رہے البتہ وسط 2000ء سے وسط 2002ء تک اٹھمقام نیلم ویلی آزاد کشمیر کا اشفاق ہمارا گھریلو کام کرتا تھا۔ اس نے بھی ہماری بڑی خدمت کی۔ اس سے پہلے اٹھمقام آزاد کشمیر کا ایک لڑکا غلام محمد چند ماہ ہمارے ہاں رہا۔ بعد میں وہ مظفر آباد آتے ہوئے بھارتی فوج کی فائرنگ سے شہید ہو گیا۔ نومبر 2003ء کے بعد چند ماہ تک اٹھمقام کا آصف ہمارا گھریلو کام کرتا رہا۔

(ر) تنظیمی ساتھیوں کا ذاتی حسن سلوک

1986ء میں برطانیہ بدری کے بعد 1990ء تک میرا مستقل ٹھکانہ تو کراچی میں تھا اور کراچی میں میرے سکولوں کا دفتر ہی میرا تنظیمی دفتر بھی تھا یعنی لبریشن فرنٹ کے چیئرمین کی حیثیت سے میرا دفتر اور میں تنظیم کے کاموں کیلئے اپنے سکول کا فون وغیرہ بھی استعمال کرتا تھا بلکہ سکول کی بلڈنگ کا ایک کمرہ تنظیم کے سندھ ڈویژن کو معمولی سے کرائے پر دیا تھا۔ 1990ء تک میں سال میں دو تین بار ہی ماہ دو ماہ کیلئے راولپنڈی اور آزاد کشمیر کی طرف آتا تھا۔ ہمارا راولپنڈی کا دفتر (آدم جی روڈ والا) میں نے 1982ء میں برطانیہ سے آ کر قائم کیا تھا۔ اس میں کل وقتی کارکنوں کی حیثیت سے سردار رؤف کشمیری (جو 1991ء سے مقبوضہ کشمیر میں پابند سلاسل ہیں) اور حافظ ممتاز کام کرتے تھے۔ دونوں نے میری بہت خدمت کی۔

1990ء میں لبریشن فرنٹ بحران کا شکار ہوا اور ڈاکٹر فاروق حیدر نے اپنا الگ گروپ بنا لیا۔









(اوپر دونوں فوٹو) میری والدہ مرحومہ (درمیان کھڑے) حاجی صاحب خان، ڈاکٹر نور جلیل، مسز شروف، ہمشیرہ (ہائی ہامہ)، میں، ہمشیرہ (لوس)، شہید الطاف علی اور حاجی فرض خان (بھتیجے) بھائی محمد لطیف کی شادی کے موقع پر دولھے کے دائیں طرف والدہ اور بائیں طرف بھاجی ثریا اور دیگر عزیز و اقارب



کراچی (اوپر) اور راولپنڈی (درمیان اور نیچے) میں مقیم اپنے عزیزوں کے ساتھ



مولوی عبدالمنان

مولوی محمد صدیق

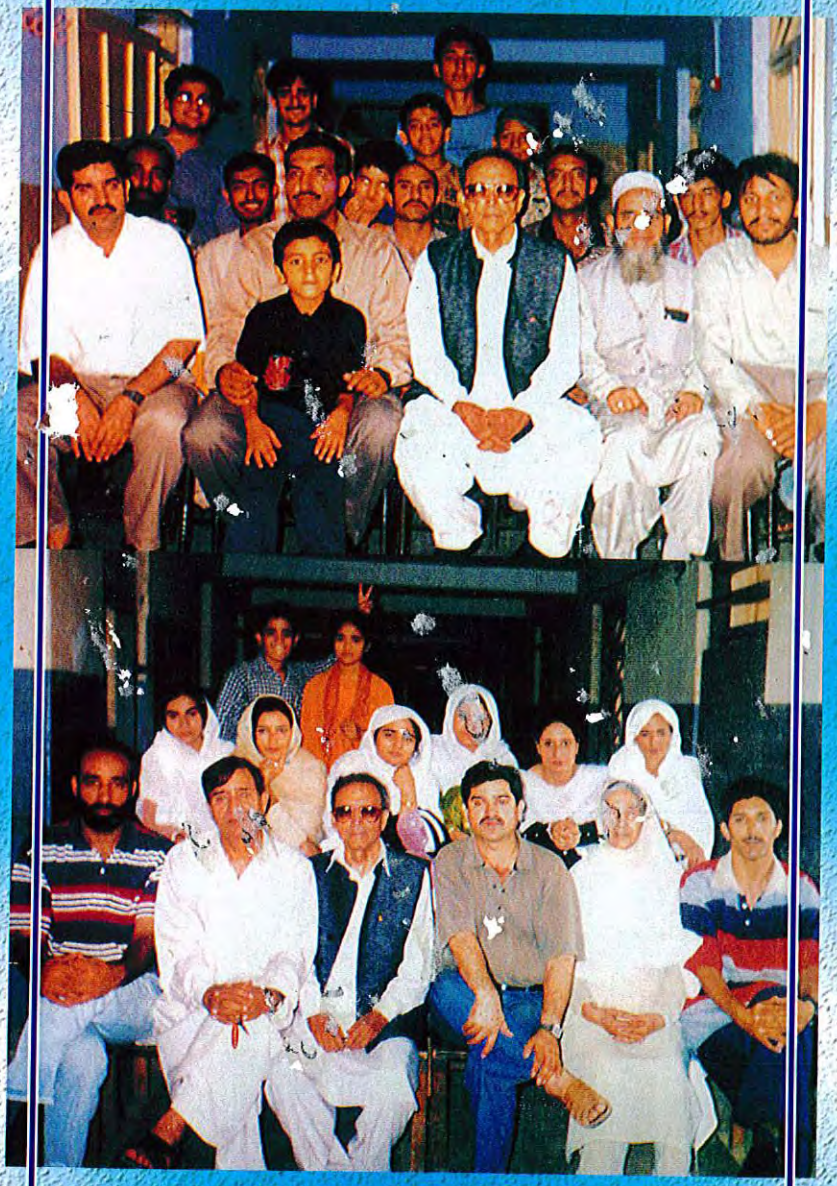








(اوپر) کرنل نیاز محمد کی شادی کے موقع پر (درمیان) عطی اللہ خان اپنی فیملی کے ساتھ
(نیچے) کراچی میں مقیم کچھ عزیز



کراچی میں مقیم میرے کچھ عزیز

ہم نے اکتوبر 1990ء میں 76 کشمیر روڈ کی تیسری منزل پر اپنا دفتر قائم کیا اور میں بھی دفتر میں ہی رہنے لگا۔ میرے ساتھ مقبوضہ کشمیر کے ڈاکٹر حیدر حجازی، اقبال میر، الطاف اندرابی، اقبال خان، شمس الدین، سہیل (شبیر) اور آزاد کشمیر کے حافظ ممتاز، دل محمد عباسی رہتے تھے۔ فروری 1993ء میں ہم نے دفتر چاندنی چوک سیٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی منتقل کرلیا۔ گزشتہ گیارہ سال کے دوران یہاں میرے ساتھ بھارتی مقبوضہ کشمیر سے تعلق رکھنے والے متذکرہ بالا افراد کے علاوہ ایس ایم افضل، منظور احمد خان، رفیق (حبیب اللہ) لون، اعجاز (امتیاز) لون، افضل میر، سعید میر، فاروق پونچھی، اشرف لون پونچھی، امجد مولوی، آفتاب عالم، طلعت بٹ اور ایس ایم افضل کے بیٹے سہیل افضل اور آزاد کشمیر کے حافظ انور سماوی، سردار خادم حسین، حافظ ممتاز، ڈاکٹر توقیر گیلانی اور عرفان مصطفےٰ رہتے رہے۔ ان کے علاوہ دل محمد عباسی، ظہیر ہمدانی اور راجہ عبدالرحمٰن ساقی، سہیل افضل، اشرف لون اور توقیر گیلانی دفتری کام بھی کرتے رہے۔ ان سب نے نظریئے، تحریک اور تنظیم کے ساتھ ساتھ میری ذاتی طور پر بڑی خدمت کی اور مجھے انتہائی احترام دیا۔ یوں تو تقریباً سب حضرات انتہائی مخلص، محبِّ وطن اور خدمت گزار ہیں لیکن ڈاکٹر حجازی کی محنت اور نظریئے اور میری ذات سے ذہنی وابستگی، ایس ایم افضل کا مفاہمتی طرزِ عمل، منظور خان کی پبلک ریلیشنگ، حافظ انور سماوی صاحب کی درویشی اور سردار خادم حسین صاحب کا جذبہ حب الوطنی، اقبال میر (وہ مدت تک ہمارے اکاؤنٹنٹ تھے) کی دیانتداری، شمس الدین کا جذبہ ایثار و قربانی (وہ ہماری گاڑی چلاتے تھے۔ ایک بار مری کی پہاڑی پر ایکسیڈنٹ کے دوران مجھے بچانے کیلئے اس نے اپنی جان کو داؤ پر لگا دیا جبکہ شمس کے بعد ایک نام نہاد مجاہد جاوید جو ہماری گاڑی چلاتا تھا، نے گاڑی ہی بیچ کھائی اور بہانہ بنایا کہ چوری ہوگئی) اور رفیق لون کی انتہائی مخلصانہ خدمت اور سعید میر کا خلوص مثالی ہیں۔ میرے ڈرائیوروں کوٹلی کے سردار انیس، سرینگر کے لیاقت علی مظفر آباد کے منیر اور بھمبر کے چوہدری زاہد نے اپنے فرائض خلوص سے انجام دیئے۔ گوریکوٹ استور کا عبداللہ بھی کچھ مدت میرا ڈرائیور رہا۔ اٹھمقام کے عظیم اور فرید تنظیم کے ملازم رہے ہیں۔ دونوں مخلص اور ایماندار ہیں۔ گو خود میری اور ہر انسان کی طرح میرے ان ساتھیوں میں بھی خامیاں ہیں لیکن پلڑا اچھائیوں اور میرے لئے پرخلوص احترام کا ہی بھاری ہے۔

میں نے راولپنڈی میں ڈاکٹر فاروق حیدر اور مرحوم پیر مقبول گیلانی کے گھر کا بہت نمک کھایا ہے۔ دونوں جگہ مجھے ذاتی طور پر پیار اور احترام بھی ملا ہے۔ مظفر آباد میں میں نے سب سے زیادہ نمک راجہ مظفر کے گھر کا کھایا۔ انکی اہلیہ اور بچوں نے مجھے ہمیشہ مخلصانہ احترام دیا۔ انکی بہنوں نے مجھے سگے بھائی کا اور بھانجے بھانجیوں نے سگے ماموں کا پیار اور احترام دیا۔ خواجہ سیف الدین، ڈاکٹر میر (راجہ صاحب کے سسر) اور اہلخانہ غلام محمد وانی، ایس ایم افضل اور پیرزادہ غلام مصطفےٰ علوی کے ہاں بھی قیام کرتا رہا۔ ان سے بھی شفقت اور احترام ملا۔ راولاکوٹ کے سردار رفیق صاحب بھی میری انتہائی پرخلوص میزبانی کرتے رہے۔ میرپور میں عبدالحمید بٹ، صابر انصاری، اسلم مرزا، اور ابتداء میں عبدالخالق انصاری صاحب میری میزبانی کرتے رہے۔ ڈاکٹر محسن شکیل میرے قریب ترین عزیزوں اور دوستوں سے کہیں زیادہ میری صحت کے

بارے میں متفکر رہتے ہیں۔ایک بار انہوں نے مجھے جبراً دو دن میر پور میں روک کر میرا مکمل میڈیکل چیک اپ کرایا۔ یہی حال ان کے چھوٹے بھائی راحیل احسن کا تھا جو گزشتہ چند سال سے امریکہ میں ہیں۔ دونوں بھائیوں نے طلعت بٹ (حال سویڈن) کے عملی تعاون سے کشمیر ریسرچ اینڈ ریکارڈ سیل (KRRC) بنائی جو آئی ٹی کے شعبے میں تحریک آزادی کی خاصی خدمت کرنے کے علاوہ مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی سے متعلق قیمتی کتابوں اور دستاویزات کی امین بھی ہے۔

لاہور میں مرحوم سعید شاہ نازکی کی فیملی اور ان کے بیٹے خاص کر فیصل نازکی اور جی ایم میر میری میزبانی کرتے رہے۔ ابتداً میں مظفر آباد اور ایبٹ آباد میں بھی میر صاحب ہی کے ہاں قیام کرتا تھا۔ 1972ء میں گلگت جیل سے رہا ہو کر اپنے ساتھیوں کے خلاف عدالت میں زیر سماعت گنگا ہائی جیکنگ کیس کے سلسلے میں کئی ماہ تک لاہور میں غلام نبی لون کے ہاں قیام پذیر رہا۔ان کے اہلخانہ بھی میرے ساتھ پرخلوص رہے۔ میرے ہمزلف بریگیڈیئر برکت علی خان بھی لاہور میں آباد ہیں۔

سیالکوٹ میں میرا ٹھکانہ مرحوم مجید امجد بٹ اور ڈاکٹر غلام احمد جراح مرحوم کے ہاں ہوتا تھا۔ دونوں کا تعلق جموں سے تھا۔ باغ میں ارشد زرگر، حاجی رزاق، راجہ ذوالفقار اور سردار شعیب سے تنظیمی کے علاوہ ذاتی مراسم بھی ہیں۔

میرے کچھ تنظیمی ساتھیوں نے گزشتہ چالیس سال کے دوران نظریے، تحریک اور تنظیم کے علاوہ میری ذات کے ساتھ بھی بڑی زیادتیاں اور ناانصافیاں کیں۔لیکن میں اس کتاب میں ان کی نشاندہی کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔

برطانیہ، یورپ، امریکہ اور مشرق وسطیٰ میں جن لوگوں نے میری ذاتی اور تنظیمی مدد کی ہے انکی تفصیل کتاب کی پہلی جلد کے صفحہ نمبر 56 تا 58 پر ہے۔

الغرض میں متذکرہ بالا اور بہت سے ان دوسرے حضرات کا انتہائی ممنون و مشکور ہوں (جن کا میں یہاں ذکر کرنے سے قاصر رہا ہوں) کہ انہوں نے کسی نہ کسی شکل میں میرے بزرگوں، میرے خاندان، اور ذاتی طور پر میری خدمت اور مدد کی ہے۔ میں دعا گو ہوں کہ ان سب کو ہر ممکن شکل میں اس کا صلہ ملے۔

3- میری اصل تاریخ پیدائش اور تعلیم

میری زندگی کے کچھ دوسرے پہلوؤں کی طرح میرا بچپن اور میری تعلیم کے پہلو بھی اکثر لوگوں کی زندگی کے ان پہلوؤں سے خاصے مختلف ہیں۔ آیئے ایک نظر ڈالیں۔

میرے والد صاحب گرداور جمعہ خان کی پہلی شادی سے آٹھ بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ دو بیٹے بھی ہوئے لیکن دونوں بچپن میں ہی فوت ہو گئے۔ میرے والد صاحب پر ان کی اہلیہ نے دباؤ ڈالا کہ وہ دوسری شادی کریں تا کہ انکی بیٹیوں کیلئے بھائی کی شکل میں کوئی سہارا پیدا ہو۔ چنانچہ والد صاحب نے اپنے ہی

گاؤں کھنگر ول کے ایک معزز شخص حمزہ خان کی نوجوان بیٹی سکینہ سے شادی کی جنکے بطن سے میں پیدا ہوا۔

میری ذاتی دستاویزات میں درج میری تاریخ پیدائش 24 اگست 1934ء ہے جو غلط ہے۔ دراصل برصغیر کی آزادی سے پہلے برٹش انڈیا میں عیسوی کیلنڈر رائج تھا جبکہ ریاست جموں کشمیر میں بکرمی کیلنڈر رائج تھا۔ بکرمی کیلنڈر کی تاریخ عیسوی کیلنڈر کی تاریخ سے 56 سال 8 ماہ 18 دن آگے ہوتی ہے۔ اور حال ہی میں ملی میری کچھ آبائی دستاویزات کے مطابق میری مصدقہ تاریخ پیدائش 12 بھادون 1988 بکرمی ہے جو عیسوی کیلنڈر کے مطابق 24 اگست 1931ء بنتی ہے۔ چنانچہ میری اصل تاریخ پیدائش 24 اگست 1931ء ہے اور 24 اگست 2004ء کو میری عمر ٹھیک تہتر (73) سال ہوگئی۔ غالباً سکول میں اندراج کے وقت میری تاریخ پیدائش کو بکرمی سے عیسوی سن میں تبدیل کرنے کے دوران غلطی سے تین سال کم لکھے گئے جسکے نتیجے میں یہ تاریخ 1931ء کی بجائے 1934ء ہوگئی جبکہ میری اصل تاریخ پیدائش 24 اگست 1931ء ہے۔

میں والد صاحب کی زندگی میں انتہائی ناز سے پلا تھا لیکن انکی وفات کے بعد میری زندگی یکسر بدل گئی۔ ان دنوں صمد خان والے میری جان کے درپے تھے انہوں نے ایک بار مجھے زہر دیکر مار ڈالنے کی کوشش کی لیکن ناکام ہوگئے۔ چنانچہ خاندان والوں خاص کر میرے ماموں حاجی عبدالرحیم خان، بہنوئی گرداور نعمت خان، چچا اکبر خان اور والدہ نے فیصلہ کیا کہ مجھے بہنوئی ہاشم علی خان کے ساتھ وادیٔ کشمیر کے علاقے ہائی ہامہ کپواڑہ بھیجا جائے تاکہ میری جان بھی محفوظ رہے اور مجھے بہتر تعلیم بھی ملے۔ علاوہ ازیں ہاشم علی خان نے میرے والد کی زندگی کے آخری لمحوں میں ان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ میری صحیح پرورش اور تعلیم کا پورا خیال رکھیں گے اور انہوں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔

میں نے پرائمری تک کی تعلیم ہائی ہامہ میں پڑھی اور تحصیل بھر میں مسلمان طلباء میں اول پوزیشن حاصل کر کے سکالرشپ (دو روپے ماہوار) حاصل کیا۔ مڈل کا ری ہامہ سے کیا جس کیلئے پہلے دو سال روزانہ تقریباً 18 کلومیٹر پیدل چلتا رہا۔ مڈل کے امتحان میں ضلع بھر میں تیسری پوزیشن حاصل کی۔ نویں کلاس کیلئے میں نے ہائی سکول ہندواڑہ میں داخلہ لیا۔ 1950ء میں کشمیر یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور یونیورسٹی بھر میں مسلمان طلبا میں اول آیا۔ سرینگر میں ایس پی کالج میں داخلہ ملا، اور وہاں کے مسلمان پروفیسروں کے مشورے پر میں نے سائنس کے مضامین لئے جبکہ میں نے میٹرک تک سائنس پڑھی ہی نہیں تھی چنانچہ میں نے بڑی مشکل سے فرسٹ ایئر پاس کیا لیکن سیکنڈ ایئر کے امتحان سے پہلے ہی بھارت مخالف مظاہرے کی پاداش میں میرے خلاف وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے جسکی وجہ سے میں سرینگر سے بھاگ کر جموں میں دو ہفتے رہ کر 2 جنوری 1952ء کو براستہ جموں، سیالکوٹ پاکستان آ گیا۔

میں نے راولپنڈی میں کالج میں داخلہ لینے کی کوشش کی لیکن پنجاب یونیورسٹی نے یہ کہہ کر کہ وہ کشمیر یونیورسٹی کو (جہاں سے میں نے میٹرک پاس کیا تھا) تسلیم نہیں کرتی مجھے کسی کالج میں داخلہ دینے

سے انکار کرتے ہوئے دوبارہ میٹرک کا امتحان دینے کا مشورہ دیا۔ بہر حال میں نے اپنے ماموں زاد بھائی محمد اسماعیل خان کی مدد سے ایڈورڈز کالج پشاور میں داخلہ لیا لیکن کچھ مدت کے بعد کالج کے وائس پرنسپل نے مجھے ایک ذاتی عناد کی وجہ سے کالج سے نکال دیا۔ کچھ دن گورنمنٹ کالج مردان میں رہا پھر کراچی چلا گیا۔ کراچی کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ شہر خود کفیل طلباء کیلئے ماں باپ کا کردار ادا کرتا ہے اور حقیقت بھی یہی تھی۔

کراچی میں تقریباً ایک سال تک خاصا پریشان رہنے کے بعد میں نے 1953ء میں سندھ مسلم (ایس ایم) کالج میں ایف ایس سی میں داخلہ لیا لیکن پہلے سال فیل ہوگیا۔ دوسرے سال ایف ایس سی پاس کی اور سائنس چھوڑ کر بی اے میں داخلہ لیا اور 1957ء میں بی اے سیکنڈ ڈویژن میں کیا۔ 1962ء میں ایس ایم لاء کالج کراچی سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد کراچی یونیورسٹی میں ایم اے بین الاقوامی امور میں داخلہ لیا۔ پہلے سال کے امتحان کے دوران (مئی 1964ء میں) شیخ محمد عبداللہ کے دورہ پاکستان کے سلسلے میں راولپنڈی میں تھا اسلئے امتحان نہ دے سکا۔ دوسرے سال امتحان کے دنوں کشمیر سے متعلق جلوس نکالنے کی پاداش میں قید ہو کر جیل میں تھا اسلئے امتحان نہ دے سکا۔ اس کے بعد ذاتی اور سیاسی مصروفیات کی وجہ سے امتحان کی تیاری نہ کر سکا چنانچہ حصول تعلیم کا سلسلہ ہمیشہ کیلئے ختم ہوگیا۔

اس سے قبل 1960ء میں میں نے لنکنز ان (Lincolns Inn) لندن میں بیرسٹری کیلئے داخلہ لیا تھا اور اس سلسلے میں پاسپورٹ بھی حاصل کیا تھا لیکن ایک تو بزرگوں خاص کر ماموں حاجی عبدالرحیم خان کے منع کرنے پر، دوسرے یہ سوچ کر کہ میرے کراچی سے چلے جانے کے بعد میرے زیر کفالت اور زیر تعلیم نصف درجن سے زیادہ میرے عزیزوں کا مستقبل تباہ ہو جائے گا میں نے بیرسٹری کرنے کا ارادہ ترک کر کے لندن جانے کا پروگرام منسوخ کر دیا۔

یہ تھی مختصر ترین الفاظ میں میری اصل تاریخ پیدائش، میرے بچپن اور میری تعلیم کی کہانی۔

4- میری ملازمتیں

میں طبعاً آزاد فکر کا حامل انسان ہوں اسلئے ملازمت میری طبیعت کے خلاف ہے لیکن دنیا میں انسان ہر معاملے میں اپنی ہی سوچ کے مطابق نہیں چل سکتا۔ چنانچہ وقفے وقفے سے مجھے بھی ملازمت کرنی پڑی لیکن مجموعی طور پر میں ملازمت کی زنجیروں سے آزاد رہا۔ میں نے پہلی باضابطہ ملازمت 1953ء میں کراچی میں محکمہ مردم شماری میں کی جو چھ ماہ جاری رہی کیونکہ یہ عارضی تھی۔ اس کے بعد اگست 1953ء میں میں نے تیس روپے ماہوار تنخواہ پر سٹی نائٹ سکول نزد سندھ مدرسہ کراچی میں تدریس شروع کی جو اگست 1956ء میں ادارے کے سربراہ سے ٹکراؤ کے نتیجے میں ختم ہوگئی۔ اسی دوران 1954ء میں میں نے اورینٹ ایئر ویز (جو بعد میں پی آئی اے بن گئی) میں چھ ماہ ملازمت کی۔ 1956ء میں میں نے جرمن

ماڈل سکول سولجر بازار کراچی میں ملازمت شروع کی جو 1960ء تک جاری رہی۔ اس ملازمت سے انگریزی بول چال پر عبور حاصل ہوا جو بعد میں میرے قیام برطانیہ کے دوران کام آیا۔ کچھ مدت ریڈیو پاکستان میں انگریزی سے کشمیری زبان میں ترجمہ کرتا رہا۔ اور چند ماہ ڈاکخانے میں بھی ملازمت کی۔ 1957ء اور 1961ء کے درمیان مجموعی طور پر کوئی دو سال کے عرصے کے دوران (اپنے قائم کردہ سکولوں کا خسارہ پورا کرنے کیلئے) بیک وقت دو ملازمتیں اور تین تین ٹیوشن بھی کرتا رہا اسطرح روزانہ تقریباً اٹھارہ گھنٹے کام کرتا تھا۔

برطانیہ میں قیام کے دوران کچھ مدت میں نے کریڈٹ اینڈ کامرس انشورنس کمپنی کی ایجنسی لے لی جس سے ایک سال میں تقریباً چار ہزار پونڈ کمائے۔ جن کا بیشتر حصہ تنظیم پر صرف کیا۔ بہرحال میں نے مجموعی طور پر سات آٹھ سال کل وقتی یا جز وقتی ملازمت کی اور بالغ زندگی کے باقی سال تحریک آزادی سے متعلق سرگرمی اور کچھ سال اپنے تعلیمی اداروں کی نگرانی پر صرف کئے۔

5- میرے تعلیمی ادارے

انسان کی زندگی میں کبھی کبھی ایسے واقعات پیش آتے ہیں جو اسکی زندگی کا رخ ہی موڑ دیتے ہیں۔ میری زندگی ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے جن میں سے اکثر کا ذکر کتاب کی پہلی جلد میں ہوا ہے۔ اگر میں اگست 1956ء میں پیش آنے والے واقعے کو ان واقعات میں اہم ترین قرار دوں تو شاید غلط نہ ہو۔

1953ء سے میں کراچی کے سٹی نائٹ سکول میں پڑھاتا تھا۔ سکول میں طلباء کی بھاری اکثریت مزدور پیشہ افراد کی تھی جو دن بھر محنت مزدوری کر کے شام کو پڑھتے تھے۔ میں سکول کے مقبول ترین اساتذہ میں سے تھا اور طلباء اکثر مجھ سے اپنے ذاتی معاملات کے بارے میں بھی مشورہ لیتے تھے۔ سکول کے ایک استاد جو ادارے کے مالک کے عزیز بھی تھے کے بارے میں طلباء کو عام شکایت تھی کہ وہ کلاس میں پڑھانے کی بجائے ٹائم پاس کرتے ہیں۔ اگست 1956ء کی کسی تاریخ کا واقعہ ہے کہ میں نے سٹاف کی میٹنگ کے دوران اس استاد کی موجودگی میں اسکے متعلق اس حقیقت کا ذکر کیا تو ادارے کے سربراہ نے مجھے ٹوکتے ہوئے ایک تضحیک آمیز ریمارک بھی پاس کیا چنانچہ میں نے نہ صرف اس کا جواب دیا بلکہ ملازمت سے بھی استعفٰے دیکر سکول سے باہر نکل آیا۔ میرے آنے کے بعد سکول میں بات پھیل گئی کہ طلباء کے مفاد کی بات کرنے پر ادارے کے سربراہ نے امان اللہ خان کی تضحیک کی جسکے ردعمل کے طور پر امان اللہ خان سکول سے مستعفی ہو کر چلے گئے۔ میں سکول سے واپسی پر روز لی مارکیٹ میں ایک بلوچ پان سگریٹ والے کے پاس کھڑا ہو کر ریڈیو پاکستان کی خبریں سنا کرتا تھا۔ اس دن بھی وہاں کھڑا ریڈیو پاکستان سے خبریں سن رہا تھا کہ سٹی نائٹ سکول کے بہت سے طلبا جو اس علاقے میں رہتے تھے وہاں پہنچ گئے اور مجھ سے ہونے والے سلوک پر افسوس کا اظہار کرتے رہے خاص کر اسلئے کہ میرے ساتھ یہ سلوک طلباء کے مفاد میں

بات کرنے پر ہوا تھا۔ اسی دوران ایک لڑکے نے کہا سر آپ اپنا سکول کیوں نہیں کھولتے ہم سب آپ کے ہاں آئینگے۔ میرا اس طرف کبھی ذہن گیا ہی نہیں تھا۔ میں نے کہا میرے پاس جگہ نہیں تو لڑکوں نے کہا آپ سکول کھولنے کا فیصلہ کریں ہم جگہ ڈھونڈ لیں گے۔ میں نے رات کو اس تجویز پر سنجیدگی سے غور کیا۔ حسب معمول اس سلسلے میں بھی میری چھٹی حس نے میری رہنمائی کی اور اس اقدام پر زور دیا۔ چنانچہ میں نے آخر فیصلہ کیا کہ مجھے اپنا سکول کھولنا چاہیئے۔ سکول قائم کرنے کے فیصلے کے وقت میرے پاس صرف پندرہ روپے تھے۔ لیکن ہمت مرداں مدد خدا کے مصداق میرے عزم نے کرشمے دکھائے اور میں نے کراچی کے پرانے علاقے لی مارکیٹ میں اپنی رہائشی کوٹھڑی میں نائٹ سکول کی کلاس جاری کی۔ پہلے ہی دن دس لڑکے داخل ہو گئے۔ میں دن میں اور رات کو کوٹھڑی کو اپنی رہائش کے طور پر استعمال کرتا اور شام کو چھ سے نو بجے تک اپنا بستر اور صندوق (جو میری کل جائیداد تھی) اوپر چھت پر رکھ کر کمرے میں بینچ ڈالکر اسے کلاس روم میں تبدیل کر دیتا۔ کچھ دن کے بعد ساتھ والا کمرہ بھی کرائے پر لیا اور پھر تیسرا بھی۔ ہمارے پہلے سال کا میٹرک کا رزلٹ سو فیصد آ گیا تو داخلوں کا رش ہو گیا۔ اسی دوران میں نے اپنی کوٹھڑی سے خاصے دور ایک چار کمرے والے حبیبیہ پرائمری سکول (جسے کراچی کے افغانوں کی تنظیم حبیبیہ ایجوکیشنل سوسائٹی چلاتی تھی اور جسکے سربراہ حاجی نوران شاہ تھے) کو چھ سے نو بجے رات تک کیلئے کرائے پر لیکر جولائی 1957ء میں سکول ادھر منتقل کر لیا۔ کچھ مدت بعد میں نے اسی عمارت کو دوپہر ایک بجے سے پانچ بجے تک کیلئے بھی کرائے پر لیکر وہاں انگلش میڈیم سکول مری ڈیل انگلش سکول (Merry Dale English School) قائم کیا۔ سکول کی فیس آٹھ روپے ماہوار تھی۔ چھ ماہ تک صرف دو بچے آتے رہے وہ بھی بہن بھائی جنکی کل فیس 12 روپے ماہوار ہو جاتی تھی جبکہ دوپہر کی شفٹ کا خرچہ ساڑھے چار سو روپے ماہوار تھا۔ اس خسارے کو پورا کرنے کیلئے میں تقریباً دو سال تک دو سکولوں اور ریڈیو پاکستان میں ملازمت کے علاوہ ٹیوشن پڑھاتا رہا۔ 1962ء تک دونوں سکول خاصا منافع دینے لگے۔ جس سے میں نے قرضے بھی چکائے اور اپنے عزیزوں کے تعلیمی اخراجات بھی پورے کرتا رہا۔ تھوڑا سرمایہ جمع ہوا تو وائس آف کشمیر (Voice of Kashmir) کے نام سے ایک انگریزی ماہنامہ بھی جاری کیا۔ اس دوران میرے سکول خاصے منافع بخش ہو گئے تھے جسکے نتیجے میں حبیبیہ ایجوکیشنل سوسائٹی والوں کی نیت میں فتور آ گیا اور انہوں نے سکول پر قبضہ کرنے کی سازشیں شروع کیں اور ایک دن سکول کے دروازے پر تالا لگا دیا۔ چونکہ ایسا کرنا ہمارے معاہدے کی خلاف ورزی تھی اسلئے میں نے تالا توڑا۔ سوسائٹی والوں نے پولیس بلائی جسے خوب کھلایا پلایا گیا تھا۔ اس نے سکول کا تالا توڑنے پر پابندی لگائی جبکہ دوسری پارٹی کو تالا لگانے سے منع نہیں کیا۔ دوسرے دن پھر تالا لگا تھا۔ میں نے پھر توڑ دیا تو پولیس مجھے گرفتار کر کے لے گئی لیکن کراچی کے سب سے بڑے بدمعاش کالا ناگ (جسکے بچے میرے سکول میں پڑھتے تھے) نے کراچی پولیس کے سربراہ کو فون کر کے دھمکی دی کہ اگر پولیس نے امان اللہ خان کو غیر قانونی حراست سے رہا نہ کیا تو رشوت کھا کر امان اللہ خان کو گرفتار کرنے والے پولیس انسپکٹر کی خیر نہیں چنانچہ مجھے دو گھنٹے کے بعد رہا کیا گیا اور

سکول کی عمارت بھی میرے حوالے کی گئی۔ (اس دلچسپ واقعے کی تفصیل کتاب کی پہلی جلد میں ہے)

اگرچہ میں وقتی طور پر سکول کے بحران پر قابو پا چکا تھا لیکن حبیبیہ سوسائٹی والوں کی سازشیں جاری تھیں۔ اس دوران مارشل لاء حکومت نے لی مارکیٹ کی گندی سبزی مارکیٹ میں ایک لمبی عمارت تعمیر کر کے اسکی پہلی منزل پر ساٹھ کے قریب ہوادار کمرے بنائے تھے۔ چنانچہ میں نے بڑی جدوجہد کے بعد، ایک اتفاقیہ معجزے کے نتیجے میں اور بلتستان کے مرحوم محمد اسحاق صاحب کی مدد سے ان ساٹھ میں سے ایک کنارے کے دس کمرے کرائے پر لئے اور جولائی 1962ء میں اپنے دونوں سکول اس عمارت میں منتقل کئے۔ کچھ مدت کے بعد مزید آٹھ کمرے کرائے پر لئے۔ دوپہر اور شام کے علاوہ صبح کی شفٹ بھی شروع کی۔ 1965ء میں شام کی شفٹ میں انٹرمیڈیٹ کلاسیں بھی شروع کیں۔ جنہیں کچھ مجبوریوں کے تحت 1970ء میں بند کرنا پڑا۔ 1970ء تک میرے سکولوں کی تینوں شفٹوں میں طلباء کی کل تعداد 1700 سے تجاوز کر گئی تھی اور بچے دور دور سے بھی آتے تھے۔ میرے دن کے سکول کو محکمہ تعلیم نے علاقے کا ماڈل (مثالی) سکول قرار دیکر علاقے کے دوسرے سکولوں کیلئے اسکی تقلید کرنا ضروری قرار دیا تھا۔ نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی ہمارا سکول مثالی تھا اور اکثر انعامات جیتتا تھا۔ 1972ء میں حکومت کی طرف سے پرائیویٹ سکولوں کو قومیائے جانے کے نتیجے میں میری صبح اور دوپہر کی شفٹیں حکومت کی تحویل میں چلی گئیں۔ یہی نہیں بلکہ میرا بنایا ہوا فرنیچر اور سکول کی دیگر املاک کو بھی حکومت نے ہمیں کوئی معاوضہ دیئے بغیر اپنی تحویل میں لے لیا۔ میں چند ماہ تک سکول کا سربراہ بنا رہا لیکن چونکہ یہ سرکاری ملازمت تھی اور میں تحریک آزادی سے منسلک تھا اسلئے میں نے ملازمت پر تحریک کو ترجیح دی اور سکول سے الگ ہو گیا۔ اسطرح پندرہ سال کے دوران انتہائی محنت سے قائم کئے ہوئے اپنے سکول تحریک آزادئ کشمیر پر قربان کر کے ان سے ہمیشہ کیلئے محروم ہو گیا۔

میرا دن والا سکول ہی قومیایا گیا تھا شام والا بچ گیا تھا کیونکہ اسکی حیثیت ایک کوچنگ سنٹر کی تھی چنانچہ میں نے تگ و دو کر کے اسی عمارت میں کرائے کے تیسرے حصے کی ادائیگی پر شام کی کلاس جاری رکھنے کی اجازت حاصل کر لی۔ علاوہ ازیں بعد میں حاصل کئے گئے آٹھ کمرے بھی قومیائے جانے سے بچ گئے تھے چنانچہ ہم نے ان میں اپنی کے جی اور پرائمری کلاسیں شروع کیں۔

میں جون 1976ء میں تحریک آزادئ کشمیر کے سلسلے میں برطانیہ چلا گیا اور تین چار سال بعد ایک آدھ ماہ کیلئے کراچی آ کر سکولوں پر ایک نظر ڈالتا۔ 1986ء میں برطانیہ بدری کے بعد پاکستان آیا تو تحریک آزادئ کشمیر کے مفاد میں کراچی کی بجائے راولپنڈی کو مسکن بنانا پڑا اسلئے میں سکولوں کی طرف توجہ نہیں دے سکا جسکے نتیجے میں سکولوں کی تعلیم کے معیار کے ساتھ ساتھ طلباء کی تعداد بھی گرتی گئی۔

اس انحطاط کی کچھ اور بھی وجوہات تھیں چنانچہ مارچ 2002ء میں میں نے دن کا سکول یعنی نیو مری ڈیل انگلش سکول ہمیشہ کیلئے بند کر دیا۔ یہ اقدام بھی میرے لئے انتہائی تکلیف دہ لیکن ناگزیر تھا۔

میرے سکولوں نے مجھے مالی پریشانیوں اور ملازمتوں سے بچا کر پوری توجہ تحریک آزادی پر

دینے اور اپنے عزیزوں کی تعلیمی کفالت کرنے کے قابل بنادیا۔ بہت سے غریب بچے یہاں مفت تعلیم حاصل کرتے رہے اور یونیورسٹی اور کالجوں میں پڑھنے والے لڑکے (خاص کر آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان سے تعلق رکھنے والے) ہماری شام کی شفٹ میں پڑھا کر اپنے تعلیمی اخراجات پورے کرتے رہے۔ چند مستثنات کو چھوڑ کر سکول کے سٹاف نے سکولوں کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ سٹاف ممبران کا انفرادی اور تفصیلی ذکر کتاب کی پہلی جلد میں ہے۔ البتہ میں اپنے نائٹ سکول کے موجودہ سٹاف خاص کر خورشید عالم، محمد امیر صاحب، ثناء اللہ انصاری، محمد یعقوب اور شاہ حسین کا ممنون ہوں کہ انہوں نے ادارے کے معاملات میں پورے خلوص اور دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔

الغرض اگر میں یہ کہوں کہ مجھے تحریک آزادی میں اہم کردار ادا کرنے، اپنے عزیزوں کی تعلیمی کفالت کرنے اور تھوڑی سی خدمت خلق کرنے کے قابل بنانے میں میرے طرز فکر و عمل کے بعد سب سے اہم کردار میرے سکولوں نے ادا کیا ہے تو مبالغہ نہیں ہوگا۔ مجھے اس بات سے بھی سکون قلب ملتا ہے کہ میرے سکولوں میں (آزاد کشمیر یا گلگت بلتستان سے تعلق رکھنے والے یا غریب ہونے کی بناء پر) بغیر فیس کے یا نصف فیس پر تعلیم حاصل کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد نے معاشرے میں اہم مقام حاصل کیا ہے۔

یہ تھی میری نجی زندگی کی کہانی۔ میں اپنی سیاسی زندگی کی طرح نجی زندگی سے بھی خاصا مطمئن ہوں اسلئے کہ میں نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ میں اپنے فائدے کے لئے دوسروں کو نقصان نہ پہنچاؤں بلکہ میں نے دوسروں کو فائدہ پہنچانے کے لئے اپنا نقصان بھی برداشت کیا ہے۔ دوسروں کی بے جا دل آزاری سے ہر ممکن احتراز کیا ہے اور خدمت خلق کو عبادت سمجھا ہے۔ بایں ہمہ میری ذات کے بارے میں حتمی فیصلہ تاریخ اور جزا و سزا کے جج کا ہی ہوگا۔

حصہ دوم

مجھ سے متعلق 1986ء تک کے
اہم واقعات وحقائق کا مختصر خلاصہ

میری خودنوشت سوانح حیات ''جہدِ مسلسل'' کی پہلی جلد جو 1992ء میں شائع ہوئی تھی 1931ء میں میری پیدائش سے لیکر 1986ء تک کے مجھ سے متعلق حالات وواقعات کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔ مجھے اندازہ ہے کہ کتاب کی اس دوسری جلد کے قارئین کی اکثریت نے پہلی جلد نہیں پڑھی ہوگی چنانچہ ضروری ہے کہ 1986ء تک کے میری زندگی کے اہم حالات وواقعات پر ایک انتہائی مختصر نظر ڈالی جائے تاکہ نئے قارئین کو میری زندگی سے متعلق 1987ء سے پہلے کے حقائق وواقعات کا بھی کچھ علم ہو۔

میں 24 اگست 1931ء کو ریاست جموں کشمیر کے علاقہ استور (گلگت) کے موضع پریشنگ میں پیدا ہوا۔ میرے آباؤ اجداد گذشتہ تقریباً تین صدیوں کے دوران یاغستانی علاقہ سے ہجرت کر کے چلاس، وادیٔ کشمیر، گریز سے ہوکر استور میں آکر آباد ہوئے تھے۔ ساڑھے تین سال کی عمر میں والد صاحب کا سایہ سر سے اٹھ گیا جسکے بعد گھریلو مجبوریوں کے تحت مجھے اپنی بہن کے ساتھ وادیٔ کشمیر کے ضلع کپواڑہ بھیجا گیا جہاں میں نے تعلیم دوبارہ شروع کی۔ پرائمری کے خصوصی امتحان میں پوری تحصیل کے مسلمان بچوں میں پہلی پوزیشن حاصل کر کے سکالرشپ (دو روپے ماہوار) حاصل کیا۔ اسکے بعد میں مڈل سکول کاری ہامہ سے مڈل کا امتحان پاس کر کے ہائی سکول ہندوارہ میں داخل ہوا اور 1950ء میں کشمیر یونیورسٹی سرینگر سے میٹرک کا امتحان پاس کیا جس میں یونیورسٹی کے مسلمان امیدواروں میں سرفہرست آیا۔ ہائی سکول کی طالب علمی کے دوران ہی تحریکِ آزادیٔ کشمیر سے منسلک ہوگیا تھا اور ایک رات کی اسیری بھی کاٹی تھی چنانچہ ایس پی کالج سرینگر میں تحریکِ آزادی سے متعلق اپنی زیرِ زمین سرگرمیاں جاری رکھیں اور 1951ء کے اواخر میں سرینگر میں ایک احتجاجی مظاہرے میں شرکت کی پاداش میں میرے وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے تو میں گرفتاری سے بچ کر 2 جنوری 1952ء کو براستہ جموں سیالکوٹ پاکستان پہنچ گیا۔

میں نے راولپنڈی میں کالج میں داخلہ لینے کی کوشش کی لیکن پنجاب یونیورسٹی نے میرے کشمیر یونیورسٹی سے پاس کئے امتحان کو تسلیم کرنے سے انکار کیا چنانچہ میں نے اپنے ماموں زاد بھائی محمد اسمٰعیل خان کی مدد سے ایڈورڈز کالج پشاور میں داخلہ لیا لیکن نومبر 1952ء میں ہی مجھے پشاور چھوڑ کر کراچی جانا پڑا جہاں میں نے ایک سال خاصی مشکلات میں گذارا۔ 1953ء میں سندھ مسلم کالج کراچی میں داخلہ لینے کے ساتھ ہی مختلف عارضی ملازمتیں کیں اور 1955ء میں ایف ایس سی، 1957ء میں بی اے اور 1962ء میں ایل ایل بی کے امتحانات پاس کئے۔ اس دوران میں نے 1955ء میں کشمیر سٹوڈنٹس فیڈریشن قائم کی۔ 1956ء میں اپنا نائٹ سکول قائم کیا اور 1957ء میں انگلش میڈیم کا ڈے سکول بھی جن کے اخراجات پورے کرنے کیلئے مجھے دو ملازمتوں کے ساتھ ٹیوشن بھی کرنے پڑتے جن پر میرے روزانہ تقریباً اٹھارہ گھنٹے صرف ہوتے تھے اور یہ سلسلہ دو ڈھائی سال جاری رہا۔ 1961ء تک سکول خود کفیل ہونے لگے۔ اسی دوران میں نے نصف درجن بھر بھانجوں بھتیجوں کو تعلیم کیلئے کراچی بلایا جو میری کفالت میں رہے۔ 1961ء میں میں نے آزاد کشمیر کے پہلے انتخابات سے متعلق سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیا۔ آزاد کشمیر کی صدارت کیلئے میں نے نظریۂ خود مختار کشمیر کے علمبردار امیدوار خواجہ غلام نبی گلکار اور سٹیٹ کونسل کیلئے خواجہ غلام محمد لون (جی ایم لون) کی بھرپور حمایت کی۔ جی ایم لون بھاری اکثریت سے جیت گئے جبکہ گلکار صاحب بوجوہ ہار گئے۔ 1961ء میں میں نے اپنا انگریزی ماہنامہ وائس آف کشمیر جاری کیا۔ اسی دوران کراچی میں رہنے والے نظریۂ خود مختار کشمیر کے حامی کشمیریوں کا گروپ بنا جس میں میں پیش پیش تھا۔ 1963ء میں پاک بھارت مذاکرات کے دوران جب معلوم ہوا کہ تقسیم کشمیر کی بات ہو رہی ہے تو جی ایم لون نے میری اور دوسرے دوستوں کی تجویز پر آزاد کشمیر اور پاکستان کا دورہ کر کے محبِّ وطن اور لکھے پڑھے کشمیریوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ ہمیں تقسیم کشمیر کیخلاف بھرپور آواز اٹھانی چاہئے چنانچہ 12 مئی 1963ء کو راولپنڈی میں محبِّ وطن کشمیری دانشوروں، وکلا اور صحافیوں کا ایک اجتماع ہوا جس میں کشمیر انڈیپنڈنس کمیٹی قائم کی گئی جس نے مطالبہ کیا کہ اگر کشمیر میں ہونے والی مجوزہ اور تسلیم شدہ رائے شماری کا متبادل ہی ڈھونڈنا ہے تو اسکا واحد منصفانہ متبادل تقسیم کشمیر نہیں، پوری ریاست جموں کشمیر کی مکمل خود مختاری ہے۔ جی ایم لون کمیٹی کے کنوینر مقرر ہوئے جبکہ لکھنے پڑھنے اور رابطوں سے متعلق زیادہ تر کام میں کرتا تھا۔ ادھر پاک بھارت مذاکرات ناکام ہو کر ختم ہو گئے تو انڈیپنڈنس کمیٹی بھی سرگرم نہیں رہی۔ اُدھر کمیٹی کے ممبروں اور دوسرے قوم پرست کشمیریوں کی تقریباً دو سال کی کوششوں کے نتیجے میں جموں کشمیر محاذ رائے شماری (برائے آزاد کشمیر و پاکستان) قائم ہوا جسکا پہلا کنونشن 4 اپریل 1965ء کو سیالکوٹ میں ہوا جس میں عبدالخالق انصاری صدر، جی ایم لون سینئر نائب صدر، میں سیکرٹری جنرل اور شہید محمد مقبول بٹ پبلسٹی سیکرٹری منتخب ہو گئے۔ کنونشن کے بعد سارے شرکاء پاک کشمیر سرحد سوچیت گڑھ (جو سیالکوٹ اور جموں کے وسط میں واقع ہے اور دونوں سے پچیس پچیس کلومیٹر دور ہے) گئے جہاں ایک نڈر نوجوان مقبوضہ جموں کی مٹی اٹھا لایا اور ہم سب منتخب عہدیداروں نے مقبوضہ مادرِ وطن کی مٹی ہاتھ میں لیکر انتہائی جذباتی

انداز میں حلفاً عہد کیا کہ ہم مادرِ وطن کی آزادی کیلئے جان کی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کرینگے۔ مئی 1965ء میں کراچی میں اپنے درجن بھر ساتھیوں کے ساتھ گرفتار ہوا لیکن ہفتہ، دس دن کے بعد سب رہا ہوگئے۔ اسکے بعد اکتوبر 1970ء میں آزاد کشمیر کے صدارتی انتخابات ہونے لگے تو ہم (محاذ رائے شماری والوں) نے مطالبہ کیا کہ گلگت بلتستان والوں کو بھی حق رائے دہی دیا جائے۔ حکومت کی طرف سے خاموشی کے ردِعمل میں ہم نے ہفتہء گلگت بلتستان منایا اور اس سلسلے میں سارے آزاد کشمیر اور پاکستان کے بڑے شہروں میں احتجاجی جلسے کئے۔ اسکے بعد گلگت جانے کا پروگرام بنایا جس پر گلگت کی انتظامیہ نے کرائے کے لوگوں (ایک سرکاری ٹھیکیدار کے مزدوروں) کے ذریعہ ہمارے خلاف کالی جھنڈیوں سے مظاہرہ کرانے کا پروگرام بنایا جس پر مقامی نوجوانوں خاص کر مرحوم امیر حمزہ آف استور، مرحوم عبدالحمید آف مناور اور یوسف جمال آف گلگت نے زبردست احتجاج کیا اور اعلان کیا کہ اگر گلگت آنے والے مہمانوں کے خلاف حکومت نے کرایہ کے لوگوں کے ذریعہ کالی جھنڈیوں سے استقبال کرایا تو ہم حکومت کے خلاف مظاہرہ کرینگے۔ بہرحال اس دن گلگت کی فلائٹ نہیں ہوئی اور مظاہرہ ملتوی ہوا اور دوسرے دن ہم گلگت پہنچے لیکن حکومت کو ہمارے خلاف مظاہرہ کرانے کی جرأت نہیں ہوئی۔ ہم دن کو ہوٹل میں رہے رات دس بجے مجھے میرے بھانجے مرحوم محمد اشرف کے گھر سے اور میرے ساتھیوں عبدالخالق انصاری، میر عبدالمنان اور شہید مقبول بٹ کو ہوٹل سے اٹھا کر تھانے پہنچایا گیا جہاں سے رات بارہ بجے ہمیں پولیس والوں اور ہمارے سامان سمیت بھیڑ بکریوں کی طرح ایک ہی جیپ میں ٹھونس دیا گیا اور گلگت شہر سے تقریباً ڈیڑھ سو میل دور گلگت بلتستان کی سرحد کے باہر لے جا کر پاکستانی علاقے میں چھوڑا گیا جہاں سے ہم تین دن بعد راولپنڈی پہنچ سکے۔ ایک ماہ بعد ہم پھر گلگت گئے۔ جلسے پر پابندی لگنے کے بعد ہم نے جیپ پر لاؤڈ سپیکر لگا کر شہر کے دو چکر کئے اور اس دوران ہم نے تقاریر کے ذریعہ عوام کو ان کے سیاسی اور آئینی حقوق کا احساس دلایا۔ تیسرے چکر پر ہمیں گرفتار کیا گیا۔ دوسرے دن مجھے جیل بھیجد یا گیا اور میرے ساتھیوں کو واپس راولپنڈی۔ جنوری 1971ء میں گلگت میں عوامی احتجاج کے دوران لوگوں نے جیل پر حملہ کر کے دوسرے سیاسی قیدیوں کے ساتھ مجھے بھی جیل سے نکالا۔ دو دن بعد ہم نے پھر گرفتاری دی جسکے بعد میں سوا سال (نومبر 1970ء سے فروری 1972ء تک) قید رہا۔ یہ گلگت بلتستان کے عوامی حقوق کے مطالبے کی پاداش میں کاٹی جانے والی اب تک کی سب سے لمبی قید ہے۔

ہم (محاذ رائے شماری کے انقلابی ممبروں) نے اگست 1965ء میں ہی ایک زیرِ زمین تنظیم این ایل ایف قائم کی تھی جس کا پروگرام حصول آزادی کیلئے مسلح جدوجہد کرنا تھا۔ اس سلسلے میں ہمارے ساتھی مقبول بٹ وغیرہ مقبوضہ کشمیر میں قید ہوئے اور انہیں سزائے موت سنائی گئی تھی لیکن اس پر عمل ہونے سے پہلے ہی وہ سرینگر جیل سے فرار ہو کر آزاد کشمیر پہنچے۔ 1970ء میں ہم نے مقبوضہ کشمیر کے ایک نوجوان ہاشم قریشی کو ہوائی جہاز اغوا کرنے کی تربیت دے کر واپس بھیجد یا تھا۔ اس نے اپنے ساتھی اشرف قریشی کے ساتھ جنوری 1971ء میں ایک بھارتی جہاز گنگا اغوا کر کے لاہور پہنچایا جس سے مسئلہ کشمیر ایک بار پھر عالمی

توجہ کا مرکز بن گیا لیکن جلدی ہی صورتحال بدل گئی۔ جہاز جلائے جانے کے بعد پاکستان کی حکومت نے الزام لگایا کہ ہاشم قریشی نے جہاز بھارت کی ایما پر اغوا کیا تھا تاکہ پاکستان کو نقصان پہنچایا جائے جسکے بعد ہائی جیکروں کے علاوہ این ایل ایف اور محاذ رائے شماری کے کوئی ساڑھے تین سو ممبر آزاد کشمیر اور پاکستان سے گرفتار ہوئے اور ان پر بدنام زمانہ شاہی قلعہ لاہور سمیت پاکستان اور آزاد کشمیر کے عقوبت خانوں میں انسانیت سوز تشدد ہوا۔ خود مجھے بھی گلگت جیل سے لاکر دو ماہ تک شاہی قلعے میں غیر انسانی ذہنی اور جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا گیا جس میں بجلی کے تقریباً چالیس جھٹکے بھی شامل تھے۔ اس کے بعد ایک خصوصی عدالت قائم ہوئی جسکے سربراہ مرحوم جسٹس یعقوب علی خان سابق چیف جسٹس آف پاکستان تھے جس نے تقریباً ڈیڑھ سال کی روزانہ سماعت کے بعد ملزموں اور انکی تنظیموں محاذ رائے شماری اور این ایل ایف کو محبِ وطن اور حریت پسند کشمیری اور کشمیری تنظیمیں قرار دیکر بری کر دیا البتہ ہاشم قریشی کو دشمن کا آلہ کار بننے کے الزام میں 14 سال کی سزا دی جس نے اس فیصلے کے خلاف اپیل کی اور دس سال قید کاٹ کر 1980ء میں رہا ہو گیا۔ ستمبر 1973ء میں میری شادی ہوئی اور جولائی 1974ء میں میری بیٹی اسما پیدا ہوئی اور میں جون 1976ء میں برطانیہ میں مقیم اپنے سیاسی ساتھیوں کی دعوت پر وہاں چلا گیا جہاں میں نے (وہاں قائم محاذ رائے شماری کا نام اور آئین تبدیل کر کے) جموں کشمیر لبریشن فرنٹ قائم کیا اور وہاں سے ہی ماہنامہ واکس آف کشمیر انٹرنیشنل بھی جاری کیا۔ لبریشن فرنٹ کے قیام (29 مئی 1977ء) کے ایک ہفتے بعد ہی ہم نے دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کے سالانہ اجلاس کے موقعے پر لندن میں مسلسل پانچ دن مظاہرے کئے۔ چند سال کے اندر اندر لبریشن فرنٹ کی شاخیں یورپ کے اکثر ملکوں میں قائم ہو گئیں۔ 1979ء میں میں پہلی بار نیویارک گیا جہاں جنرل اسمبلی کے اجلاس کے موقعے پر اسکے مرکزی سیکرٹریٹ کے سامنے نیویارک میں مقیم کشمیریوں کا مظاہرہ کرایا جو وہاں اپنی نوعیت کا پہلا مظاہرہ تھا (مظاہروں کا یہ سلسلہ آج تک جاری ہے) 1980ء میں جنرل اسمبلی کے اجلاس کے دوران جہاں دنیا کے 155 ملکوں کے وزرائے خارجہ سینئر سفارتکار اور دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ کے نمائندے بیٹھے تھے میرے بنائے ہوئے پروگرام کے مطابق میرے ساتھیوں نے جنرل اسمبلی ہال کی وزیٹرز گیلری سے پندرہ منٹ تک یکے بعد دیگرے مسئلہ کشمیر اور آزادیٔ کشمیر کے بارے میں نعرے بازی کی اور مسئلہ کشمیر سے متعلق لیفلیٹ گیلری سے جنرل اسمبلی ہال میں پھینکے جو وہاں پورے ہال میں پھیل گئے اس طرح اس جرأت مندانہ اقدام نے ہمارے مطالبات دنیا کے کونے کونے تک پہنچائے۔ میں اپنے قیام نیویارک کے دوران ہر جمعے کو اقوام متحدہ کی مسجد میں جمعہ نماز کے بعد وہاں سفارتکار نمازیوں سے خطاب کرتے ہوئے مسئلے کی تفصیلات بیان کرتا رہا۔

بھارتی حکومت خاص کر لندن اور نیویارک میں قائم بھارتی سفارتخانے میری سرگرمیوں پر نظر رکھے ہوئے تھے اور خاصے پریشان تھے۔ ادھر برطانوی حکومت اپنی ہیلی کاپٹر انڈسٹری کی تباہی کی وجہ سے پریشان تھی۔ آخر دونوں کے مابین ایک خفیہ معاہدہ ہوا کہ برطانوی حکومت میری "بھارت مخالف"

سرگرمیاں بند کرا دے تو بھارت برطانیہ کے ہیلی کاپٹر خریدے گا۔ چنانچہ مجھے بغیر کسی جواز کے 5 ستمبر 1985ء کو برطانیہ میں گرفتار کیا گیا۔ 10 ماہ تک بغیر مقدمہ چلائے قید رکھا گیا اور جب عدالت میں کیس چلا اور اس نے مجھے حسب توقع بری کر دیا تو حکومت نے میری برطانیہ میں موجودگی کو برطانیہ کے قومی مفاد کے منافی قرار دیکر مجھے ساڑھے پندرہ ماہ کی بے جواز قید کے بعد برطانیہ بدر کر دیا۔ میرے بارے میں بھارت برطانیہ تجارتی معاملات کی تفصیلات ٹائمز آف انڈیا کی 25 ستمبر اور یکم اکتوبر 1986ء کی اشاعتوں میں شائع ہوئی ہیں۔ جس کی تفصیل مئی 1997ء میں شائع ہوئی۔ ہماری بیس سالہ رپورٹ کے انگریزی ایڈیشن میں شامل ہے۔

برطانیہ میں ساڑھے دس سالہ قیام کے دوران میں 1979ء سے 1984ء تک تقریباً ہر سال اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس (ستمبر تا دسمبر) کے دوران نیویارک جاتا رہا اور وہاں مختلف ملکوں کے وزرائے خارجہ سفیروں اور ذرائع ابلاغ کے نمائندوں سے ملتا رہا۔ لندن کے ہائیڈ پارک میں ہونے والے درجن بھر مظاہروں کے علاوہ ایک بار لبریشن فرنٹ کے زیر اہتمام یورپ کے پانچ ملکوں میں ایک ہی دن میں اور ایک ہی وقت پر مظاہرے ہوئے۔ ہمارا لیٹریچر وسیع پیمانے پر تقسیم ہوتا رہا اور میں نے یورپ کے ہر اہم ملک کے دارالحکومت میں پریس کانفرنسیں کیں۔

یہ تھا ایک انتہائی مختصر اور سرسری تذکرہ دسمبر 1986ء تک کی میری سیاسی سرگرمیوں کا جنہیں جہدِ مسلسل کی پہلی جلد میں تفصیلاً بیان کیا گیا ہے۔ یہ سرسری تذکرہ اسلئے کیا گیا کہ دوسری جلد کا مطالعہ کرتے ہوئے قارئین کے ذہن میں میرے سیاسی پس منظر کا کچھ علم ہو جس سے قارئین کو کتاب کے مندرجات کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

حصہ سوم

جموں کشمیر لبریشن فرنٹ

1- نظریات اور اغراض و مقاصد
2- تنظیمی ساخت
3- مرکزی تنظیم
4- علاقائی تنظیمیں
5- ذیلی تنظیمیں
6- تنظیم سے علیحدگیاں
7- عظیم نظریاتی ساتھیوں کی یاد میں

جموں کشمیر لبریشن فرنٹ

نظریات۔ تنظیمی ساخت۔ مرکزی تنظیم۔ ذیلی تنظیمیں

جیسا کہ سیاسیات کشمیر خاص کر تحریک آزادئ کشمیر سے دلچسپی رکھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں، میں 1977ء میں اسکے قیام کے وقت سے ہی جموں کشمیر لبریشن فرنٹ سے وابستہ ہوں اور تحریک سے متعلق میری اکثر سرگرمیاں لبریشن فرنٹ کے جھنڈے تلے ہی ہوتی ہیں اسلئے مناسب ہے کہ میری سرگرمیوں کی تفصیل میں جانے سے پہلے لبریشن فرنٹ کے مختلف پہلوؤں پر ایک نظر ڈالی جائے۔

جیسا کہ کتاب کی پہلی جلد میں تفصیلاً درج ہے جموں کشمیر لبریشن فرنٹ ایک خودمختار سیاسی تنظیم کی حیثیت سے 29 مئی 1977ء کو برمنگھم برطانیہ، میں قائم ہوا اور چند سال کے اندر اندر اس کی شاخیں سارے برطانیہ، یورپ کے دوسرے ملکوں، مشرق وسطیٰ اور امریکہ میں قائم ہوئیں۔ 1982ء میں اسکی شاخیں آزاد کشمیر میں اور 1987ء میں بھارتی مقبوضہ کشمیر میں قائم ہوئیں۔

(1) تنظیم کے نظریات اور اغراض ومقاصد

(الف) **نظریات:**۔ جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کے اہم نظریات مندرجہ ذیل ہیں۔

(1) مسئلہ کشمیر بھارت اور پاکستان کے مابین کسی قطعہ زمین کی ملکیت سے متعلق کوئی تنازعہ نہیں بلکہ 222000 مربع کلومیٹر سے زائد رقبے پر پھیلی ہوئی ریاست جموں کشمیر کے باشندوں کو ان کا غیر مشروط وغیر محدود حق خودارادیت دینے کا مسئلہ ہے

(2) ریاست جموں کشمیر یا اس کا کوئی حصہ کسی دوسرے ملک کا آئینی حصہ نہیں۔

(3) ریاست کے آئینی مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق صرف اور صرف ریاستی عوام کو حاصل ہے۔

(4) مسئلہ کشمیر کا بہترین حل یہ ہے کہ منقسم ریاست جموں کشمیر کو دوبارہ متحد کر کے وہاں ایک ایسی خودمختار مملکت قائم کی جائے جسکا طرز حکومت جمہوری، وفاقی اور غیر فرقہ وارانہ ہو، جسکے عالمی برادری خاص کر اپنے ہمسایوں کیساتھ دوستانہ تعلقات ہوں اور جملہ ریاستی عوام کو خواہ انکا مذہب، زبان اور علاقہ کوئی بھی ہو بنیادی انسانی حقوق حاصل ہوں اور ان سے ایک جیسا سلوک کیا جائے۔

(ب) اغراض ومقاصد

لبریشن فرنٹ کے اغراض ومقاصد کے اہم نکات مندرجہ ذیل ہیں۔

(1) پوری ریاست جموں کشمیر کو دوبارہ متحد کر کے وہاں ایک مکمل طور پر خودمختار مملکت کے قیام کیلئے جدوجہد کرنا۔

(2) جب تک پوری ریاست آزاد نہیں ہوتی اس وقت تک آزاد کشمیر گلگت بلتستان میں عوام کو بنیادی جمہوری اور آئینی حقوق دلانے کیلئے جدوجہد کرنا۔

(2) تنظیمی ساخت۔

تنظیمی لحاظ سے لبریشن فرنٹ چار زونز یعنی آزاد کشمیر گلگت بلتستان و پاکستان زون، بھارتی مقبوضہ کشمیر زون، برطانیہ زون اور یورپ زون کے علاوہ مشرق وسطے، امریکہ اور ہانگ کانگ کی شاخوں پر مشتمل ہے (مئی 2003ء میں سنٹرل کمیٹی نے آزاد کشمیر و پاکستان زون کی زونل تنظیم کو ختم کر کے اسکے معاملات کو چیف آرگنائزر کی تحویل میں دیدیا۔) امریکہ مشرق وسطیٰ اور ہانگ کانگ کی شاخیں براہ راست مرکز کے ماتحت ہیں۔ مشرق وسطیٰ میں ہماری شاخیں سعودی عرب میں الریاض، دہران، جدہ اور خمیس میں، عرب امارات میں ابوظہبی، دوبئی اور العین میں۔ یورپ میں بیلجیئم، ہالینڈ، فرانس، سویڈن، ناروے، ڈنمارک، فن لینڈ، یونان، اٹلی اور اسپین میں ہیں۔ انکے علاوہ امریکہ اور ہانگ کانگ میں بھی ہماری تنظیم ہے۔

مرکزی تنظیم۔

(1) مرکزی عہدہ دار۔ (چیئرمین۔ سینئر وائس چیئرمین۔ زونز کے صدور جو بلحاظ عہدہ وائس چیئرمین ہیں، سیکرٹری جنرل، ایڈیشنل سیکرٹری جنرل، ڈپٹی سیکرٹری جنرل، اسسٹنٹ سیکرٹری جنرل۔ (ان میں سے آخری تین بالترتیب بھارتی مقبوضہ کشمیر، برطانیہ اور یورپ کے جنرل سیکرٹری ہوتے ہیں) چیف آرگنائزر، ڈپٹی چیف آرگنائزر، پبلیسٹی سیکرٹری اور سیکرٹری مالیات)

(2) سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی :- جو اعلےٰ ترین اختیارات کا حامل ادارہ ہے۔

(3) پالیسی پلاننگ کمیٹی :- جو سینئر عہدہ داروں اور شعبوں کے سربراہوں پر مشتمل ہوتی ہے، ایک قسم کا تھنک ٹینک (Think Tank) ہے اور اہم معاملات اور پالیسی سازی کے سلسلے میں چیئرمین اور سنٹرل کمیٹی کو مشورے دیتی ہے۔ عسکریت سے متعلق معاملات بھی اسی کی تحویل میں ہوتے ہیں۔ مرکزی تنظیم 6 سب کمیٹیوں یعنی سیاسی کمیٹی، سفارتی کمیٹی، مالیاتی کمیٹی، تنظیمی کمیٹی، عسکری کمیٹی اور پبلسٹی کمیٹی پر مشتمل ہوتی ہے اور ہر کمیٹی کا سربراہ سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی اور پالیسی پلاننگ کمیٹی کا ممبر ہوتا ہے۔

(3) اب تک کے مرکزی عہدیدار

لبریشن فرنٹ کی مرکزی تنظیم کے اہم عہدوں پر گذشتہ 27 سال کے دوران مندرجہ ذیل اصحاب منتخب ہوئے۔

1- چیئرمین، عبدالجبار بٹ ساکن میرپور مقیم برطانیہ (صدر)، امان اللہ خان گلگت برطانیہ، محمد افضل جاتلوی میرپور برطانیہ، امان اللہ خان گلگت راولپنڈی۔

2- سینئر وائس چیئرمین، حاجی نذیر احمد میرپور برطانیہ، چوہدری گل نواز میرپور برطانیہ، محمد محمود نظامی میرپور برطانیہ، عبدالحمید بٹ جموں میرپور، ڈاکٹر فاروق حیدر جموں راولپنڈی، راجہ مظفر اوڑی مظفرآباد، سردار خادم حسین پونچھ، ایس ایم افضل وادی کشمیر۔

3- متعدد وائس چیئرمین، چوہدری عبدالغفور میرپور برطانیہ، محمود نظامی میرپور برطانیہ، حاجی غلام سرور کوٹلی برطانیہ، ملک محمد شفیع کوٹلی برطانیہ، سردار رشید حسرت پونچھ، سردار رؤف کاشمیری پونچھ، شہید اشفاق مجید وانی سرینگر، محمد یٰسین ملک سرینگر، شہید عبدالحمید شیخ سرینگر، جاوید میر سرینگر، غلام مصطفےٰ علوی سرینگر مظفرآباد، شہید شبیر صدیقی بڈگام، سردار آفتاب حسین پونچھ، غلام نبی بٹ ترہگام، ملک لطیف کوٹلی برطانیہ، پروفیسر مقبول سرینگر، ڈاکٹر حیدر حجازی انت ناگ، سردار شاہد محمود پلندری، مشتاق پاشا کوٹلی فرانس، خان فاروق کوٹلی برطانیہ، غلام قادر راتھر بڈگام، سردار خادم حسین پونچھ۔

4- سیکرٹری جنرل۔ نذیر الحق نازش میرپور برطانیہ، امان اللہ خان گلگت برطانیہ، شبیر چوہدری بھمبر برطانیہ، چوہدری مجید میرپور برطانیہ، زبیر الحق انصاری، میرپور برطانیہ، خلیل حبیب پونچھ ایس ایم افضل کپواڑہ مظفرآباد، ڈاکٹر حیدر حجازی انت ناگ راولپنڈی، سردار صغیر ایڈووکیٹ پونچھ۔

5- ایڈیشنل، ڈپٹی، اسسٹنٹ سیکرٹری جنرل۔ راجہ مظفر مظفرآباد۔ محمود حسین پونچھ۔ مسعود الرحمٰن مظفرآباد۔ زاہد حبیب شیخ مظفرآباد، رشید الحسن سرینگر، سردار شعیب باغ، کبیر احمد کشمیری پونچھ بیلجیم، حنیف راجہ کوٹلی، فہیم بخاری انت ناگ، راجہ ظفر خان کوٹلی برطانیہ، الطاف اندرابی پلوامہ، ایم اے حسین میرپور لندن، سلام دین شاہ سرینگر، سلیم بٹ باغ۔

6- چیف۔ ڈپٹی چیف آرگنائزر۔ چوہدری عبدالمجید میرپور برطانیہ، محمود نظامی میرپور برطانیہ، چوہدری صدیق میرپور برطانیہ، سردار رشید حسرت پونچھ، سردار قدیر پونچھ، ذوالفقار حیدر راجہ باغ، حافظ انور ساوی باغ، عبدالحمید بٹ میرپور، شیخ عبدالسلام سرینگر، ریاض لون کپواڑہ، راجہ حق نواز کوٹلی۔

7- پبلسٹی سیکرٹری۔ مرحوم افضل جاتلوی میرپور برطانیہ، عبدالمجید چوہدری میرپور برطانیہ،

معصوم انصاری میر پور برطانیہ، عظمت خان میر پور برطانیہ، احسان الحق انصاری میر پور برطانیہ، چوہدری قربان حسین میر پور برطانیہ، مجید امجد بٹ جموں سیالکوٹ، ڈاکٹر حیدر حجازی انٹ ناگ، راولپنڈی، حافظ انور سماوی باغ، راجہ مظہر اقبال باغ اور ڈاکٹر تو قیر گیلانی کوٹلی۔

8- سیکرٹری مالیات۔ مرزا محمد صدیق میر پور برطانیہ، حاجی عبدالرحمن میر پور برطانیہ، صوفی عنایت میر پور برطانیہ، حاجی مرزا بشیر میر پور برطانیہ، ملک محمد شفیع کوٹلی برطانیہ، ڈاکٹر فاروق حیدر جموں راولپنڈی، پیر زادہ غلام مصطفےٰ علوی سرینگر مظفر آباد، راجہ فاروق اقبال بھمبر، اقبال احمد خان کولگام راولپنڈی، منظور احمد خان ہائی ہامہ کپواڑہ، راولپنڈی۔
بشیر بیزام کوٹلی برطانیہ، ملک اقبال کوٹلی برطانیہ، ملک اعجاز کوٹلی برطانیہ۔

ان میں سے کچھ اصحاب مختلف مرحلوں پر اور مختلف وجوہات کی بنا پر تنظیم سے الگ ہو گئے تین ساتھی اشفاق مجید وانی، شیخ عبدالحمید اور شبیر صدیقی شہید ہو گئے اور غلام نبی بٹ، محمد افضل جاتلوی، چوہدری مجید، چوہدری غفور اور محمد محمود نظامی کا انتقال ہو گیا۔ الگ ہونے والوں میں سے کچھ حضرات نے متوازی تنظیمیں بنائیں اور کچھ گوشہ نشین ہو گئے۔

لبریشن فرنٹ کے موجودہ مرکزی عہدیدار، ممبران سنٹرل کمیٹی اور ممبران پالیسی پلاننگ کمیٹی مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔ مرکزی عہدیداران۔

چیئرمین:۔ امان اللہ خان۔ سینئر وائس چیئرمین:۔ ایس ایم افضل ترہگام وادیٔ کشمیر۔
وائس چیئرمین اول غلام قادر راتھر (صدر بھارتی مقبوضہ کشمیر زون)۔ وائس چیئرمین دوم:۔ سردار خادم حسین پونچھ۔ وائس چیئرمین سوم:۔ خان فاروق (صدر برطانیہ زون)۔ وائس چیئرمین چہارم:۔ مشتاق پاشا (صدر یورپ زون)
سیکرٹری جنرل:۔ سردار صغیر خان ایڈووکیٹ پونچھ۔ ایڈیشنل سیکرٹری جنرل:۔ سلام دین شاہ۔ (جنرل سیکرٹری بھارتی مقبوضہ کشمیر زون) ڈپٹی سیکرٹری جنرل:۔ سلیم بٹ باغ۔ جوائنٹ سیکرٹری جنرل:۔ ایم اے حسین۔ (جنرل سیکرٹری برطانیہ زون) اسسٹنٹ سیکرٹری جنرل:۔ کبیر احمد کاشمیری۔ (جنرل سیکرٹری یورپ زون) چیف آرگنائزر:۔ راجہ حق نواز۔ ایڈیشنل چیف آرگنائزر:۔ شیخ عبدالسلام۔ (آرگنائزر بھارتی مقبوضہ کشمیر) اسسٹنٹ چیف آرگنائزر:۔ صغیر احمد پاشا (آرگنائزر برطانیہ زون) اسسٹنٹ چیف آرگنائزر سعید میر (آرگنائزر یورپ زون) مرکزی پبلسٹی سیکرٹری:۔ ڈاکٹر تو قیر گیلانی۔ مرکزی سیکرٹری مالیات:۔ منظور احمد خان۔ کپواڑہ راولپنڈی۔

2۔ ممبران سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی۔

مرکزی عہدیداروں کے علاوہ سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کے موجودہ ممبر (2002ء اور بعد میں منتخب ہوئے) مندرجہ ذیل ہیں۔

چوہدری عبدالغفور، ساجد صدیقی، عبدالحمید بٹ، محمد اسلم ملک، قاری محمد نصیر، عابد ایوب ایڈوکیٹ، حافظ انور سماوی، سردار شعیب، خواجہ سیف الدین، مظفر بٹ، محمد اقبال خان، عبدالشکور عابد گلگتی، سردار انور، راجہ حاکم منہاس، سردار جاوید حنیف، راجہ ظفر خان، سردار صابر گل (چیئر مین سٹوڈنٹس لبریشن فرنٹ) ، چوہدری یاسر ممتاز (قائم مقام چیئر مین ایس ایل ایف)، سردار محفوظ طاہر۔ (سیکرٹری جنرل ایس ایل ایف)۔

3۔ ممبران پالیسی پلاننگ کمیٹی۔

سربراہ سردار خادم حسین۔ سیکرٹری راجہ ندیم یعقوب (ممبران) ایس ایم افضل (سینئر وائس چیئر مین) سردار صغیر ایڈوکیٹ (سیکرٹری جنرل) عبدالحمید بٹ (سربراہ عسکری شعبہ) راجہ حق نواز (چیف آرگنائزر) راجہ ظفر خان (انچارج سفارتی شعبہ) حافظ انور سماوی (انچارج سیاسی شعبہ) ڈاکٹر تو قیر گیلانی (مرکزی پبلسٹی سیکرٹری) منظور احمد خان (سیکرٹری مالیات) یاسر ممتاز چوہدری (قائم مقام چیئر مین ایس ایل ایف)

4- علاقائی تنظیمیں :

(ا) بھارتی مقبوضہ کشمیر کی تنظیم۔

مارچ 1996ء کے اواخر میں بھارتی سفاکوں کے ہاتھوں وادیٔ کشمیر میں لبریشن فرنٹ کی سیاسی اور عسکری قیادت کے قتل عام کے بعد تنظیم کو دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے نہیں دیا گیا اور اس کار خیر میں بھارتی حکومت، اے پی ایچ سی، یاسین ملک گروپ اور پاکستان کی آئی ایس آئی نے ایک دوسرے کی بالواسطہ طور پر مدد کی جس میں کچھ اور عوامل بھی شامل ہوئے۔ چنانچہ وہاں تنظیم ابھی تک مطلوبہ سطح پر منظم نہیں ہو سکی ہے۔ امید ہے یہ انتہائی اہم کمی جلد پوری ہو جائے گی۔

(ب) برطانیہ زون کے عہدہ دار اور ممبران ایگزیکٹو کمیٹی مندرجہ ذیل ہیں۔

عہدہ داران :۔ صدر خان فاروق جنرل سیکرٹری محمود حسین، سینئر نائب صدر ملک مشتاق نائب صدر راجہ رؤف خان، آرگنائزر محمد صغیر پاشا ڈپٹی آرگنائزر چوہدری محمد اقبال، جوائنٹ سیکرٹری محمد ریاض اسسٹنٹ سیکرٹری جاوید رشید، پبلسٹی سیکرٹری محمد عاصم خزانچی صنوبر حسین

ممبران زونل ایگزیکٹو کونسل :۔ ظفر خان لیوٹن، ملک لطیف لیچھورتھ، ظفر شریف لندن، چوہدری محمد اقبال بیڈ فورڈ، ظفر خان جونیئر لیوٹن، محمد حنیف لیوٹن، ملک شاہنواز لیوٹن، ملک لیاقت سلاؤ۔

(ج) یورپ زون :

عہدہ دار:۔ صدر ملک مشتاق پاشا، (فرانس)۔ سینئر نائب صدر دیوان مشتاق، (بیلجیم)۔ نائب صدر ارشاد حسین بخاری، (ہالینڈ)۔ جنرل سیکرٹری کبیر احمد، (بیلجیئم)۔ جوائنٹ سیکرٹری خلیل قیصر (ہالینڈ)۔ اسسٹنٹ سیکرٹری تنویر چوہدری، (فن لینڈ)۔ پبلسٹی سیکرٹری اختر مغل فنانس سیکرٹری محمد شریف، آرگنائزر سعید میر۔ (فرانس)۔

ایگزیکٹو کمیٹی:۔ شبیر احمد، عتیق احمد خان، عمران بٹ، ملک لطیف، محمد فاروق، جمیل اشرف، ماجد حسین، محمد نعیم

خان، ڈاکٹر عارف، ڈاکٹر اشتیاق، زبیر حسین، محمد ایاز خان، محمد طارق خان، سردار مشتاق۔

(د) ہماری مشرقِ وسطےٰ اور امریکہ کی شاخوں کے صدر اور جنرل سیکرٹری مندرجہ ذیل اصحاب ہیں۔

(امریکہ)۔ صدر منظور احمد خان:۔ قائم مقام صدر امتیاز احمد خان، جنرل سیکرٹری سردار محمد حلیم، (الریاض):۔ صدر محمد رفیق بیگ، جنرل سیکرٹری محمد پرویز خان۔ (جدہ):۔ صدر عظمت حسین، جنرل سیکرٹری _____ (دہران):۔ صدر انجینئر نذاکت حسین جنرل سیکرٹری سردار عثمان خان۔ (خمیس مشیط):۔ صدر ماسٹر شمیم حسین، جنرل سیکرٹری حبیب تبسم۔ (ابوظہبی):۔ صدر نیاز کاشمیری، جنرل سیکرٹری خورشید خان خورشید، (دوبئی):۔ صدر لیاقت خان جنرل سیکرٹری ماجد خان۔

(ر) یورپ زون میں ہماری شاخیں مندرجہ ذیل ممالک میں ہیں۔

(ہالینڈ):۔ صدر ارشاد بخاری، سیکرٹری راجہ حفیظ الرحمٰن۔ (بیلجیم):۔ صدر شبیر احمد، سیکرٹری عتیق احمد خان۔ (فرانس):۔ صدر محمد عمران بٹ، سیکرٹری ملک محمد لطیف۔ (جرمنی):۔ کنوینر سردار مشتاق۔ (ناروے):۔ صدر محمد فاضل مغل، سیکرٹری چوہدری محمد عجائب۔ (سویڈن):۔ کنوینر ڈاکٹر عارف چوہدری۔ (فن لینڈ):۔ صدر تنویر چوہدری سیکرٹری قاری مظہر۔ (سپین):۔ صدر ماجد حسین خان، جنرل سیکرٹری محمد نعیم خان۔ (اٹلی):۔ صدر محمد فاروق خان، سیکرٹری محمد جمیل اشرف۔

9۔ برطانیہ زون کی شاخوں کے صدر اور سیکرٹری:۔

(لندن):۔ صدر محمود اے فیض، سیکرٹری جابر حسین۔ (برمنگھم):۔ صدر محمد شبیر، سیکرٹری زاہد قریشی۔ (مانچسٹر):۔ صدر چوہدری محمد صابر، سیکرٹری چوہدری محمد اقبال۔ (لیوٹن):۔ صدر راجہ ظفر، (جونیئر) سیکرٹری چوہدری محمد یوسف۔ (سلاؤ):۔ صدر راجہ گل نواز، سیکرٹری چوہدری اعجاز۔ (بیڈفورڈ):۔ صدر محمد افضل، سیکرٹری محمد رفیق۔ (شیفلڈ):۔ کنوینر اے ایچ عاصم۔ (واسل):۔ کنوینر ارشد پرویز۔ (نارتھمپٹن):۔ کنوینر محمد شبیر۔ (سٹوک آن ٹرنٹ):۔ کنوینر افتخار احمد شاہ۔ (بریڈفورڈ):۔ کنوینر چوہدری ناصر۔ (یارموتھ):۔ کنوینر علی اصغر۔ (ووسٹر):۔ کنوینر تنویر لون۔

10۔ ہماری آزاد کشمیر گلگت بلتستان اور پاکستان کی ضلعی شاخوں کے صدر اور سیکرٹری مندرجہ ذیل اصحاب ہیں۔

(مظفر آباد):۔ صدر سیف الدین چک، سیکرٹری مظفر بٹ۔ (باغ):۔ صدر رشید صابر سیکرٹری سردار محمد امین۔ (پونچھ):۔ صدر سردار عبدالحمید خان سیکرٹری۔ خلیل کشمیری۔ (تازہ انتخاب میں صدر عابد ایوب ایڈووکیٹ اور سیکرٹری حافظ ممتاز منتخب ہوئے ہیں)۔ (کوٹلی):۔ کنوینر مسعود الٰہی سیکرٹری عتیق الرحمٰن ہاشمی۔ (میرپور):۔ صدر عجائب سکندر سیکرٹری عامر شہزاد۔ (بھمبر):۔ صدر چوہدری عبدالغفور۔ (گلگت):۔ صدر ضیاء الحق سیکرٹری عمران میر۔ (شمالی پنجاب ڈویژن):۔ صدر طاہر ایوب ایڈووکیٹ۔ (جنوبی پنجاب ڈویژن):۔ صدر فیصل ناز کی سیکرٹری سردار انور۔ (سندھ ڈویژن):۔ صدر سردار جاوید حنیف سیکرٹری سردار ارشد محمود۔ (بلوچستان ڈویژن):۔ صدر سردار اسلم کشمیری۔ سیکرٹری محمود اختر۔



1993ء میں اپنے کچھ تنظیمی ساتھیوں کے ساتھ







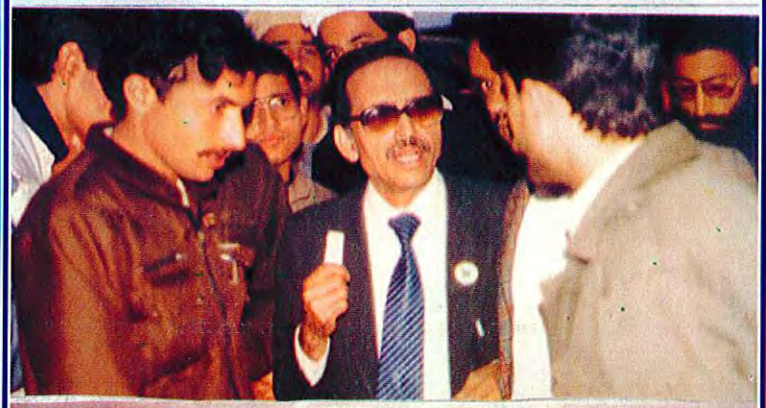
ایس ایل ایف کے 1990ء 1995ء اور 1998ء میں منتخب ہوئے مرکزی عہدہ دار حلف اٹھا رہے ہیں۔

مسلسل جہد جلد دوم

تحریک آزادی میں گرم حصہ لینے والی لبریشن فرنٹ کی خواتین ممبران سے کچھ (پہلی صف) بیگم اشرف وانی، بیگم راجہ مظفر خان اور دیگر (دوسری صف)

صابرہ سلطانہ، زاہدہ مظفر، یاسمین سلیم (تیسری صف) میری تنظیم میں گرفتاری کے خلاف نعرے لگاتے ہوئے (چوتھی صف) آزاد کشمیر یونیورسٹی کی طالبات







(اوپر) ایس ایل ایف کے ممبروں کے ساتھ (درمیان) رؤف کشمیری (جو 1991ء سے بھارتی جیل میں ہے) کے ساتھ 1990ء میں۔
(نیچے) سابق صدر آزاد کشمیر جنرل حیات خان اوران کے عزیز کے ساتھ 110 منزلہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر نیویارک کی چھت پر نومبر 1989ء

یہ تھے لبریشن فرنٹ کے سابقہ اور موجودہ مرکزی عہدیداروں کے علاوہ زونل، ڈیژنل اور ضلعی سطح کی شاخوں کے موجودہ صدور اور سیکرٹری۔ مجھے افسوس ہے کہ کتاب کی اس جلد میں میں بوجوہ ان تمام احباب کے نام شامل نہیں کر سکا ہوں جن کی نظریئے، تحریک اور تنظیم کیلئے خدمات قابلِ ذکر ہیں۔ انشاءاللہ کتاب کی تیسری جلد میں ان سب اصحاب کے نام "کاروانِ آزادی میں میرے ہمسفر" کے عنوان کے تحت شامل ہونگے۔

5 ذیلی تنظیمیں۔

دور جدید میں تنظیموں اور اداروں کی کارکردگی کو زیادہ موثر اور نتیجہ خیز بنانے کے لئے انہیں کام کی نوعیت کی بنیاد پر مختلف حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ لبریشن فرنٹ میں یہ تقسیم دو طرح کی ہے۔ ایک تقسیم مرکزی تنظیم کی اعلیٰ ترین اختیارات کی حامل دو کمیٹیوں (یعنی سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی اور پالیسی پلاننگ کمیٹی) اور سنٹرل کمیٹی کی متذکرہ بالا مزید چھ سب کمیٹیوں (شعبوں) میں تقسیم ہے ان میں سے ہر کمیٹی اپنے شعبے کی کارکردگی کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ تنظیم کی دوسری طرز کی تقسیم اس کی تین ذیلی تنظیموں یعنی طلباء ونگ۔ عسکری ونگ اور خواتین ونگ کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ طلباء ونگ جموں کشمیر سٹوڈنٹ لبریشن فرنٹ JKSLF یا صرف SLF کہلاتا ہے۔ عسکری ونگ نیشنل لبریشن آرمی (NLA) کہلاتا ہے جبکہ خواتین کا شعبہ، شعبہ خواتین ہی کہلاتا ہے۔ ایس ایل ایف کی الگ پہچان کیلئے لبریشن فرنٹ کے پرچم کے سفید حصے میں سبز ستارے کا اضافہ کیا گیا ہے۔ این ایل اے پرچم کے ساتھ مشعل آزادی بھی ہوتی ہے جبکہ خواتین ونگ مرکزی پرچم ہی استعمال کرتا رہا ہے۔ آیئے اب تینوں شعبوں کے بارے میں ذرا تفصیل میں جائیں۔

(الف) سٹوڈنٹس لبریشن فرنٹ (SLF)

جموں کشمیر سٹوڈنٹس لبریشن فرنٹ (SLF) میں نے 17 اپریل 1987ء کو کراچی میں قائم کیا۔ اس کے پہلے کنوینر حمید طاہر اور سیکرٹری شاہ محمد تبسم تھے۔ اپنے قیام کے ایک ماہ بعد ہی ایس ایل ایف نے بھارتی قونصلیٹ کراچی پر ایک زبردست احتجاجی مظاہرہ کیا جس پر پولیس نے لاٹھی چارج کیا اور آنسو گیس استعمال کرنے کے علاوہ دو درجن بھر ممبروں کو گرفتار کیا۔ اکتوبر 1987ء میں میں نے اپنے دورہ آزاد کشمیر کے دوران میرپور میں سارے آزاد کشمیر کے لئے ایس ایل ایف کی تنظیم قائم کی۔ اکتوبر 1989ء میں ایس ایل ایف نے آزاد کشمیر کے تمام شہروں میں بھارتی مقبوضہ کشمیر میں ہونے والے بھارتی فوج کے مظالم کے خلاف مظاہرے کئے۔ 17 اور 22 مئی 1989ء کو ایس ایل ایف نے گلگت بلتستان کے عوام کے آئینی حقوق کے لئے کراچی میں بڑا مظاہرہ کیا۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ بھارتی مقبوضہ کشمیر کے ہلال بیگ شہید کی سربراہی

میں مقبوضہ کشمیر میں بھی ایس ایل ایف قائم ہوا تھا جس کا پس منظر یہ تھا کہ ہلال بیگ کی یاسین ملک اور اس کے ساتھیوں سے نہیں بنتی تھی اور وہ ایک ساتھ کام کرنے کے لئے تیار نہیں تھے چنانچہ راجہ مظفر نے 1989ء کے اواخر میں میری غیر حاضری میں (میں امریکہ گیا تھا) ہلال بیگ کو بھارتی مقبوضہ کشمیر کیلئے ایس ایل ایف کا سربراہ بنادیا۔ ہلال بیگ ایک نیم خواندہ نوجوان تھا۔ اس نے مبینہ طور پر کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر مشیر الحق اور ایک بھارتی ہندو صنعتکار کو اغوا کر کے قتل کرا دیا تھا جس سے لبریشن فرنٹ کیلئے قومی اور عالمی سطح پر شدید مشکلات پیدا ہوگئیں جن میں میرے امریکی ویزے کی منسوخی بھی شامل تھی۔ ہم نے ہلال بیگ سے تنظیم کے فیصلوں اور پالیسی کے منافی ان اقدامات کے بارے میں باز پرس کی تو اس نے ہم سے علیحدگی اختیار کر کے اپنے گروپ کا نام اخوان المسلمون رکھا چنانچہ ہمارا اس سے رابطہ ہی ختم ہوگیا اور مقبوضہ کشمیر میں ایس ایل ایف تقریباً منجمد ہوگیا۔

آزاد کشمیر میں ایس ایل ایف کے نوجوانوں نے قومی آزادی کے حصول کیلئے عسکری جدوجہد میں بھرپور حصہ لیا۔ آزاد کشمیر میں یہ طرہ امتیاز ایس ایل ایف کو ہی حاصل ہے کہ اس نے اپنی تنظیمی حیثیت میں مسلح جدوجہد آزادی میں عملی حصہ لیا جس کے نتیجہ میں آزاد کشمیر سے تعلق رکھنے والے اس کے اہم رکن چوہدری جمیل آف تراڑکھل، سردار افتخار احمد اور محمد سلیم آف راولاکوٹ، سردار اقبال آف عباسپور، شمریز شاد اور خورشید حسرت آف باغ مسلح جدوجہد آزادی کے دوران مقبوضہ کشمیر میں شہید ہوگئے۔ 1992ء میں جب لبریشن فرنٹ نے جنگ بندی لائن کو اعلانیہ، اجتماعی اور غیر مسلح طور پر عبور کرنے کی کوشش کی تو پاکستانی فوج کی فائرنگ سے ایس ایل ایف کے راجہ سجاد، مشتاق راٹھور، اشتیاق احمد اور آزاد علی کھوکھر شہید ہوگئے۔ اسکے علاوہ ایس ایل ایف کے سابق چیئرمین پرویز مرزا نے مقبوضہ کشمیر میں پونے چار سال کی قید کاٹی جبکہ راجہ طارق کوٹلی، راجہ مظہر آف کسگمہ بھمبر، رفاقت ہاشمی باغ، سرفراز کٹاریہ کوٹلی اور ساجد بخاری کوٹلی اب بھی بھارت اور بھارتی مقبوضہ کشمیر کی جیلوں میں ہیں اور ان میں سے تقریباً ہر ایک دس سال سے زیادہ مدت کی قید کاٹ چکا ہے۔ طاہر مبین آف حویلی دوران عسکری تربیت شہید ہوا جبکہ ایس ایل ایف کے سابق جنرل سیکرٹری زاہد حبیب شیخ آف مظفر آباد، طاہر حمید آف پونچھ اور ساجد صدیقی آف بھمبر مدت تک مقبوضہ کشمیر میں بھارتی فوج سے برسرپیکار رہ کر واپس آگئے۔

ایس ایل ایف اپنی مادر تنظیم جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کے ساتھ اس کے ہر پروگرام میں شانہ بشانہ رہا ہے۔ 1992ء اور 1999ء میں لبریشن فرنٹ کی طرف سے جنگ بندی لائن عبور کرنے کی چاروں کوششوں میں ایس ایل ایف نے ہراول دستے کا کردار ادا کیا اور اس دوران اس کے ممبر شہید اور زخمی ہوگئے۔ لبریشن فرنٹ کے بھارتی مقبوضہ کشمیر زون کے صدر شبیر صدیقی اور انکے 26 ساتھیوں کی بھارتی فوج کے ہاتھوں شہادت کے خلاف اسلام آباد میں بھارتی سفارتخانے پر ہمارے تاریخی مظاہرے پر لاٹھی چارج، آنسو گیس اور فائرنگ کے بعد تنظیم کے 52 افراد گرفتار ہوئے جن میں سے ایک بڑی تعداد ایس ایل ایف کے ممبروں کی تھی جو تقریباً دو ہفتے راولپنڈی کی اڈیالہ جیل میں قید رہے۔ ایس ایل ایف

نے ہر مناسب موقعے پر خود بھی اقدامات کیے۔ پاکستان ٹیلی ویژن نے گلگت بلتستان کو پاکستان کا حصہ دکھانا شروع کیا تو ایس ایل ایف کے نوجوان 13 دسمبر 1996ء کو پاکستان ٹیلی ویژن کے اسلام آباد، پشاور، لاہور، کوئٹہ اور کراچی سٹیشنوں کی عمارتوں پر چڑھ دوڑے اور انکے سامنے پی ٹی وی کے ماڈل کو نذر آتش کر دیا۔

ایس ایل ایف کو آزاد کشمیر کی طلبا برادری میں بھی ایک امتیازی مقام حاصل ہے چنانچہ آزاد کشمیر کی طلبا تنظیموں کے اتحاد (جموں کشمیر متحدہ طلبا محاذ) نے گذشتہ نو سالوں کے دوران اپنی صدارت کی مسند پر دوبار ایس ایل ایف کے نمائندوں (سردار انور اقبال اور ڈاکٹر توقیر گیلانی) کو منتخب کیا۔

ایس ایل ایف کے مخلص، محبِ وطن، محنتی اور جذبہ ایثار و قربانی سے سرشار نوجوان لبریشن فرنٹ کے ہی نہیں پوری کشمیری قوم کا ایک بے بہا سرمایہ ہیں چنانچہ جب میں یہ کہتا ہوں کہ ایس ایل ایف میری پیاری تنظیم ہے تو میں کسی قسم کی غلط بیانی یا مبالغہ آرائی نہیں کرتا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مجھے ایس ایل ایف کا نظریاتی سربراہ اور آئینی سرپرست ہونے پر فخر ہے۔ میں ایس ایل ایف کے نوجوانوں کا مشکور ہوں کہ انہوں نے مجھے ہمیشہ پدرانہ احترام دیا اور ہر جائز ہدایت اور مشورے پر آنکھیں بند کر کے عمل کیا۔ اگرچہ نوجوانوں کی اکثر تنظیموں کے برعکس ایس ایل ایف میں نظریاتی اور تنظیمی نظم و نسق کہیں بہتر رہا ہے اسکے باوجود چند نازک مرحلوں پر ایس ایل ایف کے کچھ کوتاہ اندیش نوجوانوں نے دوسروں کی باتوں میں آ کر تنظیم سے علیحدگی اختیار کی۔ بہرحال ہمیں فخر ہے کہ نازک ترین مرحلوں اور انتہائی ناموافق حالات میں بھی ایس ایل ایف کے ممبروں کی بھاری اکثریت پوری طرح ثابت قدم رہی۔ مجھے اس بات کی بھی خوشی ہے کہ تعلیم سے فارغ ہو کر عام زندگی اختیار کرنے کے بعد بھی ایس ایل ایف کے ممبروں کی اکثریت نے انتہائی نامساعد حالات، ماحول اور مخالف قوانین کے باوجود تنظیم کے نظریات سے وابستگی قائم رکھی۔ مجھے امید ہے کہ وہ آئندہ بھی ایسا ہی کرینگے۔

ایس ایل ایف کے اب تک کے مرکزی عہدیدار

جموں کشمیر سٹوڈنٹس لبریشن فرنٹ کے گذشتہ 17 سال کے دوران منتخب ہونے والے اہم مرکزی عہدیداروں کی فہرست مندرجہ ذیل ہے ان میں سے کچھ عہدیدار کسی نہ کسی مرحلے پر تنظیم سے الگ ہو گئے جنکی فہرست آخر میں دی گئی ہے۔

1- چیئرمین۔ حمید طاہر (پہلا کنوینئر) ساجد حمید ناز، عابد شاہین، وجاہت عزیز، مسعود الرحمٰن، پرویز مرزا، جمشید مرزا، توقیر گیلانی، صابر گل اور قائم مقام یاسر ممتاز چوہدری اور نور منتخب چیئرمین راجہ مظہر اقبال

2- سینئر وائس چیئرمین۔ حمید طاہر، ریاض ساغر، پرویز مرزا، توقیر گیلانی، وسیم کاشر، راجہ ندیم یعقوب، یاسر ممتاز۔ اشفاق قمر۔

3- وائس چیئر مین۔ عابد شاہین، شکیل چوہدری، جمشید مرزا، اشتیاق افضل، افضال سلہریا، اشفاق قمر اور عبدالشکور۔

4- سیکرٹری جنرل۔ شاہ محمد تبسم۔ (پہلا سیکرٹری) نسیم اقبال، آفتاب چوہدری، طارق بٹ، ظفر اقبال، سردار شعیب، سردار انور، ذوالفقار حیدر راجہ، سردار صابر گل، عمر نذیر کشمیری، سردار محفوظ طاہر۔

5- ڈپٹی سیکرٹری جنرل۔ شاہ محمد تبسم، مختار راجہ، عارف شیر باز، ممتاز کاشمیری، عظمت خان، راجہ مظہر، عبدالغفور بٹ۔

6- اسسٹنٹ سیکرٹری جنرل۔ الیاس کشمیری، سردار عبدالرحمٰن، جمشید مرزا، یونس صدیق، اشتیاق خالق، سردار عابد، شاہین کشمیری، ناظم راجہ، راجہ سکندر۔

7- سیکرٹری اطلاعات۔ ظفر اقبال، عرفات قادری، عمر نذیر، ذوالفقار حیدر راجہ، سردار محفوظ طاہر، عبدالرحمٰن ساقی، یاسر نوید، شہریار خان۔

8- چیف آرگنائزر۔ محمد ارشاد خان، اسرار الحق منہاس، توقیر گیلانی، وسیم کاشر، وقار احمد، یاسر ممتاز، راجہ مظہر، افضال سلہریا۔

9- ڈپٹی چیف آرگنائزر۔ طاہر مسعود چغتائی، کاظم شاہ، میر افضال سلہریا، راجہ آزاد سہیل، تنویر ملک۔

10- سیکرٹری مالیات۔ آزاد انقلابی، کاظم شاہ، راجہ اظہر محمود، راجہ سکندر خان، راجہ ممتاز کشمیری، سردار شعیب، امتیاز کھوکھر، راجہ امتیاز۔

نوٹ۔ مندرجہ بالا عہدیداروں میں سے ساجد حمید ناز۔ عابد شاہین۔ نسیم اقبال۔ آفتاب چوہدری۔ ظفر اقبال۔ محمد ارشاد خان۔ عظمت خان۔ الیاس کاشمیری اور آزاد انقلابی نے مختلف مرحلوں پر تنظیم سے علیحدگی اختیار کی۔

دسمبر 2003ء میں صاحبزادہ محمد رفیع۔ یاسر کشمیری۔ سردار ایاز۔ راجہ سکندر۔ عبدالشکور چوہدری۔ گلشن صالح۔ انجینئر رفاقت۔ ارباب حسین۔ اشتیاق افضل۔ افضال سلہریا۔ راجہ آزاد سہیل۔ اور عثمان نذیر ایس ایل ایف کی سنٹرل کمیٹی کے ممبر منتخب ہوئے۔

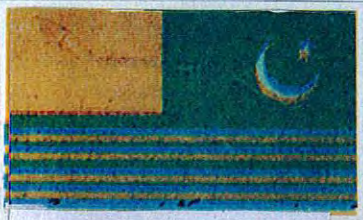
ایس ایل ایف کے موجودہ ضلعی صدور اور جنرل سیکرٹری مندرجہ ذیل ہیں

میرپور	صدر علی اصغر چوہدری	جنرل سیکرٹری زبیر حسین
کوٹلی	صدر سجاد وستی	جنرل سیکرٹری مدثر شاہ
پونچھ	قائم مقام صدر کمال اصغر	جنرل سیکرٹری منیر صابر
باغ	صدر عمران کاشر	جنرل سیکرٹری طفیل کشمیری
مظفر آباد	صدر راجہ شاہد قیوم	جنرل سیکرٹری بابر اعوان

کشمیر کے مختلف ادوار کے پرچم



بھارتی مقبوضہ کشمیر 1947ء تا حال



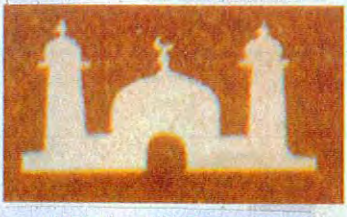
آزاد کشمیر 1947ء تا حال



ڈوگرہ راج 1846ء تا 1947ء



سکھ دور 1819ء تا 1846ء



افغان دور 1752ء تا 1819ء



مغل دور 1586ء تا 1752ء



خود مختار ہندو دور 560ء تا 1339ء



خود مختار مسلم دور 1339ء تا 1586ء

گلگت سٹی	صدر رضوان سعید	جنرل سیکرٹری آصف کیکاوس
قراقرم یونیورسٹی	صدر عالم زیب	جنرل سیکرٹری راشد ولی
راولپنڈی	صدر احسن اسحاق	جنرل سیکرٹری دانیال جنت
لاہور	صدر عامر خان	جنرل سیکرٹری مسعود حنیف
بلوچستان	صدر سلمان احمد	جنرل سیکرٹری شاہد عزیز
سندھ	صدر عاصم بیگ	جنرل سیکرٹری جہانگیر مرزا

ہر انسان کی طرح مجھے بھی جلد یا بدیر مرنا ہے میری دعا ہے، خواہش ہے اور امید بھی ہے کہ ایس ایل ایف یعنی میری نظریاتی اولاد میری عملی اور جسمانی شفقت سے محروم ہو جانے کے بعد بھی اپنے قومی اور نظریاتی فرائض (وطن عزیز کی مکمل خود مختاری کیلئے جہدِ مسلسل اور اسکے حصول کے بعد اسے ایک مثالی، فلاحی، خوشحال، خوددار اور ترقی پسند مملکت بنانا) بطریق احسن انجام دیتی رہے گی۔ میری دعا یہ بھی ہے کہ میرے یہ عزیز (ایس ایل ایف کے سابقہ موجودہ اور آئندہ کے ممبر) قومی فرائض انجام دینے کے علاوہ ذاتی حیثیت میں بھی معاشرے میں اعلیٰ اور معزز مقام حاصل کریں۔ آمین۔

(ب) لبریشن فرنٹ کا عسکری شعبہ این ایل اے

اگرچہ تنظیم اور تحریک کے ارفعہ تر تقاضوں کے پیش نظر ہم نے وقتی اور مشروط طور پر عسکریت کو تحریک کی ترجیحات میں آخری پوزیشن دیدی ہے لیکن اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی کے نیم مردہ جسموں میں ہماری طرف سے شروع کی گئی مسلح جدوجہد آزادی نے ہی نئی روح پھونک دی۔ اس مسلح جدوجہد کی تفصیلات متعلقہ باب میں تفصیل سے درج ہیں۔

ہم نے تحریک کے تقاضے کے تحت 1999ء میں تنظیم کے عسکری معاملات کیلئے الگ سے ایک ذیلی تنظیم یعنی نیشنل لبریشن آرمی (این ایل اے) قائم کی اور عسکریت سے متعلق تمام معاملات کو تنظیم کی پالیسی پلاننگ کمیٹی کے زیر نگرانی این ایل اے کی تحویل میں دیا۔ این ایل اے کی سرگرمیوں میں شہدا اور اسیروں کے علاوہ جن اصحاب نے سرگرم حصہ لیا ان میں کمانڈر فاروق خان اور سردار افتخار منگ سدھنوتی، راجہ حق نواز سہنسہ کوٹلی، عبدالحمید بٹ میر پور، ساجد صدیقی سماہنی بھمبر، سردار نسیم بلوچ سدھنوتی، ذیشان تیتری نوٹ پونچھ، محمد اشفاق تیتری نوٹ پونچھ، محمد سلیم شہباز سہنسہ کوٹلی، خورشید مرزا ریڑہ باغ، سلیم بٹ ریڑہ باغ، محمد امین ریڑہ باغ، ساجد کشمیری کوٹلی، حنیف بیگ کوٹلی، راقب کشمیری میر پور، ذوالفقار گوئی کوٹلی، عبدالواحد گوئی کوٹلی، نثار نقوی سیڑہ پونچھ، جاوید پونچھی حال مظفر آباد، ڈاکٹر حبیب انور چڑھوئی کوٹلی، مقصود

شاہ میر پور، مظہر چوہدری کوٹلی، محمد بشیر مقبوضہ پونچھ، محمد آزاد مقبوضہ پونچھ، حاجی حنیف مقبوضہ پونچھ، راجہ اظہر کوٹلی، قاری تنویر سہنسہ کوٹلی، انصر مرزا سہنسہ کوٹلی، علی اصغر شاہ پونچھ، شمس کاشمیری چھنی کوٹلی، راحیل بیگ ناڑ کوٹلی، عنصر محمود، نوید اختر کوٹلی، شاہد محمود پلندری، سجاد احمد بلوچ سدھنوتی، فراز احمد، شیراز احمد، ظفر کشمیری، خضر حیات گوئی کوٹلی، واحد کشمیری گوئی کوٹلی، ابوبکر دھیر کوٹ، یاسین مغل کوٹلی، امتیاز احمد لون اوڑی شامل ہیں۔ مقبوضہ کشمیر سے تعلق رکھنے والے شہیدوں اور حریت پسندوں اور آزاد کشمیر کے باقی ماندہ حریت پسندوں کے نام کتاب کی تیسری جلد میں شامل ہونگے۔

(ج) ہمارا خواتین ونگ

اکثر تحاریک آزادی میں خواتین براہ راست بھی اور حریت پسند مردوں کی ماؤں، بیویوں، بہنوں اور بیٹیوں کی حیثیت سے بالواسطہ طور پر بھی اہم کردار ادا کرتی رہی ہیں۔ بھارتی مقبوضہ کشمیر میں خواتین نے دونوں حیثیتوں میں کام کیا اور قربانیاں دیں۔ 1988ء کے بعد کئی سال تک سرینگر کا خواتین مرکز بختاور آپا کی سرکردگی میں خاصا سرگرم رہا۔

ادھر آزاد کشمیر میں لبریشن فرنٹ کا خواتین ونگ باقاعدگی سے کام کرتا رہا لبریشن فرنٹ کے ہر جلسے میں خاص کر مظفر آباد، میر پور، کوٹلی اور راولپنڈی میں ہماری خواتین ممبر ہر سیاسی سرگرمی میں حصہ لیتی رہیں۔ فروری 1992ء میں جنگ بندی لائن عبور کرنے کی کوشش کے دوران سینکڑوں خواتین آزاد کشمیر اور پاکستان کے مختلف علاقوں سے مظفر آباد پہنچیں۔ 11 فروری کو سینکڑوں خواتین نے مظفر آباد سے چناری تک کا طویل سفر پیدل طے کیا اور دوسرے دن کے جلسے کے بعد چکوٹھی کی طرف روانہ ہونے لگیں تھی، لیکن میرے سختی سے منع کرنے پر وہاں ہی رک گئیں لیکن ایک گھنٹے کے بعد جب جنگ بندی لائن کی طرف جانے والے جلوس پر آنسو گیس استعمال کی گئی اور خواتین کو کسی طرح اس کا علم ہو گیا تو انہوں نے اپنے دوپٹے اور پانی آگے بھیج دیا تاکہ ہم آنسو گیس کا مقابلہ کر سکیں۔ 1993ء میں بیلجیئم میں میری گرفتاری پر خواتین نے راولپنڈی میں بھوک ہڑتال کی اور جلوس میں شامل ہو کر پولیس کے ڈنڈے بھی کھائے۔

ہمارا خواتین ونگ 1999ء کے بعد خاصا سست پڑ گیا ہے کیونکہ سرگرم خواتین میں سے کچھ ملک سے باہر چلی گئیں اور کچھ کی شادی ہو گئی اور نئے ماحول میں وہ سرگرمیاں جاری نہ رکھ سکیں اور کچھ ویسے ہی تنظیم اور تحریک سے لاتعلق ہو گئیں۔ جن خواتین نے ہمارے خواتین ونگ میں اہم کردار ادا کیا ان میں بیگم راجہ مظفر، نادیہ اشرف، طاہرہ پیرزادہ، روبینہ بشیر، رخسانہ وانی، فرحت بدر، صابرہ سلطانہ، عذرا یعقوب، عائشہ گل، زرقا میر، شاہدہ بٹ، رابعہ سلہریا، شاہدہ وانی، بنت ستار مجاہد، عذرا بٹ، خالدہ بھٹی، نگہت شمس، مسز حیات لون، بیگم عبدالاحد کنٹھ، بیگم شیریں تاج، بیگم خواجہ فتح محمد، بیگم حنیفہ احد، رضیہ بٹ، مسرت، زاہدہ میر، گلناز ڈار، رخشندہ، باجی شمیم، بیگم بشیر مغل، بلقیس منہاس، صفیہ رفیقی، رابعہ مظفر،

شکیلہ بٹ، سلیمہ بٹ، بیگمات و دختران غلام احمد بٹ، فرح شیخ، امتیاز اظہر، نادیہ غنی، شازیہ ناز کی، مسز شاہین سلیم، مسز حمید، ریحانہ کنول، یاسمین قاسم، ثمینہ کوثر، روبینہ کوثر، بلقیس بیگم، شازیہ اشرف، مسز عذرا اسلم، روبینہ اشرف، سفیرہ بیگم، پروین اختر، رخسانہ صادق، عذرا پروین کا کردار نا قابل فراموش ہے۔ راولپنڈی سے نثار یاض خان، شازیہ رفیق خان، کنول خان، فوزیہ منظور، نازیہ خان اور شائستہ عزیز بھی کچھ مدت خاصی سرگرم رہیں۔ ان کا تعلق پونچھ سے ہے اور یہ راولپنڈی میں رہائش پذیر ہیں۔ ڈاکٹر فاروق حیدر کی اہلیہ اور بیٹوں بیٹیوں نے کئی سال تک بالواسطہ طور پر تحریک کو بڑی تقویت پہنچائی۔ میری اہلیہ اور بیٹی نے بھی تحریک اور تنظیم کو بالواسطہ طور پر تقویت پہنچائی جسکا سرسری سا ذکر ''میری گھریلو زندگی'' کے عنوان کے تحت ہے۔

یہ تھا جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کے نظریات و اغراض و مقاصد، اسکی تنظیمی ساخت، ذیلی تنظیموں اور ان کی اب تک کی کارکردگی اور اب تک کے عہدہ داروں کا مختصر سا تذکرہ جے کے ایل ایف اور اسکی ذیلی تنظیموں ایس ایل ایف، این ایل اے اور خواتین ونگ سے متعلق جملہ سرگرم افراد کا تذکرہ انشاءاللہ کتاب کی تیسری جلد میں ''کاروان آزادی میں میرے ہمسفر'' کے عنوان کے تحت ہوگا۔

6 تنظیم سے علیٰحدگیاں

بھارت، پاکستان اور کشمیر میں بڑی اور اہم تنظیموں میں اکثر توڑ پھوڑ ہوتی رہتی ہے۔ اس توڑ پھوڑ کی وجہ تنظیم کے سربراہ کا آمرانہ رویہ، دوسری صف کی قیادت یا افراد کا سربراہ یا پوری قیادت سے ذاتی، اصولی یا نظریاتی اختلاف، تنظیم کے اہم راہنماؤں کے مابین علاقائی، نسلی یا فرقہ وارانہ بنیادوں پر اختلاف، تنظیم کی پالیسی سے اختلاف، یا اکثر صورتوں میں انفرادیت یا لیڈری کا شوق، دوسری یا تیسری صف کے راہنماؤں کو مرکز سے بغاوت کرنے پر مجبور کرتا یا آخری وجہ کی صورت میں اُکساتا ہے۔ دور جدید میں بیرونی طاقتیں بھی تنظیموں کی قیادت میں نفاق ڈالتی ہیں۔

جموں کشمیر لبریشن فرنٹ میں اس کے قیام (1977ء) سے آج 2004ء تک نصف درجن بھر بار مرکزی عہدہ داروں کی علیحدگیاں ہوئی ہیں۔ سب سے پہلی علیحدگی 1982ء میں ہوئی۔ اس وقت تک تنظیم عملاً یورپ اور امریکہ تک محدود تھی۔ جب میرپور کی ایک برادری سے تعلق رکھنے والے ممبروں کی اکثریت نے مرکز سے بغاوت کر کے تنظیم کے سابق صدر عبدالجبار صاحب کی قیادت میں میرے خلاف بغاوت کر کے متوازی گروپ قائم کیا۔ یہ گروپ کچھ مدت تک میرے خلاف زہریلے اخباری بیانات کی بنیاد پر زندہ رہا۔ آخر ایک اور تنظیم میں ضم ہو کر ختم ہو گیا۔ تنظیم میں دوسری علیحدگی 1990ء میں ہوئی جب میری طرف سے عارضی حکومت خودمختار ریاست جموں کشمیر کے قیام کا اعلان ہوا۔ میرے اس اعلان سے کچھ احباب آئی ایس آئی کے دباؤ کے تحت، کچھ گرفتاریوں کے ڈر سے اور کچھ عارضی حکومت میں انہیں شامل نہ کرنے پر ناراضگی کی بناء پر تنظیم سے علیحدہ ہو گئے اور سب نے ملکر متوازی تنظیم کھڑی کی۔ ایسا

کرنے والوں میں سینئر وائس چیئر مین ڈاکٹر فاروق حیدر اور چیف آرگنائزر سردار رشید حسرت سرفہرست تھے۔ رشید حسرت صاحب کا مئی 1992ء میں انتقال ہوگیا اور ڈاکٹر فاروق حیدر جنوری 1992ء میں تنظیم میں واپس آ گئے۔ چنانچہ متوازی تنظیم سکڑ کر چند افراد تک محدود ہوگئی۔ ڈاکٹر فاروق حیدر کی واپسی بھی باغی تنظیم کے کچھ جذباتی اور انتہا پسند کارکنوں جن کی قیادت حافظ انور سماوی کر رہے تھے، کے ضلع باغ میں اٹھائے گئے انتہائی اقدام ''آپریشن ریڈ کراس'' جس کی عالمی سطح پر تشہیر ہوئی تھی، کے نتیجے میں ہوئی تھی۔ تنظیم میں تیسری علیحدگی 1993ء میں ہوئی جب برطانیہ میں مقیم تنظیم کے سابق سیکرٹری جنرل شبیر چوہدری کی قیادت میں ایک گروپ ۔ز تنظیم سے بغاوت کر کے الگ گروپ بنایا جو چند سال بعد یٰسین ملک گروپ میں ضم ہوگیا جہاں سے انہیں 2003ء میں خارج کیا گیا۔ غالباً 1996ء میں برطانیہ ہی میں مقیم چوہدری عبدالرحمٰن، چوہدری حنیف اور راسب کشمیری سمیت کچھ افراد تنظیم سے علیحدہ ہوگئے۔

1993ء سے ہی اطلاعات آ رہی تھیں کہ 1990ء میں گرفتار ہوئے مقبوضہ کشمیر کیلئے ہمارے ذوالفقار صدر محمد یٰسین ملک (جس کی صحت کے بارے میں ہم نے عالمی سطح پر مہم چلائی تھی) سے دہلی میں جیل اور ہسپتال میں بھارت کے کچھ اہم دانشور، صحافی اور انسانی حقوق کے علمبردار اور بھارت نواز کشمیری (خاص کر مسٹر کلدیپ نیئر اور مجید ترنبو) باقاعدگی سے ملاقات کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ مئی 1994ء میں رہا ہوئے اور رہا ہوتے ہی انہوں نے مسلح جدوجہد آزادی کو ختم کرنے کا اعلان کیا اور وہ بھی مرکز سے پوچھے بلکہ اطلاع تک دیئے بغیر اور حریت کانفرنس کے خلاف بھی محاذ کھڑا کیا۔ اس دوران اس نے بھوک ہڑتال کی اور کشمیری زعماء کی بار بار کی اپیل کے باوجود اسے توڑنے سے صاف انکار کیا آخر مشہور بھارتی صحافی کلدیپ نیئر کے کہنے پر اور اسکے ہاتھوں جوس کا گلاس پی کر بھوک ہڑتال توڑ دی جس کا بالواسطہ طور پر فائدہ بھارت کو ہوا۔ اس ساری صورتحال سے عوام میں یہ تاثر ابھرتا رہا کہ یٰسین ملک کی جیل سے رہائی اس شرط پر ہوئی تھی کہ وہ مسلح جدوجہد آزادی ختم کرانے کے علاوہ حریت کانفرنس کی ساکھ کو بھی مجروح کرے اور یٰسین ملک یہی شرط پوری کر رہا ہے۔ اس دوران یٰسین ملک مرکزی تنظیم کے ہر مشورے اور ہدایات سے انحراف کرتا رہا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے اپنے ساتھی جاوید میر پر انتہائی گھناؤنے الزام لگا کر اس کے خلاف اس کے مخالفین پر مشتمل تحقیقاتی کمیٹی قائم کی تھی۔ یٰسین ملک نے تنظیم کے ایک انتہائی قابل، مخلص اور اعلیٰ تعلیم یافتہ رکن تنظیم کے سابق ترجمان اور حریت کانفرنس میں تنظیم کے سابق نمائندے اور اس کی آئینی کمیٹی کے ممبر شبیر احمد صدیقی کو دیکھتے ہی گولی مار دینے کا حکم جاری کر دیا۔ دراصل یٰسین ملک جاوید میر کی متحرک شخصیت اور شبیر صدیقی کی قابلیت سے خائف تھا اور دونوں کو راستے سے ہٹانا چاہتا تھا۔

ادھر تنظیم کے بندوق بردار حریت پسندوں کی اکثریت یٰسین ملک کی متکبرانہ طبیعت، دوسروں سے تضحیک آمیز برتاؤ اور جنگ بندی کے اعلان کی وجہ سے نالاں تھی مرکز بھی اس کی طرف سے تنظیم کے آئین اور پالیسی سے مسلسل انحراف کی وجہ سے اس سے نالاں تھا اور اس بارے میں اپنے 30 جون 1995ء کے تفصیلی خط کے ذریعے اسے تنبیہہ کر چکا تھا۔ اگست 1995ء کے اجلاس میں سنٹرل کمیٹی نے

The News International Rawalpindi July 29, 1993

JKLF seeks world community's help to save life of Yasin Malik

APP

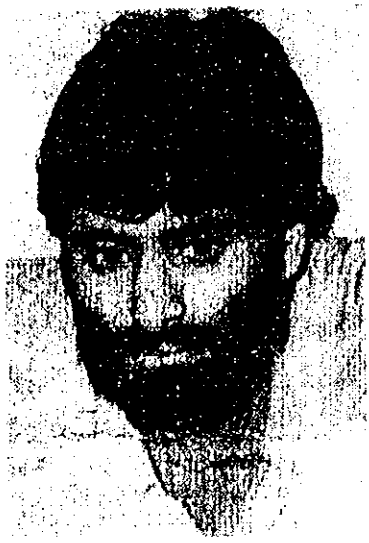
ISLAMABAD: The Jammu and Kashmir Liberation Front (JKLF) Wednesday appealed to international human rights organisations to help save the life of its leader Yasin Malik, who is seriously ill in a prison in New Delhi.

Chairman JKLF Amanullah Khan, in a letter to the organisations said that Yasin was arrested by Indian authorities on August 6, 1990 and was subjected to severe physical torture during interrogation.

Yasin, who is a heart patient and has undergone heart surgery some time back, now also suffers from facial paralysis. He even fell unconscious in a court of Jammu due to extreme weakness.

Amanullah in his letter said that since Yasin has refused to compromise on principles and his ideology of independence to Kashmir, the Indian government might get rid of him by denying him proper medical treatment.

The letter has been sent to the US President Clinton, Vice President Al Gore, Secretary of State Warren Christopher, Chairman Institute of Peace of United States, Chairman of US congressional committees on foreign affairs, human rights and for South Asia affairs., UN Secretary General Boutros Boutros Ghali, British Prime Minister John Major, British parliamentary committee on human rights committee, Lord Avebury, British parliamentary committee on Kashmir, the OIC secretary general Hamidul Ghabid, chairman international commission on human rights Geneva, chairmen, Amnesty International, Asia Watch and physicians for human rights and Kashmir Human Rights Foundation, Los Angeles.



Yasin Malik—unbowed

Amanullah Khan also spoke to concerned people at Amnesty International and Asia Watch on telephone about the matter and apprised them of his serious concern.

یاسین ملک کی جان بچانے کے لئے عالمی برادری سے میری اپیل

The News International Rawalpindi July 29, 1993

فیصلہ کیا کہ یٰسین ملک کو اس کے عہدے سے ہٹا کر اسکی جگہ کسی مناسب شخص کو مقبوضہ کشمیر کے لئے تنظیم کا سربراہ مقرر کیا جائے۔

اسی دوران غالباً 20 ستمبر 1995ء کو اچانک خبر آئی کہ ہمارے سینئر کمانڈر بشارت رضا نے ایک پریس کانفرنس کے ذریعے یٰسین ملک پر انتہائی سنگین الزامات عائد کر کے مقبوضہ کشمیر میں ہمارے عسکری شعبے کی سربراہی خود سنبھال لی اور شبیر احمد صدیقی نے اس کا ساتھ دیا۔ اچانک پیدا ہونے والی اس صورتحال نے میرے لئے مشکلات پیدا کیں۔ مرکز کے ساتھ یٰسین ملک کا رویہ پہلے سے ہی باغیانہ تھا اور اس کے راہ راست پر آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس نے مرکز کے تنبیہی خطوط کو یکسر نظر انداز کیا تھا۔ سنٹرل کمیٹی نے مجھے اسے اسکے عہدے سے ہٹانے کا اختیار بھی دے رکھا تھا چنانچہ خاصی سوچ و بچار اور کچھ ساتھیوں سے مشورے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ مجھے سنٹرل کمیٹی کی طرف سے ملے ہوئے اختیار کو بروئے کار لانا چاہیئے۔ چنانچہ میں نے یٰسین ملک کو مقبوضہ کشمیر زون کی صدارت سے ہٹا کر ان کی جگہ شبیر صدیقی کو زونل صدر مقرر کیا۔ میں نے نہ تو یٰسین ملک کو تنظیم سے نکالا تھا نہ ہی کسی دوسرے عہدہ دار کو اس کے عہدے سے ہٹایا تھا بلکہ دوسرے عہدہ داروں اور یٰسین ملک سے اپیل کی تھی کہ وہ شبیر صدیقی سے تعاون کریں لیکن شام کو بی بی سی ریڈیو کی اردو سروس نے خبر دی کہ امان اللہ خان نے یٰسین ملک کو تنظیم سے نکال دیا۔ میں نے فوراً بی بی سی کو لندن فون کر کے بتایا کہ یٰسین ملک کو تنظیم سے نہیں نکالا گیا صرف عہدے سے ہٹایا گیا ہے۔ اور رات ساڑھے دس بجے کی خبروں سے میری وضاحت نشر بھی ہوئی۔ لیکن یٰسین ملک اور ان کے ساتھیوں نے بی بی سی کی غلط خبر کا بہانہ بنا کر مرکز کے خلاف بغاوت کر کے یٰسین ملک کو تنظیم کا مرکزی چیئرمین بنانے کا اعلان کیا۔ دوسرے دن یٰسین ملک کے کچھ ساتھیوں نے جاوید میر کو بلیک میل کر کے اسے بھی میرے خلاف یٰسین ملک کا ساتھ دینے پر مجبور کیا۔ دراصل جاوید میر کے خلاف کچھ انتہائی سنگین الزامات تھے اور یٰسین کے ساتھیوں نے یہ دھمکی دیکر کہ اگر اس نے یٰسین کا ساتھ نہ دیا تو وہ ایک پریس کانفرنس کے ذریعے ان الزامات کے ثبوت عوام کے سامنے پیش کریں گے، جاوید میر کو یٰسین کا ساتھ دینے پر مجبور کیا اور اس نے ایک پریس کانفرنس میں اس کا اعلان کیا۔ اس طرح ایک دن پہلے تک ایک دوسرے کے خون کے پیاسے یٰسین ملک اور جاوید میر میری مخالفت میں ایک ہو گئے اور یہ صورتحال پیدا کرنے میں بلیک میلنگ کے علاوہ ایسی طاقتوں نے بھی بھرپور کردار ادا کیا جن کے لئے میری باطل کے سامنے نہ جھکنے اور کسی قیمت پر بھی نہ بکنے کی عادت سوہان روح بنی ہوئی تھی۔ یٰسین ملک کی مرکز سے بغاوت کے کچھ دن پہلے میں نے فیصلہ کیا تھا کہ حریت کانفرنس میں لبریشن فرنٹ کی نمائندگی دوبارہ شبیر صدیقی کو دی جائے کیونکہ یٰسین ملک حریت کانفرنس کو تسلیم ہی نہیں کرتا تھا اور اس کے خلاف انتہائی ناشائستہ زبان استعمال کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا تھا۔ اسی دوران ایک دن میر واعظ عمر فاروق (چیئرمین حریت کانفرنس) سے فون پر بات ہو رہی تھی کہ انہوں نے کہا کہ کل امریکہ کا سفیر ہم سے ملنے سرینگر آ رہا ہے اور اس سے ملاقات سے پہلے حریت کی ایگزیکٹو کونسل کا اجلاس ہوگا۔ اس لئے آپ کل بارہ بجے فون کریں

ممکن ہے ہمیں کسی معاملے کے سلسلے میں آپ کے مشورے کی ضرورت پڑے۔ان دنوں میں ہی ٹیلی فون کے ذریعہ حریت میں اپنی تنظیم کی نمائندگی کر رہا تھا۔ میں نے دوسرے دن فون کیا وہاں حریت کی ایگزیکٹو کونسل کے سارے ممبر موجود تھے۔ان دنوں شبیر احمد شاہ صاحب بھی حریت میں تھے۔ میں نے حریت میں لبریشن فرنٹ کی نمائندگی کے بارے میں تمام ممبروں سے علیحدہ علیحدہ بات کی اور انہوں نے کہا کہ آپ جس شخص کو بھی حریت کانفرنس میں اپنا نمائندہ مقرر کریں ہمیں قبول ہوگا۔ میں شبیر صدیقی کو حریت کانفرنس میں اپنا نمائندہ مقرر کرنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ یٰسین ملک نے مرکز سے بغاوت کردی۔ 21 ستمبر 1995ء کو میں نے سنٹرل کمیٹی کے فیصلے کے مطابق یٰسین ملک کی جگہ شبیر صدیقی کو مقبوضہ کشمیر کے لئے زونل صدر مقرر کیا۔ دوسرے دن یٰسین ملک نے مرکز کے خلاف بغاوت کر کے اپنی متوازی تنظیم بنائی اور اسی دن حریت کانفرنس نے یٰسین ملک کے غیر آئینی اور باغی گروپ کو اصل لبریشن فرنٹ تسلیم کرتے ہوئے مجھے تحریک دشمن قرار دیا۔اسی سہ پہر حکومت پاکستان نے بھی ریڈیو پاکستان اور پی ٹی وی کے ذریعے یٰسین ملک کے گروپ کو اصلی لبریشن فرنٹ تسلیم کیا۔بعد میں حریت کانفرنس کے کچھ زعماء نے مجھ سے کہا کہ اگر ہم اس وقت آپ کے مقابلے میں یٰسین ملک کا ساتھ نہ دیتے تو وہ (یٰسین ملک) یقیناً مسئلہ کشمیر پر بھارت کی حمایت کا اعلان کرنے والا تھا۔

بہر حال یہ میرے خلاف یٰسین ملک، حریت کانفرنس اور حکومت پاکستان کے مشترکہ اقدام کی ایک انوکھی مثال تھی۔

1995ء سے 2004ء تک کے تقریباً ایک عشرے کے دوران ہمارے مابین مفاہمت کی کئی کوششیں ہوئیں بلکہ ایک بار تو میں نے برطانیہ میں مقیم اپنے دو قریبی ساتھیوں کو اس مقصد سے امریکہ بھی بھیجا جہاں یٰسین ملک علاج کیلئے گئے تھے لیکن مفاہمت نہ ہوسکی اسلئے کہ میں نظریئے سے متعلق اصولوں اور اپنی تنظیم کی سیاسی آزادی پر مفاہمت کرنے والوں میں سے نہیں۔ نہ ہی سیاست میں منافقت یا دو کشتیوں میں سواری کا قائل ہوں۔ میں نے ہمیشہ اپنے قول و فعل اور ظاہر و باطن میں کوئی فرق نہیں رکھا۔اس طرز فکر و عمل کی میں پہلے بھی بھاری قیمت ادا کر چکا ہوں اور آئندہ بھی کرنے کیلئے تیار ہوں۔اسلئے کہ یہی طرز فکر و عمل میری اور میرے ساتھیوں کی قیمتی متاع ہے۔اس موضوع (یاسین ملک سے اختلاف) پر میں تفصیل میں جانے سے قصداً احتراز کر رہا ہوں اسلئے کہ ایسا کرنا ارفع تر قومی مفاد میں ہے۔یٰسین ملک کی علیحدگی کے بعد میرے دو سینئر ساتھی راجہ مظفر اور ڈاکٹر فاروق حیدر نے بھی یٰسین ملک کیمپ میں شمولیت اختیار کی بلکہ ان سے کرائی گئی گو وہ اب وہاں حسب سابق سرگرم عمل نہیں۔ بہر حال یہ علیحدگیاں ہوتی رہتی ہیں۔یٰسین ملک کے بھی درجن بھر سینئر ساتھی بشمول شکیل بخشی، جاوید میر، اقبال گندرو، سلیم نتھا جی، وجاحت حسین، راسخ خان وغیرہ آج اس سے الگ ہیں۔

عظیم نظریاتی ساتھیوں کی یاد میں

نظریۂ خودمختار کشمیر جسے حال ہی تک بھارتی حکومت اور میڈیا بھارت دشمنی اور پاکستان کی حکومت اور میڈیا پاکستان دشمنی اور اس حوالے سے دونوں حکومتیں اور وہاں کے میڈیا اس نظریئے کو دونوں ملکوں سے غداری قرار دیتے تھے اور کشمیری عوام کی اکثریت بھی مجبوراً اسے ایک متعدی ذہنی بیماری قرار دے کر اس سے دور بھاگتی تھی، آج ہر ذی شعور، حقیقت پسند اور انصاف پسند کشمیری، بھارتی اور پاکستانی اسے مسئلہ کشمیر کا واحد منصفانہ، پُر امن اور آبرومندانہ حل تسلیم کرتا ہے یہاں تک کہ حقیقت پسند عالمی رائے عامہ بھی اسے مسئلے کا واحد حل قرار دیتی ہے۔ البتہ اس کے حق میں بھرپور آواز ابھی تک کسی بھی حلقے سے نہیں اٹھی ہے۔ یہ نظریہ عدم مقبولیت کی اُس انتہا سے مقبولیت کی اس حد تک کس طرح پہنچا یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ اس میں ہمارے ہموطنوں اور ساتھیوں کے مثالی صبر و استقلال کے علاوہ ان کا پسینہ بھی شامل ہے اور خون بھی۔

اگرچہ اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ کشمیر پندرھویں صدی میں اپنی خودمختاری خاص کر دور بڈ شاہی کے دوران ہی قومی زندگی کے ہر میدان میں ترقی کی معراج تک پہنچا، ہر کشمیری کے دل میں یہ خواہش تھی کہ اسکا وطن آزاد ہو کر ایک بار پھر اس بلندی تک پہنچے لیکن ناموافق حالات انہیں اسکے مطالبے کی تو درکنار اظہار کی بھی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اسکے علاوہ مسلسل غلامی انسان سے اسکی خودداری اور اعلیٰ ہمتی بھی چھین لیتی ہے چنانچہ خودمختاری کیلئے کوئی منظم تحریک نہ چل سکی اور کشمیر صدیوں تک دوسروں کا غلام رہا۔

گذشتہ صدی کی پہلی چوتھائی میں کشمیر نے انگڑائی لی اور یکے بعد دیگرے ریشم خانہ اور 13 جولائی 1931ء کے واقعات پیش آئے جن کے نتیجے میں ایک سیاسی جماعت مسلم کانفرنس اور کشمیر اسمبلی بھی قائم ہوئی۔ مسلم کانفرنس 1939ء میں نیشنل کانفرنس میں تبدیل ہوئی اور اس نے چار سال بعد ''نیا کشمیر'' نام سے اپنا سیاسی اور معاشی پروگرام پیش کیا اور اس کے دو سال بعد 1946ء میں ''کشمیر چھوڑ دو'' تحریک چلائی جو جمہوری خودمختاری کی طرف ایک عملی قدم تھا لیکن اسے طاقت سے کچل دیا گیا۔ ایک سال بعد 14 اگست 1947ء کو برصغیر تقسیم ہوا۔ مہاراجہ بھارت سے الحاق کرنے کیلئے پر تول رہا تھا کہ سرینگر کے غلام نبی گلکار ممبر کشمیر اسمبلی نے اپنے کچھ ساتھیوں کے تعاون سے 4 اکتوبر 1947ء کو راولپنڈی سے ریاست کیلئے ایک عبوری جمہوریہ کے قیام کا اعلان کر دیا جسے 20 دن بعد دوبارہ منظم کر کے حکومت آزاد کشمیر کا نام دیا گیا لیکن وہ آہستہ آہستہ عملاً حکومت پاکستان کی تحویل میں چلی گئی۔ اسکے بعد 17 سال تک آزاد کشمیر پر غیر جمہوری اور پاکستان کی نامزد حکومتیں مسلط رہیں۔ گلگت بلتستان کا علاقہ پاکستان نے براہ راست اپنی تحویل میں لے لیا۔ بھارتی مقبوضہ کشمیر کو ابتدا میں بھارتی آئین کے تحت اندرونی خود مختاری دی گئی جو آہستہ آہستہ واپس لے لی گئی۔

1961ء میں آزاد کشمیر میں پہلے صدارتی انتخابات کے ساتھ ہی ایک سٹیٹ کونسل کے انتخابات بھی ہوئے تو بہت سے امیدواروں نے اپنے منشوروں میں خودمختار کشمیر کا نظریہ پیش کیا ایک صدارتی

امیدوار جناب کے ایچ خورشید نے آزاد حکومت کو دوسرے ملکوں سے تسلیم کرانے کا مطالبہ کیا جو کسی نہ کسی طرح خودمختاری کا ہی نعم البدل تصور ہوتا تھا۔ کے ایچ خورشید کے علاوہ خودمختاری کے علمبردار دو امیدوار خواجہ جی ایم لون اور قاضی خورشید عالم سٹیٹ کونسل کے ممبر منتخب ہو گئے۔ دو سال بعد 1963ء میں مسئلہ کشمیر پر پاک بھارت مذاکرات شروع ہوئے تو پہلے ہی اجلاس میں فیصلہ ہوا کہ مذاکرات کشمیریوں کے حق خود ارادیت پر نہیں بلکہ ''کچھ لو کچھ دو'' کی بنیاد پر ہونگے۔ یہ صورتحال لکھے پڑھے اور محبِ وطن کشمیریوں کیلئے نا قابلِ قبول تھی چنانچہ جی ایم لون صاحب نے احباب کے مشورے سے سارے آزاد کشمیر اور پاکستان کا دورہ کر کے لکھے پڑھے محبِ وطن کشمیریوں کو آنے والے خطرات سے آگاہ کیا اور 12 مئی 1963ء کو ڈان ہوٹل راولپنڈی میں کشمیری وکلاء صحافیوں اور دانشوروں کا ایک اجلاس ہوا جس میں ایک قرارداد کے ذریعے واضح کیا گیا کہ مسئلہ کشمیر کا مسلمہ حل کشمیریوں کو حقِ خودارادیت دینا ہے اور اگر اس کا متبادل ہی ڈھونڈنا ہے کہ وہ متبادل ریاست کی بندر بانٹ نہیں پوری ریاست کی براہ راست مکمل خودمختاری ہے اور اسی قرارداد کو بنیاد بنا کر حصولِ خودمختاری کیلئے کشمیر انڈیپنڈنس کمیٹی (Kashmir Independence Committee) تشکیل دی گئی جسکے کنوینر جی ایم لون (ممبر آزاد کشمیر سٹیٹ کونسل) اور ممبروں میں غلام نبی گلکار بانی صدر آزاد کشمیر، قاضی خورشید عالم ممبر سٹیٹ کونسل سیالکوٹ، عبدالخالق انصاری ایڈووکیٹ میرپور، ملک عبدالمجید ایڈووکیٹ میرپور، امان اللہ خان ایڈیٹر ''وائس آف کشمیر'' کراچی (میں) میر عبدالعزیز ایڈیٹ ہفت روزہ ''انصاف'' راولپنڈی۔ میر عبدالرشید ایڈیٹر ''فری کشمیر'' سیالکوٹ، مجید امجد بٹ ایڈیٹر ''ولر'' سیالکوٹ، شیخ محمد سلیم سیالکوٹ، ایم اے فاروق ایڈووکیٹ مظفرآباد، میر عبدالقیوم کراچی، سعید شاہ نازکی لاہور، ڈاکٹر غلام احمد جراح سیالکوٹ اور علی محمد ملک پشاور شامل تھے۔

انڈیپنڈنس کمیٹی (جسکا لکھنے پڑھنے کا زیادہ تر کام میں کرتا تھا) نے 12 مئی 1963ء کی قرارداد کی کاپیاں بھارت اور پاکستان کی حکومتوں، میڈیا اور سیاسی پارٹیوں کے علاوہ عالمی سطح پر بھی تقسیم کیں اور مسئلہ کشمیر سے متعلق حقائق پر مبنی مزید لٹریچر شائع کر کے تقسیم کیا۔ ''وائس آف کشمیر'' ''فری کشمیر'' ''انصاف'' ''ولر'' اور دوسرے جریدوں نے خودمختار کشمیر پر اداریئے لکھے اور مضامین شائع کئے۔ اسی اثناء میں پاک بھارت مذاکرات کی ناکامی کا اعلان ہوا چنانچہ انڈیپنڈنس کمیٹی بھی سست پڑ گئی۔ ادھر اپریل 1965ء میں جموں کشمیر محاذِ رائے شماری (برائے آزاد کشمیر و پاکستان) قائم ہوا۔ جو نظریہ خودمختار کشمیر کا حامی تھا اور جسکے قیام میں انڈیپنڈنس کمیٹی کے اکثر ممبرو
ں کا کلیدی کردار تھا اسلئے کمیٹی کو توڑ دیا گیا۔

کشمیر انڈیپنڈنس کمیٹی کے 15 بانی ممبروں میں سے آج صرف ہم چار یعنی عبدالخالق انصاری، ملک عبدالمجید، ایم اے فاروق اور میں بقید حیات ہیں۔ باقی سب اللہ کو پیارے ہو گئے۔

جموں کشمیر محاذ رائے شماری میں شامل نظریہ خودمختار کشمیر کے حامی ممبروں کی اکثریت کراچی اور میرپور سے تعلق رکھتی تھی۔ ان میں سے بھی اکثر اصحاب آج اس دنیا میں نہیں۔ ان میں انڈیپنڈنس کمیٹی

کے اکثر ممبروں کے علاوہ (کراچی سے) میر عبدالمنان، غلام محی الدین بانکا، ملک عبدالرشید، رشید شاہ، ڈاکٹر نذیر خالد، کمانڈر غلام نبی ڈار، غلام محمد پہلوان، عبدالاحد راٹھور، محمد صدیق، عبداللہ خان، عبدالمجید لون، محمد شفیع، میر اسلم، ماسٹر اصغر علی، حبیب اللہ ریشی، محمد رمضان، عبدالرحمٰن ملک، عبدالاحد اور غلام محمد۔ میر پور سے حاجی وہاب الدین، ماسٹر عبدالرحمٰن، صوفی محمد زمان، کامریڈ مقبول، کامریڈ محمد حسین، کامریڈ عبدالعزیز، ماسٹر عطا محمد، صوفی لطیف، لالہ فیروز، میجر عباس، چوہدری صادق، چوہدری شہباز، عبدالغفور قریشی، غلام نبی انصاری، راولپنڈی سے اکرام اللہ جسوال، ستار ماگرے، غلام محمد گاما، غلام حسن اسلام آبادی، شیر باز میر، حاجی غلام نبی، غلام احمد کاؤس، لسہ ریشی، عبدالرحمٰن۔ مظفر آباد میں نظریۂ خودمختار کشمیر کے علمبرداروں میں میر ہدایت اللہ، غلام دین عشائی، عبدالاحد کٹھ، عبدالرشید منہاس، (حالانکہ یہ سب اعلیٰ سرکاری عہدوں پر تھے اور اپنے سیاسی نظریئے کی وجہ سے مسلسل زیرعتاب رہے) آذر عسکری، مجاہد کالا خان، غلام محمد لالہ، راجہ مقصود کیانی۔ پونچھ سے، سردار علی محمد، سردار رشید حسرت، سردار ارشاد محمود۔ باغ سے سردار اکرم، کوٹلی سے عبداللہ چوہان۔ لاہور سے غلام رسول بٹ، شیخ برکت علی، شیخ عبدالرحمٰن، سیالکوٹ سے منشی معراج الدین، ملک فیض محمد، پشاور سے شہید مقبول بٹ، نذیر احمد، عبدالغنی سالار اور گلگت سے شہید اورنگزیب، برطانیہ میں نظریۂ خودمختار کشمیر کے علمبردار ہمارے مرحوم ساتھیوں میں سے لالہ عبدالرحمٰن، راجہ محمد خان، افضل جاتلوی، محمد محمود نظامی، چوہدری مجید، چوہدری غفور، عزیز بھٹی، حاجی محمد حنیف، حاجی گلزار، (یہ سب حضرات لبریشن فرنٹ کے ممبر تھے) اور سید سلطان علی شاہ اور ہالینڈ کے ندیم عمریز، راجہ نذیر، شامل ہیں۔ یہ جملہ ساتھی خاص کر کشمیر انڈیپنڈنس کمیٹی، محاذِ رائے شماری اور لبریشن فرنٹ کے مرحوم ممبر آج اس دنیا میں نہیں لیکن نظریۂ خودمختار کشمیر کے ہراول دستے کی حیثیت سے ان سب کے نام نظریۂ خودمختار کشمیر کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھے جائینگے اور انشاءاللہ انکے خوابوں کا خودمختار کشمیر جلد یا بدیر وجود میں آئیگا۔ میں اپنے ان عظیم ساتھیوں کو دل کی گہرائیوں سے سلام عقیدت پیش کرتا ہوں۔

فروری 1984ء میں برطانیہ میں بھارتی ڈپٹی ہائی کمشنر راوندر امھاترے کے اغوا اور قتل کے سلسلے میں مجھ سمیت لبریشن فرنٹ کے سینکڑوں ممبر گرفتار ہوئے تھے آخر کیس میں صرف چھ افراد یعنی راجہ قیوم، ملک ریاض، صدیق بھٹی، جہانگیر مرزا، مجید انصاری اور راجہ اسحاق۔ راجہ اسحاق پر پانچ سو پونڈ جرمانہ ہوا جبکہ باقیوں کو مختلف مدت کی قید کی سزائیں ہوئیں۔ مجید انصاری اور جہانگیر مرزا ایک اور دو سال کے بعد رہا ہوئے۔ صدیق بھٹی نے 12 سال کی قید کاٹی اور ریاض ملک 20 سال قید کاٹ کر 2004ء کے اوائل میں رہا ہو گیا جبکہ راجہ عبدالقیوم کی رہائی فروری 2005ء میں متوقع ہے۔ اسلم مرزا بھی 2004ء میں گرفتار ہوئے ہیں۔ چونکہ آخری تین ساتھیوں کی رہائی ایک قسم کی مشروط رہائی ہے اور اسلم مرزا کا کیس زیرسماعت ہے اسلئے اس مرحلے پر مسئلہ پر تبصرہ کرنا مناسب نہیں۔

نظریۂ خودمختار کشمیر کے علمبردار اپنے موجودہ ساتھیوں اور شہیدوں کا تفصیلی تذکرہ انشاءاللہ کتاب کی تیسری جلد میں ہوگا۔

حصہ چہارم

نظریۂ خودمختار کشمیر

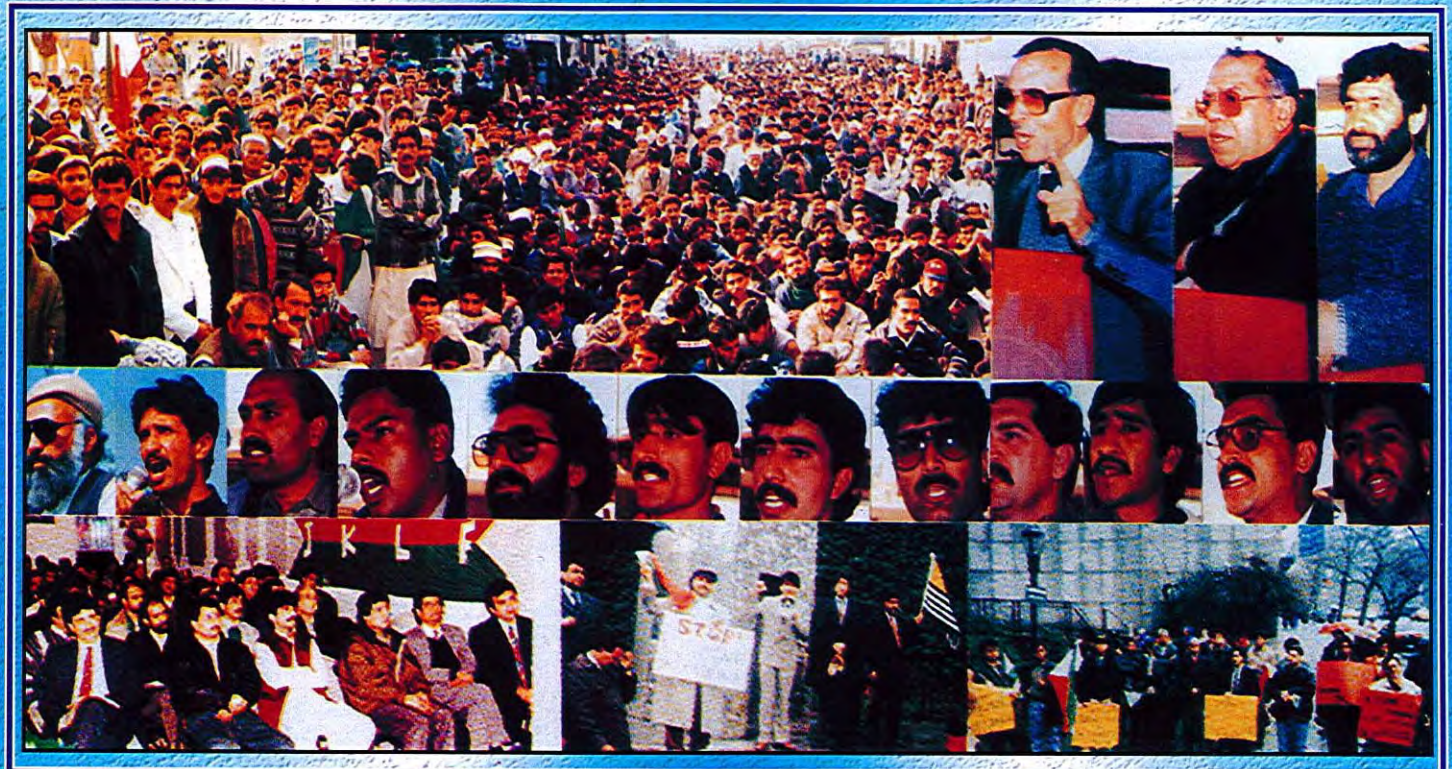
1- مختصر تاریخ
2- نظریۂ خودمختار کشمیر اور بھارت
3- نظریۂ خودمختار کشمیر اور پاکستان
4- نظریۂ خودمختار کشمیر اور عالمی برادری
5- نظریۂ خودمختار کشمیر اور کشمیری
6- کیا نظریۂ خودمختار کشمیر قابل عمل ہے

نظریۂ خودمختار کشمیر

1- مختصر تاریخ

کشمیر کی تاریخ ہزار ہا سال پرانی ہے۔ آج سے ساڑھے چھ سو سال پہلے چودھویں صدی عیسوی میں اس کے سیاسی افق پر مسلمانوں کے نمودار ہونے سے پہلے اس پر ہندو، بدھ، جین اور زرتشت مذاہب کے 21 خاندانوں نے حکومت کی تھی جن میں سے 18 خاندانوں کے دور میں کشمیر ایک آزاد، خودمختار ملک تھا۔ اس دور کے کشمیر کا مشہور ترین مقامی حکمران راجہ للتا دتیہ (Lalita Ditya) تھا جس نے 715ء سے 751ء تک کشمیر پر حکمرانی کی۔ اس کی حکمرانی کے دوران کشمیر علاقے کا سب سے طاقتور، سب سے خوشحال اور سب سے زیادہ معزز ملک تھا۔ کشمیر کے سیاسی افق پر مسلمان 1339ء میں نمودار ہوئے جب اس کے تخت پر شاہ میر نامی مسلمان بیٹھ گیا۔ اس سے قبل 1320ء میں رنچن نامی ایک حکمران نے بھی اسلام قبول کیا تھا۔ لیکن تخت پر پھر غیر مسلموں نے قبضہ کرلیا۔ بہرحال 1339ء میں کشمیر پھر ایک مسلمان، خودمختار مملکت بن گیا اور اس کی یہ خودمختاری 1586ء تک یعنی 246 سال قائم رہی اور اسی خودمختاری کے دوران یعنی سلطان زین العابدین بڈشاہ کے دور حکومت (1420 تا 1470) میں ہی کشمیر اپنی پوری تاریخ کے سنہری دور سے گزرا۔ اس دوران کشمیر خوشحالی، ترقی، فوجی طاقت اور ہمسایوں کی طرف سے حاصل عزت واحترام کے لحاظ سے اپنی طویل تاریخ کے عروج تک پہنچا۔ بہرحال کشمیر کی یہ عظمت زیادہ دیر قائم نہیں رہی اور عہد بڈشاہ کے 115 سال بعد کشمیر شیعہ سنی فسادات کی وجہ سے طوائف الملوکی کا شکار ہوگیا تو ہندوستان کے طاقتور مغل حکمران اکبر اعظم نے اس پر قبضہ کرلیا۔ بلکہ اسے کچھ کشمیری سنی زعماء نے کشمیر پر قبضہ کرنے کی دعوت دی اور اس کیلئے راستہ صاف کیا۔ مغلوں نے کشمیر پر 166 سال حکومت کی جس کے بعد افغانوں کی 67 سالہ حکومت آئی جو 1819ء میں سکھوں کے کشمیر پر قبضے کے نتیجے میں اختتام پذیر ہوئی۔ 1846ء میں کشمیر سکھوں کے قبضے سے نکل کر انگریزوں کی کاغذی تحویل میں چلا گیا جنہوں نے اسے جموں کے ڈوگرہ حکمران گلاب سنگھ کے ہاتھ 75 لاکھ روپے میں بیچ دیا۔ ڈوگروں نے اس پر ایک سو سال حکومت کی اور 1947ء سے کشمیر کا بڑا حصہ بھارت کے قبضے میں ہے اور باقی پاکستان کے بالواسطہ اور بلاواسطہ کنٹرول میں ہے۔

1586ء میں کشمیر کی خودمختاری کے خاتمے کے بعد سے بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی تک کشمیری بیرونی حکمرانوں کے ظلم واستبداد تلے بری طرح دبے رہے۔ یہاں تک کہ ان کے زعما کی زندہ کھالیں کھینچی گئیں اور عوام کو بنیادی ضروریات زندگی فراہم کرنے کا مطالبہ کرنے والے زعما کو جھیل ڈل میں ڈبو دیا گیا۔ چنانچہ آزادی کی کوئی منظم تحریک نہ چل سکی۔ بہرحال 1924ء میں پہلی بار سرینگر میں حکمرانوں کے خلاف آواز اٹھی۔ 1932ء میں کشمیر میں پہلی سیاسی پارٹی مسلم کانفرنس قائم ہوئی جسکے دو



(اوپر) میر پور آزاد کشمیر میں یوم خود مختار کشمیر کے سلسلے میں جلسہ عام 1993ء (نیچے) نیویارک میں مظاہرہ اور جلسہ عام

سال بعد 1934ء میں اسمبلی قائم ہوئی۔ 1939ء میں مسلم کانفرنس نیشنل کانفرنس میں تبدیل ہوگئی۔ البتہ 1942ء میں چوہدری غلام عباس کی سربراہی میں مسلم کانفرنس کا پھر احیاء کیا گیا۔ نیشنل کانفرنس نے 1946ء میں ''کشمیر چھوڑ دو تحریک'' شروع کی جسے حکمران نے پوری طاقت سے کچل دیا اور تحریک چلانے والوں کے لیڈر شیخ محمد عبداللہ کو نو سال قید بامشقت کی سزا دیکر جیل بھیج دیا۔ 1947ء میں برصغیر انگریزوں کے تسلط سے آزاد ہوگیا لیکن کشمیر کا معاملہ آسمان سے گرا کھجور پر اٹکا کے مصداق ڈوگرہ شخصی راج سے آزاد ہوتے ہوتے بھارت اور پاکستان کی تحویل میں چلا گیا اور ایک بین الاقوامی مسئلے کی شکل اختیار کر گیا۔

1947ء کے بعد کے 57 سالوں کے دوران مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کے لئے پوری ریاست کی مکمل خودمختاری کی تجویز بھی پیش ہوتی رہی ہے۔ آیئے دیکھیں کہ بھارت پاکستان اور کشمیر کے عوام، حکومتیں اور سیاسی جماعتیں اس نظریے کے سلسلے میں کیا کہتی اور کرتی رہی ہیں۔

نظریۂ خودمختار کشمیر اور بھارت

مسئلہ کشمیر کی 57 سالہ تاریخ یوں تو اس بات کے واضح ثبوت پیش کرتی ہے کہ بھارت اور پاکستان دونوں کو کشمیریوں کے احساسات اور خواہشات سے کہیں زیادہ دلچسپی سرزمین کشمیر کی ملکیت میں ہے۔ البتہ اپنے مقصد کے حصول کیلئے وہ مختلف جواز پیش کرتے ہیں۔ بھارت مہاراجہ کشمیر کی طرف سے ریاست کے بھارت سے الحاق کی دستاویز کو پوری ریاست جموں کشمیر (بمعہ آزاد کشمیر و گلگت بلتستان) پر اپنے دعویٰ ملکیت کی بنیاد بناتا ہے اور پاکستان ریاست کی مسلم اکثریت، برصغیر کی دوقومی نظریے کی بنیاد پر تقسیم اور اقوام متحدہ کی 5 جنوری 1949ء کی قرارداد کو، جس کے تحت ہونے والی رائے شماری کے بارے میں پاکستان کو یقین ہے کہ اسکا نتیجہ پاکستان کے حق میں نکلے گا۔ اسکے باوجود بھارت کی حکومتوں اور لیڈروں نے ایک سے زائد بار کشمیر کے حق خودمختاری کو تسلیم کیا ہے۔

ریاست جموں و کشمیر کی مکمل خودمختاری کے بارے میں بھارت کا سب سے واضح اور سب سے اہم اعلان 15 جنوری 1948ء کو دنیا کے سب سے اونچے ادارے یعنی اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں بھارت کے مندوب گوپال سوامی آئنگر نے کشمیر کا مسئلہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ انہوں نے بھارتی حکومت کی طرف سے واضح طور پر اعلان کیا ''ہم نے کشمیریوں کے اس حق کو تسلیم کیا ہے کہ وہ کشمیر میں حالات معمول پر آنے کے بعد خود ہی اس بات کا فیصلہ کریں کہ آیا کشمیر بھارت سے اپنے الحاق کو ختم کرے، پاکستان سے الحاق کرے یا خودمختار ہو کر اقوام متحدہ کی رکنیت حاصل کرنے کی کوشش کرے''۔ بھارتی مندوب نے سلامتی کونسل میں بھارت کے اس اعلان کو 3 فروری 1948ء کو پھر دہرایا۔ 9 جولائی 1951ء کو بھارت کے وزیراعظم پنڈت جواہر لعل نہرو نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی سے خطاب کرتے ہوئے کہا ''کشمیر کو بھارت یا پاکستان کیلئے ایک تحفہ تصور کرنا بالکل غلط ہے۔ معلوم ہوتا ہے لوگ اس حقیقت

کو بھول جاتے ہیں کہ کشمیر کوئی بکاؤ مال نہیں۔ اسکی اپنی ایک انفرادی حیثیت ہے اور اسکے عوام کو ہی اسکے مستقبل کے تعین کرنے کا حق حاصل ہے'' کشمیر کی خودمختاری کے حق میں بھارت کے اہم ترین رہنما کی اس سے زیادہ مضبوط دلیل اور کیا ہوسکتی ہے۔ بھارت نے ریاست جموں کشمیر کو جو اندرونی خودمختاری دی تھی جسکے تحت ریاست کا اپنا صدر، اپنا وزیراعظم، اپنا پرچم اور اپنی قومی زبان تھے، اسکے بارے میں بھی اس وقت یہ تاثر دیا گیا تھا کہ یہ مکمل خودمختاری کی طرف ابتدائی قدم ہے۔ اسکے بعد بھی آنجہانی جے پرکاش نارائن جیسے اونچے سیاسی قد کاٹھ کے بھارتی لیڈر خاصی مدت تک کشمیر کی خودمختاری کی حمایت کرتے رہے۔

نظریۂ خودمختار کشمیر اور پاکستان

برصغیر کی آزادی کے بارے میں برطانوی حکومت کے 3 جون 1947ء کے تاریخی اعلان کے صرف دو ہفتے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر اور پاکستان کے بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح نے 17 جون 1947ء کو ایک پالیسی بیان میں مسلم لیگ کے اس موقف کی وضاحت کی کہ برصغیر کی شخصی ریاستوں کا مستقبل انکے بھارت یا پاکستان سے الحاق تک محدود نہیں انہیں مکمل خودمختاری کا بھی حق حاصل ہے۔ مسلم لیگ کے سربراہ اور پاکستان کے بابائے قوم کا یہ پالیسی بیان نظریۂ خودمختار کشمیر کی پہلی بالواسطہ حمایت تھا۔

8 جولائی 1947ء کو آل انڈیا سٹیٹس مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے ایک قرارداد کے ذریعے برصغیر کی شخصی ریاستوں کے حق خودمختاری کی حمایت کی۔

مسلم لیگ اور پاکستان کی طرف سے نظریۂ خودمختار کشمیر کی واضح ترین اور براہ راست حمایت 11 جولائی 1947ء کو ہوئی جب قائداعظم نے آل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس کے قائم مقام صدر چوہدری حمید اللہ اور جموں کشمیر مسلم لیگ کے پروفیسر محمد اسحاق سے دھلی میں طویل ملاقات کے بعد ایک بیان جاری کیا۔ جس میں انہوں نے ریاستوں کے مستقبل کے بارے میں اپنے 17 جون والے بیان کا اعادہ کرتے ہوئے مہاراجہ کشمیر اور حکومت کشمیر کو مشورہ دیا کہ وہ ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کرتے وقت حکمرانوں ہی کے مفاد کا نہیں عوام کے مفادات کا بھی خیال رکھیں۔ انہوں نے کہا کہ جو ریاستیں خودمختار رہنا چاہیں انکا ایسا کرنا خود انکے علاوہ پاکستان کیلئے بھی فائدہ مند ثابت ہوسکتا ہے اور دونوں باہمی مفاد کیلئے معاہدے کرسکتے ہیں۔ قائداعظم نے ریاستی خودمختاری کے بارے میں اپنے موقف کو اپنے 30 جولائی 1947ء کے اخباری بیان میں بھی دہرایا۔ قائداعظم کے ریاستوں کی خودمختاری سے متعلق ان بیانات کا متن حکومت پاکستان کی طرف سے 1993ء میں شائع کی گئی کتاب بعنوان ''قائداعظم محمد علی جناح۔ تقاریر و بیانات

QUAID-I-AZAM MOHAMMAD ALI JINNAH

Speeches and Statements
As
Governor General of Pakistan
1947-48

قائداعظم محمد علی جناح کی 1947-8ء کے دوران کی گئی تقریروں اور اخباری بیانات پر مشتمل کتاب (جسے حکومت پاکستان کی وزارت اطلاعات اسلام آباد نے شائع کیا ہے) میں شامل قائد کے 17 جون، 11 جولائی اور 30 جولائی 1947ء کے بیانات جن میں انہوں نے برصغیر کی ریاستوں بشمول جموں کشمیر کی مکمل خود مختاری کے حق کی حمائت کی ہے۔ یہ تینوں بیانات اگلے تین صفحوں میں درج ہیں (مصنف)

Published by:
Government of Pakistan
Ministry of Information & Broadcasting
Directorate of Films & Publications
Islamabad

Statement Regarding the States

June 17, 1947

On June 17, 1947, Quaid-i-Azam Mohammad Ali Jinnah, in a statement, declared that with the termination of paramountcy, Indian States would be free to join either the Hindustan Constituent Assembly or the Pakistan Constituent Assembly, or to remain independent.

The Quaid-i-Azam further said:

"There is a great deal of controversy going on with regard to the Indian States, and I am, therefore, obliged to state the position of the All-India Muslim League so that there should be no misunderstanding as to what the Muslim League stands for and what our policy is with regard to the Indian States.

"Constitutionally and legally, the Indian States will be independent sovereign States on the termination of paramountcy and they will be free to decide for themselves to adopt any course they like; it is open to them to join the Hindustan Constituent Assembly, or decide to remain independent. In the last case, they enter into such arrangements or relationship with Hindustan or Pakistan as they may choose.

League Policy

"The policy of the All-India Muslim League has been clear from the very beginning. We do not wish to interfere with the internal affairs of any State, for that is a matter primarily to be resolved between the rulers and the peoples of the States. Such States as wish to enter the Pakistan Constituent Assembly of their free will and desire to discuss or negotiate with us, shall find us ready and willing to do so. If they wish to remain independent and wish to negotiate or adjust any political or any other relationship such as commercial or economic relations with Pakistan, we shall be glad to discuss with them and come to a settlement which will be in the interest of both.

No Limitation

"I am clearly of the opinion that the Cabinet Mission's memorandum of May 12, defining the policy of His Majesty's Government towards the Indian States, does not in any way limit them as it is often wrongly repeated, that they have no option except to join one or the other Constituent Assembly. In my opinion, they are free to remain independent if they so desire, neither the British Government nor the British Parliament compel them to do anything contrary to their free will and accord nor have they any power or sanction of any kind to do so.

"The British Government have made it clear that paramountcy will not be transferred to any Government or Governments or authority that may be set up in British India, and that itself shows that paramountcy cannot be transferred, but is going to terminate. On its termination, the full sovereign status of the Indian States emerges."

The Quaid Demands Release of Kashmir Detenus

Press Statement: July 11, 1947

Quaid-i-Azam Mohammad Ali Jinnah, in a press statement on July 11, 1947, after an hour's interview with the Kashmir Muslim leaders, said:

"The Jammu and Kashmir Muslim Conference leaders, Chaudhry Hamidullah Khan and Mr. Muhammad Ishaque Qureshi had an interview with me today and they informed me of the situation there which is making the people restive. They placed before me the question of the detention of the Muslim Conference leaders who have been in jail now for nine months without trial. Their only offence was that they held the Muslim Conference session in spite of prohibitory orders of the Government. But they soon dispersed, and did not proceed with their business. Only six leaders were arrested to which no resistance was offered and everything went off peacefully. For such a technical offence they have already suffered for nine months and I see no justification for their continued detention.

"I hope that the Maharaja and the Prime Minister of Kashmir will realize the fast-changing circumstances and wisdom demands that the feelings and sentiments of the Muslims who

form 80 per cent of the population should not be ignored, much less hurt.

"The second question that is engaging the attention of the Muslims of Kashmir is whether Kashmir is going to join the Constituent Assembly of Pakistan. I have already made it clear more than once that the Indian States are free to join either the Pakistan Constituent Assembly or the Hindustan Constituent Assembly or remain independent. I have no doubt that the Maharaja and the Kashmir Government will give their closest attention and consideration to this matter and realize the interests not only of the Ruler but also of his people. We have made it clear that we are not going to coerce, intimidate or put any pressure on any State making its choice. But those states who wish to join the Pakistan Constituent Assembly will find us ready and willing to negotiate with them agreement for the mutual advantage of both. Those who wish to declare their complete independence may be beneficial for both and secure mutual and reciprocal interest."

Statement Regarding the States

July 30, 1947

In a statement issued on July 30, 1947, Quaid-i-Azam Mohammad Ali Jinnah reiterated that the Muslim League had no intention of coercing any State into adopting any particular course of action. The Quaid-i-Azam stated:

"I have been asked from certain quarters to indicate what the attitude of the new Pakistan Government is likely to be, in respect of the Indian States, on the lapse of paramountcy.

"I thought, I had already made the position perfectly clear. The legal position is that with the lapse of paramountcy on the transfer of power by the British, all Indian States would automatically regain their full sovereign and independent status. They are, therefore, free to join either of the two Dominions or to remain independent.

"The Muslim League recognizes the right of each State to choose its destiny. It has no intention of coercing any State into adopting any particular course of action.

"Should a State desire to join the Pakistan Dominion or enter into any understanding or a treaty, the negotiating Committee of the Pakistan Constituent Assembly when set up, or the representatives of the Government of Pakistan, as the case may be, will be glad to negotiate the terms on which such association can be brought about. While it is desirable to conclude such negotiations quickly, no definite time-limit can obviously be placed on their completion, as this will, in my opinion, amount to interference with the States' freedom of choice.

"Meanwhile, there is already a provision for a standstill agreement to fill up any void that may arise in the administrative field. This standstill agreement would take care of the immediate problems that may result from the lapse of paramountcy."

36 - 37

روزنامہ جنگ راولپنڈی مورخہ 4 جون 2003ء

کشمیر کی بندر بانٹ کا کسی کو کوئی حق حاصل نہیں، امان اللہ خان

کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے، تاریخی حقائق اسے کسی کی شہ رگ بتاتے ہیں

کشمیر کو متحد کر کے خود مختار مملکت قائم کرنے تک جدوجہد جاری رہے گی

روزنامہ اوصاف مورخہ 24 جون 2000ء

خود مختار کشمیر بھارت پاکستان دونوں کے مفاد میں ہے، امان اللہ

ملت بتدریج کامیاب ہو رہی ہے، خود مختاری کے لئے ہر آئینی حق لڑ کر چھینیں گے، کراچی میں جلسے سے خطاب

پاکستان کے خیر خواہ ہیں، مگر وفاداریاں کشمیر کے ساتھ ہیں، امان اللہ

سیاسیت پاکستان پر نقصین کا باعث بنے گی لیکن اخلاقی پاکستان کا نہیں

پاکستان اور بھارت کا طرز عمل ہر صورت کو اپنی جگہ کے خطرے دوچار کر سکتا ہے

کشمیر کی اپنی آزاد ریاست بھارت دوستی پر قربان نہیں کر سکتے، امان اللہ

روزنامہ اوصاف 23 فروری 2004

48-1947ء (انگریزی، اردو) میں درج ہیں۔ اردو ایڈیشن میں ان بیانات کے متن صفحات نمبر 17، 26، اور 41 اور انگریزی میں صفحات نمبر 16، 17، 23، 24 اور 36 پر درج ہیں۔ کتاب کا پیش لفظ پاکستان کی اس وقت کی وزیراعظم بے نظیر بھٹو نے لکھا ہے اور پاکستانیوں پر زور دیا ہے کہ انہیں قائداعظم کے فرمودات پر عمل کرنا چاہیئے۔ اس کتاب کے علاوہ قائداعظم کے یہ بیانات 18 جون، 13 جولائی اور 31 جولائی 1947ء کے اخبارات میں تفصیل سے شائع ہوئے ہیں۔ قائداعظم کے 17 جون 1947ء کے بیان کی خبر رساں ایجنسی رائٹرز کی رپورٹ انڈیا آفس لائبریری (لندن) میں دی ٹرانسفر آف پاور (The Transfer of Power) سے متعلق دستاویز کے صفحہ نمبر 438 پر آئٹم نمبر 225 کے تحت درج ہے۔

پاکستان نے اپنے قیام کے ساتھ ہی ریاست جموں کشمیر کی حکومت کے ساتھ جوں کا توں معاہدہ (Stand-still Agreement) کر کے بھی بالواسطہ طور پر ریاست جموں کشمیر کی خودمختاری کے حق کو تسلیم کیا تھا۔

پاکستان کے قیام کے بعد بھی حکومت پاکستان خاص کر قائداعظم جو اس کے پہلے گورنر جنرل بنے ریاست کے حق خودمختاری کے حامی تھے۔ چنانچہ اقوام متحدہ کے کمیشن کی 13 اگست 1948ء کی قرارداد میں کشمیریوں کا اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق غیر محدود، غیر مشروط تسلیم کیا گیا تھا اور اس میں ان کے حق خودارادیت پر کوئی قدغن نہیں تھی۔ لیکن قائداعظم کی وفات کے ساتھ ہی حکومت پاکستان کی کشمیر پالیسی میں بنیادی تبدیلی آ گئی اور اس کے وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خان نے 25 دسمبر 1948ء کو اقوام متحدہ کے کمیشن سے تحریری طور پر رجوع کر کے اس کی 5 جنوری 1949ء کی سپلیمنٹری قرارداد کے ذریعہ کشمیریوں کے حق خودارادیت کو ریاست کے بھارت یا پاکستان سے الحاق تک محدود کرا دیا۔

قائداعظم کی وفات کے خاصی مدت بعد پاکستان کے صحافتی اور سیاسی حلقوں میں تاثر پھیلایا گیا کہ قائداعظم نے کشمیر کو پاکستان کی شہ رگ قرار دیا تھا۔ اس بات میں کوئی صداقت نہیں نہ ہی 11 ستمبر 1948ء (قائداعظم کے یوم وفات) سے پہلے شائع ہوئے کسی اخبار، رسالے یا کتاب میں اس کا کوئی ذکر ہے جبکہ خودمختار کشمیر کے حق میں قائداعظم کے بیانات اخبارات اور کتابوں یہاں تک کہ حکومت کی طرف سے شائع کی گئی کتاب میں بھی واضح طور پر شائع ہوئے ہیں۔ دراصل قائداعظم سے منسوب یہ بیان نظریۂ خودمختار کشمیر کے مخالف کسی دانشور، صحافی یا سیاسی لیڈر کی ذہنی اختراع کے سوا کچھ نہیں۔

پاکستان کے قیام سے اب تک یہاں سیاسی اور فوجی حکومتوں کی میعاد بالترتیب 27 سال اور 30 سال ہے۔ سیاسی حکومتوں میں طویل ترین مدت مسلم لیگی حکومتوں کی رہی ہے۔ جو دوقومی نظریئے کی داعی ہونے کی وجہ سے مسلم اکثریتی ریاست جموں کشمیر پر اپنا حق ملکیت جتاتی رہی ہیں۔ چنانچہ ان کی نظر میں خودمختار کشمیر کا نظریہ دوقومی نظریئے اور پاکستان کے قومی مفاد سے متصادم ہے۔ اس کے کچھ اہم رکن مرحوم شیخ دین محمد (سابق وزیر امور کشمیر) مرحوم شیخ منظور قادر، (سابق وزیر خارجہ) شیخ رشید احمد (سابق

اور موجودہ مرکزی وزیر) ذاتی حیثیت میں اس نظریئے کے حامی تھے یہ سب کشمیری نژاد ہیں۔ میں پاکستان پیپلز پارٹی کے قیام کے تقریباً ایک سال بعد 1968ء میں اس کے بانی اور سربراہ مرحوم ذوالفقار علی بھٹو سے اپنے ساتھیوں مرحوم جی ایم لون، مرحوم میر عبدالقیوم، مرحوم میر عبدالمنان اور خواجہ عطاء اللہ کے ساتھ کراچی میں ان کی عالیشان کوٹھی 70 کلفٹن میں ملا۔ بھٹو صاحب نے کہا مجھے مسئلہ کشمیر اور کشمیریوں کے کاز کے سلسلے میں اپنے موقف اور استدلال کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی ہے۔ یعنی وزارت چھوڑنی پڑی ہے۔ (یاد رہے کہ بھٹو صاحب کو صدر ایوب خان نے 1967ء میں اپنی حکومت سے الگ کر دیا تھا وہ ان کے وزیر خارجہ تھے) بھٹو صاحب نے کہا مجھے مسئلہ کشمیر پر ایوب خان کی پالیسی اور طرز عمل سے اختلاف تھا جو حکومت سے میرے اخراج پر منتج ہوا۔ میں نے کہا بھٹو صاحب آپ بین الاقوامی امور اور انٹرنیشنل لاء کے ماہر ہیں۔ کیا کسی محکوم قوم کے حق خودارادیت کو محدود یا مشروط کیا جاسکتا ہے؟ کہنے لگے آپ یہ سوال کیوں پوچھ رہے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے یہ سوال ذرا معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا تو میں نے بھی معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ ہی جواب دیا ''اپنی معلومات میں اضافے کیلئے'' کہنے لگے آپ کشمیری لوگ بہت چالاک ہوتے ہیں۔ اصل میں آپ یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ کشمیریوں کے حق خودارادیت میں ریاست کی خودمختاری کا حق شامل ہے یا نہیں۔ میں نے کہا آپ ٹھیک سمجھے ہیں۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہنے لگے ایک جمہوریت پسند سیاستدان کی حیثیت سے تو میں سمجھتا ہوں کہ آپ لوگوں کو حق خودمختاری ملنا چاہیے لیکن سچی بات یہ ہے کہ ہماری پارٹی نے ابھی تک اس مسئلے پر کوئی واضح موقف اختیار نہیں کیا ہے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ جلدی ہی اس مسئلے کے بارے میں پارٹی میں بحث کرا کر اس کا کوئی واضح موقف مرتب کر کے اس کے بارے میں ہم کو مطلع کریں گے۔ بہرحال ان کا کوئی واضح جواب ہمیں نہیں ملا البتہ ان کی پارٹی پاکستان پیپلز پارٹی کے تین اہم رکن ملک معراج خالد جو بھٹو صاحب کی صدارت کے دور میں پنجاب کے وزیراعلیٰ اور بیسویں صدی کے آخری عشرے میں تین ماہ کے لئے پاکستان کے عبوری وزیراعظم بنے، معراج محمد خان جنہیں ایک دور میں بھٹو صاحب نے اپنا جانشین نامزد کیا تھا اور ان کی کابینہ میں وزیر بھی تھے اور ڈاکٹر مبشر حسن جو ان کی کابینہ کے وزیر تھے اور آج کل پاک بھارت عوامی دوستی فورم کے اہم رکن ہیں، ذاتی حیثیت میں نظریۂ خودمختار کشمیر کے حامی رہے ہیں۔ بھٹو صاحب نے صدر پاکستان کی حیثیت سے 14 جولائی 1972ء کو قومی اسمبلی میں اپنے تاریخی اعلان میں واضح کیا کہ اگر کشمیری اپنی خودمختاری کے لئے بھرپور مسلح تحریک شروع کریں تو ہم ان کی بھرپور مدد کریں گے خواہ اس کے نتیجے میں ہمارے بھارت کے ساتھ تعلقات پھر سے کشیدہ ہی کیوں نہ ہو جائیں۔

جماعت اسلامی شروع سے ہی اس نظریئے کی مخالف رہی ہے البتہ اس کے کچھ ممبر بھی ذاتی حیثیت میں ہمارے نظریئے کے حامی ہیں۔ عوامی نیشنل پارٹی کے سابق سربراہ محمد اجمل خان خٹک ہمارے نظریئے کے زبردست حامی ہیں۔ بلوچستان کے محمود خان اچکزئی کے علاوہ بہت سے بلوچ نیشنلسٹ لیڈر بھی ہمارے نظریئے کے حامی ہیں۔

1988ء سے 1999ء تک کے پاکستان کے دو منتخب اور چار عبوری وزیراعظم ذاتی حیثیت میں نظریہ خودمختار کشمیر کے حامی رہے ہیں۔ لیکن انہوں نے (بجز میاں نواز شریف) سرکاری حیثیت میں کبھی اس نظریئے کی حمایت نہیں کی۔ میاں نواز شریف نے 18 فروری 1992ء کو تہران میں بی بی سی ریڈیو کو دیئے گئے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ کشمیری چاہیں تو ریاست کو مکمل خودمختاری دی جاسکتی ہے (انکے اس بیان پر مبنی بی بی سی کی خبر کا ریکارڈ (میاں صاحب کی آواز میں میرے پاس موجود ہے) لیکن صدر، فوج اور دفتر خارجہ کی طرف سے شدید مخالفت کی وجہ سے انہوں نے دوبارہ اس موقف کا اظہار نہیں کیا۔ بے نظیر بھٹو 1986ء میں برطانیہ سے پاکستان واپس آنے تک اس نظریئے کے لئے خاصا نرم گوشہ رکھتی تھیں لیکن بعد میں انہوں نے ملک کے مضبوط ترین اداروں یعنی فوج اور افسر شاہی کی طرف سے اس نظریئے کی شدید مخالفت کی وجہ سے اپنا موقف بدلا اور وزیراعظم اور قائد حزب اختلاف کی حیثیت میں اس نظریئے کی پرزور مخالفت کرتی رہیں۔ چاروں عبوری وزرائے اعظم یعنی غلام مصطفےٰ جتوئی، ملک معراج خالد، بلخ شیر مزاری اور معین قریشی ذاتی طور پر اس نظریئے کے حامی تھے البتہ اپنی سرکاری حیثیت میں انہوں نے کبھی اس کی حمایت نہیں کی۔

پاکستان کی بیوروکریسی میں آٹے میں نمک کے برابر ہی افراد اس نظریئے کے حامی ہیں۔ افسر شاہی کے جن ستونوں کو میں جانتا ہوں ان میں سے پاکستان کے سابق وزیر خارجہ جناب آغا شاہی اور جناب نیاز اے نائیک ذاتی حیثیت میں اس نظریئے کے حامی تھے لیکن ریٹائرمنٹ کے خاصی مدت بعد آغا شاہی صاحب نے اپنا موقف بدل لیا۔ تاریخ اور آثار قدیمہ کے مشہور ماہر احمد حسن دانی نے بھی حال ہی اس نظریئے کی پرزور حمایت کی ہے۔

پاکستان کے اہم اداروں میں سے نظریہ خودمختار کشمیر کا سب سے بڑا مخالف فوج کا ادارہ ہے جو بوجوہ پاکستان کا مضبوط ترین ادارہ بھی ہے۔ فوجی ڈسپلن کے تحت دوران سروس تو خیر کوئی بھی فوجی افسر اس نظریئے کی حمایت نہیں کرسکتا لیکن بجز ایئر مارشل اصغر خان کسی فوجی افسر نے ریٹائر ہونے کے بعد بھی اس نظریئے کی حمایت نہیں کی حالانکہ اعلیٰ عہدوں سے ریٹائر ہونے والے فوجیوں کی بڑی تعداد سیاست کے میدان میں کود پڑتی رہی ہے۔ اصغر خان صاحب کی طرف سے حمایت کی بنیادی وجہ ان کی حقیقت پسندی کے علاوہ ان کا کشمیری پس منظر بھی ہے۔ مجھے فوجی حلقوں نے 1987ء میں باور کرایا بلکہ یقین دلایا تھا کہ فوجی ٹاپ براس (اعلےٰ قیادت) اس نظریئے کے حق میں ہے لیکن بعد میں ثابت ہوا کہ وہ موقف ان کی وقتی حکمت عملی کا ایک حصہ تھا اور بے بنیاد تھا۔ البتہ صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف نے اپنی 25 اکتوبر 2004ء کی افطار پارٹی تقریر میں مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کیلئے تجاویز پیش کیں جن میں سے ایک پوری ریاست یا اسکے کسی حصے کی مکمل خودمختاری بھی ہے۔ قائداعظم کی وفات (1948ء) کے بعد پاکستان کے کسی سربراہ مملکت نے پہلی بار کشمیر کی مکمل خودمختاری کو مسئلے کا ایک حل تسلیم کیا ہے۔ دیکھیں کیا پاکستان اپنے اس اعلان پر قائم رہتا یا اس پر مبنی حل حاصل کرسکتا ہے ؟

الغرض ماضی میں پاکستان میں مجموعی طور پر نظریۂ خودمختار کشمیر کی شدید مخالفت رہی ہے حتیٰ کہ اس نظریئے کے حامل لوگوں کو غدار اور پاکستان کے دشمن تک گردانا جاتا رہا۔ البتہ اب اس میں خاصا فرق آیا ہے لیکن بعد از خرابی بسیار۔ اگر پاکستان شروع سے اس نظریئے کی عملی حمایت اور مدد کرتا تو اسکو کب کی عملی شکل مل گئی ہوتی جو پاکستان کیلئے (اور بھارت کیلئے بھی) کشمیر کی موجودہ صورتحال کی نسبت کہیں زیادہ فائدہ مند ہوتا۔ بہرحال اب بھی اس نظریئے کو سرکاری حلقوں میں سرکاری طور پر پذیرائی حاصل نہیں ہے۔ جسکا واحد مطلب یہ ہے کہ کشمیر پر پاکستان کا موقف بھی نوآبادیاتی ہے۔

نظریۂ خودمختار کشمیر اور عالمی برادری

اگرچہ عالمی برادری خاص کر اقوام متحدہ نے ابتدائی ایک عشرے کے دوران مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کے لئے خاصی محنت کی لیکن مجموعی طور پر کشمیر کی خودمختاری کے راستے میں رکاوٹیں ہی کھڑی کیں۔ یہاں تک کہ اس کے کشمیر کمیشن کی 5 جنوری 1949ء کی قرارداد نے کشمیر کی خودمختاری کا راستہ ہی بند کر دیا جو حق خودارادیت کی مسلمہ تشریح کے بالکل منافی تھا۔ اگرچہ اقوام متحدہ خاص کر اس کی سلامتی کونسل کے مستقل ممبروں میں سے کچھ غیر رسمی طور پر اور غیر رسمی اجلاسوں میں ریاست کی خودمختاری کو مسئلہ کے حل کے طور پر پیش کرتے رہے ہیں لیکن یہ نظریہ آج تک کبھی بھی سلامتی کونسل میں رسمی طور پر زیر بحث نہیں آیا۔ غیر جانبدار تحریک اور سارک (SAARC) تیکنیکی بنیادوں پر مسئلہ کشمیر کو اپنے اجلاسوں کے ایجنڈوں میں شامل ہی نہیں کرتے کیونکہ ان کے آئین کے تحت ان تنظیموں کے ممبر ملکوں کے باہمی تنازعات کو ان کے اجلاسوں میں زیر بحث نہیں لایا جاسکتا۔ اسلامی کانفرنس مسئلہ کشمیر پر پاکستان کی سرکاری پالیسی کی تقلید کرتی ہے اور اقوام متحدہ کی قراردادوں کو عملی جامہ پہنانے پر زور دیتی ہے اور یہ قراردادیں اس نظریئے کو تسلیم ہی نہیں کرتیں۔ البتہ یورپین پارلیمنٹ نے مارچ 1992ء میں کشمیریوں کے حق خودارادیت (یعنی خودمختاری) کے حق میں قرارداد پاس کی اور اکتوبر 1993ء میں یورپین پارلیمنٹ کے سوشلسٹ گروپ نے ریاست کشمیر کے دونوں حصوں کے رہنماؤں کی ایک گول میز کانفرنس کا بھی اہتمام کیا۔

اس صورتحال کے باوجود جب بھی آپ پاکستان میں متعین سفارتکاروں سے بات کریں ان کی بھاری اکثریت ذاتی حیثیت میں اور غیر رسمی تبادلہ خیال کے دوران اس بات سے سو فیصد اتفاق کرتی ہے کہ ریاست کی مکمل خودمختاری ہی اس مسئلے کا بہترین حل ہے لیکن یہ سفارتکار اور ان کی حکومتیں اس کا اعلانیہ اظہار کر کے بھارت اور پاکستان دونوں کو ناراض کرنا نہیں چاہتیں کیونکہ دونوں اس نظریئے کے مخالف ہیں۔ البتہ عالمی سطح پر کچھ شخصیات ببانگ دہل اس نظریئے کی حمایت کرتی ہیں۔ ایسا کرنے والوں میں انسانی حقوق کے علمبردار اور عالمی شہرت کے مالک برطانیہ کے لارڈ ایرک ایوبری سرفہرست ہیں۔ جنوبی افریقہ کے قائد اور سابق صدر نیلسن منڈیلا نے بھی ستمبر 1998ء میں غیر جانبدار تحریک کی سربراہی کانفرنس میں کشمیریوں کے حقوق کی حمایت کا اعلان کیا تھا۔

نظریۂ خودمختار کشمیر اور کشمیری

جیسا کہ تاریخ کشمیر کا ایک عام طالب علم بھی جانتا ہے اور اس کتاب میں بھی کئی حوالوں سے اس کا تذکرہ ہے کہ کشمیری 1586ء میں اپنی ہزاروں سال کی خودمختاری کھو بیٹھے۔ اس کے بعد ان پر یکے بعد دیگرے ایسے بیرونی حکمران مسلط ہوئے جنہوں نے انہیں سر اٹھانے نہیں دیا۔ حتیٰ کہ بیسویں صدی کا تیسرا عشرہ آن پہنچا جس دوران سرینگر میں قائم ریشم خانہ (ریشم بنانے کا کارخانہ) کے مزدوروں نے بغاوت کی جسے طاقت کے زور سے دبا دیا گیا۔ 1924ء میں وائسرائے ہند کے دورہ کشمیر کے دوران اسے مقامی عوام خاص کر مسلمانوں پر ریاست کی شخصی حکومت کے مظالم پر مشتمل یادداشت پیش کی گئی تو ریاستی حکومت نے یادداشت پر دستخط کرنے والے اکثر معززین کو ریاست بدر کر دیا۔ اس کے بعد 13 جولائی 1931ء کے واقعے کے نتیجے میں ریاست میں پہلی سیاسی پارٹی مسلم کانفرنس اور اس کے دو سال بعد 1934ء میں ریاست میں پہلی قانون ساز اسمبلی قائم ہوئی۔ یہ سارے اقدامات اگرچہ ریاست کی خودمختاری کے لئے نہیں کئے گئے تھے لیکن یہ اسی منزل کے حصول کے لئے غیر شعوری طور پر اٹھنے والے قدم تھے۔ 1939ء میں مسلم کانفرنس کے نیشنل کانفرنس میں تبدیل ہونے کے بعد 1944 میں موخرالذکر نے ''نیا کشمیر'' کے عنوان سے اپنا منشور مرتب کیا جسے ریاست میں ایک فلاحی مملکت قائم کرنے کے لئے کشمیریوں کا میگنا کارٹا (Magna Carta) قرار دیا گیا۔ اس میں ایک جدید جمہوری فلاحی مملکت کے آئین کا خاکہ پیش کیا گیا تھا۔ نیا کشمیر میں جاگیرداری نظام کے خاتمے، مزدوروں، کسانوں اور عورتوں کے حقوق، منتخب قومی اسمبلی کی بالادستی، کم خرچ تعلیم جیسے معاملات کے بارے میں پروگرام شامل تھے۔

1946ء میں شیخ محمد عبداللہ نے ''کشمیر چھوڑ دو'' تحریک شروع کی تو اسے اور اس کے اکثر قریبی ساتھیوں کو بغاوت کے الزام میں گرفتار کر کے لمبی سزائیں دی گئیں۔ 3 جون 1947ء کے برطانوی حکومت کے اعلان کے بعد ریاست کے شخصی حکمران مہاراجہ ہری سنگھ اور اسکے وزیراعظم پنڈت رام چند کاک دونوں اس نتیجے پر پہنچے کہ ریاست کے حکمران اور عوام دونوں کا مفاد اسی میں ہے کہ ریاست جموں کشمیر کو ایک آزاد مملکت بنا کر بھارت اور پاکستان دونوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھے جائیں لیکن نیشنل کانفرنس کی دوسری صف کی قیادت (خاص کر شیخ محمد عبداللہ کے دست راست بخشی غلام محمد) اور کانگریس کی صف اول کی قیادت کی ملی بھگت سے پنڈت رام چند کاک (جس سے نیشنل کانفرنس کی قیادت کی ذاتی دشمنی تھی) کو برصغیر کی آزادی سے صرف چار دن پہلے اس منصب سے ہٹایا گیا جس سے نظریۂ خودمختار کشمیر کو شدید دھچکہ لگا۔ یہی نہیں بلکہ کاک کی جگہ پہلے جنرل جنک سنگھ اور اس کے بعد کٹر بھارت نواز مہر چند مہاجن کو ریاست کا وزیراعظم بنایا گیا جس نے خفیہ اور اعلانیہ اقدامات کے ذریعے ریاست کے بھارت سے الحاق کے لئے راستہ صاف کر لیا اور مہاراجہ کو بھی ریاست کی خودمختاری کے بارے میں تذبذب میں

ڈال دیا۔ ادھر مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ نے 18 جولائی 1947ء کو قائداعظم اور چوہدری غلام عباس کی خواہش کے مطابق ریاست کی خودمختاری کے حق میں قرارداد منظور کی لیکن دوسرے دن 19 جولائی 1947ء کو تنظیم کی جنرل کونسل کے اجلاس میں کچھ جوشیلے نوجوانوں کے اصرار بلکہ دھمکیوں کے نتیجے میں ریاست کی خودمختاری کو بھی ایک متبادل صورت تسلیم کرتے ہوئے ریاست کے پاکستان سے (صرف دفاع، امور خارجہ اور مواصلات کے سلسلے میں) الحاق کے حق میں قرارداد منظور کی گئی۔ اس سے قبل 6 جولائی کو مسلم کانفرنس کی کوارڈینیشن کمیٹی کے چیئرمین نے مہاراجہ ہری سنگھ کے نام ایک تار میں اسے اس بات پر مبارکباد دی تھی کہ اطلاعات کے مطابق اس نے ریاست کو خودمختار رکھنے کا فیصلہ کیا ہے اور امید ظاہر کی کہ خودمختاری کا اعلان جلد کیا جائیگا۔ کشمیر کے مشہور دانشور اور سینئر صحافی پنڈت پریم ناتھ بزاز بھی ریاست کی مکمل خودمختاری کے حق میں تھے۔ انہوں نے اس نظریہ کے حق میں ''آزاد کشمیر'' نام سے کتاب بھی لکھی تھی۔

ستمبر 1947ء میں شیخ محمد عبداللہ کو جیل سے رہا کیا گیا۔ اکتوبر میں مسئلہ کشمیر پہلے پاک بھارت سطح پر اور اس کے بعد عالمی سطح پر اجاگر ہوا۔ اس وقت شیخ صاحب اس پوزیشن میں تھے کہ کشمیر کے بھارت سے الحاق کی حمایت کرنے کی بجائے کشمیر کے لئے خودمختاری حاصل کرتے لیکن 1951ء میں شیخ محمد عبداللہ نے جنہیں اکتوبر 1947ء میں ریاست کا سول ایڈمنسٹریٹر اور مارچ 1948ء میں وزیراعظم بنایا گیا تھا، بھارتی حکومت کے تعاون سے کشمیر کے لئے ایک آئین ساز اسمبلی قائم کی جس کے بنائے ہوئے آئین کے تحت کشمیر کا اپنا صدر، اپنا وزیراعظم، اپنا قومی پرچم، اپنی قومی زبان تھی۔ بھارت کے پاس صرف دفاع، امور خارجہ اور مواصلات کے محکمے تھے اور اس آئینی پوزیشن کو بھارت نے اپنے آئین میں بھی قبول کیا تھا اور عام تاثر یہی تھا کہ ریاست کی مکمل خودمختاری کی طرف یہ پہلا اور اہم ترین عملی قدم تھا۔ لیکن کچھ مدت بعد بھارت کی نیت بدل گئی (یا پہلے ہی سے اس کا یہی پروگرام تھا) اور ریاست کے اندرونی معاملات میں مداخلت شروع کر دی۔ شیخ صاحب اور بھارتی حکومت کے مابین خلیج پیدا ہوگئی جسے 1952ء کا معاہدہ دہلی بھی ختم نہ کر سکا۔ ادھر 9 جون 1953ء کو شیخ صاحب کی نیشنل کانفرنس نے مسئلہ کشمیر کے چار متبادل حل پیش کئے جن میں سے ایک پوری ریاست کی مکمل خودمختاری تھا لیکن دو ماہ بعد 9 اگست 1953ء کو شیخ صاحب کو وزارت عظمیٰ سے ہٹا کر ان کے مخلص ساتھیوں سمیت گرفتار کیا گیا اور انہیں 11 سال تک پس دیوار زنداں رکھا گیا۔

4 اکتوبر 1947ء کو راولپنڈی سے جاری کئے گئے ایک اعلان میں کہا گیا کہ شخصی حکمران مہاراجہ ہری سنگھ کو معزول کر کے ریاست جموں کشمیر کیلئے ایک عبوری جمہوریہ قائم کی گئی ہے جسکے صدر انور اور وزیراعظم سردار محمد ابراہیم خان بنائے گئے۔ انور دراصل تحریک آزادئ کشمیر کے اولین اسیروں میں سے ایک اور کشمیر اسمبلی کے ممبر سرینگر کے خواجہ غلام نبی گلکار تھے۔ عبوری جمہوری حکومت کے قیام کے اعلان میں کہا گیا تھا کہ یہ حکومت اپنے دونوں ہمسایہ ملکوں بھارت اور پاکستان سے دوستانہ تعلقات قائم

کر یگی اور اپنی کابینہ میں جلدی ہی غیر مسلموں کو بھی شامل کر یگی۔ 14 اکتوبر کے کچھ دن بعد گلکار صاحب سری نگر چلے گئے اور وہاں گرفتار ہو گئے۔ 24 اکتوبر 1947 کو 14 اکتوبر کی حکومت کی تنظیم نو کر کے اسکا نام عبوری جمہوریہ جموں کشمیر کی جگہ آزاد کشمیر گورنمنٹ رکھا گیا اور سردار محمد ابراہیم خان اسکے صدر مقرر ہوئے لیکن یہ حکومت آہستہ آہستہ حکومت پاکستان کے زیر اثر چلی گئی اور اپنی انقلابی روح کھو بیٹھی۔ بہر حال خود مختاری کا نظریہ کسی نہ کسی شکل میں قائم رہا۔ پچاس کے عشرے میں تین صحافیوں ثناء اللہ بٹ، غلام نبی گلکار اور میر عبدالعزیز نے اپنے ہفت روزوں کے ذریعے نظریۂ خود مختار کشمیر کو اجاگر کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ ثناء اللہ بٹ اور انکے ساتھی جناب ولی عادل کو 1956ء میں صدر آزاد کشمیر سردار عبدالقیوم خان کے حکم پر جبراً جنگ بندی لائن کے اس پار دھکیل دیا گیا۔ بٹ صاحب نے سرینگر پہنچنے کے کچھ مدت بعد ہفت روزہ آفتاب شروع کیا جو بعد میں روزنامہ بنا اور اب کشمیر کے صف اول کے اخباروں میں سے ایک ہے۔ گلکار صاحب اور میر عبدالعزیز کو 1959ء میں ''غیر پسندیدہ نظریات کے پرچار'' کی پاداش میں گرفتار کر کے ایک سال قید رکھا گیا۔ 1960ء میں سیالکوٹ سے میر عبدالرشید آف جموں نے فری کشمیر (Free Kashmir) نام کے ایک انگریزی پندرہ روزے کا اجراء کیا جو نظریۂ خود مختار کشمیر کی تبلیغ کرتا تھا۔ اسی دوران یعنی 1961ء میں میں نے کراچی سے انگریزی ماہنامہ وائس آف کشمیر (Voice of Kashmir) جاری کیا جو نظریۂ خود مختار کشمیر کا علمبردار تھا۔ سیالکوٹ سے مجید امجد بٹ کا ہفت روزہ دلر اور منشی معراج الدین کا ہفت روزہ پاسبان میر پور آزاد کشمیر سے عبدالخالق انصاری کا ہفت روزہ نئی سحر بھی نظریۂ خود مختار کشمیر کے داعی تھے۔

1962ء میں امریکہ کی ثالثی کے نتیجے میں پاکستان اور بھارت کے درمیان وزارتی سطح کے مذاکرات (بھٹو سورن سنگھ مذاکرات) شروع ہوئے۔ پہلے راؤنڈ کے دوران ہی خبر آئی کہ مذاکرات حق خود ارادیت کی بجائے ''کچھ لو کچھ دو'' یعنی تقسیم کی بنیاد پر ہو رہے ہیں یہاں تک کہ ایک تجویز دریائے جہلم کو پاک بھارت سرحد بنا کر وادیٔ کشمیر کو بھی تقسیم کرنے کی آئی۔ ان حالات میں محبِّ وطن کشمیریوں کے لئے خاموش رہنا ناممکن ہو گیا چنانچہ آزاد کشمیر سٹیٹ کونسل کے ممبر جی ایم لون نے سارے آزاد کشمیر اور پاکستان کا دورہ کر کے محبِّ وطن اور لکھے پڑھے افراد کو 12 مئی 1963ء کو راولپنڈی میں جمع کیا اور خاصے بحث مباحثے کے بعد ایک قرارداد کے ذریعہ بھارت، پاکستان اور عالمی برادری پر واضح کیا گیا کہ اگر مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کیلئے رائے شماری کا متبادل ہی ڈھونڈنا ہے تو یہ متبادل کشمیر کی کسی قسم کی تقسیم نہیں بلکہ منقسم ریاست جموں کشمیر کو دوبارہ متحد کر کے اسے ایک آزاد و خود مختار مملکت بنانا ہے۔ اور اس مطالبے کو عملی شکل دلانے کیلئے جی ایم لون ہی کی سربراہی میں کشمیر انڈیپنڈنس کمیٹی کے نام سے ایک تنظیم قائم کی گئی۔ بھٹو سورن سنگھ مذاکرات کے دوران وادیٔ کشمیر سے 125 سیاسی کارکنوں نے بھی بھٹو صاحب اور سورن سنگھ کے نام ایک مشترکہ خط میں پوری ریاست کی مکمل خود مختاری کا مطالبہ کیا تھا۔

بہر حال بھٹو سورن سنگھ مذاکرات کے چھ دور ہوئے لیکن یہ نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئے چنانچہ یہ

سلسلہ ٹوٹ گیا اور پاکستان نے پھر سے کشمیریوں کے حق خودارادیت کی باتیں کرنا شروع کیں اور بھارت کی طرف سے اٹوٹ انگ کی رٹ شروع ہوگئی چنانچہ کشمیر انڈیپنڈنس لیگ بھی ٹوٹ گئی جس کے ٹوٹنے کی چند اور وجوہات بھی تھیں اور کمیٹی کے اکثر ممبر اپریل 1965ء میں بننے والے محاذ رائے شماری میں شامل ہوگئے۔ آزاد کشمیر میں اعلانیہ طور پر نظریۂ خودمختار کشمیر کا پرچار کرنے والی پہلی تنظیم جموں کشمیر ریپبلکن پارٹی (JK Republican Party) تھی لیکن یہ تنظیم بوجوہ عوام میں زیادہ مقبول نہ ہوسکی۔ اسکے سربراہ خواجہ غلام نبی گلکار نے 1961ء کے صدارتی انتخاب میں حصہ لیا لیکن بہت کم ووٹ حاصل کر سکے جس کی بنیادی وجہ ان کا احمدی ہونا تھا۔ اسی دوران آزاد کشمیر سٹیٹ کونسل کے انتخابات میں مہاجر سیٹوں پر وادیٔ کشمیر اور جموں کے امیدواروں میں سب سے زیادہ ووٹ لینے والے خواجہ غلام محمد لون (جی ایم لون آف کراچی) اور قاضی خورشید عالم آف سیالکوٹ تھے اور دونوں نے ریاست کی مکمل خودمختاری کے منشور کے تحت انتخابات میں حصہ لیا تھا۔ صدارتی امیدواروں میں جناب کے ایچ خورشید اور سردار عبدالقیوم سب سے آگے تھے لیکن خورشید صاحب جن کے منشور میں آزاد کشمیر حکومت کو عالمی سطح پر پوری ریاست کی انقلابی حکومت کی حیثیت سے تسلیم کرانا تھا اور عوام اس منشور کو خودمختاری کا منشور ہی تصور کرتے تھے۔ الحاق پاکستان کے داعی سردار عبدالقیوم کے مقابلے میں زیادہ ووٹ لیکر صدر منتخب ہوگئے۔ لیکن خورشید صاحب کو ان کی مدت پوری ہونے سے پہلے ہی اگست 1964ء میں (شیخ محمد عبداللہ کے دورہ پاکستان کے کچھ مدت بعد) ان کے عہدے سے ہٹایا گیا۔ شیخ محمد عبداللہ نے 1968ء اور 1970ء میں سرینگر میں جو سٹیٹ پیپلز کنونشن منعقد کئے تھے ان سے خطاب کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد نے بھی ریاست کے لئے مکمل خودمختاری تجویز کی تھی۔ اپریل 1965ء میں قائم ہونے والا جموں کشمیر محاذ رائے شماری (برائے آزاد کشمیر و پاکستان) گو آئینی طور پر غیر محدود و غیر مشروط حق خودارادیت کا داعی تھا لیکن اس کے جملہ عہدیدار اور سینئر ممبر نظریۂ خودمختار کشمیر پر مبنی اپنے طرز فکر و عمل کے لئے مشہور تھے۔ محاذ نے نظریۂ خودمختار کشمیر کی تشہیر کے مقصد سے خاصا لٹریچر بھی شائع کیا۔ اس کے بانی صدر عبدالخالق انصاری، نائب صدر جی ایم لون اور غلام نبی گلکار، سیکرٹری جنرل میں جوائنٹ سیکرٹری مجید امجد بٹ، اسسٹنٹ سیکرٹری جی ایم خان، خزانچی میر عبدالقیوم اور پبلسٹی سیکرٹری مقبول احمد بٹ تھے۔ سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے میں نے نظریۂ خودمختار کشمیر پر مبنی درجنوں کتابچے، پمفلٹ اور مضامین (اردو اور انگریزی میں) لکھ کر وسیع مقدار میں تقسیم کرائے۔

1965ء میں ہی زیرزمین تنظیم جموں کشمیر نیشنل لبریشن فرنٹ (NLF) بنی جسکا میں سیاسی اور سفارتی شعبوں کا انچارج تھا۔ NLF بھی ریاست کی مکمل خودمختاری کا علمبردار تھا اور اس مقصد کے حصول کیلئے مسلح جدوجہد آزادی کا داعی تھا۔ این ایل ایف اور اسکے ممبروں نے خاصی قربانیاں دیں۔ یہاں تک کہ اس کے بانیوں میں سے ایک مقبول بٹ تقریباً 13 سال قید کاٹنے کے بعد تختہ دار پر چڑھ گئے۔ این ایل ایف نام کی ایک تنظیم آج بھی زندہ ہے لیکن 1966ء والے سے بالکل مختلف۔ 1966ء میں بننے والی کشمیر کمیٹی برائے افریشیائی عوامی اتحاد کا مقصد مسئلہ کشمیر اور نظریۂ خودمختار کشمیر کو عالمی خاص کر

ایشیا اور افریقہ کی سطح پر اجاگر کرنا تھا۔ جی ایم لون اس کے کنوینر اور میں سیکرٹری جنرل تھا باقی اہم ممبروں میں کراچی سے ملک رشید، میر پور سے عارف کمال، خواجہ مشتاق، صابر انصاری، لاہور سے نصیر محمود وانی، راولپنڈی سے میر عبدالعزیز، اکرم اللہ جسوال اور مظفر آباد سے ایم اے فاروق ایڈووکیٹ شامل تھے۔

بھارتی مقبوضہ کشمیر میں محاذ رائے شماری کے ممبروں کی ایک بڑی تعداد نظریۂ خودمختار کشمیر کی حامی تھی۔ 1975ء کے دہلی ایکارڈ اور محاذ رائے شماری کو نیشنل کانفرنس میں ضم کئے جانے کے بعد محاذ کے نائب صدر صوفی محمد اکبر صاحب کی سرگردگی میں بہت سے اصحاب نے جموں کشمیر محاذ آزادی قائم کیا جس نے نظریۂ خودمختار کشمیر کو اپنایا۔ اس کے اور اس کی قیادت کے لئے عوام کے دلوں میں خاصا احترام ہونے کے باجود اسے تنظیمی وسعت نہیں مل سکی اور 1987ء میں صوفی صاحب کے انتقال کے بعد محاذ آزادی خاصا کمزور ہو گیا۔ اعظم انقلابی اس کے سربراہ ہیں۔

آج بھارتی مقبوضہ کشمیر میں لبریشن فرنٹ کے علاوہ جی ایم شاہ کی عوامی نیشنل کانفرنس، شبیر شاہ کی جمہوری فریڈم پارٹی اور یاسین ملک کا گروپ بھی مکمل خودمختاری کی حامی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن اس سلسلے میں ان میں لبریشن فرنٹ کی سی شدت اور عزم نہیں۔

آزاد کشمیر میں جموں کشمیر نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن 1966ء میں مرحوم راجہ ممتاز حسین راٹھور کی سربراہی میں قائم ہوا گو اسکے قیام اور اس کا آئین مرتب کرنے میں میرا بھی خاصا ہاتھ تھا۔ یہ کشمیری قوم پرست طلباء کی سب سے بڑی تنظیم تھی لیکن کچھ مدت بعد اسکی قوم پرستی اور قومی خودمختاری کی جگہ سوشلزم، کمیونزم نے لے لی اور اسکا ''کشمیر بنے گا خودمختار'' کا نعرہ ''ایشیا سرخ ہے'' کے نعرے کے نیچے دب گیا۔ بہرحال یہ تنظیم بھی خاصے نشیب و فراز سے گزری ہے۔ اسکی تمام تر کمزوریوں کے باوجود نظریۂ خودمختار کشمیر کو تقویت دلانے میں اسکا خاصا ہاتھ ہے۔ اسکے بانی راجہ ممتاز حسین راٹھور کچھ مدت آزاد کشمیر کے وزیراعظم بھی رہے۔ این ایس ایف سے فارغ ہونے والے کچھ لوگوں نے جموں کشمیر نیشنل عوامی پارٹی بنائی ہے جسکے اولین سربراہ نکیال کوٹلی کے سردار محمد انور خان تھے۔ اور آج کل اسکے سربراہ پروفیسر خلیق ہیں۔ کچھ اور قوم پرست نوجوانوں نے جن میں بیرسٹر قربان علی اور شوکت علی کشمیری شامل ہیں جموں کشمیر پیپلز نیشنل پارٹی قائم کی تھی جو کچھ مدت بعد دو حصوں میں تقسیم ہو گئی بعد میں دونوں اصحاب بیرون ملک چلے گئے۔

ریاست کی مکمل خودمختاری کی داعی ایک اور تنظیم کشمیر فریڈم موومنٹ ہے۔ یہ کشمیر کے اسلامی تشخص کو خصوصی اہمیت دیتی ہے اسے اسلامی جمہوریہ بنانا چاہتی ہے۔ اس تنظیم کے زعما میں افسر شاہد ایڈووکیٹ، سردار آفتاب، بیرسٹر آصف شامل ہیں۔ 1976ء میں دوسرا بھارتی جہاز اغوا کر کے پاکستان پہنچانے والے کشمیری گروپ کے سربراہ عبدالحمید دیوانی فریڈم موومنٹ کے بانیوں میں سے تھے لیکن وہ الحاق پاکستان کے داعی تھے۔

برطانیہ میں لاکھوں آزاد کشمیری آباد ہیں چنانچہ ان میں سے کچھ اصحاب خاص کر مرحوم لالہ عبدالرحمٰن، انکے بھائی راجہ محمد خان، مقبول خاور، سلطان علی شاہ وغیرہ نے وہاں خودمختار کشمیر کی داعی تنظیم

کشمیر انڈیپینڈنس موومنٹ قائم کی۔ سلطان علی شاہ نے لندن سے ''دی فرنٹ'' نام کا ایک ہفت روزہ بھی شروع کیا۔ راجہ حبیب خان مسلم کانفرنسی ہونے کے باوجود ذاتی طور پر خودمختاری کے کٹر حامی ہیں۔ 1981ء سابق بھارتی وزیراعظم مسز اندرا گاندھی کے برمنگھم کے ڈگبیتھ ہال کے جلسے میں راجہ صاحب نے اکیلے ہی خودمختار کشمیر کے حق میں نعرے لگائے جو ٹی وی پر بھی دکھائے گئے۔ راجہ صاحب نے ہماری خاصی مالی مدد بھی کی۔ 1973ء میں برطانیہ میں محاذ رائے شماری قائم ہوا جس نے نظریۂ خودمختار کشمیر کا پرچار محدود پیمانے پر ہی سہی شروع کیا لیکن برطانیہ میں محاذ رائے شماری کو مئی 1977ء میں جموں کشمیر لبریشن فرنٹ میں تبدیل کیا گیا۔ دراصل یہ تبدیلی میری کوششوں اور محاذ کے ممبروں کے تعاون سے عمل میں آئی۔ لبریشن فرنٹ نے نظریۂ خودمختار کشمیر کو واضح طور پر اپنا نصب العین بنایا اور اس کا پرچار ساری دنیا میں کرتا رہا۔ 1981ء تک لبریشن فرنٹ کی شاخیں یورپ کے بہت سے ملکوں کے علاوہ امریکہ اور مشرق وسطیٰ میں سعودی عرب اور عرب امارات میں بھی قائم ہوئیں۔ 1982ء میں اس کی شاخیں آزاد کشمیر میں اور 1987ء میں بھارتی مقبوضہ کشمیر میں قائم ہوئیں۔ اور گذشتہ 27 برس سے لبریشن فرنٹ ہر ممکن طریقے سے نظریۂ خودمختار کشمیر کو اندرون ملک اور عالمی سطح پر اجاگر کر رہا ہے۔ مختلف وجوہات کی بناء پر کئی بار اسکی شکست وریخت ہوئی ان تیز وتند ہواؤں کے باوجود میں اور میری تنظیم اپنی جگہ کھڑے ہیں۔ اور میری تنظیم ہی نظریۂ خودمختار کشمیر کی اہم ترین اور سرگرم ترین ترجمان تنظیم تسلیم ہوتی ہے۔ البتہ اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہم سے الگ ہونے والے کچھ اصحاب کا بھی اس نظریئے کو قلم اور زبان کے ذریعے آگے بڑھانے میں خاصا کردار ہے۔ اگرچہ نظریۂ خودمختار کشمیر کے بانیوں میں مرحوم شیخ محمد عبداللہ بھی شامل تھے بلکہ ایک زمانے میں اسکے سب سے بڑے علمبردار تھے۔ لیکن جیسا کہ میرے نام ان کے خط (جو کتاب کی پہلی جلد کے آخر میں شائع ہوا تھا) سے ظاہر ہوتا ہے وہ اپنی زندگی کے اواخر میں حالات سے بددل ہوکر اس نظریئے کی افادیت اور قابل عمل ہونے سے ہی منکر ہوگئے تھے لیکن ان کا یہ استدلال حقیقت کی نہیں بلکہ ان کی مایوس ذہنی کیفیت کی عکاسی کرتا ہے۔

نظریۂ خودمختار کشمیر سے متعلق تعجب کی ایک بات یہ ہے کہ ریاست جموں کشمیر بھر میں پوری ریاست کی مکمل خودمختاری کے حق میں واضح اور غیر مبہم قرارداد منظور کرانے والی پہلی بار ایسوسی ایشن سنٹرل بار ایسوسی ایشن گلگت تھی جس نے یہ قرارداد غالباً 1991ء میں منظور کی تھی۔ جبکہ پاکستان میں یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ گلگت بلتستان کے لوگ اپنے علاقوں کو ریاست جموں کشمیر کا حصہ ہی تسلیم نہیں کرتے۔ گلگت بلتستان کی تاریخ اور جغرافیہ سے ناواقف اور پاکستان کی نوکر شاہی کے گمراہ کردہ لوگوں یا گماشتوں پر مشتمل ایک طبقہ اس موقف کی رٹ لگائے ہوئے ہے کہ گلگت بلتستان کشمیر کا حصہ ہی نہیں جبکہ ان علاقوں کا دانشور اور سیاسی سوجھ بوجھ کا حامل طبقہ گلگت بلتستان کو کشمیر کا حصہ تسلیم کرتے ہوئے ریاست کے تینوں حصوں پر مشتمل ایک خودمختار ملک کا مطالبہ کرتا ہے۔

الغرض نظریۂ خودمختار کشمیر کوئی نیا نظریہ نہیں۔ یہ بھارت، پاکستان اور کشمیر میں اور عالمی سطح پر

مدت سے موجود ہے اور اندرون ریاست خاصی تیزی سے مقبول ہو رہا ہے لیکن بھارت اور پاکستان دونوں اسکے مخالف ہیں اور دونوں نے ریاست کے دونوں حصوں میں روایتی اور کرسی پرست قیادت کو اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ جو نظریہ خودمختار کشمیر کے نظریے کے راستے میں بھارت اور پاکستان کی حکومتوں کے بعد سب سے بڑی رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔

کیا نظریہ خودمختار کشمیر قابل عمل ہے؟

نظریہ خودمختار کشمیر کے مخالفین اس نظریے کے خلاف سب سے بڑی دلیل یہ دیتے ہیں کہ یہ ناقابل عمل ہے۔ اس دلیل کے دو معنی اخذ کئے جاسکتے ہیں۔ اولاً یہ کہ بھارت اور پاکستان کشمیریوں کو خودمختاری دینے پر راضی نہیں ہو جائیں گے اور ثانیاً یہ کہ اگر کشمیر کو خودمختاری مل بھی گئی تو وہ (خودمختار کشمیر) دفاعی، سیاسی اور اقتصادی طور پر زندہ نہیں رہ سکے گا۔

آیئے اس بارے میں حقائق تلاش کریں۔

مسئلہ کشمیر سے متعلق سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ اس کا ایک پرامن، جمہوری، منصفانہ اور پائیدار حل بھارت، پاکستان اور کشمیر تینوں کے لئے ایک پرامن، خوشحال اور باعزت مستقبل کے لئے دروازے کھول دے گا۔ جبکہ اس مسئلے کا ایسے ہی لٹکے رہنا پورے جنوبی ایشیا کو ایک ایٹمی جنگ کی تباہ کاریوں کا نشانہ بنا سکتا ہے اگر جنگ نہ بھی ہو تو بھی مسئلے کی وجہ سے پیدا شدہ پاک بھارت کشیدگی دونوں ملکوں کے وسائل کا خون چوستی رہے گی اور دونوں ملک عالمی سطح پر ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش میں خود اپنی ہی ساکھ کھوتے رہیں گے۔ اس لئے بھارت، پاکستان اور کشمیر کے مفاد میں یہی بات ہے کہ یہ مسئلہ پرامن، منصفانہ اور مستقل طور پر حل ہو جائے۔

مسئلے سے متعلق دوسری اہم حقیقت یہ ہے کہ بھارت اور پاکستان دونوں نے اس مسئلے کو اپنی قومی انا کا مسئلہ بنایا ہے (کم از کم 6 جنوری 2004ء سے پہلے ایسا تھا) اور دوسرے فریق کو اس مسئلے پر کسی قسم کی رعایت دینا اپنی شکست تصور کرتے تھے بلکہ دونوں کی حکومتیں سمجھتی تھیں کہ کشمیر پر دوسرے فریق کو کوئی جائز رعایت دیکر بھی وہ قائم نہیں رہ سکتی ہیں۔ چہ جائیکہ اپنے زیر انتظام کشمیر کا کوئی علاقہ دوسرے فریق کو دیکر وہ قائم رہ سکیں۔ دونوں نے مسئلہ کشمیر کو اپنے قومی نظریئے سے بھی جوڑ رکھا تھا یعنی بھارت نے اپنے سیکولرازم کے ساتھ اور پاکستان نے اپنے دوقومی نظریئے کے ساتھ۔ دونوں اس مسئلے کو اپنی سلامتی سے بھی منسلک گردانتے۔ یعنی اگر سارا کشمیر ایک کو مل گیا تو دوسرے کی قومی سلامتی خطرے میں پڑ جائے گی اگرچہ 6 جنوری 2004ء کے پاک بھارت معاہدے نے یہ صورتحال بدل دی ہے یعنی دونوں نے اپنے مواقف میں کچھ تبدیلی لائی ہے لیکن یہ تبدیلی منفی ہے اسلئے عام خیال یہی ہے کہ یہ صورتحال جلد ہی بدل جائے گی کیونکہ جنگ بندی لائن یا لائن آف کنٹرول کو مستقل پاک بھارت سرحد بنانا کشمیریوں کے لئے قابل قبول نہیں۔ اگر قابل قبول ہوتا تو مسئلہ کشمیر جولائی 1949ء میں ہی حل ہو گیا ہوتا جب یہ خونی لکیر

کھینچی گئی تھی۔ علاوہ ازیں اگر لائن آف کنٹرول کو ہی پاک بھارت سرحد بنانا تھا تو گزشتہ 16 سال کے دوران دی گئی عظیم قربانیاں کہاں جائیں گی بھارت کے لئے تاریخ کا تلخ سبق یہ بھی ہے کہ وہ طاقت کے بل بوتے پر کشمیریوں کو ہمیشہ کے لئے غلام بنائے نہیں رکھ سکتا ہے نہ ہی پاکستان کشمیریوں کی قومی امنگوں اور جائز مفادات کو اپنے مفادات پر قربان کر کے سکھ کی نیند سو سکتا ہے۔

یہ سب تلخ اور شیریں حقائق یہ واضح سبق دیتے ہیں کہ اگر بھارت پاکستان اور ریاست جموں کشمیر کو ایک خوفناک ایٹمی جنگ کی تباہ کاریوں اور پاک بھارت کشیدگی کے نتیجے میں دونوں پر پڑنے والے مالی بوجھ سے بچا کر تینوں اطراف کے تقریباً ڈیڑھ ارب باشندوں کے لئے ایک پرامن، خوشحال اور باعزت مستقبل کی ضمانت فراہم کرنی ہے تو ہمیں ایک ایسا طریقہ ڈھونڈنا ہوگا جو مسئلہ کشمیر کو بھارت اور پاکستان کی قومی انا اور دونوں کے قومی نظریوں خاص کر بھارت کے سیکولرازم کو مجروح کئے بغیر، دونوں کے جائز قومی مفاد کو نقصان پہنچائے بغیر، کسی ایک کو احساس شکست دیئے بغیر اور کشمیری عوام کی قومی امنگوں اور آزادانہ رائے کے مطابق حل کرے اور یہ جملہ شرائط پوری کرنے والا واحد حل یہ ہے کہ منقسم ریاست جموں کشمیر کو دوبارہ متحد کر کے وہاں ایک ایسی آزاد و خودمختار مملکت قائم کی جائے جس کا طرز حکومت جمہوری، وفاقی اور غیر فرقہ وارانہ ہو اور جس کے بھارت اور پاکستان دونوں سے دوستانہ تعلقات ہوں۔ 15 سال بعد وہاں اقوام متحدہ کے زیر نگرانی ریفرنڈم ہو جس میں کشمیری عوام یہ فیصلہ کریں کہ آیا کشمیر کی خودمختاری کو ہی مستقل شکل دی جائے، اسے بھارت یا پاکستان کا حصہ بنایا جائے یا مسئلے کا کوئی اور حل تلاش کر کے اسے عملی جامہ پہنایا جائے اور اسی عوامی فیصلے کو جملہ فریق مسئلہ کشمیر کا حتمی حل تسلیم کر کے اسے عملی جامہ پہنائیں۔

یہ فارمولا مسئلہ کشمیر کو بھارت یا پاکستان کی قومی انا مجروح کئے بغیر حل کرتا ہے اسلئے کہ اس میں بھارت یا پاکستان سے یہ نہیں کہا جاتا کہ وہ اپنے زیر کنٹرول کشمیر کو دوسرے کے حوالے کرے۔ اس سے بھارت کا سیکولرازم بھی متاثر نہیں ہوتا اس لئے کہ مسئلے کے اس حل کی بنیاد فرقہ واریت پر نہیں ہے۔ اور دونوں ملکوں کی سلامتی کو بھی خودمختار کشمیر سے کوئی خطرہ نہیں ہوگا اسلئے کہ اس فارمولے کے تحت خودمختار کشمیر کیلئے لازمی ہوگا کہ وہ دونوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھے اور اپنی سرزمین کو کسی کے خلاف استعمال ہونے نہ دے اور چونکہ کشمیر کے مستقبل کا حتمی فیصلہ کشمیری عوام خود کریں گے اس لئے یہ حل جمہوری قدروں پر مبنی بھی ہوگا۔

جہاں تک بھارت یا پاکستان کا مسئلہ کشمیر کے اس حل پر متفق ہونے کا تعلق ہے یہ ان کی مرضی ہے اگر ان ملکوں کے حکمران دونوں ملکوں اور کشمیر کی مکمل تباہی چاہتے ہیں تو وہ نامعقولیت اور ''میں نہ مانوں'' کے اپنے کھیل جاری رکھیں اور اگر انہیں تینوں کے مفاد کا خیال ہے تو اس مسئلے پر ٹھنڈے دل سے سوچنا ہوگا۔ اور ہر ٹھنڈے دل اور خلوص کے ساتھ سوچنے والے انسان کو مسئلہ کشمیر کا اس سے زیادہ معقول اور منصفانہ حل اور کوئی نہیں ملے گا۔

اس سلسلے میں ایک اور اہم حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور وہ یہ کہ مسئلہ کشمیر صرف بھارت یا پاکستان کے حکمرانوں کی خواہشات کے تابع نہیں ہے حالات ایسے پیدا ہو سکتے ہیں کہ بھارت اور پاکستان نہ چاہنے کے باوجود مسئلہ کشمیر کے اس حل پر متفق ہو جائیں گے۔ انگریز برصغیر سے رضا کارانہ طور پر نہیں گیا جنگ عظیم دوم کے نتیجے میں پیدا ہونے والے حالات نے اسے برصغیر چھوڑنے پر مجبور کیا۔ پاکستان خوشی سے اپنے مشرقی بازو سے دستبردار نہیں ہوا اسے ہونا پڑا۔

جہاں تک خودمختار کشمیر کے قیام کے بعد اسکے دفاعی سیاسی اور معاشی طور پر زندہ رہ سکنے کے امکانات کا تعلق ہے یہ سوال ہی کشمیر سے متعلق حقائق سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

جہاں تک خودمختار کشمیر کے دفاع کا تعلق ہے اس حقیقت کا ذکر کرنا ہی بے جا ہے کیونکہ کشمیر اپنے کسی بھی ہمسائے سے دشمنی رکھ کر اپنا دفاع نہیں کر سکتا۔ یا زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسلئے ضروری ہے کہ خودمختار کشمیر کے اپنے تمام ہمسائیوں خاص کر بھارت، پاکستان اور چین سے دوستانہ تعلقات ہوں۔ اسکے ہمسائے ضمانت دیں کہ وہ اس کے اندرونی معاملات اور سرحدوں پر مداخلت نہیں کرینگے۔ اور خودمختار کشمیر کی حکومت ضمانت دے کہ وہ اپنی سرزمین کو کسی ملک کیخلاف استعمال ہونے نہیں دیگی۔ خودمختار کشمیر پوری کوشش کرے کہ ان ضمانتوں پر پوری طرح عمل ہو۔ اگر پوری کوشش کے باوجود اس انتظام پر پوری طرح عمل نہ ہو سکے اور خودمختار کشمیر کو اپنی سالمیت اور سلامتی خطرے میں نظر آئے تو وہ اس خطرے سے محفوظ رہنے کیلئے اپنے کسی دوست اور خیر خواہ ملک یا ممالک کیساتھ دفاعی معاہدہ کر کے اپنے دفاع کو یقینی بنا سکتا ہے۔ الغرض خودمختار کشمیر کا دفاع کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہوگا۔

جہاں تک خودمختار کشمیر کے سیاسی اور سماجی مسائل کا تعلق ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ ریاست جموں کشمیر کے لوگ نصف درجن بھر مختلف مذہبوں، زبانوں اور علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی لئے ہم نے اس کے لئے جمہوری، وفاقی اور غیر فرقہ وارانہ طرز حکومت تجویز کی ہے۔ جمہوری اسلئے کہ جمہوری طرز حکومت اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود دوسرے طرز کی حکومتوں سے بہتر ہوتی ہے۔ ہم نے وفاقی طرز حکومت اس لئے تجویز کی ہے کہ خودمختار کشمیر کے پانچ صوبے (جموں، وادی، لداخ، آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان) ہوں گے اور انہیں زیادہ سے زیادہ اندرونی خودمختاری حاصل ہوگی۔ نیشنل اسمبلی اور سینٹ پر مشتمل پارلیمنٹ ہوگی۔ سینٹ میں ہر صوبے کو برابر کی نمائندگی حاصل ہوگی جبکہ نیشنل اسمبلی میں نمائندگی آبادی کی بنیاد پر ہوگی۔ مرکز کسی صوبے سے متعلق کسی معاملے کو متعلقہ صوبے پر اس کی مرضی کے خلاف مسلط نہ کر سکے گا۔ طرز حکومت غیر فرقہ وارانہ اسلئے ہو کہ خودمختار کشمیر کی تقریباً ایک چوتھائی آبادی غیر مسلموں پر مشتمل ہوگی۔

چنانچہ خودمختار کشمیر میں جمہوری، وفاقی اور غیر فرقہ وارانہ طرز حکومت کے نتیجے میں کوئی بڑا سیاسی، سماجی یا مذہبی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا۔

جہاں تک اقتصادی مسئلے کا تعلق ہے ہم پورے وثوق کے ساتھ اور اعداد و شمار کی بنیاد پر دعویٰ

کرتے ہیں کہ خودمختاری کے حصول کے ایک ڈیڑھ عشرے کے اندر اندر کشمیر، بھارت، پاکستان، بنگلہ دیش، نیپال اور افغانستان وغیرہ سے کہیں زیادہ خوشحال ہو جائیگا۔ ایک ڈیڑھ عشرے کا وقت اس لئے لگے گا کہ اس دوران اس کے سیاحتی، صنعتی، زرعی اور دوسرے وسائل (Potentials) کو منظم کر کے انہیں جدید طرز پر استوار کیا جائے گا۔ ہماری معیشت کے ان بنیادی ستونوں کے علاوہ گھریلو صنعتیں جنگلات، پھل فروٹ، بیرون ملک ہمارا پانچ لاکھ افراد پر مشتمل مین پاور (جس میں ہزاروں کی تعداد میں ڈاکٹر اور انجینئر بھی شامل ہوں گے) معدنیات، قالین سازی وغیرہ سے ہم اپنی ضرورت سے کہیں زیادہ زرمبادلہ کما سکتے ہیں۔ کشمیر کی خودمختاری کے مخالفین ایک اعتراض یہ کرتے ہیں کہ کشمیر کے پاس نہ تو اپنی کوئی بندرگاہ ہے نہ وہاں پٹرول نکلتا ہے۔ اس لئے وہ اقتصادی طور پر ہمیشہ دوسروں کا محتاج رہے گا۔ اس سلسلے میں پہلے تو یہ عرض ہے کہ آج کی دنیا میں دنیا کا کوئی بھی ملک قومی ضرورت کی ہر چیز میں خود کفیل نہیں یہاں تک کہ نام نہاد واحد سپر پاور امریکہ بھی نہیں۔ اسے بھی پٹرول سمیت سینکڑوں قسم کی ضروری اشیاء باہر سے خریدنی پڑتی ہیں۔ دنیا کے 191 میں سے 39 یا 40 ملکوں کی اپنی بندرگاہ نہیں اور پٹرول دنیا کے صرف 15 فیصد ملکوں میں نکلتا ہے۔ لیکن بندرگاہ اور پٹرول نہ نکلنے کے باوجود یہ ملک جیتے ہیں بلکہ ان میں سے اکثر خاصے خوشحال ہیں۔

خودمختار کشمیر کیلئے انتظامی ضروریات پہلے سے ہی پوری ہیں۔ اس وقت ریاست جموں کشمیر میں تین حکومتیں اور تین اسمبلیاں سرگرم عمل ہیں۔ یعنی بھارتی مقبوضہ کشمیر کی حکومت، اسمبلی اور کونسل، آزاد کشمیر کی انتظامیہ اسمبلی اور کشمیر کونسل اور گلگت بلتستان کی انتظامیہ اور قانون ساز کونسل۔ عبوری دور کیلئے ان تینوں پر مشتمل مرکزی حکومت اور پارلیمنٹ بنائی جاسکتی ہے۔ اسلئے انتظامی لحاظ سے بھی خودمختار کشمیر کوئی کمی محسوس نہیں کریگا۔ ایک اہم سوال یہ بھی کیا جاتا ہے کہ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا یعنی کشمیر کو خودمختاری دینے پر بھارت اور پاکستان کو راضی کون کریگا۔ اس سلسلے میں پہلے تو عرض ہے کہ مسئلہ کشمیر کے حل ہونے کے اتنے بڑے فوائد اور نہ ہونے میں اتنے سنگین خطرات کے پیش نظر دونوں ملکوں کے عوام، سیاسی پارٹیوں اور حکومتوں کو خود ہی احساس ہونا چاہیئے کہ مسئلے کا حل ہونا دونوں کے بہترین مفاد میں ہے۔ اگر انہیں یہ احساس نہ ہو اور اغلباً نہیں ہوگا اسلئے عالمی برادری کو پوری طاقت کے ساتھ سامنے آنا چاہیئے اسلئے کہ پاک بھارت جنگ کی صورت میں عالمی امن اور عالمی اقتصادی نظام بھی درہم برہم ہو جائیں گے۔ اس سلسلے میں ہماری تجویز یہ ہے کہ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل، سلامتی کونسل کے مستقل ممبروں (امریکہ، روس، چین، فرانس، برطانیہ) غیر جانبدار تحریک، اسلامی کانفرنس، یورپین یونین، جرمنی اور جاپان کے نمائندوں پر مشتمل ایک انٹرنیشنل کشمیر کمیٹی قائم ہو۔ اس کمیٹی کی سفارتی، اقتصادی اور سیاسی طاقت اتنی ہوگی کہ بھارت یا پاکستان اس کی بات ماننے سے انکار نہیں کرسکیں گے۔ علاوہ ازیں کمیٹی غیر جانبدار بھی ہوگی کیونکہ اس میں دونوں ملکوں کے دوست شامل ہیں اور سلامتی کونسل کی 6 جون 1998ء کی متفقہ قرارداد نمبر 1172 کے تحت اقوام متحدہ کا فرض بنتا ہے کہ وہ مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کی کوشش کرے اور اس سلسلے

میں بھارت اور پاکستان کی حکومتوں اور ریاست جموں کشمیر کے تینوں حصوں (بھارتی مقبوضہ حصے، آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان) کی تمام سیاسی پارٹیوں کا تعاون حاصل کرے (مسئلہ کو مرحلہ وار حل کرنے کی تفصیلات ہمارے روڈ میپ میں ہیں)

الغرض نہ صرف یہ کہ خودمختار کشمیر کا قیام ممکن ہے اور وہ نہ صرف قائم رہے گا بلکہ ایک ڈیڑھ عشرے کے اندر اندر جنوبی ایشیا کا خوشحال ترین ملک بھی بن جائے گا۔ قصہ مختصر، نظریۂ خودمختار کشمیر کوئی نیا نظریہ نہیں۔ کشمیر اپنی تاریخ کے بڑے حصے کے دوران خودمختار رہا ہے اور اس سے بھی اہم بات یہ کہ بھارت اور پاکستان دونوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات پر مبنی کشمیر کی خودمختاری تینوں کے بہترین مفاد میں ہے۔

نوٹ: خودمختار کشمیر کے فوائد کیلئے دیکھئے میرے دو کتابچے ''نظریہ خودمختار کشمیر'' اور خودمختار کشمیر کیوں'' کے علاوہ اگلے عنوان ''مسئلہ کشمیر کے حل کیلئے ہمارا روڈ میپ'' کا ذیلی عنوان ''فارمولے اور روڈ میپ کی اہم خصوصیات''

حصہ پنجم

مسئلہ کشمیر کے حل کیلئے ہمارا روڈ میپ

1- روڈ میپ کا مقصد
2- فارمولا
3- روڈ میپ کی بنیاد
4- پانچ مرحلے
5- روڈ میپ کی اہم خصوصیات
6- اعتراضات

مسئلہ کشمیر کے حل کیلئے ہمارا روڈ میپ

جموں کشمیر لبریشن فرنٹ وقتاً فوقتاً ریاستی علاقائی اور عالمی سطح کی صورتحال کی روشنی میں مسئلہ کشمیر کیلئے قابل عمل، پرامن اور منصفانہ حل پیش کرتا رہا ہے۔ یہ سارے حل بنیادی طور پر میرے ہی ذہن کی پیداوار ہوتے تھے۔ ان کی حتمی منزل بھی ایک ہی ہوتی ہے یعنی ریاستی عوام کیلئے غیر محدود غیر مشروط حق خودارادیت کا حصول۔ البتہ تنظیم کی سنٹرل کمیٹی اس پر بحث کر کے اور اس میں زمینی حقائق اور رجحانات کی روشنی میں حسب ضرورت ترامیم کر کے اسے منظور کرتی رہی ہے۔

لبریشن فرنٹ کا مسئلہ کشمیر کیلئے تازہ ترین روڈ میپ (نقشہ راہ) بھی بنیادی طور پر میرے ہی ذہن کی پیداوار ہے جسے تنظیم کی سنٹرل کمیٹی نے اپنے اجلاس منعقدہ راولاکوٹ آزاد کشمیر مورخہ 28 مئی 2003ء میں پاس کر کے فیصلہ کیا کہ اسے انگریزی میں

THE JKLF ROADMAP FOR PEACE AND PROSPERITY IN SOUTH ASIA.

(جنوبی ایشیا کیلئے امن اور خوشحالی کے حصول کیلئے لبریشن فرنٹ کا نقشہ راہ)

کے عنوان سے شائع کر کے عالمی سطح پر اور اسکا اردو ترجمہ اندرون ریاست اور بھارت پاکستان میں تقسیم کیا جائے۔ چنانچہ ہم نے ایسا ہی کیا۔ اور اس روڈ میپ کو میں نے 14 جون 2003ء کو اسلام آباد میں متعین سفارتکاروں، قومی اور عالمی پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے سامنے لانچ (LAUNCH) کیا اور اس کی کاپیاں بڑی تعداد میں قومی اور عالمی سطح پر تقسیم کرائیں۔

روڈ میپ کا مقصد

اس روڈ میپ کا مقصد جنوبی ایشیا کی اہم قوموں بھارت اور پاکستان جو پہلے ہی تین جنگیں لڑ چکی ہیں اور چوتھی اور ایٹمی جنگ کے دہانے پر کئی بار آئیں، کو ایک ایسے پرامن مقام تک پہنچانا ہے جہاں ان دونوں ملکوں کو ایک پرامن، خوشحال اور آبرومندانہ قومی اور انفرادی زندگی کی ضمانت ملے اور کشمیر (جس نے سب سے زیادہ نقصان برداشت کیا ہے) کے عوام کو بھی ان کا پیدائشی، عالمی سطح پر تسلیم شدہ اور موعود حق خودارادیت ملے۔

(ا) فارمولا

ہمارے روڈ میپ کا فارمولا یہ ہے کہ منقسم ریاست جموں کشمیر کو ایک انٹرنیشنل کشمیر کمیٹی جس کو ہندوستان، پاکستان کی حکومتوں اور کشمیر کی سیاسی پارٹیوں کی تائید اور تعاون حاصل ہو، کے زیر اہتمام پانچ پرامن مرحلوں میں دوبارہ متحد کر کے اسے عارضی طور پر ایک ایسی خودمختار مملکت بنایا جائے جس کا نظام حکومت جمہوری، وفاقی اور غیر فرقہ وارانہ ہو اور جس کے ہندوستان اور پاکستان دونوں سے لازمی دوستانہ تعلقات ہوں جو یہ ضمانت بھی دیں کہ وہ کشمیر کی سرحدوں اور اسکے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کریں گے اور جواب میں کشمیر یہ ضمانت دے کہ وہ اپنی سرزمین کو کسی کے خلاف استعمال ہونے نہیں دے گا۔ دوبارہ متحد اور خودمختار ہونے کے پندرہ سال بعد وہاں اقوام متحدہ کی زیر نگرانی ایک آزادانہ اور شفاف ریفرنڈم کروایا جائے جس میں جموں کشمیر کے عوام یہ فیصلہ کریں کہ آیا کشمیر کی مکمل آزادی کو ہی مستقل شکل دی جائے، اسے ہندوستان یا پاکستان کا حصہ بننا چاہیئے یا مسئلے کا کوئی اور حل نکالا جائے۔ اس عوامی فیصلے کو تمام متعلقہ فریق یعنی ہندوستان، پاکستان، کشمیری عوام اور عالمی برادری مسئلہ کشمیر کے حتمی حل کے طور پر قبول کریں اور اسے عملی جامہ پہنائیں۔ انٹرنیشنل کشمیر کمیٹی اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل، سلامتی کونسل کے پانچ مستقل ممبروں، یورپی یونین، غیر جانبدار تحریک، اسلامی کانفرنس، جرمنی اور جاپان کے ایک ایک نمائندے پر مشتمل ہو۔

روڈ میپ کی بنیاد

اس روڈ میپ کی بنیاد مندرجہ ذیل تلخ و شیریں تاریخی اسباق اور زمینی حقائق پر ہے

(ا) بھارت اور پاکستان دونوں نے مسئلہ کشمیر کو اپنی قومی انا کا مسئلہ بنانے کے علاوہ اسے اپنی قومی سلامتی اور قومی نظریوں سے بھی منسلک کر دیا ہے چنانچہ کوئی بھی ایسا حل جو انکی قومی انا کو مجروح کرتا ہو یا انکے جائز مفادات کو نقصان پہنچاتا ہو ان کیلئے قابل قبول نہیں ہوگا۔ اسلئے وہ حل قابل عمل بھی نہیں ہوگا۔ خواہ وہ کتنا ہی منصفانہ اور جمہوری کیوں نہ ہو۔

(ب) بھارتیوں کی یہ سوچ بالکل غلط ہے کہ وہ کشمیر پر کشمیریوں کی مرضی کے خلاف ہمیشہ کیلئے قابض رہ سکتے ہیں۔ اسی طرح پاکستانیوں کی یہ سوچ بھی بے بنیاد ہے کہ کشمیر کا بھارتی مقبوضہ علاقہ بھی جلد یا بدیر ان کی جھولی میں آ گرے گا۔

(ج) بھارت اور پاکستان مسئلہ کشمیر کو دوطرفہ مذاکرات کے ذریعے حل نہیں کر سکتے کیونکہ یہ دونوں اس مسئلے کو گزشتہ نصف صدی کے دوران حل نہیں کر سکے ہیں۔ اسلئے یہ مسئلہ کسی ایسے عالمی ادارے یا کمیٹی کی ثالثی، پنچایت یا مدد کے بغیر حل نہیں ہو سکتا جو مضبوط سفارتی طاقت کی حامل اور غیر جانبدار ہو۔

(د) مسئلہ کشمیر کا کوئی بھی ایسا حل جو ان تمام علاقوں کے لوگوں کی امنگوں اور آزادانہ طور پر ظاہر کئے گئے جذبات پر مبنی نہ ہو جو 15 اگست 1947ء کو اس ریاست جموں کشمیر میں شامل تھے، دیرپا ثابت نہیں ہوسکتا۔ تاریخ اس حقیقت کے واضح ثبوت پیش کرتی ہے۔

(ر) مذہبی، ثقافتی یا علاقائی بنیاد پر ریاست کی کسی بھی قسم کی تقسیم وسیع پیمانے کے خون خرابے اور نقل مکانی پر منتج ہوگی۔

(س) پاکستان اور بھارت کشمیر سے متعلق اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عمل نہ ہونے کی ذمہ داری ایک دوسرے پر ڈالتے ہیں۔ قطع نظر اس بات کے کہ اس سلسلے میں کس کا دعویٰ صحیح ہے۔ اب یہ قراردادیں ناقابل عمل ہوچکی ہیں۔

درج بالا حقائق کو نظر انداز کر کے مسئلہ کشمیر کا کوئی منصفانہ، قابل عمل اور مستقل حل نہیں ڈھونڈا جاسکتا۔ اسلئے ہم نے ان حقائق، مسئلہ کشمیر کی سابقہ تاریخ اور موجودہ علاقائی اور عالمی صورتحال کو مدنظر رکھ کر مسئلے کو پرامن، منصفانہ، جمہوری، آبرومندانہ اور مستقل طور پر حل کرنے کے لئے ایک فارمولا مرتب کیا اور اسے روڈ میپ کی شکل میں پیش کیا ہے روڈ میپ کے پانچ مرحلے مندرجہ ذیل ہیں۔

(ب) روڈ میپ کے پانچ مرحلے

پہلا مرحلہ :- اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کا فرض ہے کہ وہ سلامتی کونسل کی 6 جون 1998ء کی متفقہ قرارداد نمبر 1172 کی تعمیل کے طور پر جس میں عالمی ادارے نے یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تناؤ ختم کرنے کیلئے ضروری اقدامات کرے گا جسکا بہترین طریقہ مسئلہ کشمیر کو حل کرنا ہے، مجوزہ انٹرنیشنل کشمیر کمیٹی قائم کرے۔ انٹرنیشنل کشمیر کمیٹی بیٹھ کر روڈ میپ کو عملی شکل دینے کیلئے تفصیلی پروگرام مرتب کرے۔ پروگرام اس طرح ترتیب دیا جائے کہ روڈ میپ کے پانچ میں سے پہلے چار مرحلے 18 ماہ کے اندر اندر پایہ تکمیل کو پہنچیں۔ پہلے مرحلے کا دوسرا اقدام تمام معاملات کو ہندوستان، پاکستان اور کشمیر میں سیز فائر لائن کے دونوں طرف کی سیاسی پارٹیوں کے سربراہوں سے گفت وشنید کے ذریعے ان سے اس فارمولے کو تسلیم کرانے اور اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے ان کا تعاون حاصل کرنا ہوگا۔

انٹرنیشنل کشمیر کمیٹی اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل سے کہے گی کہ وہ کشمیر میں اقوام متحدہ کے فوجی مبصروں کی تعداد میں اضافہ کرے جو 1948ء سے کشمیر میں تعینات ہیں تاکہ وہ ہندوستان اور پاکستان کی افواج اور غیر ریاستی مسلح گروپوں کی واپسی اور کشمیری عسکری تنظیموں کو غیر مسلح کرنے میں کمیٹی کی مدد دیں۔

دوسرا مرحلہ :- اس مرحلے میں تمام ہندوستانی اور پاکستانی مسلح افواج، نیم فوجی دستے،

بیوروکریٹس، سول اور فوجی ایجنسیاں الغرض ہندوستان اور پاکستان کے وہ تمام ادارے اور اشخاص جو ریاست جموں کشمیر کے کسی بھی حصے میں کسی طرح کا بھی کام سرانجام دے رہے ہیں کشمیر سے ایک متفقہ دورانیے کے دوران نکل جائیں گے۔ ہر پارٹی نکلنے سے پہلے وہ تمام مائنز اور دھماکہ خیز سامان اور باڑ جو کہ اس نے سیز فائر لائن پر یا اس کے نزدیک نصب کیا تھا تباہ کر دے گی۔

تیسرا مرحلہ :- تیسرے مرحلے کا اہم کام انٹرنیشنل کشمیر کمیٹی کے ذریعے اور تمام کشمیری سیاسی جماعتوں اور مسلح تنظیموں کے تعاون سے بھارت مخالف اور بھارت نواز مسلح افراد کو غیر مسلح کیا جائے گا اور اس میں ہندوستان اور پاکستان کی حکومتیں بھی تعاون کرینگی۔ جو اپنے زیر اثر مسلح گروہوں پر زور دینگی کہ وہ خود غیر مسلح ہو جائیں اور اپنا اسلحہ حکام کے حوالے کر دیں۔ مسلح افراد کو غیر مسلح کرنے کے بعد ان تمام ریاستی شہریوں کو جو 1988ء کے بعد اپنے گھر چھوڑ چکے ہیں اور ہندوستان، جموں اور آزاد کشمیر میں یا کہیں اور رہ رہے ہیں کو اپنے اپنے گھروں کو جانے میں مدد کی جائیگی۔ وہ کشمیری جو 1947ء، 1965ء یا 1971ء کے دوران ریاست چھوڑ چکے ہیں اور اس وقت سے ہندوستان پاکستان یا کسی دوسرے ملک میں رہ رہے ہیں انہیں ریاست جموں کشمیر، ہندوستان، پاکستان یا وہ ملک جس میں وہ رہ رہے ہیں میں سے اپنے مستقل مادر وطن کے طور پر کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ دوسرے مرحلے کے اختتام سے چوتھے مرحلے کے اختتام تک مقامی انتظامیہ نظم ونسق کو برقرار رکھنے کی ذمہ دار ہوگی اور اقوام متحدہ کا ہندوستان اور پاکستان کیلئے فوجی مبصر گروپ جسکی تعداد میں اضافہ کیا جائے گا انتظامیہ کی مدد کرے گا۔

چوتھا مرحلہ :- اس مرحلے میں انٹرنیشنل کشمیر کمیٹی ریاست جموں کشمیر کے مختلف حصوں کی حکومتوں کے تعاون سے ان تمام راستوں کو جو ریاست کے ہندوستان کے زیر انتظام حصے کو پاکستان کے زیر انتظام حصوں سے ملاتے ہیں اور جو یکم جنوری 1949ء کو ہونے والی جنگ بندی کے نتیجے میں بند کر دیئے گئے تھے کھول دیگی۔ ریاست کے تینوں حصوں یعنی بھارت کے زیر انتظام، پاکستان کے زیر انتظام علاقوں اور آزاد کشمیر کے انتظامی اور عدالتی ڈھانچے اسی طرح جاری رہیں گے۔ لیکن انٹرنیشنل کشمیر کمیٹی سرینگر میں ایک قومی حکومت تشکیل دیگی جو کہ ریاست کے تمام علاقوں، تمام مذاہب، تمام اہم سیاری پارٹیوں، تینوں نظریات (الحاق ہندوستان، الحاق پاکستان اور خودمختار کشمیر) کے حامیوں پر مشتمل ہوگی۔ اور یہ اس وقت تک قائم رہے گی جب تک قومی اسمبلی کا انتخاب نہیں ہوتا۔ اس وقت تک کیلئے ہندوستان کے زیر کنٹرول کشمیر کی قانون ساز اسمبلی، آزاد کشمیر قانون ساز اسمبلی اور گلگت بلتستان قانون ساز کونسل پر مشتمل عارضی قومی اسمبلی تشکیل پائے گی۔

یہ قومی حکومت انٹرنیشنل کشمیر کمیٹی کے زیر نگرانی کام کریگی۔ انٹرنیشنل کشمیر کمیٹی قومی حکومت کے مشورے سے آئینی ماہرین پر مشتمل ایک آئین کمیٹی کا تقرر کریگی جو تین ماہ کے اندر اندر ریاست جموں کشمیر کیلئے ایک عبوری آئین بنائے گی جس میں متحدہ ریاست کے پانچ صوبے (وادیٔ کشمیر، جموں،

لداخ، آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان) ہوں۔ البتہ بلتستان والے خود فیصلہ کرینگے کہ وہ لداخ کے ساتھ رہینگے یا گلگت کیساتھ۔ ان صوبوں کو مناسب اندرونی خودمختاری حاصل ہوگی۔ اس آئین میں یہ بھی کہا گیا ہو کہ ریاست میں دو ایوانی پارلیمنٹ ہوگی جس میں ایوان زیریں آبادی کی بنیاد پر اور ایوان بالا میں پانچوں صوبوں کو برابر نمائندگی ہو اور عبوری آئین کے بننے کے تین ماہ کے اندر اندر ریاست میں انٹرنیشنل کشمیر کمیٹی کے زیر انتظام قومی آئین ساز اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کیلئے مجوزہ صوبوں میں پہلے سے موجود ووٹروں کی فہرست کی بنیاد پر آزادانہ انتخابات ہوں۔ ان انتخابات کے انعقاد سے ایک ماہ پہلے قومی حکومت کو توڑ دیا جائے۔ تمام سیاسی پارٹیوں کو یہ اجازت دی جائے کہ وہ الیکشن میں حصہ لیں اور اپنے سیاسی نظریات کو اجاگر کریں۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بننے والی نئی حکومت اہم دارالحکومتوں میں اپنے سفارتی مشن قائم کریگی اور دنیا سے اپنے آپ کو ایک آزاد مملکت تسلیم کرائے گی۔ یہاں ہر چار پانچ سال بعد (یا جیسا آئین میں درج ہو) عام انتخابات ہوتے رہیں گے۔ انٹرنیشنل کشمیر کمیٹی ضرورت کے مطابق ابتدائی انتظامی اور ترقیاتی اخراجات کیلئے فنڈز کا انتظام کریگی۔ انٹرنیشنل کشمیر کمیٹی کا کام پہلی منتخب حکومت کے قیام کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گا۔ البتہ یہ کمیٹی اس امر کو یقینی بنائے گی کہ تمام متعلقہ حلقے کشمیر کی سلامتی اور سالمیت سے متعلق کیے گئے تمام معاہدوں کا احترام کریں گے۔ انٹرنیشنل کشمیر کمیٹی کے قیام سے چوتھے مرحلے کی تکمیل تک کے مجوزہ اقدامات 18 ماہ کے اندر اندر پایہ تکمیل کو پہنچیں گے۔

پانچواں مرحلہ :- متحدہ ریاست جموں کشمیر کے خودمختار ہونے کے پندرہ سال بعد وہاں عالمی برادری کے زیر نگرانی اور فرانسیسی طرز انتخابات کے تحت ایک ریفرنڈم کے ذریعہ یہ معلوم کیا جائے کہ آیا کشمیری عوام کی خالص اکثریت ریاست کی خودمختاری کو ہی مستقل شکل دینا چاہتی ہے، ریاست کو بھارت یا پاکستان کا حصہ بنانا چاہتی ہے یا مسئلے کا کوئی اور حل چاہتی ہے۔ ریفرنڈم فرانسیسی طریقہ انتخاب کے تحت اسلئے ہونا چاہیئے کہ برطانوی طریقہ انتخاب جمہوریت کی روح کے منافی ہے۔ مثلاً ایک نشست کیلئے تین امیدوار ہیں یا کسی مسئلے کے تین متبادل حل ہیں۔ ایک امیدوار (یا مجوزہ حل) 40 فیصد ووٹ لیتا ہے۔ دوسرا 35 فیصد اور تیسرا 25 فیصد برطانوی طرز انتخاب کے تحت 40 فیصد (سب سے زیادہ) ووٹ لینے والا کامیاب قرار پائیگا جبکہ 60 = (25+35) فیصد ووٹ اسکے خلاف گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں دو سے زیادہ امیدوار ہوں وہاں عالمی اداروں کے تحت ہونے والے انتخابات فرانسیسی طرز پر ہوتے ہیں۔ درج بالا مثال میں فرانسیسی طریقہ یہ ہوگا کہ چونکہ کسی امیدوار نے 50 فیصد سے زیادہ ووٹ نہیں لئے ہیں (اگر لئے ہوتے تو وہی امیدوار قرار پاتا کیونکہ باقی دو امیدواروں کے ووٹوں کا مجموعہ 50 فیصد سے کم ہوتا) اسلئے ووٹنگ دوبارہ ہوگی اور پہلے انتخاب میں سب سے کم ووٹ لینے والے کا نام امیدواری سے خارج کر کے اور باقیوں کے مابین مقابلہ ہوگا اور یہ سلسلہ اس وقت تک چلے گا جب تک کوئی امیدوار 50 فیصد سے زیادہ ووٹ نہ لے اور 50 فیصد سے زیادہ لینے والا ہی کامیاب قرار پائیگا اور کشمیر کے مستقبل کے بارے میں جو بھی حل (مکمل خودمختاری۔ پاکستان سے الحاق۔ بھارت سے الحاق یا

کوئی اور حل) 50 فیصد سے زیادہ ووٹ لے گا مسئلہ کشمیر کے جملہ فریق اسی حل کو مسئلے کا حتمی حل تسلیم کر کے اسے عملی جامہ پہنائیں گے۔

اس طرح یہ فارمولا مسئلہ کشمیر کے اُسی حل کو قبول کریگا جو بالآخر دوسرے متبادل حلوں کے مجموعی ووٹوں سے بھی زیادہ ووٹ حاصل کرے یعنی صحیح معنوں میں جمہوری حل ہو۔ (اس حل کے ذریعہ وہ لوگ بھی مطمئن ہو جائیں گے جو یہ دلیل دیتے ہیں کہ ریاست کی خودمختاری اور الحاق پاکستان کے الگ الگ بیلٹ باکس رکھنے سے مسلمانوں کے ووٹ بٹ جائینگے جس سے بھارت نوازوں کو ناجائز فائدہ پہنچے گا۔)

فارمولے اور روڈ میپ کی اہم خصوصیات

1- ہمارا یہ فارمولا مسئلہ کشمیر کو ہندوستان اور پاکستان کی قومی انا کو مجروح کیے بغیر حل کرتا ہے کیونکہ اس میں بھارت یا پاکستان سے یہ نہیں کہا گیا کہ وہ اپنے زیر انتظام ریاست جموں کشمیر کا علاقہ دوسرے کے حوالے کرے۔

2- اس فارمولے کے تحت ہندوستان، پاکستان اور کشمیریوں کی طرف سے دی جانے والی ضمانتوں کی بنا پر تینوں میں سے کسی ایک کی سلامتی یا دوسرے قومی مفادات خطرے میں نہیں پڑتے۔

3- یہ فارمولا ہندوستان اور پاکستان دونوں کے قومی نظریات کی حفاظت کرتا ہے۔

4- یہ حل کشمیر کو ہندوستان اور پاکستان کے مابین فساد کی جڑ کی پوزیشن سے نکال کر دونوں کے درمیان دوستی کے پل میں تبدیل کر دیتا ہے۔

5- کشمیر کے ہندوستان اور پاکستان کے ساتھ لازمی دوستانہ تعلقات تینوں کو تجارت، معیشت اور دفاع میں بے شمار فائدے پہنچا سکتے ہیں۔

6- مسئلہ کشمیر کے اس طرح حل ہوتے ہی دونوں ملک اپنی آبادی کو غربت کی لائن کے نیچے سے باہر نکال کر خوشحالی کی طرف لے جا سکیں گے۔

7- مسئلہ کشمیر کے اس طریقے سے حل ہونے سے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تمام دوسرے تنازعات وقت گزرنے کے ساتھ خود بخود حل ہو جائیں گے۔

8- ہندوستان اور پاکستان دشمنی کی وجہ سے ایک دوسرے کو نقصان پہنچاتے رہے ہیں حتیٰ کہ عالمی اداروں میں بھی ایکدوسرے کی تذلیل کرتے رہے ہیں۔ جبکہ بحیثیت دوست (جو کہ وہ مسئلہ کشمیر کے حل ہونے سے یقیناً بن جائیں گے) وہ بین الاقوامی تعلقات میں ایک اہم اور قابل

عزت کردار ادا کر سکتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں دونوں کا قومی وقار نا قابل تصور سطح تک بلند ہو جائے گا۔

-9 اس فارمولے اور روڈ میپ کی بنیاد پر مسئلہ کشمیر ریاستی عوام کی قومی امنگوں اور آزادانہ طور پر ظاہر کی گئی رائے کے عین مطابق حل ہوگا کیونکہ اس کا حتمی حل آزادانہ ریفرنڈم کے ذریعہ ہی ہوگا۔

-10 یہ روڈ میپ مسئلہ کشمیر کو ایک قطرہ خون بہائے بغیر حل کریگا جبکہ اس کا حل نہ ہونا 1947ء سے اب تک لاکھوں قیمتی جانیں لے چکا ہے اور آئندہ اس سے بھی زیادہ لے سکتا ہے۔ مسئلہ کشمیر کے ہر دوسرے حل کے نتیجے میں کشمیر میں بڑے پیمانے کی خونریزی ہو سکتی ہے۔

-11 مسئلہ کشمیر کا یہ حل پورے جنوبی ایشیا کو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ممکنہ چوتھی اور پہلی ایٹمی جنگ کی تباہ کاریوں سے بچاتا ہے اور اس کے لئے ایک پرامن، خوشحال اور باعزت مستقبل کو یقینی بناتا ہے۔

-12 درج بالا حقائق کی روشنی میں اس روڈ میپ کو تسلیم کرنے سے اتنے عظیم مقاصد اتنی کم قیمت پر حاصل ہو جاتے ہیں۔ کیا بھارت اور پاکستان مستقل امن اور خوشحالی اور اطمینان کی ان عظیم منزلوں تک پہنچانے والے اس روڈ میپ کو مسترد کر کے ایک اور مہلک حماقت کے مرتکب نہیں ہونگے؟

اعتراضات

کچھ پاکستانیوں اور کشمیریوں کی طرف سے ہمارے فارمولے (جو اس روڈ میپ کی بنیاد ہے) پر دو اعتراضات کئے جاتے ہیں۔ پہلا اعتراض یہ ہے کہ جب تک بھارت مسئلہ کشمیر پر پاکستان یا کشمیریوں سے بات کرنے پر راضی نہیں ہوتا ہمیں کوئی فارمولا پیش نہیں کرنا چاہیئے۔ اس دلیل پر ہمارا موقف یہ ہے کہ بھارت کشمیر پر بات کرنے کیلئے اسی صورت میں راضی ہوگا جب اس کو کوئی ایسی تجویز پیش کی جائے جس کے ذریعے مسئلہ کشمیر بھارت کی قومی انا کو مجروح کئے بغیر اور اسکے جائز قومی مفادات کو نقصان پہنچائے بغیر حل ہو سکتا ہو۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اس فارمولے کو عملی جامہ کون پہنائے گا۔ اس بارے میں ہم یہ کہتے ہیں کہ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل، سلامتی کونسل اور G-8 جو اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل کی 6 جون 1998ء کی قرارداد نمبر 1172 اور G-8 کی 4 جون 1998ء کی قرارداد کے تحت اس بات کے پابند ہیں کہ وہ پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات کو معمول پر لانے کیلئے ہر ممکن کوشش کریں گے (جو کہ صرف

مسئلہ کشمیر کے پرامن اور منصفانہ حل کے ذریعے ہی ہوسکتا ہے) مزید براں یہ ہندوستان، پاکستان، کشمیری اور پوری دنیا کے لوگوں کی اخلاقی اور قومی ذمہ داری ہے کہ وہ ہندوستان، پاکستان اور کشمیر کی حکومتوں اور تمام سیاسی جماعتوں اور عالمی برادری کو مجبور کریں کہ وہ اس روڈ میپ کو جو کہ جنوبی ایشیا کیلئے مستقل امن اور خوشحالی کی ضمانت فراہم کرتا ہے قبول کریں اور اسے عملی جامہ پہنائیں۔

دور جدید میں اہم اور پیچیدہ قومی اور بین الاقوامی مسائل حل کرنے کا ایک آسان طریقہ ''کچھ دو کچھ لو'' کا نظریہ دریافت کیا گیا ہے۔ یہ طریقہ عام طور پر ناانصافی پر مبنی ہوتا ہے کیونکہ یہ ظالم اور مظلوم کو ایک ہی نظر سے دیکھتا ہے۔ بہرحال مسئلہ کشمیر کا بھی ''کچھ دو اور کچھ لو'' کی بنیاد پر ایک حل ممکن ہے اور اس حل کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ناانصافی پر مبنی بھی نہیں ہوگا اور ساتھ ہی انتہائی آسان بھی ہے اور وہ حل ہے ''کشمیر کشمیریوں کو واپس دو اور بھارت اور پاکستان کیلئے ایک پرامن اور روشن مستقبل لو''

''کچھ دو کچھ لو'' کے نظریئے کے تحت مسئلہ کشمیر کا دوسرا ممکن حل تقسیم کشمیر ہے لیکن یہ حل مسئلہ کشمیر کے اہم ترین فریق یعنی کشمیری عوام کو قبول نہیں جنہوں نے اس (تقسیم کشمیر) کے خلاف گزشتہ سترہ سال کے دوران عظیم قربانیاں دی ہیں اور اب تک اپنے 80 ہزار فرزند قربان کئے ہیں۔ اگر تقسیم کشمیر ہی مسئلے کا حل ہوتا تو یہ تقسیم 1949ء میں ہوگئی تھی گزشتہ 55 سال تک اس کے خلاف لڑنے اور جانی مالی اور ذہنی قربانیاں دینے کا کیا جواز تھا۔ علاوہ ازیں کشمیر کی مستقل تقسیم کے نتیجے میں شدید فرقہ وارانہ فسادات اور بڑے پیمانے پر انتقال آبادی ہوگی۔

بہرحال میں سمجھتا ہوں کہ ماضی کے تلخ تجربوں، زمینی حقائق اور مستقبل کے رجحانات کی روشنی میں ہمارا روڈ میپ ہی مسئلہ کشمیر کا بہترین، قابل عمل، منصفانہ، آبرومندانہ، حقیقت پسندانہ، جمہوری اور مستقل حل پیش کرتا ہے۔

حصہ ششم

ہماری جدوجہد آزادی

1- سیاسی جدوجہد
2- میڈیا کے اہم محاذ پر
3- ہماری مسلح جدوجہد آزادی
4- سفارتی محاذ پر سرگرمیاں
5- بیلجیئم کانفرنس اور میری اسیری

1- سیاسی جدوجہد

سیاسی جدوجہد آزادی محکوم قوموں کی جنگ آزادی کے اہم ترین محاذوں میں سے ایک ہوتی ہے چنانچہ جموں کشمیر لبریشن فرنٹ نے بالعموم اور خود میں نے بالخصوص اس محاذ پر خاصی توجہ دی جسکا کچھ ثبوت کتاب کی پہلی جلد میں درج میری سیاسی سرگرمیاں ہیں جو 1947ء سے 1986ء تک میری سیاسی سرگرمیوں کا احاطہ کرتی ہیں۔

دسمبر 1986ء میں برطانیہ بدری کے بعد میں نے (برطانیہ جانے سے پہلے کی طرح) کراچی میں رہائش جاری رکھی کیونکہ وہاں ہی میرے تعلیمی ادارے تھے جنہوں نے میری مالی ضروریات پوری کر کے مجھے اپنا پورا وقت تحریک آزادی اور تنظیمی معاملات پر صرف کرنے کے قابل بنایا تھا یہاں تک کہ ان ہی تعلیمی اداروں سے برطانیہ میں بھی میرے اکثر اخراجات پورے ہوتے تھے۔ اور انہی کی مالی مدد سے میں نے لیوٹن میں اپنا مکان بھی خریدا تھا جس کا نام کشمیر ہاؤس رکھا تھا اور برطانیہ میں مقیم اکثر کشمیری (آزاد کشمیر والے) اور پاکستانی اسے ''خود مختار کشمیر کا سفارتخانہ'' گردانتے تھے۔ برطانیہ بدری کے بعد میں نے یہ مکان لبریشن فرنٹ کے انتہائی مخلص رکن اور لیوٹن شاخ کے سابق صدر ملک محمد شفیع صاحب کو فروخت کیا اور انہوں نے مکان کا نام کشمیر ہاؤس برقرار رکھا۔ میں نے اس رقم سے کراچی میں مکان اور گاڑی خریدی اور دو سال (88-1987) میں تقریباً دو لاکھ (ایک لاکھ اٹھانوے ہزار روپے) تنظیم پر صرف کئے۔ میں 1990ء تک کراچی میں ہی رہا۔ سال میں دو تین بار راولپنڈی اور آزاد کشمیر آتا اور تحریک اور تنظیم سے متعلق معاملات کو نبھاتا۔ آخر تحریک، تنظیم اور نظریئے کے مفاد میں میں 1990ء میں مستقلاً راولپنڈی منتقل ہو گیا کیونکہ جملہ سفارتخانے اور عالمی میڈیا بھی اسلام آباد میں تھا اور آزاد کشمیر گلگت بلتستان بھی نزدیک۔ کراچی میں تنظیم سے متعلق ٹیلی فون اور فیکس کے اخراجات بھی بہت ہو رہے تھے۔ میری اہلیہ اور بیٹی 2000ء تک کراچی میں ہی رہیں اور 2003ء میں میں نے کراچی کا مکان بھی بیچ ڈالا۔ یہ تھے تحریک سے متعلق میرے ذاتی معاملات۔ آیئے اب سیاسی سرگرمیوں کی طرف۔

(ا) سیاسی سرگرمیاں

1986ء کے اواخر سے آج 2004ء تک کی میری اور لبریشن فرنٹ کی سیاسی سرگرمیوں کو مختلف عنوانات کے تحت بیان کرنا زیادہ مفید ہے اسلئے کہ اس سے قاری کے ذہن پر ان سرگرمیوں کی ایک واضح تصویر ابھرتی ہے اسلئے ایسا ہی کر رہا ہوں۔

کشمیر لبریشن الائنس کا قیام : جدوجہد آزادی میں مصروف محکوم قوموں کی قیادت کی صفوں میں کم از کم تحریک آزادی، اسکی منزل اور تحریک کو منزل تک پہنچانے کیلئے حکمت عملی کے بارے میں اتفاق فکر و عمل بنیادی ضرورت ہوتی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اسی بنیادی ضرورت کی عدم موجودگی ہمارے لئے حصول آزادی میں ناکامی کی اہم ترین وجوہات میں سے ایک ہے۔ چنانچہ میں ہمیشہ اسی اتحاد فکر و عمل کیلئے کوشاں رہا ہوں۔ 1966ء میں مسلم کانفرنس، لبریشن لیگ اور محاذ رائے شماری کے مابین اتحاد ثلاثہ کے قیام اور 77-1976ء میں برطانیہ میں مقیم کشمیریوں کو تحریک آزادی کے سلسلے میں متحد کر کے یونائیٹڈ کشمیر ایکشن کمیٹی قائم کرنے میں میرا کردار کلیدی تھا چنانچہ جب میں دسمبر 1986ء میں برطانیہ بدر ہو کر پاکستان آیا اور ادھر ہماری تنظیم لبریشن فرنٹ نے مقبوضہ کشمیر میں مسلح جدوجہد آزادی شروع کی تو کم از کم حد متارکہ جنگ کے اس طرف یہ اتحاد ناگزیر ہو گیا۔ اسی دوران (اواخر دسمبر 1988ء میں) بھارتی وزیر اعظم کے دورہ پاکستان کے دوران آزاد کشمیر کی قیادت نے اسکے خلاف مشترکہ مظاہرہ کیا اور اسی مظاہرے کے سلسلے میں ہونے والی ایک میٹنگ میں میں نے تجویز پیش کی کہ اس اتحاد کو مستقل شکل دی جائے اور کشمیری قیادت خاص کر وزیر اعظم سردار سکندر حیات خان نے میری تجویز کی بھرپور حمایت کی۔ چنانچہ 26 جولائی 1989ء کو راولپنڈی میں معروف کشمیری سیاسی پارٹیوں کے سربراہوں کے علاوہ صدر اور وزیر اعظم آزاد کشمیر کا اجلاس ہوا۔ اجلاس میں آزاد کشمیر اور آل جموں کشمیر مسلم کانفرنس کے صدر سردار عبدالقیوم خان، وزیر اعظم سردار سکندر حیات خان، جماعت اسلامی آزاد کشمیر کے امیر کرنل رشید احمد عباسی، کشمیر لبریشن لیگ کے صدر چوہدری شریف طارق، تحریک عمل کے سربراہ جنرل محمد حیات خان، آزاد مسلم کانفرنس کے صدر چوہدری سلطان محمود، محاذ رائے شماری کے صدر سعید شاہ نازکی، جمعیت العلماء اسلام کے صدر مولانا محمد یوسف، جمعیت العلماء جموں کشمیر کے صدر صاحبزادہ عتیق الرحمٰن، جمعیت اہلحدیث آزاد کشمیر کے مولانا یونس اثری، جمعیت المشائخ آزاد کشمیر کے صدر مولانا محمد صادق اور جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کے سربراہ کی حیثیت سے میں شامل تھے۔

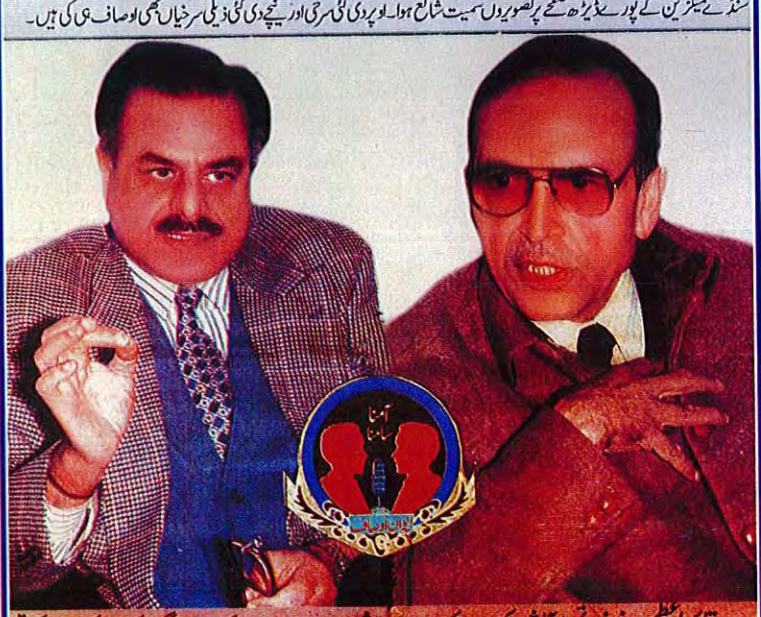
کشمیری قیادت پر مشتمل ایک اتحاد کے قیام پر اتفاق کے بعد اسکے اغراض و مقاصد پر اظہار خیال ہوا تو حاضرین کی بھاری اکثریت نے تجویز پیش کی کہ ہمیں کشمیر سے متعلق اقوام متحدہ کے کمیشن کی قراردادوں کو عملی جامہ پہنانے کا مطالبہ کرنا چاہیئے۔ میں نے اپنی باری پر کہا کہ حاضرین اجلاس کی بھاری اکثریت اقوام متحدہ کی قراردادوں کو عملی جامہ پہنانے کے حق میں ہے جبکہ اسکی آخری یعنی 5 جنوری 1949ء کی قرارداد کشمیریوں کے حق خودارادیت کو ریاست کے بھارت یا پاکستان سے الحاق تک محدود کر کے کشمیریوں کو انکے حق خودمختاری سے محروم کرتی ہے۔ اس صورتحال میں میرے سامنے دو راستے ہیں وہ یہ کہ میں یا تو اکثریت کی رائے پر اپنے نظریہ خودمختار کشمیر جو میرے لئے میرے سیاسی کلمے کا درجہ رکھتا ہے، کو قربان کر کے اکثریتی رائے کو قبول کروں یا پھر اس اتحاد میں شامل ہی نہ ہو جاؤں۔ لیکن اپنے سیاسی کلمے کو کسی بھی قیمت پر ترک کرنا میرے لئے ناممکن ہے اسلئے میرے سامنے عملاً دوسرا ہی راستہ ہے۔ یہ کہہ

کیا کشمیر کو خود مختار ریاست ہونا چاہیے؟

کشمیر بنے گا خود مختار، امان اللہ نہیں امریکی ایجنڈا ہے: حمید گل

نظریہ خود مختار کشمیر کے علمبردار امان اللہ خان اور آئی ایس آئی کے سابق سربراہ جنرل (ر) حمید گل کا "آمنا سامنا"

اگرچہ آئی ایس آئی نے 1987ء میں ہمیں یہ تاثر دیا تھا کہ وہ نظریۂ خود مختار کشمیر کی مخالف نہیں لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ اسکا یہ استدلال اسکی وقتی مجبوریوں کی روشنی میں مرتب کی گئی حکمت عملی کا حصہ تھا۔ اس دوران کچھ مدت لیفٹیننٹ جنرل حمید گل آئی ایس آئی کے سربراہ رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے اپنی تنظیم "تحریک اتحاد" قائم کی۔ کشمیر میں جہاد کے زبردست حامی لیکن نظریۂ خود مختار کشمیر کے شدید مخالف ہیں اور اسے امریکی ایجنڈا قرار دیتے ہیں۔ روزنامہ "اوصاف" اسلام آباد کے چیف ایڈیٹر مہتاب خان اور اُس زمانے کے ایڈیٹر حامد میر جدت پسندی کیلئے مشہور ہیں انہوں نے نظریۂ خود مختار کشمیر کے شدید ترین مخالف جنرل حمید گل کو اس نظریے کے علمبردار کی حیثیت سے مجھے اپنے پروگرام "آمنا سامنا" میں نظریے کے حوالے سے اپنا اپنا موقف پیش کرنے کیلئے کہا چنانچہ موضوع پر ہمارا کئی گھنٹے کا مباحثہ ہوا۔ میں نے اس نظریے کو مسئلہ کشمیر کا بہترین، قابل عمل، منصفانہ، آبرومندانہ حل ثابت کرنے کیلئے دلائل دیئے جبکہ جنرل حمید گل اس نظریے کو امریکی ایجنڈے کا حصہ اور نظریہ پاکستان اور اسلام کے خلاف سازش قرار دیتے رہے البتہ یہ بھی کہتے رہے کہ لبریشن فرنٹ والوں کی نیت شک وشبہ سے بالاتر ہے لیکن وہ ایک سراب کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ ہمارا یہ مناظرہ روزنامہ اوصاف اسلام آباد کے 18 جنوری 1998ء کے سنڈے میگزین کے پورے ڈیڑھ صفحے پر تصویروں سمیت شائع ہوا۔ اوپر دی گئی سرخی اور نیچے دی گئی ذیلی سرخیاں بھی اوصاف ہی کی ہیں۔



قائداعظم نے خود تھرڈ آپشن کی بات کی

شیخ عبداللہ منافقت نہ کرتے تو انگریز کی چالاکی کام نہ کرتی

کشمیر کو سوئٹزرلینڈ کی طرح نیوٹرل ریاست بنائیں گے

ہم نے افغانستان میں نیوٹریلیسی کو ٹوٹتے دیکھا

میں کشمیری مسلمان ہوں

علاقائی قومیت کا یہ تصور مغربی ہے



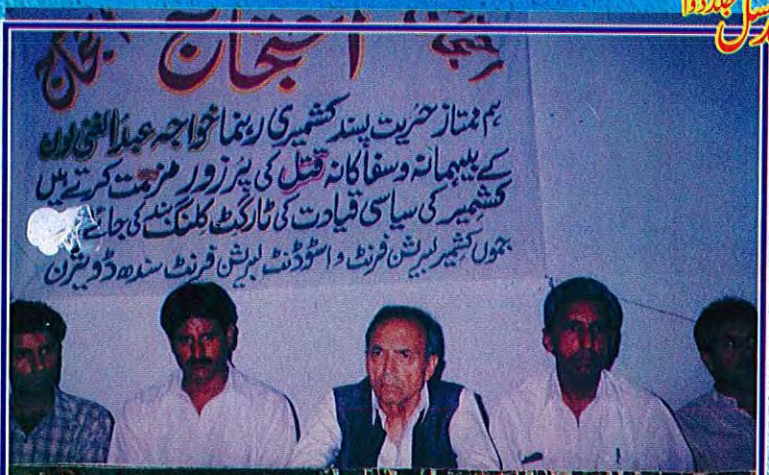
اوپر لبریشن فرنٹ کی طرف سے سے طلب کردہ سربراہی کانفرنس (19 مارچ 1997ء) سے خطاب کرتے ہوئے۔ (درمیان) لیوٹن برطانیہ میں لبریشن فرنٹ کے زیر اہتمام جلسہ عام (نیچے)۔ (1) کراچی کے کچھ تنظیمی ساتھی (2) لبریشن فرنٹ کا ابتدائی والنٹیر کور برمنگھم۔ لبریشن الائنس کے تحت نیویارک میں جنرل حیات صاحب اور میں مظاہرین سے خطاب کر رہے ہیں۔ کرنل رشید صاحب، سردار عتیق صاحب اور ممتاز گیلانی صاحب اور نیویارک میں مقیم اہل وطن بھی کھڑے ہیں۔ مظاہرین پس منظر میں ہیں۔





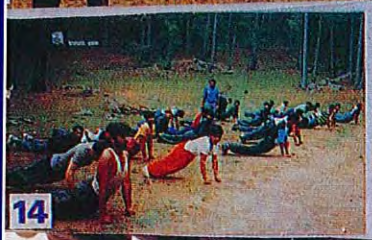


(اوپر) وادی کشمیر اور جموں کے غیر مسلم رہنما پنڈت بھوشن بزاز، وید بھسین اور کشن دیو سیٹھی کے ساتھ اپنے دفتر میں نومبر 2000ء (درمیان) نیویارک میں مقیم ریاست کے دونوں حصوں کے احباب کے ساتھ۔ (نیچے) مظفر آباد میں اقوام متحدہ کے مبصرین کو یادداشت دینے کے بعد۔













(اوپر) ممتاز کشمیری لیڈر شہید خواجہ عبدالغنی لون کی یاد میں (درمیان) ہمارے مسلح حریت پسند تربیت کے دوران (نیچے) کراچی کے ایک اجتماع میں مقررین کا اظہار یکجہتی

کر میں وہاں سے جانے لگا تو وزیراعظم آزاد کشمیر سردار سکندر حیات خان نے زور سے آواز دیکر کہا امان اللہ صاحب واپس آجائیں ہم آپ کو کھو دینے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ہمیں کوئی ایسا راستہ نکالنا چاہیئے جو آپ سمیت ہم سب کیلئے قابل قبول ہو اور خود ہی مجھ سے پوچھا کہ اگر اقوام متحدہ کی قراردادوں کی بجائے اقوام متحدہ کے چارٹر کی روشنی میں مسئلہ کشمیر کے حل کا مطالبہ کیا جائے تو آپ اس سے اتفاق کریں گے؟ تو میں نے کہا مجھے منظور ہے۔ اسکے بعد انہوں نے دوسرے شرکاء سے بھی پوچھا چنانچہ خاصے بحث مباحثہ کے بعد سکندر حیات صاحب کی تجویز منظور ہوگئی اور کشمیر لبریشن الائنس (KLA) کے نام سے کشمیری سیاسی پارٹیوں کا اتحاد قائم ہوا جسکے اغراض و مقاصد یہ تھے۔

1- کشمیریوں کیلئے اقوام متحدہ کے چارٹر کے مطابق حق خودارادیت کے حصول کیلئے جدوجہد کرنا
2- مقبوضہ کشمیر میں جاری مسلح جدوجہد آزادی کی ہر قسم کی مدد کرنا۔
3- ریاست جموں کشمیر کی تقسیم کی ہر کوشش کو ناکام بنانا خواہ وہ کسی طرف سے بھی ہو۔
4- گلگت بلتستان کو ریاست جموں کشمیر سے ہمیشہ کیلئے الگ کرنے کی ہر کوشش کو ناکام بنانا خواہ وہ کسی طرف سے بھی ہو۔

ان اغراض و مقاصد پر مبنی اعلان میں جملہ پارٹیوں کے سربراہوں کے علاوہ آزاد کشمیر کے صدر اور وزیراعظم نے بھی دستخط کئے جس کی ایک کاپی آج بھی میرے پاس ہے۔ جنرل حیات خان سابق صدر آزاد کشمیر کو کے ایل اے (KLA) کا پہلا کنوینر منتخب کیا گیا۔

کے۔ ایل۔ اے کے قیام کے ساتھ ہی اس کی سیاسی سرگرمیاں شروع ہوگئیں۔ الائنس کے ایک وفد نے اکتوبر، نومبر 1989ء میں امریکہ کا دورہ کیا جہاں اس نے اقوام متحدہ میں متعین دنیا بھر کے صحافیوں کی تنظیم UNCA کے پریس کلب میں جو اقوام متحدہ کے مرکزی سیکرٹریٹ کی عمارت میں ہی ہے، ایک پریس کانفرنس اور اقوام متحدہ کیلئے بھارت کے مشن کے سامنے ایک بھرپور مظاہرہ کیا (چونکہ میں پہلے سے ہی ہر سال اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس کے دوران برطانیہ سے نیویارک جاتا تھا اور ان کاموں کا تجربہ تھا اسلئے) دونوں کے انتظامات میں میں نے کلیدی کردار ادا کیا۔ ہم نے کچھ سفارتکاروں اور امریکہ میں مقیم کشمیریوں سے بھی ملاقاتیں کیں۔ جنرل حیات خان کی سربراہی میں اس وفد میں آزاد کشمیر کے وزیر ممتاز گیلانی، جماعت اسلامی کے امیر کرنل رشید مرحوم، مسلم کانفرنس کے سردار عتیق احمد اور میں شامل تھے۔ واپسی پر میں نے ہالینڈ میں بھی ایک پریس کانفرنس کی۔

وفد کی پاکستان واپسی پر کے۔ ایل۔ اے کی تنظیم نو کی گئی اور طے پایا کہ ہر ممبر تنظیم کا سربراہ باری باری تین ماہ کیلئے الائنس کا چیئرمین ہوگا۔ جبکہ مجھے ایک سال کے لئے اس کا سیکرٹری جنرل مقرر کیا گیا۔ اسکے بعد کے۔ ایل۔ اے کے سربراہوں نے آزاد کشمیر کے تمام ضلعی مراکز میں جلسے منعقد کر کے عوام کو تحریک آزادی میں بھرپور حصہ لینے پر زور دیا۔ اسی دوران آزاد کشمیر میں حکومت تبدیل ہوگئی۔ ادھر الائنس

Amanullah must join talks: Karan Singh

THE TIMES OF INDIA, NEW DELHI WEDNESDAY, JUNE20,1990

بھارت۔ پاکستان اور تنازعہ کشمیر کے تمام فریقوں سے مذاکرات کریں

نیویارک میں حیات خان، امان اللہ خان اور رشید عباسی کی مشترکہ پریس کانفرنس

اقوام متحدہ کی تمام قراردادیں قرآنی آیات نہیں، امان اللہ خان

ان پر عمل درآمد چاہنے والے غلامی کے بدترین وکیل ہیں

روزنامہ جنگ راولپنڈی مورخہ 4 جون 2003ء

کشمیر کی بندر بانٹ کا کسی کو کوئی حق حاصل نہیں، امان اللہ خان

کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے کہنا ہٹ دھرمی کے مترادف ہوگا، عالمی برادری

کشمیر کو متحد کر کے خودمختار مملکت قائم کرنے تنازعہ کشمیر حل کیا جا سکتا ہے

عتاب
18-08-2001

کی کچھ ممبر تنظیموں نے الائنس کے ممبروں کیلئے مقرر ضابطہ اخلاق سے انحراف کرنا شروع کیا۔ اس طرح کے۔ ایل۔ اے منجمد ہوگئی۔ کچھ مدت بعد جنرل حیات خان نے جموں کشمیر لبریشن الائنس کے نام سے ایک بار پھر الائنس کی تجدید کی جس کی ممبر تنظیموں کی تعداد بیس سے تجاوز کر گئی جو اجلاسوں تک ہی محدود رہی۔ آخر اسکے سیکرٹری جنرل طارق مشکور بٹ کی سرینگر واپسی کے بعد یہ الائنس بھی عملاً ختم ہوگیا۔

اسطرح کشمیری پارٹیوں کا اتحاد تحریک آزادی کے سلسلے میں کوئی اہم اور بڑا کارنامہ انجام دیئے بغیر ہی دو سال کے اندر ختم ہوگیا۔

عارضی حکومت خودمختار ریاست جموں کشمیر کے قیام کا اعلان: 18 جون 1990ء کو میں نے عارضی حکومت خودمختار ریاست جموں کشمیر کے قیام کا اعلان مظفر آباد آزاد کشمیر میں قومی اور عالمی میڈیا پر مشتمل ایک پرہجوم پریس کانفرنس میں کیا۔ حسب توقع اس کو پاکستان کے قومی پریس میں معمولی سی اور عالمی میڈیا میں زبردست کوریج ملی۔ پاکستان کے سرکاری میڈیا نے حسب معمول خبر کو کلیتاً بلیک آؤٹ کیا۔ اس اہم اعلان کی تفصیلات میں جانے سے پہلے اس کے پس منظر اور وجوہات پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔

1- سیاسی، سفارتی اور مسلح جدوجہد آزادی کے میدانوں میں سرگرم عمل دنیا کی اکثر تحاریک آزادی کسی نہ کسی مرحلے پر جلاوطن یا عارضی آزاد حکومت قائم کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں ہمارے سامنے ویت نام، الجزائر، فلسطین اور بنگلہ دیش کی عارضی حکومتوں کی مثالیں موجود ہیں۔ خود ہمارے ہاں 14 اکتوبر 1947ء کو بننے والی عارضی جمہوریہ جو 24 اکتوبر 1947 کو دوبارہ منظم ہوکر حکومت آزاد کشمیر بن گئی اور اسی کی سرکردگی میں ریاست کا وہ حصہ آزاد ہوا جسے آزاد کشمیر کہا جاتا ہے۔ گلگت بلتستان والوں نے بھی یکم نومبر 1947ء کو گلگت میں متعین ریاستی گورنر بریگیڈیئر گھنسارا سنگھ کو گرفتار کر کے وہاں ایک خودمختار حکومت قائم کی تھی یہ اور بات ہے کہ اسے 18 دن بعد حکومت پاکستان نے ختم کر کے وہاں اپنا پولیٹیکل ایجنٹ بھیج دیا جس نے وہاں عنان حکومت سنبھال لی۔

2- آزاد کشمیر حکومت کے قیام کا بنیادی مقصد آزاد شدہ علاقے آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کو بیس کیمپ بنا کر بھارتی مقبوضہ کشمیر کو آزاد کرا کے ریاستی عوام کو ان کا پیدائشی حق خودارادیت دلانا تھا۔ لیکن 28 اپریل 1949ء کو پاکستان کے وزیر امور کشمیر نواب مشتاق احمد گورمانی، آزاد کشمیر کے صدر سردار محمد ابراہیم خان اور آزاد کشمیر کی حکمران جماعت مسلم کانفرنس کے سربراہ چوہدری غلام عباس کے مابین ہونے والے معاہدہ کراچی کے تحت تحریک آزادی اور مسئلہ کشمیر سے متعلق تقریباً تمام امور اور گلگت بلتستان کا نظم ونسق حکومت پاکستان کو تفویض کئے گئے اور 25 سال بعد آزاد کشمیر ایکٹ 1974ء کے تحت آزاد حکومت سے مزید اختیارات چھین لئے گئے۔ مجھے آزاد کشمیر کے صدر سردار عبدالقیوم خان نے ایک

بار بتایا کہ انہیں پاکستان کے وزیر خارجہ صاحبزادہ یعقوب علی خان کا ایک خط ملا ہے جس میں سردار صاحب کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اپنے دورہ یورپ اور امریکہ کے دوران کسی اجلاس، جلسوں، میزبان ملکوں کے حکام سے بات چیت کے دوران مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادیٔ کشمیر کے بارے میں کوئی بات نہ کریں کیونکہ یہ معاملات کراچی پیکٹ کے تحت حکومت پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں، آزاد کشمیر کی حکومت یا لیڈرز سے نہیں۔ اسطرح آزاد حکومت کے قیام کا مقصد ہی یکسر فوت ہو رہا تھا۔

3- معاہدہ کراچی کی رو سے آزاد شدہ 32 ہزار مربع میل علاقہ سکڑ کر چار ہزار مربع میل رہ گیا تھا کیونکہ گلگت بلتستان کے اٹھائیس ہزار مربع میل کا علاقہ پاکستان نے براہ راست اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔

اس ساری صورتحال کے پیش نظر میں خاصی مدت سے سوچ رہا تھا کہ مناسب موقع پر یہاں بھی عبوری یا جلاوطن حکومت قائم کرنی چاہیئے تا کہ مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی سے متعلق معاملات پاکستان کی افسر شاہی کے قبضے سے نکل کر پھر کشمیریوں کے ہاتھ میں آ جائیں کیونکہ پاکستان کی نوکر شاہی نے مسئلے اور تحریک کا حلیہ ہی بگاڑ دیا تھا۔ بہر حال حالات ہمیں اس قسم کے دوررس منفی یا مثبت نتائج کے حامل انقلابی اقدام کی اجازت نہیں دے رہے تھے لیکن ایک واقعے نے ہمیں بغیر مناسب تیاری کے یہ اقدام کرنے پر مجبور کر دیا۔

جیسا کہ میں نے کتاب میں کہیں اور تفصیلاً لکھا ہے، اوائل جون 1990ء میں مجھے ایک سازش کے تحت راولپنڈی اور آزاد کشمیر سے دور کسی مقام پر گوشہ نشین ہونے پر مجبور کیا گیا تھا تا کہ آزاد کشمیر میں میرا عظیم الشان استقبال نہ ہو سکے جسکی تیاری زور و شور سے ہو رہی تھی۔ میں گوشہ نشینی سے تنگ آ کر ایک ہفتے بعد ہی راولپنڈی واپس آ گیا۔ آزاد کشمیر کے میرے مجوزہ دورے میں میری جگہ سردار رشید حسرت صاحب نے لی تھی اور وہ ہر جگہ لوگوں کے نعروں کا جواب دیتے جن میں اکثر نعرے میرے بارے میں ہوتے تھے۔ ابھی یہ لوگ کوٹلی پہنچے تھے اور دوسرے دن کوٹلی میں جلسہ تھا چنانچہ میں نے ساتھیوں سے فون پر کہا کہ میں کل کوٹلی پہنچ رہا ہوں اور انہوں نے انتہائی تذبذب کے بعد حامی بھری۔ میں دوسری صبح سویرے کوٹلی روانہ ہونے والا تھا کہ ڈاکٹر فاروق حیدر کی اہلیہ نے مجھ سے کہا کہ رات گئے مظفر آباد سے راجہ مظفر کا فون آیا تھا انہوں نے کہا ہے کہ کوٹلی روانہ ہونے سے پہلے میں انہیں فون کروں۔ میں نے راجہ مظفر سے بات کی تو انہوں نے مجھے فوراً مظفر آباد پہنچنے کو کہا اور بتایا کہ ایک انتہائی اہم واقعہ ہونے والا ہے۔ آپ کوٹلی کا پروگرام منسوخ کر کے فوراً مظفر آباد پہنچیں اور میں ٹیکسی میں کوٹلی کے بجائے الطاف اندرابی کے ساتھ مظفر آباد کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں طرح طرح کے خیالات آتے رہے کہ کیا ہونے والا ہے۔ زیادہ خیال یہی آ رہا تھا کہ ہمارے حریت پسند مقبوضہ کشمیر سے کسی اہم شخصیت کو اغوا کر کے لائے ہیں اور انہیں سمجھ نہیں آ رہا ہے کہ اس سے کس طرح استفادہ کیا جائے۔ بھارتی وزیر داخلہ مفتی سعید کی بیٹی ربیعہ سعید کے معاملے کو ابھی چھ مہینے ہی ہوئے تھے اور اس واقعہ نے مسئلہ کشمیر، تحریک آزادی اور لبریشن فرنٹ کو

عالمی سطح پر خوب اجاگر کیا تھا۔

راجہ مظفر نے بتایا کہ الحاق نواز جماعت اسلامی کے اہم حامی ڈاکٹر ایوب ٹھاکر برطانیہ سے جدہ پہنچے ہیں اور وہ 19 جون کو ریاست جموں کشمیر کی جلاوطن حکومت کے قیام کا اعلان کر رہے ہیں۔ حکومت کا مرکز لندن میں ہوگا لیکن اعلان جدہ سے ہوگا تاکہ ڈاکٹر ٹھاکر صاحب کے جدہ میں ذاتی اثر ورسوخ کی وجہ سے اعلان کو بہتر میڈیا کوریج ملے۔ راجہ صاحب نے یہ بھی بتایا کہ انہیں یہ بات سعودی عرب میں مقیم سرینگر کے ڈاکٹر منظور قاضی نے بتائی ہے۔ میں نے ڈاکٹر منظور سے فون پر بات کی تو اس نے راجہ صاحب کی رپورٹ کی تصدیق کی بلکہ ان کے ساتھ بیٹھے سرینگر سے آئے ایک اور صاحب نے بھی تصدیق کی کہ 19 جون کو ہونے والے اعلان کی پوری کاغذی تیاری ہو چکی ہے۔ ادھر مجھے اسی دن کسی اور حلقے سے بھی اشارہ ملا کہ الحاق پاکستان کے حامی جلد ہی کوئی بڑا سیاسی دھماکہ کرنے والے ہیں۔ میں نے ایک بار پھر ڈاکٹر منظور کو فون کیا جس نے پھر خبر کی تصدیق کر دی۔ اس کی بات پر یقین نہ کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر الحاقیوں نے عبوری حکومت بنائی تو مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی غلط رخ اختیار کریں گے میں نے دروازہ بند کر کے اڑھائی گھنٹے صورتحال کا تجزیہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ہمیں 19 جون سے پہلے ہی خودمختار کشمیر کی عبوری حکومت کے قیام کا اعلان کرنا چاہیئے۔ میں نے راجہ مظفر، خواجہ سیف دین اور مزید ساتھیوں سے جن میں تنظیم کے کچھ کمانڈر (مقبوضہ کشمیر سے آئے سینئر حریت پسند ایس ایم افضل، منظور خان، ظہور بٹ، ملک انور) بھی شامل تھے مشورہ کیا تو تقریباً سبوں نے میری تجویز سے اتفاق کیا۔ اسی دوران میں نے تنظیم کے سینئر وائس چیئرمین ڈاکٹر فاروق حیدر کو راولپنڈی فون کر کے بتایا کہ یہاں ایک نازک صورتحال پیدا ہوگئی ہے اور مجھے ایک اہم انقلابی قدم اٹھانا پڑ رہا ہے۔ انہوں نے تفصیل پوچھی تو میں نے کہا کہ پہلے ہی فون پر تفصیل بتانا مناسب نہیں۔ انہوں نے کہا اگر آپ مناسب سمجھتے ہیں تو قدم اٹھائیں میں فی الحال مظفر آباد نہیں آ سکتا۔ میں نے انہیں کہا کہ تنظیم کے چیف آرگنائزر سردار رشید حسرت کوٹلی میں ہیں انہیں بھی اطلاع دیدیں۔ میں نے شام کو ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کیا حسرت صاحب کو اطلاع دیدی تو انہوں نے کہا ان سے رابطہ نہیں ہوا تو میں نے خود حسرت صاحب کو فون کیا۔ وہ کہنے لگے میں رات کو راولپنڈی آؤں گا میں نے کہا میں مظفر آباد میں ہوں تو کہنے لگے میں میرپور کے جلسے تک مظفر آباد سے واپس نہیں آ سکوں گا اسلئے اگر آپ ضروری سمجھتے ہیں تو مجوزہ قدم اٹھائیں چنانچہ دوسرے دن یعنی 18 جون 1990ء کو میں نے ایک پرہجوم پریس کانفرنس میں عارضی حکومت برائے خودمختار ریاست جموں کشمیر کے قیام کا اعلان کر دیا۔ حکومت کے مشیروں کی کونسل حق خودارادیت کی داعی ہر کشمیری تنظیم سے تعلق رکھنے والے 24 افراد یعنی (انگریزی میں حروف تہجی کی ترتیب سے) 1- عبدالغنی لون صاحب 2- عبدالحمید شیخ صاحب 3- آسیہ اندرابی صاحبہ 4- آغا الموسوی اصلفوی صاحب 5- سردار اوتار سنگھ 6- اعظم انقلابی 7- بشیر احمد بٹ 8- پنڈت بھوشن بزاز 9- ڈاکٹر فاروق حیدر صاحب 10- ڈاکٹر کرن سنگھ 11- غلام نبی بٹ 12- پنڈت ہروے ناتھ وانچو

Arab News Jeddah 19 June 1990

INDIA AND PAKISTAN TO HOLD TALKS

JKLF announces provisional govt

Independent Kashmir the only option: JKLF chief

Daily Jang London 19 June 1990

امان اللہ نے آزاد ریاست جموں کشمیر کی عبوری حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا

13- ہلال احمد بیگ 14-جاوید احمد میر 15-میاں عبدالقیوم ایڈووکیٹ 16-میر واعظ -عمر فاروق 17-محمد یاسین ملک 18-مظفر علی خان 19-پروفیسر عبدالغنی بٹ 20-راجہ محمد مظفر 21-سردار رشید حسرت 22-شبیر احمد شاہ 23- شکیل بخشی اور 24-سید علی گیلانی پر مشتمل تھی۔

ان کے علاوہ مسئلہ کشمیر کو عالمی سطح پر اجاگر کرنے کیلئے بیرون کشمیر مقیم 19 افراد یعنی 1-افضل جاتلوی برطانیہ 2-علی محمد خواجوال امریکہ 3-اشرف صحاف امریکہ 4-عظمت خان برطانیہ 5-ڈاکٹر ایوب ٹھاکر برطانیہ 6-ڈاکٹر پرویز میر امریکہ 7-غلام نبی فائی امریکہ 8-افتخار چوہدری امریکہ 9-محمد حلیم خان امریکہ 10-محمد عجیب خان برطانیہ 11-شبیر چوہدری برطانیہ 12-راجہ ظفر خان برطانیہ 13-ایم ایچ محبوب برطانیہ 14-مقصود غوری برطانیہ 15-عزیز عشائی امریکہ پر مشتمل کمیٹی مقرر ہوئی اور انسانی حقوق کی پامالی کے خلاف آواز اٹھانے کا فرض 1-فاروق کاٹھواری صاحب نیویارک 2-فارق خان نیویارک 3-رفیق خان لاس اینجلس 4-ایم اے حسین لندن پر مشتمل کمیٹی کو سونپا گیا۔ان تمام حضرات کا تعلق بھارتی مقبوضہ کشمیر، آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان سے تھا اور کشمیریوں کے حق خود ارادیت کے حامی ہر گروپ یعنی الحاق بھارت، الحاق پاکستان اور پوری ریاست کی مکمل خودمختاری کے حامی شامل تھے۔اس میں مسلمان بھی تھے ہندو بھی اور سکھ بھی۔بودھوں کو نمائندگی بعد میں دی جانی تھی اور آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کو متعلقہ افراد سے پوچھ کر مزید نمائندگی ملنی تھی۔

پریس کانفرنس میں عالمی میڈیا کے نمائندے پاکستان کے قومی میڈیا سے کہیں زیادہ تھے۔ پریس کانفرنس کے بعد عالمی میڈیا کے بہت سے نمائندوں بشمول بی بی سی کی لیز ڈوسٹ Lyse Doucet نے میرے تفصیلی انٹرویو کیے۔پریس کانفرنس کے فوراً بعد راجہ مظفر نے ڈاکٹر فاروق حیدر اور سردار رشید حسرت کو فون پر بتایا کہ امان صاحب نے عبوری خودمختار حکومت کے قیام کا اعلان کیا ہے۔ دونوں نے خوشی کا اظہار کیا۔شام کو بی بی سی اردو / ہندی سروس سمیت جملہ عالمی نشریاتی اداروں نے خبر نشر کی۔رات دیر سے میں نے جب ڈاکٹر فاروق حیدر کو فون کیا تو وہ کوئی اور ہی زبان بول رہے تھے وہ انتہائی غصے میں میرے اقدام کو پاگل پن تحریک کی تباہی وغیرہ گردان رہے تھے۔حالانکہ دوپہر کو انہوں نے راجہ مظفر سے بات کرتے وقت میرے اقدام پر خوشی کا اظہار کیا تھا (خود ڈاکٹر صاحب اور لبریشن فرنٹ کی بدقسمتی کہ ڈاکٹر صاحب دباؤ برداشت نہیں کر سکتے انہوں نے یہ پینترا آئی ایس آئی کے پریشر میں آ کر بدلا تھا۔انہوں نے اس سے قبل 1971ء میں بیرونی دباؤ میں آ کر تنظیم سے بے وفائی کی اور پھر 1995ء میں بھی کی۔اگر ڈاکٹر صاحب میں یہ کمزوری نہ ہوتی تو وہ تحریک آزادئ کشمیر کیلئے عظیم سرمایہ تھے۔ان کی حب الوطنی اور جذبہ قربانی خاص کر مالی قربانی بے مثال ہیں)

ادھر بی بی سی سے رات آٹھ بجے خبر نشر ہوتے ہی کسی نے کوٹلی میں افواہ پھیلائی کہ حکومت لبریشن فرنٹ کے تمام لیڈروں کو گرفتار کرنے والی ہے۔جلسہ عام کے سلسلے میں وہاں موجود میرے کچھ سینئر ساتھیوں کو گلہ تھا کہ ان کے نام عبوری حکومت کی وزارتی یا مشاورتی کونسل میں شامل نہیں۔اس ساری

صورتحال کے دوران کوٹلی سے معمول کے مطابق پاکستان کے فوجی دستوں کا گذر ہوا تو بے پر کی اڑائی گئی کہ یہ فوجی سرگرمی لبریشن فرنٹ والوں کو گرفتار کرنے کیلئے ہو رہی ہے۔ یہ افواہ پہلے ہی پھیلائی گئی تھی کہ امان اللہ کو مظفر آباد میں پریس کانفرنس کے فوری بعد گرفتار کیا گیا۔ اس ساری صورتحال سے میرے کچھ ساتھی گھبرا گئے کہ پتہ نہیں کیا ہوگا کیونکہ میرے اقدام کو پاکستان اور آزاد کشمیر سے بغاوت قرار دیا جا رہا تھا جس کی سزا پھانسی بھی ہو سکتی ہے۔ سردار رشید حسرت ویسے بھی ہمیشہ گرفتاری سے بچنے کی کوشش کرتے تھے۔ 1971ء میں وہ محاذ رائے شماری اور این ایل ایف کے واحد اہم شخص تھے جو گرفتار نہیں ہوئے تھے۔ اس دوران انہوں نے تقریباً ایک سال قبائلی علاقے میں گزارا تھا۔ کوٹلی میں طرح طرح کی افواہیں پھیلنے کے بعد حسرت صاحب، تنظیم کے سیکرٹری جنرل خلیل حبیب، راجہ حنیف، حافظ انور سماوی، ایس ایل ایف کے ساجد حمید ناز سمیت بہت سے ساتھیوں کو لیکر رات کو ہی مظفر آباد روانہ ہو گئے اور صبح سویرے مظفر آباد پہنچ گئے۔

ہم نے تنظیم کے مرکزی دفتر کو جو راجہ مظفر کی رہائش گاہ تھا عبوری حکومت کا دفتر بنایا تھا۔ راجہ صاحب کی فیملی اپر پلیٹ میں ایک کرائے کے مکان میں شفٹ ہو گئی تھی۔ بی بی سی سے خبر نشر ہونے کے بعد دنیا کے کونے کونے سے میرے تنظیمی ساتھیوں اور دوسرے محبِ وطن کشمیریوں کے ٹیلی فون متواتر آتے رہے۔ رات بھر ہمارا فون مصروف رہا ہر شخص خوش تھا اور مجھے مبارکباد دے رہا تھا۔ کچھ لوگ فون پر خود مختار کشمیر کے نعرے بھی لگا رہے تھے۔ ادھر میرے کچھ مخالفین نے کہنا شروع کیا کہ امان اللہ نے یہ کارروائی تحریک آزادی کو نقصان پہنچانے کیلئے بھارت کے ایما پر کی ہے۔ کچھ لوگ اسے آئی ایس آئی کے اشارے پر کیا گیا اقدام گردانتے تھے۔ کوئی اسے امریکہ کی کارستانی گردانتا تھا الغرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ دوسرے دن صبح سویرے ہی سردار رشید حسرت صاحب اور ساتھی مظفر آباد پہنچ گئے۔ میں ابھی سویا ہی تھا کیونکہ رات تقریباً تین بجے تک ٹیلی فون آتے رہے تھے۔ 18 جون کو ہی ہمارے ساتھی زاہد امین کاشف نے جو ہماری سیاسی کمیٹی کے سربراہ تھے میرے اقدام کے پس منظر اور پریس ریلیز پر مشتمل ایک پمفلٹ تیار کر کے تقسیم کیا تھا اس کا ایک بنڈل برآمدے میں ہی پڑا تھا جسے پڑھ کر میرے ساتھیوں کا پارہ مزید چڑھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں دفتر کے کمرے میں آیا تو میرے یہ ساتھی غصے میں لال پیلے مجھ سے کہنے لگے آپ نے تحریک اور تنظیم کی پیٹھ میں چھرا گھونپا ہے آپ اس اعلان کو فوراً واپس لیں۔ خلیل حبیب صاحب کچھ زیادہ ہی اچھل رہے تھے۔ میں نے کہا 26 جون کو سنٹرل کمیٹی کا اجلاس پہلے سے ہی مقرر ہے اس موضوع پر اجلاس میں بحث ہوگی اور آخری فیصلہ یہ اعلیٰ ترین اختیاراتی ادارہ کرے گا۔ اس پر وہ لوگ آگ بگولا ہو گئے اور مجھے برا بھلا کہتے ہوئے راولپنڈی روانہ ہو گئے۔ ان کے جانے کے کچھ دیر بعد میرے پرانے ساتھی لاہور کے سعید شاہ ناز کی جو ہماری تنظیم میں نہیں بلکہ محاذ رائے شماری میں تھے دفتر پہنچے۔ کچھ لوگ پہلے ہی بیٹھے تھے ناز کی صاحب نے گلے مل کر مبارکباد دی اور کہنے لگے تحریک کے بارے میں بڑی مدت کے بعد ایک صحیح انقلابی قدم اٹھا ہے خوشی سے ناچنے کو جی چاہتا ہے لیکن سفید داڑھی اجازت

نہیں دیتی۔اسی دوران ہماری ہمسائیگی میں رہنے والے سابق وزیر آزاد کشمیر مرحوم میاں غلام رسول جو دل کے مریض بھی تھے لاٹھی کے سہارے اندر داخل ہوئے اور مجھ سے گلے مل کر مبارکباد دینے کے بعد کہنے لگے میں دل کا مریض ہوں رسک لیکر آیا ہوں اگر مر گیا تو یہی سمجھوں گا کہ شہید ہو گیا کیونکہ میں ایک انقلابی اقدام کی مبارکباد دینے آیا ہوں۔تھوڑی دیر بعد ایک اور سابق وزیر خواجہ فاروق بھی مبارکباد دینے دفتر آئے الغرض دن بھر ملاقاتیوں اور ٹیلی فونوں کا تانتا بندھا رہا۔

میرے ساتھی رشید حسرت صاحب وغیرہ راولپنڈی میں سیدھے ڈاکٹر فاروق حیدر صاحب کے پاس پہنچے اور بحث مباحثے کے بعد فیصلہ ہوا کہ سنٹرل کمیٹی کے ہم خیال ممبروں کو بلا کر اس بارے میں فیصلہ کیا جائے چنانچہ انہوں نے چند دن کے بعد سنٹرل کمیٹی کے ممبروں کا اجلاس بلا کر مجھے اور راجہ مظفر کو ''تنظیم اور تحریک کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے'' کے الزام میں تنظیم سے نکال دیا اور ڈاکٹر فاروق حیدر تنظیم کے ''چیئرمین'' بن گئے۔ادھر میں نے بھی سنٹرل کمیٹی کا اجلاس بلایا اور اسکے ساتھ ہی ضلعی صدور اور مقبوضہ کشمیر سے آئے ہوئے سینئر حریت پسندوں کو بھی بلایا اور 26 جون 1990ء کو سنٹرل کمیٹی کے کورم کیلئے ضروری ممبروں کی تعداد کے علاوہ ضلعی صدور سینئر کمانڈروں اور سٹوڈنٹس لبریشن فرنٹ کے سینئر عہدیداروں کا اجلاس ہوا جس میں میرے اقدام کی توثیق کی گئی اور میری قیادت پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا گیا۔اس طرح کچھ دن میرے کم ہمت اور کوتاہ نظر ساتھیوں نے میرے اور میرے انقلابی اقدام کے خلاف اتنی بیان بازی کی کہ لوگ بری طرح کنفیوز ہو گئے کہ کون سچ کہتا ہے کون جھوٹ۔(دراصل ڈاکٹر فاروق حیدر آئی ایس آئی کے دباؤ میں آ گئے۔رشید حسرت صاحب گرفتاری سے بچنے کیلئے اور خلیل حبیب اور ساجد حمید کو یہ گلہ تھا کہ انہیں کونسل میں کیوں نہیں لیا گیا وہ دونوں گرفتاری کے امکان سے بھی خوفزدہ تھے) چنانچہ ڈاکٹر صاحب اور ساتھیوں نے متوازی تنظیم قائم کی اور عوام میں شدید کنفیوژن پیدا ہو گیا اگرچہ مرکز کے جملہ عہدیدار (بجز میرے) دوسری طرف چلے گئے لیکن سنٹرل کمیٹی میں عام ممبروں کی اکثریت، ضلعی تنظیمیں، سٹوڈنٹس لبریشن فرنٹ کے ممبروں کی اکثریت، تنظیم کے عام ممبروں کی غالب اکثریت اور تمام حریت پسند اور انکے کمانڈر میرے ساتھ تھے۔لبریشن فرنٹ اور سٹوڈنٹس لبریشن فرنٹ کی مقبوضہ کشمیر شاخ نے بھی دیر سے ہی سہی میری اور میرے اقدام کی حمایت کی جسکی خبر 17 جولائی 1990ء کو بی بی سی سے بھی نشر ہوئی۔ چنانچہ فاروق حیدر صاحب کا گروپ آہستہ آہستہ کمزور تر ہوتا گیا۔یہاں تک کہ وہ خود جنوری 1992ء میں ہمارے پاس واپس آ گئے اور ان کے علاوہ بہت سے سابق سینئر ممبر بھی، رشید حسرت صاحب کا مئی 1992ء میں انتقال ہو گیا۔بہرحال ڈاکٹر فاروق صاحب اور انکے ساتھیوں کی علیحدگی اور ہمارے اور ہمارے انقلابی اقدام کے خلاف انکی زہریلی بیان بازی نے عوام کو کنفیوز کر کے تنظیم اور اقدام کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کر دیئے اور یہ انقلابی اقدام ناکام ہو گیا۔میرا قصور صرف یہ تھا کہ میں نے اس امکان کو نظر انداز کیا تھا کہ چراغ تلے اندھیرا کی مثال کا اطلاق مجھ پر بھی ہو سکتا ہے۔

درصل کم ہمت، گرفتاری سے ڈرنے والے، اندرونی یا بیرونی دباؤ میں آنے والے اور

خودغرض عہد یدار انقلابی اقدامات کو فائدے سے کہیں زیادہ نقصان پہنچاتے ہیں اور ہمارے اس انقلابی اقدام کے ساتھ بھی یہی ہوا اگر میرے ساتھی وہ طرزِ عمل اختیار نہ کرتے جو انہوں نے کیا تو آج صورتحال کچھ اور ہوتی۔

انٹرا کشمیر کانفرنسوں کیلئے کوششیں: اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ طویل جدوجہد کے باوجود کشمیریوں کو آزادی نہ ملنے کی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ کشمیری گذشتہ پانچ عشروں سے جغرافیائی طور پر تین حصوں (مقبوضہ کشمیر، آزاد کشمیر، گلگت بلتستان) میں اور نظریاتی طور پر چار طبقوں (ریاست کے بھارت سے الحاق کے حامیوں، پاکستان سے الحاق کے حامیوں، خودمختاری کے حامیوں اور تقسیم کے حامیوں) میں بٹے ہوئے ہیں چنانچہ مسئلہ کشمیر کا اہم ترین فریق ہونے کے باوجود کشمیری انتہائی کمزور پوزیشن میں ہیں۔ مجھے کشمیریوں کی اس کمزوری کا ہمیشہ احساس رہا ہے اور ان کے مابین اتحاد فکر و عمل پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ میری یہ کوششیں کبھی مسلم کانفرنس لبریشن لیگ اور محاذ رائے شماری کے مابین 1966ء کے اتحاد ثلاثہ کی شکل میں، کبھی 1976ء میں برطانیہ میں قائم ہونے والی یونائیٹڈ کشمیر ایکشن کمیٹی، کبھی 1989ء میں قائم ہونے والے کشمیر لبریشن الائنس، کبھی لبریشن فرنٹ اور حزب المجاہدین کے مابین ہونے والے 1991ء اور 1993ء کے معاہدوں، کبھی دسمبر 1991ء کے اعلان لاہور اور کبھی لبریشن فرنٹ، این ایل ایف، کشمیر فریڈم موومنٹ اور جموں کشمیر ڈیموکریٹک فریڈم پارٹی کے مابین اتحاد اربعہ کی شکل میں سامنے آئیں گو کہ ان اتحادوں میں دوسرے احباب کی کوششیں بھی شامل تھیں۔ بہرحال یہ تمام کوششیں وقتی طور پر کچھ فائدہ مند ثابت ہونے کے باوجود مجموعی طور پر مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی کو کوئی اہم اور نتیجہ خیز فائدہ نہ پہنچا سکیں جسکی وجہ اتحاد میں شامل تنظیموں میں نظریاتی اختلاف اور کشمیریوں کے مابین اتحاد نہ چاہنے والی بیرونی طاقتیں رہی ہیں۔

ہماری طرف سے فروری اور مارچ 1992ء میں جنگ بندی لائن کو اجتماعی، غیر مسلح اور اعلانیہ طور پر روند ڈالنے کی کوششوں کے پاکستان کی طرف سے رکاوٹیں کھڑی کرنے اور گولیاں چلا کر کئی افراد کو شہید اور بہتوں کو زخمی کرنے کے نتیجے میں پوری طرح کامیاب نہ ہونے کے بعد ہم (لبریشن فرنٹ) نے منقسم ریاست جموں کشمیر کے تینوں حصوں کی سیاسی قیادت کے ایک جگہ مل بیٹھ کر ریاست کیلئے ایک متفقہ منزل اور اسکے حصول کیلئے ایک متفقہ حکمت عملی اور طریقہ کار وضع کرنے کیلئے انٹرا کشمیر کانفرنس کے انعقاد کا آغاز اپریل 1992ء میں ہی کیا تھا اور فیصلہ کیا تھا کہ ریاست کے تمام حصوں یعنی وادی، جموں، لداخ، آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کے باشندوں اور بیرون ریاست مقیم کشمیریوں، جملہ مذاہب اور چاروں سیاسی طبقہ ہائے فکر کے داعی زعماء کی ایک کانفرنس یکم سے تین جولائی تک راولاکوٹ پونچھ آزاد کشمیر میں ہو۔ یہ اس مقصد کیلئے کی جانے والی پہلی کوشش تھی۔ ہم نے بھارتی مقبوضہ جموں کشمیر کی تمام معروف سیاسی پارٹیوں کے سربراہوں سمیت 85 مسلمانوں اور کشمیری پنڈتوں اور جموں کے ڈوگروں پر مشتمل



JAMMU KASHMIR QAUMI CONFERENCE

جموں کشمیر قومی کانفرنس

RAWLAKOT (AZAD KASHMIR)

JULY 1—3, 1992

Under the auspices of

JAMMU KASHMIR LIBERATION FRONT (JKLF)

As you know, the fate of Jammu Kashmir State has been hanging in the balance since 1948. During this period, specially since 1988, the people of the State have been undergoing worst kind of trials and tribulations one way or the other. India and Pakistan seem to have agreed to disagree on a just, equitable, peaceful, practicable and permanent solution of the issue. As such, the responsibility of looking for and evolving such a solution falls on the people of the State themselves.

We have decided to convene a conference (meeting) of notables belonging to all political, regional and religious factions of Jammu Kashmir State (as it existed on August 14, 1947) so that we could evolve, through detailed discussions, a practicable way for solving the Kashmir Issue which could, on one hand, fulfil, to the maximum extent, the wishes and aspirations of the people of the State and on the other hand, meet the legitimate rights of India and Pakistan besides lessening tension in the region. The conference will be held at Rawlakot, Poonch Azad Kashmir from July 1 to 3, 1992.

We cordially invite and request you to participate in this all-important and historic conference. We will try our best, directly and indirectly, to persuade the governments of India and Pakistan to facilitate the invitees from other side of the cease-fire-line to reach Azad Kashmir (on passport, visa or across the cease-fire-line under UN supervision.)

Earnestly hoping that you will try your best to participate in the conference and looking forward to hearing from you at your earliest convenience,

Sincerely Yours,

R.S.V.P.
JKLF
76-KASHMIR ROAD,
RAWALPINDI CANTT - PAKISTAN.
TELE : - 92 - 51 - 566732
H.O. MUZAFFARABAD (AZAD KASHMIR)
TELE : - 92 - 58 - 2504

(Amanullah Khan)
Chairman,
JAMMU KASHMIR LIBERATION FRONT
(JKLF)

مجوزہ انٹرا کشمیر کانفرنس کے لئے دعوت نامہ

40 ہندوؤں، دو سکھوں اور دو بودھوں کو دعوت نامے بھیجے۔ ان دعوت ناموں کی تقسیم میں جموں کشمیر نیشنل پینتھرز پارٹی خاص کر اسکے سربراہ پروفیسر بھیم سنگھ نے ہماری بڑی مدد کی اور لبریشن فرنٹ سرینگر کے حریت پسند اور سرگرم کارکن شہید جلیل اندرابی ایڈووکیٹ نے سرینگر ہائی کورٹ سے حکومت کو ہدایت جاری کرائی کہ کانفرنس کے مدعوئین کو جلد از جلد پاسپورٹ جاری کئے جائیں۔ (جلیل اندرابی کو 1996ء میں بھارتی فوج نے شہید کیا۔ اس کی لاش پندرہ دن بعد دریا سے نکلی)۔

کانفرنس کے انعقاد کے اعلان کے ساتھ ہی ہم نے بھارت اور پاکستان کے وزرائے اعظم کو ایک مشترکہ خط لکھا جس میں مجوزہ کانفرنس کے فوائد بیان کرتے ہوئے ان سے اپیل کی گئی کہ وہ اس کانفرنس کے انعقاد میں رکاوٹ نہ ڈالیں اور بھارتی مقبوضہ کشمیر کے مدعوئین کو پاسپورٹ اور ویزا جاری کریں۔ لیکن ہمارے اس خط کا ہمیں کوئی جواب نہیں ملا۔ مجوزہ کانفرنس کی تیاری خاموشی سے لیکن پوری تیزی سے ہو رہی تھی۔ راولاکوٹ کے زعماً نے مہمانوں کیلئے اپنے رہائشی مکان خالی کرنے کی پیشکش کی تھی اور اس پیشکش میں لبریشن فرنٹ کے علاوہ مسلم کانفرنس، پیپلز پارٹی، تحریک عمل، لبریشن لیگ جموں کشمیر پیپلز پارٹی اور جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے اصحاب بھی شامل تھے۔

اسی دوران ہم نے 19 جون 1992ء کو اسلام آباد میں کشمیری سیاسی پارٹیوں کے سربراہوں اور کشمیری نژاد پاکستانی سیاسی زعماً کی ایک کانفرنس بلائی جسکا اصل مقصد اس بڑی کانفرنس کی ریہرسل کے طور پر منعقد کر کے اصل کانفرنس کی کامیابی کے امکانات کا اندازہ لگانا تھا۔ کانفرنس کے دوران سرینگر سے عبدالغنی لون اور جموں سے بلراج پوری، کے ڈی سیٹھی اور وید بھسین نے فون پر کانفرنس کے شرکاء سے خطاب کرنا تھا۔ لیکن وہاں کسی نے افواہ پھیلائی کہ کانفرنس ملتوی ہوگئی ہے۔ چنانچہ ان کا خطاب نہ ہوسکا البتہ جموں سے کشمیر ٹائمز کے ایڈیٹر وید بھسین سے بات ہوئی اور انہوں نے فون پر ایئر مارشل اصغر خان اور مجھ سے بات کرتے ہوئے راولاکوٹ کانفرنس کے انعقاد سے پوری طرح اتفاق کرتے ہوئے اس کی کامیابی کی دعا کی۔ 19 جون کی اس کانفرنس میں صرف دو مقررین کے سوا جملہ اصحاب نے لبریشن فرنٹ کی اس تجویز سے اتفاق کیا کہ پوری ریاست کو دوبارہ متحد کر کے اسے کچھ مدت کیلئے اقوام متحدہ کی نگرانی میں دیا جائے اور اس کے بعد وہاں غیر محدود رائے شماری کے ذریعے عوام سے پوچھا جائے کہ ریاست کو پاکستان یا بھارت سے الحاق کرنا چاہیئے یا ایک آزاد خودمختار مملکت بننا چاہیئے اور اس عوامی فیصلے کو اس مسئلے کا حتمی حل تسلیم کر کے اسے عملی جامہ پہنایا جائے۔

ابھی ہم راولاکوٹ کانفرنس کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ کانفرنس کیلئے مقررہ تاریخوں سے چند دن پہلے بھارت، پاکستان اور آزاد کشمیر کی حکومتوں کی طرف سے یکے بعد دیگرے اعلان جاری ہوئے کہ وہ راولاکوٹ کانفرنس کی اجازت نہیں دینگے اور اس سلسلے میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ تینوں نے اپنے فیصلے کی ایک ہی وجہ بتائی تھی کہ یہ کانفرنس لبریشن فرنٹ اور خاص کر امان اللہ خان اپنی تشہیر کیلئے منعقد کر رہے ہیں۔

Govt not to allow JKLF conference on Kashmir, says Qayyum

PPI

MUZAFFARABAD: Jammu Kashmir Liberation Front (JKLF) will not be allowed to hold Kashmir international conference scheduled to be convened on July 3, at Rawalakot.

This was announced by the AJK Prime Minister Sardar Abdul Qayyum Khan on Sunday night in a press conference. The AJK prime minister said that the proposed conference is against the cause of Kashmir and the Hindu leaders who were responsible for the massacre of Muslims in occupied Kashmir have also been invited to take part in the conference.

He said if the JKLF reacted against the decision of the government it would be banned. The AJK prime minister alleged that the JKLF was a terrorist organisation and its programmes were always preplanned which reflect foreign hand behind it.

بھارت، پاکستان اور آزاد کشمیر کی حکومتوں نے لبریشن فرنٹ کی مجوزہ انٹرکشمیر کانفرنس راولاکوٹ پر پابندی لگادی

India warns those who plan to attend JKLF conference in AJK

From our correspondent

NEW DELHI: India Friday warned those who are planning to attend an international conference on Kashmir being convened by the JKLF in Rawalakot, Azad Kashmir from July 1 to 3 of not taking part in that meeting.

An Indian External Affairs Ministry spokesman said here that an association with the JKLF would be illegal. India, he said, would regard the conference as yet another propagandist stunt by the JKLF which is an unlawful organisation.

"Amanullah Khan is a declared criminal wanted in several cases in India and association with his body would be illegal," the spokesman added. He said in India's view, the attendance at the conference will only encourage the JKLF and its benefactors to continue with their unlawful terrorist and secessionist activities.

Meanwhile, President of the Panthers Party and a prominent invitee to the conference, Professor Bhim Singh, reacted to the government statement by saying that legally it is not binding on the invitees not to participate in the conference.

He revealed that he had sent a fax message to JKLF chairman, Amanullah Khan, telling him that so far 50 participants from Jammu and Kashmir out of 130 invitees had submitted their papers for getting visas from the Pakistan High Commission here. But till today, visas have not been granted which will make it difficult for the participants to book their air tickets for Islamabad to reach Rawalakot in time.

Pakistan calls JKLF move treacherous

ISLAMABAD, June 28: The Government of Pakistan, which supports the epic struggle of the people of Jammu and Kashmir for self-determination, is extremely surprised that Amanullah Khan, Chairman JKLF should be planning to hold a Jammu and Kashmir Qaumi conference in Rawalakot, Azad Kashmir on July 1-3, said an official spokesmen here on Sunday.

He said at a time when the people of Indian held Kashmir were in the middle of a freedom fight against the Indian occupation forces which had unleashed a reign of terror. Therefore, he said, there could be only one conclusion - that this move was designed to deflect world attention from Indian repression and terror.

"The proposed conference is a part of feverish and desperate attempt by the JKLF leadership for self-promotion/projection to regain advantages lost as a result of their two abortive attempts to cross the Line of Control", the spokesman said.

The proposed Qaumi conference, the spokesman said, was co-sponsored by Panthers Party of India, headed by Bhim Singh, who was well-known for his anti-Pakistan stance, he said.

None of the freedom fighters' organisations who were waging a valiant struggle in Indian held Kashmir, had been found qualified by Amanullah Khan for this conference. Neither the held Kashmir-based JKLF has been invited nor do they appear to be supportive of the conference, he said. The spokesman said according to the information available to them, none of the prominent political leaders/personalities of the held Kashmir such as Justice Farooqi, Abdul Ghani Lone, Syed Gillani Prof Abdul Ghani Butt and Mir Waiz, who were invited by Amanullah Khan for the conference had agreed to participate —APP

اس طرح ایک ایسا مجوزہ اجتماع جو مسئلہ کشمیر کو کشمیریوں کی خواہشات اور امنگوں کے مطابق حل کرنے کیلئے ایک قابل عمل اور منصفانہ فارمولا وضع کرسکتا تھا۔ بھارت، پاکستان اور آزاد کشمیر کی حکومتوں کی لبریشن فرنٹ، امان اللہ خان اور انکے نظریئے سے دشمنی کی نذر ہوگیا۔

انٹرا کشمیر کانفرنس کے انعقاد کی ایک اور کوشش چند ماہ بعد ہوئی اب کے یہ کوشش جموں کشمیر پیپلز پارٹی، جموں کشمیر لبریشن لیگ، پاکستان مسلم لیگ جموں کشمیر، اور جموں کشمیر نیشنل پیپلز پارٹی پر مشتمل جموں کشمیر ڈیموکریٹک الائنس کی طرف سے ہوئی۔ جس کے سربراہ سردار محمد ابراہیم خان مرحوم تھے۔ اسی دوران ایک دن آزاد کشمیر پیپلز پارٹی کے سردار خالد ابراہیم، مسلم لیگ کے جنرل حیات خان، لبریشن لیگ کے بیرسٹر سلطان محمود اور نیشنل پیپلز پارٹی کے ظفر ماگرے میرے دفتر آئے اور انٹرا کشمیر کانفرنس کیلئے لبریشن فرنٹ کی مدد مانگی۔ میں نے وعدہ کیا اور اس سلسلے میں ان کی مدد کرنے کیلئے لبریشن فرنٹ کے مرکزی سیکرٹری نشر واشاعت ڈاکٹر حیدر حجازی کی ڈیوٹی لگادی جسکے بعد کانفرنس کے سلسلے میں لکھنے پڑھنے اور چھپائی کا سارا کام ڈاکٹر حجازی نے ہی سردار محمد ابراہیم خان کی ہدایات کے مطابق کیا۔ الائنس کی طرف سے مجوزہ کانفرنس 15، 16 دسمبر 1992ء کو میر پور آزاد کشمیر میں ہونا قرار پائی اور اس سلسلے میں متوقع مدعوئین کو کانفرنس کے مقصد پر مشتمل خط اور دعوت نامے بھی بھیج دیئے گئے لیکن مقبوضہ کشمیر کے ابتر حالات کی وجہ سے یہ کانفرنس بھی پہلے ملتوی پھر منسوخ کرنی پڑی۔

میں نے اکتوبر 1993ء میں جنیوا میں یورپین یونین کی طرف سے ہونے والی کشمیر کانفرنس کے دوران بھارتی مقبوضہ کشمیر کے سابق وزیراعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ سے علیحدگی میں تحریک آزادیٔ کشمیر پر تفصیلی بات کی اور فیصلہ ہوا کہ ہم دوسرے دن پھر علیحدگی میں ملیں گے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں دوسرے دن کی میٹنگ میں سردار عبدالقیوم صاحب کو بھی ساتھ لے جاؤں تاکہ سردار صاحب اور فاروق صاحب اور میرے مابین سنجیدہ اور تفصیلی گفتگو ہو جسکے بہت اہم مثبت نتائج نکل سکتے تھے۔ لیکن میں اسی رات گرفتار ہوگیا چنانچہ سارا پروگرام ٹھپ ہوگیا۔

اس کے بعد برطانیہ کے ہاؤس آف لارڈز کے لارڈ ایرک ایوبری (LORD ERIC AVEBURY) نے یکے بعد دیگرے برطانیہ، یورپ اور نیپال میں انٹرا کشمیر کانفرنس منعقد کرنے کی کوششیں کیں اور ان کوششوں میں ہم نے انکا ہاتھ بٹایا لیکن ان کی یہ کوششیں بھارتی حکومت کی طرف سے کھڑی کی گئی رکاوٹوں کی وجہ سے بارآور نہ ہوسکیں۔

میں نے اپنی اکلوتی اولاد یعنی بیٹی اسماء کی نومبر 2000ء میں راولپنڈی میں ہونے والی شادی کو بھی انٹرا کشمیر کانفرنس میں تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ چنانچہ میں نے ریاست کے پانچوں حصوں (وادی، جموں، لداخ، آزاد کشمیر، گلگت بلتستان) کے جملہ سیاسی رہنماؤں کو شادی میں شرکت کی دعوت دی۔ یہاں تک کہ شادی کے دعوت نامے کی پشت پر لکھے گئے پیغام میں بھی مسئلہ کشمیر کے پرامن اور منصفانہ حل کی ضرورت پر زور دیا تھا تاکہ بھارت اور پاکستان کے مابین کشیدگی کی باعث بنی ہوئی یہ زہریلی ہڈی

(کشمیر) دونوں کے مابین دوستی کے پل میں تبدیل ہو جائے۔ لیکن کچھ نے میری دعوت کی اہمیت کو نہ سمجھتے ہوئے اس میں دلچسپی نہیں لی۔ کچھ خاص کر حریت کانفرنس والے سیاسی وجوہات کی بناء پر نہیں آئے۔ یہاں تک کہ کسی نے رسمی شکریہ بھی ادا نہیں کیا۔ جبکہ مقبوضہ کشمیر کے سابق وزیراعلیٰ جی ایم شاہ سمیت بہت سے مدعوئین کو دہلی میں پاکستان کے ہائی کمیشن نے ویزا دینے میں ٹال مٹول سے کام لیا یہاں تک کہ شادی کی تاریخ ہی نکل گئی اور ٹال مٹول کا مقصد بھی غالباً یہی تھا البتہ وادی سے میرے سمدھی شہید خواجہ عبدالغنی لون کے ساتھ کچھ سیاسی اور صحافتی شخصیتیں بھی تشریف لائیں۔ (تفصیل ''دلچسپ متفرقات'' کے باب ''بیٹی اسما کی شادی'' کے عنوان میں)۔ شادی کی تقریب (جو بذات خود ایک اہم سیاسی جلسہ بن گئی) سے خطاب کرتے ہوئے لون صاحب نے ریاست کی وحدت کی بحالی کیلئے جدوجہد کرنے کے عزم کا اظہار کیا۔ میں نے میری اپنی شادی کے موقع پر میری والدہ کے تبصرہ کا ذکر کیا۔ (میری والدہ کے تبصرے کی تفصیل بھی اسماء کی شادی کی رپورٹ میں) شادی کے بعد مقبوضہ کشمیر سے آئے ہوئے مہمانوں نے مظفر آباد اور میرپور کا دورہ کیا جہاں ان کا والہانہ استقبال ہوا۔ راولپنڈی اور اسلام آباد میں ان کی گلگت بلتستان اور آزاد کشمیر کی قیادت سے خاصی انفرادی اور اجتماعی ملاقاتیں ہوئیں۔ آزاد کشمیر کے لیڈروں نے درجن بھر ظہرانے اور عشائیے دیئے۔ واپسی پر صحافیوں نے اپنے اخبارات اور جرائد میں یہاں کے حالات اور لوگوں کے طرز فکر (خاص کر مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی) کے بارے میں اداریے، کالم اور تبصرے لکھے۔ اسطرح میری بیٹی کی شادی سے ہم نے انٹرا کشمیر کانفرنس کے بہت سے فائدے حاصل کئے۔

بھارتی مقبوضہ کشمیر کے سابق وزیراعلیٰ اور عوامی نیشنل کانفرنس کے صدر جی ایم شاہ نے (جو مرحوم شیخ محمد عبداللہ کے داماد بھی ہیں) 10، 11 فروری 2001ء کو جموں میں انٹرا کشمیر کانفرنس منعقد کرنے کا اعلان کیا اور اس سلسلے میں بھارتی مقبوضہ کشمیر، آزاد کشمیر، گلگت بلتستان اور بیرون ملک مقیم کشمیری زعماً کو دعوت دیتے ہوئے مجھ سے مدد مانگی۔ چنانچہ میں نے ان کے دعوت نامے آزاد کشمیر و گلگت بلتستان کے مدعوئین تک پہنچائے اور ان میں سے اکثر کو جموں جانے پر آمادہ کیا اور ان میں سے بہت سوں کے پاسپورٹ ویزا کیلئے اسلام آباد میں بھارتی ہائی کمیشن میں جمع کروائے۔ یہاں تک کہ اپنا پاسپورٹ بھی ویزا کی درخواست کے ساتھ جمع کرایا حالانکہ وہاں میرے خلاف (قتل و غارت کرانے اور دہشت گردی کے) سنگین الزامات کے تحت وارنٹ گرفتاری تھے۔ لیکن بھارتی ہائی کمیشن ویزا کے اجراء کے سلسلے میں ٹال مٹول کرتا رہا تا آنکہ کانفرنس کی تاریخ سر پر آ پہنچی۔ چنانچہ جی ایم شاہ نے کانفرنس پہلے ملتوی پھر منسوخ کر دی۔ کانفرنس کے انتظامات کے سلسلے میں ان کے صاحبزادے مظفر شاہ نے انتھک محنت کی تھی۔

بہرحال ہم نے خاص کر خود میں نے گزشتہ ڈیڑھ عشرے کے دوران ریاست کے تینوں حصوں کے سیاسی زعماً کو ایک جگہ جمع کر کے ریاست کے لئے ایک مشترکہ منزل کے تعین اور اسکے حصول کے لئے متفقہ اور اجتماعی حکمت عملی وضع کرنے کیلئے مسلسل اور انتھک کوششیں کیں

لیکن ابھی تک اس میں مطلوبہ کامیابی نہیں ہوئی جس کی وجہ بھارت اور پاکستان کی خودغرضی اور کشمیری قیادت میں نظریاتی اختلاف کے علاوہ اکثر کشمیری لیڈروں کی لگام کا بھارت یا پاکستان کے ہاتھ میں ہونا ہے۔ اسلئے وہ انہی کی مرضی کے تابع ہیں اور چاہنے کے باوجود خود آزادانہ طور پر کچھ نہیں کر سکے۔ چنانچہ تحریک آزادیٔ کشمیر اپنی کامیابی کی ایک بنیادی ضرورت یعنی کشمیری قیادت میں اتحاد فکر و عمل کی عدم موجودگی کی وجہ سے اب تک کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکی ہے۔

ہمارے زیر اہتمام کشمیری سربراہی کانفرنسیں: آزاد کشمیر کے سیاسی کلچر کی ایک خوبی یہ ہے کہ شدید سیاسی اختلافات کے باوجود یہاں کے سیاسی لیڈر (بہت ہی کم استثناعات کے ساتھ) ارفع قومی مفادات کیلئے ایک دوسرے سے انفرادی اور اجتماعی طور پر ملتے رہتے ہیں۔ خواہ وہ کسی مشترکہ نتیجے پر پہنچیں یا نہ پہنچیں (یہ خوبی بھارتی مقبوضہ کشمیر کی قیادت میں بالکل مفقود ہے جو جدوجہد آزادی میں ان کی ناکامی کی ایک اہم وجہ ہے)

1989ء میں آزاد کشمیر کی پارٹیوں کا اتحاد کشمیر لبریشن الائنس بنا تھا جسکی مرکزی پارٹی سربراہوں پر مشتمل تھی اور اس کے اجلاس عموماً ہوتے رہتے تھے لیکن یہ اتحاد 1991ء میں ہی ختم ہو گیا اس لئے اسکے بعد پھر سے سربراہی اجلاس ہونے لگے۔ اور یہ اجلاس عموماً مسلم کانفرنس۔ جماعت اسلامی اور لبریشن فرنٹ کے زیر اہتمام ہوتے تھے۔ لبریشن لیگ اور پیپلز پارٹی کے زیر اہتمام بھی غالباً ایک ایک اجلاس ہوا۔

ہمارے زیر اہتمام پہلی سربراہی کانفرنس: لبریشن فرنٹ کے زیر اہتمام پہلی سربراہی کانفرنس 31 جنوری 1992ء کو اسلام آباد میں ہوئی جس میں بجز دو تنظیموں کے جملہ معروف تنظیموں کے سربراہوں نے شرکت کی۔ دسمبر 1991ء میں لبریشن فرنٹ نے 11 فروری 1992ء کو جنگ بندی لائن (ایل او سی) کو اجتماعی، غیر مسلح اور اعلانیہ طور پر روند ڈالنے کا فیصلہ کیا تھا اور ہم نے ڈیڑھ ماہ میں اس سلسلے میں تقریباً ساری تیاریاں کی تھیں۔ ہم نے سوچا بہتر ہوگا کہ ہمارا یہ اقدام انفرادی کی بجائے اجتماعی نوعیت کا ہو چنانچہ اجلاس میں ہم نے پیشکش کی کہ اگر دوسری تنظیمیں حصہ لیں تو ہم اسے تمام کشمیری تنظیموں کا مشترکہ پروگرام قرار دیں گے۔ اکثر تنظیموں کے سربراہوں نے پروگرام کو سراہا لیکن تقریباً ہر ایک نے کہا کہ وہ اپنی تنظیموں کے مجاز اداروں سے پوچھے بغیر اس پروگرام میں شرکت کرنے کا اعلان نہیں کر سکتے۔ بہرحال صرف کشمیر ریفیوجیز کونسل، انجمن طلباء اسلام اور تحریک اسلامی جمہور یہ جموں کشمیر نے ہمارا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا اور اس فیصلے پر پوری طرح عمل بھی کیا لیکن دوسری تنظیموں کے بہت سے ممبروں نے صرف ذاتی حیثیت میں ہمارا ساتھ دیکر حب الوطنی کی عظیم مثال قائم کی۔

دوسری سربراہی کانفرنس: ہم (لبریشن فرنٹ) نے کشمیری سیاسی پارٹیوں کی دوسری سربراہی کانفرنس اسلام آباد میں 19 جون 1992ء کو منعقد کی جس میں بجز پاکستان پیپلز پارٹی کے آزاد کشمیر کی جملہ سیاسی پارٹیوں، سربراہوں کے علاوہ ایئر مارشل (ر) اصغر خان اور انکے فرزند عمر اصغر خان (جو کچھ مدت تک پاکستان کے مرکزی وزیر رہنے کے بعد جوانی میں ہی کراچی میں اچانک فوت ہوگئے) نے شرکت کی۔ اس کانفرنس کی تفصیل انٹرا کشمیر کانفرنسوں کے سلسلے میں پہلے ہی آئی ہے۔

تیسری سربراہی کانفرنس: 23 مارچ 1997ء کو اسلام آباد میں اسلامی سربراہی کانفرنس منعقد ہو رہی تھی چنانچہ لبریشن فرنٹ نے فیصلہ کیا کہ ہم کشمیری تنظیموں کی ایک سربراہی کانفرنس بلائیں جس میں اسلامی سربراہی کانفرنس کو پیش کرنے کے لئے تمام کشمیریوں کی طرف سے ایک مشترکہ یادداشت منظور کی جائے ہم نے یہ کانفرنس 19 مارچ 1997ء کو اسلام آباد (ہالیڈے ان جہاں ہماری اکثر کانفرنسیں اور پریس کانفرنسیں ہوتی رہی ہیں) میں بلائی جس میں مسلم کانفرنس کے صدر سردار عبدالقیوم خان، پاکستان پیپلز پارٹی آزاد کشمیر کے جاوید راٹھور، لبریشن لیگ کے جسٹس عبدالمجید ملک، پاکستان مسلم لیگ آزاد کشمیر کے جنرل محمد حیات خان، جماعت اسلامی آزاد کشمیر کے عبدالرشید ترابی، پیپلز لیگ کے محمود احمد ساغر، تحریک جعفریہ کے سید محمود شاہ، فریڈم موومنٹ کے افسر شاہد، جموں کشمیر پیپلز پارٹی کے سردار خالد ابراہیم، (بذریعہ نمائندہ) گلگت بلتستان یونائیٹڈ فرنٹ فارسیلف رول کی محترمہ فوزیہ سلیم، متحدہ قومی موومنٹ گلگت کے میجر حسین شاہ، این ایل ایف کے ملک اصغر ایڈووکیٹ، محاذ رائے شماری کے عبدالخالق انصاری، (غائبانہ) جماعت العلماء جموں کشمیر کے رضاالمصطفےٰ نورانی اور جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کی طرف سے میں نے شرکت کی۔ اجلاس سے مشہور کشمیری صحافی مرحوم میر عبدالعزیز نے بھی خطاب کیا۔ انکے علاوہ پیپلز لیگ کے ملک ارشاد ایڈووکیٹ، فریڈم موومنٹ کے سردار آفتاب، لبریشن فرنٹ کے ڈاکٹر حیدر حجازی، کمانڈر فاروق خان، بیرسٹر ظفر چوہدری، گلگت کے ایس ایس پی امیر حمزہ مرحوم۔ کشمیر قرا قرم جرنلسٹس فورم کے حبیب الرحمٰن نے شرکت کی۔ اے پی ایچ سی (APHC) نے دعوت کے باوجود بوجوہ شرکت نہیں کی۔

میں نے اسلامی کانفرنس کو پیش کئے جانے کیلئے ایک یادداشت کا مسودہ پیش کیا جس پر تفصیلی بحث ہوئی۔ اجلاس میں دیر سے پہنچنے والے جماعت اسلامی کے سربراہ عبدالرشید ترابی نے بھی ایک مسودہ پیش کیا چنانچہ فیصلہ ہوا کہ اجلاس میں تسلیم شدہ لبریشن فرنٹ کے مسودے میں جماعت اسلامی کی قابل قبول تجاویز شامل کی جائیں اور اس کام کی ذمہ داری عبدالرشید ترابی صاحب کو اور مجھے سونپی گئی لیکن سردار عبدالقیوم کی دو دن کی کوششوں اور مداخلت کے باوجود ہم دونوں کسی متفقہ یادداشت پر متفق نہ ہو سکے اسلئے کہ ترابی صاحب کا اصرار تھا کہ اس میں مسئلہ کشمیر کو اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق حل کرنے کا مطالبہ کیا جائے لیکن یہ میرے لئے نا قابل قبول تھا کیونکہ قراردادیں خاص کر آخری 5 جنوری 1949ء کی

قرارداد کشمیر کی مکمل خودمختاری کو تسلیم نہیں کرتی۔ ترابی صاحب کا مسودہ دراصل پاکستان کی وزارت خارجہ کا ڈرافٹ کیا ہوا تھا۔ بہرحال بالآخر اسلامی ممالک کے سربراہان کے نام دو یادداشتیں گئیں۔ ایک میں اقوام متحدہ کی قراردادوں کو عملی جامہ پہنانے (یعنی کشمیریوں کو یہ حق دیا جائے کہ وہ فیصلہ کریں کہ بھارت کا حصہ بننا چاہتے ہیں یا پاکستان کا) کا مطالبہ تھا اور دوسری (ہمارے مسودے پر مبنی) میں کشمیریوں کو غیر محدود اور غیر مشروط حق خودارادیت (جس میں ریاست کی مکمل خودمختاری کا حق بھی شامل ہو) دینے کا مطالبہ تھا۔ تنظیموں کی اکثریت نے ہماری قرارداد پر دستخط کئے تھے جبکہ کچھ نے دونوں پر کئے تھے۔

اسی طرح کشمیری سیاست میں پایا جانے والا نظریاتی انتشار اس انتہائی اہم موقع پر بھی کوئی متفقہ مطالبہ مرتب کرنے کے راستے میں رکاوٹ بنا رہا کشمیریوں کی غلامی کی اہم ترین وجہ ان کے طرز فکر و عمل میں پایا جانے والا یہی انتشار ہے جو ان کے بیرونی آقاؤں کا پیدا کردہ ہے۔

چوتھی سربراہی کانفرنس: ہم نے کشمیری سیاسی پارٹیوں کی چوتھی سربراہی کانفرنس 4 نومبر 2001ء کو اسلام آباد میں بلائی اس کانفرنس کا مقصد یہ تھا کہ کشمیریوں کی مسلح جدوجہد آزادی کو دہشت گردی قرار دلانے کی بھارتی کوششوں کو ناکام بنانے کیلئے اجتماعی لائحہ عمل مرتب کیا جائے۔ بھارتی مقبوضہ کشمیر میں فوج کی وحشیانہ کارروائیوں کے خلاف متفقہ آواز اٹھائی جائے اور دنیا پر واضح کیا جائے کہ محکوم قوموں کو اپنی آزادی کیلئے مسلح جدوجہد سے باز رکھنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ انہیں ان کا حق آزادی دیا جائے۔

کانفرنس میں میرے اور ہمارے سینئر وائس چیئرمین ایس ایم افضل کے علاوہ لبریشن لیگ کے صدر اور آزاد کشمیر ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس ملک عبدالمجید، جماعت اسلامی آزاد کشمیر کے امیر عبدالرشید ترابی، جماعت اسلامی بھارتی مقبوضہ کشمیر کے امیر غلام نبی نوشہری، جموں کشمیر پیپلز لیگ کے فاروق رحمانی، ڈی ایف پی کے نائب صدر محمود احمد ساغر، حریت کانفرنس آزاد کشمیر چیپٹر کے یوسف نسیم اور غلام محمد صفی، کشمیر ایکشن کمیٹی لاہور کے ڈاکٹر مظفر شاہ اور نیشنل عوامی پارٹی کے سردار انور خان نے شرکت کی۔ مسلم کانفرنس اور پیپلز پارٹی کے سربراہ دعوت دینے اور وعدہ کرنے کے باوجود شریک نہیں ہوئے۔

تلاوت کلام پاک کے بعد میں نے کانفرنس کے متذکرہ بالا مقاصد بیان کئے اور ان مقاصد پر مبنی کچھ قراردادوں کا مسودہ پیش کیا تاکہ لمبی چوڑی تقریروں کی بجائے ان قراردادوں پر بحث اور ترامیم کر کے انہیں سربراہی کانفرنس کی طرف سے عالمی سطح پر تقسیم کیا جائے۔

ان قراردادوں پر بحث کے دوران ہی مجھے اندازہ ہوا کہ کانفرنس میں شریک چند اصحاب خاص کر حریت کانفرنس کے غلام محمد صفی صاحب ان قراردادوں کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر رہے ہیں صرف اسلئے کہ اس کانفرنس کا انعقاد لبریشن فرنٹ خاص کر میں نے کیا ہے۔ صفی صاحب نے تو اس کا اظہار بھی کیا اور علیحدگی میں (وقفے کے دوران) صدر مجلس ملک عبدالمجید سے بات بھی کی چنانچہ کرسی صدارت کی طرف سے فیصلہ آیا کہ آج قراردادوں سے متعلق کوئی فیصلہ کرنے کی بجائے ایک کمیٹی قائم کی جائے جو

جلدی ہی ایک ایسی کانفرنس کا انعقاد کرے جس میں آزاد کشمیر کی چھوٹی بڑی تمام تنظیموں کی نمائندگی ہو۔ چنانچہ ملک عبدالمجید صاحب ہی کی سربراہی میں ایس ایم افضل، فاروق رحمانی، محمود احمد ساغر اور غلام محمد صفی پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی لیکن جیسا کہ ایسے معاملات میں ہوتا ہے اس کمیٹی کا کبھی کوئی اجلاس تک نہیں ہوا کیونکہ ایسی کمیٹیوں کا قیام دراصل کانفرنس کو بغیر شور شرابے کے ناکام بنانے کیلئے عمل میں لایا جاتا ہے نہ کہ اس کے ظاہر کردہ مقصد کو پورا کرنے کیلئے۔

دراصل پاکستان کا انتہائی طاقتور ادارہ آئی ایس آئی نہیں چاہتا کہ کشمیری قیادت میں اتحاد فکر وعمل پیدا ہو اور اگر اس قسم کے اتحاد کی کوشش میں کروں تو اس کوشش کو ناکام بنانا وہ اپنا قومی فرض سمجھتا ہے اور اسے ناکام بنانے کیلئے اپنے تنخواہ دار کشمیری لیڈروں کو استعمال کرتا ہے۔

بہرحال کشمیریوں کی سب سے بڑی بدقسمتی غالباً یہی ہے کہ ان کے خاصے لیڈر اپنے قومی مفاد کی بجائے دوسروں کے مفاد کیلئے کام کر رہے ہیں۔

دوسری کانفرنسوں میں شرکت: لبریشن فرنٹ کے زیر اہتمام ہونے والی ان سربراہی کانفرنسوں کے علاوہ میں نے دوسروں کے زیر اہتمام ہونے والی کانفرنسوں میں بھی تنظیم اور نظریے کی نمائندگی کی۔ جن میں 11 فروری 1990ء کو پرل کانٹینینٹل ہوٹل راولپنڈی میں وزیر اعظم آزاد کشمیر سردار سکندر حیات خان کی بلائی گئی کانفرنس بھی شامل تھی۔ اس میں آزاد کشمیر اور پاکستان کی جملہ سیاسی پارٹیوں کے سربراہوں اور چوٹی کے دانشوروں، تجزیہ نگاروں کے علاوہ بڑی تعداد میں قومی اور عالمی میڈیا کے نمائندوں نے شرکت کی۔ میں نے زبانی تقریر کے علاوہ نظریۂ خودمختار کشمیر پر مبنی اپنی تقریر کا تحریری متن بھی وہاں موجود قومی اور عالمی پرنٹ میڈیا اور الیکٹرنک میڈیا کے نمائندوں میں تقسیم کرایا جس کے نتیجے میں میری تقریر کو خاصی کوریج ملی۔

دوسری اہم کانفرنس لبریشن لیگ کی طرف سے 2 اپریل 1993ء کو گلگت بلتستان کے معاملات کے بارے میں اسلام آباد میں بلائی گئی کانفرنس تھی جس میں میں نے ٹھوس تجاویز پیش کیں۔ جماعت اسلامی کے تحت بلائی گئی 14 مارچ 1999ء کی سربراہی کانفرنس اور آزاد کشمیر کے قائم مقام وزیر اعظم چوہدری محمد یوسف کی طرف سے مئی 1995ء کو بلائی گئی کانفرنس قومی تحریک آزادیٔ کشمیر کے سربراہ محمد اسحاق عباسی صاحب کی نومبر 1991ء میں لاہور میں بلائی گئی کانفرنس (جس میں منظور ہونے والا ''اعلان لاہور'' میں نے ہی مرتب کیا تھا) اور دیگر ایسی کانفرنسوں میں میں نے اہم کردار ادا کیا۔ جن میں اہم ترین برسلز کانفرنس تھی جو اکتوبر 1993ء میں یورپی پارلیمنٹ نے بلائی تھی۔ جسکی تفصیل متعلقہ باب میں ہے۔ 2004ء میں پیپلز پارٹی آزاد کشمیر، صدر آزاد کشمیر اور جماعت اسلامی کی بلائی گئی سربراہی کانفرنسوں میں میں نے اہم کردار ادا کیا۔ 16 مئی 2004ء کو جماعت اسلامی آزاد کشمیر کی طرف سے گلگت میں ہونے والی وحدت کشمیر کانفرنس میں بھی میں نے بھرپور حصہ لیا۔ الغرض لبریشن فرنٹ بالعموم اور

میں بالخصوص اہم موقعوں پر اور اہم قومی معاملات کے سلسلے میں کشمیری قیادت میں اتحادِ فکر و عمل پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہے ہیں۔

جلسے، جلوس، مظاہرے اور دیگر سیاسی سرگرمیاں: میں نے گزشتہ اٹھارہ سال کے دوران مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادیٔ کشمیر سے متعلق معاملات، علاقائی اور عوامی مسائل، شہدا کو خراج عقیدت پیش کرنے اور مختلف حلقوں اداروں اور حکومتوں کی طرف سے تحریک دشمن، نظریہ دشمن اور عوام دشمن اقدامات کے خلاف اور اپنی تحریک اور نظریے کی تبلیغ و تشہیر کے سلسلے میں آزد کشمیر کے تمام ضلعی اور تقریباً ہر تحصیل ہیڈ کوارٹر اور گلگت، چلاس اور سکردو میں، پاکستان کے بڑے شہروں اسلام آباد، مری، راولپنڈی، گوجرانوالہ، سیالکوٹ، لاہور، کوئٹہ، حیدر آباد اور کراچی اور 1990ء تک برطانیہ کے درجن بھر شہروں کے علاوہ برلن، کوپن ہیگن، پیرس، ایمسٹرڈم، برسلز، نیویارک، نیو پورٹ اور لاس اینجلس میں عام جلسوں اور انڈور اجتماعات سے خطاب کیا اور مظاہروں کی قیادت کی ہے۔ یورپ اور مشرق وسطیٰ یہاں تک کہ ہانگ کانگ تک ہونے والے بڑے اجتماعات سے فون پر خطاب کیا ہے اور بہت سے اجتماعات میں میرے تحریری پیغام پڑھ کر سنائے گئے ہیں۔ ہم نے ممکنہ تقسیم کشمیر کے خلاف 13 اگست سے 7 ستمبر 2004ء تک سارے آزاد کشمیر کا دورہ کر کے عوام کو تقسیم کشمیر کیلئے ہونے والی سازش سے آگاہ کیا۔

بار ایسوسی ایشنز سے خطاب: وکلاء طبقہ کسی معاشرے کے سیاسی مفکروں، رہنماؤں اور کارکنوں کا اہم ترین طبقہ بلکہ اکثر معاملات میں ہراول دستہ ہوتا ہے۔ اور ان کی بڑی تعداد ملک کی بڑی سیاسی، سماجی، فلاحی پارٹیوں اور انسانی حقوق سے متعلق اداروں کی ممبر ہوتی ہے۔ اور وکیلوں کا پیشے سے متعلق اہم ترین ادارے بار ایسوسی ایشنز ہوتی ہیں۔ چنانچہ میں اپنے نظریات اور پروگرام کو آگے بڑھانے کیلئے معاشرے کے اس اہم طبقے سے باقاعدہ رابطہ رکھنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اسلئے میں اکثر وکلاء سے ذاتی سطح پر اور دوسروں سے اجتماعی طور پر ملتا رہا ہوں۔ اور ان ملاقاتوں کا سب سے موثر طریقہ بار ایسوسی ایشنز کے ممبروں سے خطاب کرنا ہے۔

میں گزشتہ 18 سال کے دوران آزاد کشمیر، پاکستان اور گلگت بلتستان کے بار رومز میں وکلاء سے مخاطب ہوتا رہا ہوں۔ میری تقریر کے بعد شرکاء کی طرف سے سوال ہوتے ہیں جنکے میں جواب دیتا ہوں۔ 1989ء سے 2004ء تک میں سنٹرل بار روم مظفر آباد میں چار بار، سنٹرل بار روم گلگت میں ایک بار، باغ میں دو بار، تحصیل ہیڈ کوارٹر کہوٹہ میں ایک بار، ڈھیر کوٹ میں ایک بار، راولاکوٹ میں دو بار، ہجیرہ ایک بار، عباسپور ایک بار، کوٹلی تین بار، نکیال ایک بار، میر پور دو بار پلندری ایک بار اور کراچی میں چار بار خطاب کر چکا ہوں۔

دستخطی مہم: ہم نے اوائل 2000ء میں نظریہ خودمختار کشمیر کے ترجیحاً پڑھے لکھے حامیوں کے سروے کی ایک مہم شروع کی اور اس سلسلے میں فارم شائع کر کے آزاد کشمیر گلگت بلتستان کے علاوہ پاکستان مشرق وسطیٰ یورپ اور امریکہ میں اپنے یونٹوں کو بھیجے جہاں انہوں نے ان فارموں پر نظریہ خودمختار کشمیر کے حامی لکھے پڑھے کشمیریوں سے دستخط لئے۔ یہ کام صرف دو ماہ میں ہوا اگر مزید وقت صرف کیا جاتا تو دستخط دگنے تگنے ہو سکتے تھے۔

فارم پر دستخط کرنے والے نظریہ خودمختار کشمیر کے ان حامیوں کی کل تعداد 70375 تھی جن میں سے 10010 گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ (بی اے، ایم اے، بی ایس سی، ایم ایس سی، بی کام ایم کام، ڈاکٹر، انجینئر، چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ، ایل ایل بی، ایل ایل ایم وغیرہ)۔ 55925 (انڈر گریجویٹ یعنی ایف اے، ایف ایس سی، میٹرک وغیرہ) اور باقی 4440 مڈل پرائمری وغیرہ تھے۔

ہم نے نظریہ خودمختار کشمیر کے یہ اعداد و شمار اسلام آباد میں سفارتکاروں کو دی گئی بریفنگ اور پریس کانفرنس میں پیش کرنے کے علاوہ عالمی سطح پر وسیع پیمانے پر تقسیم کئے۔

اسکے بعد ہم نے ''اعلان وعہد'' کے عنوان سے ہزاروں ہم وطنوں سے عہد لیا کہ وہ مادر وطن ریاست جموں کشمیر کے عوام سے پوچھے بغیر یا انکی رائے کے خلاف ریاست کی کسی قسم کی بھی تقسیم نہیں ہونے دیں گے۔

آزاد کشمیر کی دلچسپ انتخابی تاریخ اور ہمارا طرز عمل: ریاست جموں کشمیر کے آزاد شدہ شمالی علاقے گلگت بلتستان 16 نومبر 1947ء سے ہی (جب پاکستان نے یکم نومبر 1947ء کو وہاں بننے والی جمہوریہ گلگت کو ختم کر کے وہاں اپنا پولیٹیکل ایجنٹ بھیجا) براہ راست پاکستان کی حکمرانی میں تھے اور حکومت پاکستان، آزاد کشمیر حکومت اور آزاد کشمیر کی حکمران جماعت آل جموں کشمیر مسلم کانفرنس کے نمائندوں (موخرالذکر دو کے سربراہوں) کے مابین 28 اپریل 1949ء کو ہونے والے معاہدہ کراچی کے تحت تا فیصلہ ثانی گلگت بلتستان پر مرکزی حکومت پاکستان کی حکمرانی تسلیم کرنے کے علاوہ مسئلہ کشمیر تحریک آزادئ کشمیر اور آزاد کشمیر کے دفاع کو بھی براہ راست حکومت پاکستان کی تحویل میں دیا گیا۔

1947ء سے 1961ء تک آزاد کشمیر میں ظاہری طور پر تو آل جموں کشمیر مسلم کانفرنس کی حکومت ہوتی تھی لیکن اصل میں مسلم کانفرنس صرف دستانے کا کام دیتی تھی اندر ہاتھ پاکستان کی وزارت امور کشمیر کا ہوتا تھا۔ 1961ء میں مرحوم کے۔ ایچ خورشید کے دور حکومت میں نہ صرف آزاد کشمیر کے صدر کیلئے انتخابات ہوئے بلکہ وہاں ایک بارہ رکنی سٹیٹ کونسل بھی منتخب ہوئی۔ بی ڈی سسٹم کے تحت ہونے والے ان انتخابات میں خورشید صاحب، سردار عبدالقیوم صاحب سمیت چار امیدواروں کو ہرا کر آزاد کشمیر کے پہلے منتخب صدر بن گئے تھے۔ لیکن 1964ء میں خورشید صاحب کی صدارت سے جبری سبکدوشی کے

بعد وہاں پھر وزارت امور کشمیر مسلط ہوگئی۔ 1970ء میں وہاں پھر صدارتی انتخابات ہوئے اور اب کے سردار عبدالقیوم خان صدر منتخب ہوگئے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ 1974ء تک آزاد کشمیر کے انتخابات میں امیدوار کیلئے الحاق پاکستان کا حلف اٹھانے کی پابندی نہیں تھی یہاں تک کہ 1961ء کے سٹیٹ کونسل کے انتخابات میں وادیٔ کشمیر سے تین منتخب ممبران سٹیٹ کونسل میں سب سے زیادہ ووٹ حاصل کرنے والے جی ایم لون اور صوبہ جموں کے تین ممبروں میں سب سے زیادہ ووٹ لینے والے قاضی خورشید عالم تھے اور دونوں نے نظریۂ خودمختار کشمیر کے منشور پر الیکشن لڑا تھا۔ دونوں بعد میں 1963ء میں بننے والی نظریۂ خودمختار کشمیر کی حامی پہلی تنظیم کشمیر انڈیپنڈنس کمیٹی کے ممبر بنے۔ بلکہ لون صاحب اس کے کنوینر تھے۔ اور یہ کمیٹی انہی کی کوششوں سے بنی تھی۔

1974ء میں آزاد کشمیر کی جملہ معروف تنظیموں کے سربراہوں کے مشورے سے وزارت امور کشمیر کا بنایا ہوا ایکٹ 1974ء نافذ ہوا۔ جو آزاد کشمیر کے آئین کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس آئین کی چار اہم خصوصیات ہیں اولاً یہ کہ آزاد کشمیر کو صدارتی کی بجائے پارلیمانی طرز حکومت دی گئی یعنی وہاں اسکے بعد صدر کے ساتھ ساتھ (زیادہ اختیارات والا) وزیر اعظم بھی ہوگا۔ منتخب عہدے کیلئے ہر امیدوار کیلئے الحاق پاکستان کا حامی ہونے کا حلفیہ بیان دینا ضروری ہوگا۔ اور آزد کشمیر کیلئے کونسل کی جگہ قانون ساز اسمبلی ہوگی جس کے ممبروں کی کل تعداد 48 ہوگی۔ آزاد حکومت کو مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی سے بے دخل کیا گیا۔ گو آزاد حکومت کا سرکاری نام آزاد حکومت ریاست جموں کشمیر ہے لیکن ایکٹ 1974ء میں اس کا دائرہ اختیار صرف آزاد کشمیر کے چار ہزار مربع میل تک محدود ہے۔ 1975ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی جیت گئی۔ سردار عبدالقیوم صاحب کو گرفتار کیا گیا لیکن 1977ء میں پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف پاکستان قومی اتحاد کی تحریک عروج پر پہنچ گئی۔ بھٹو صاحب نے سردار صاحب کو جیل سے رہا کر کے قومی اتحاد کے ساتھ ثالثی کے فرائض سونپ دیئے۔ 1975ء کے انتخابات کی ایک اہم بات یہ تھی کہ الحاق پاکستان کے حلف کی پابندی کے باوجود جموں کشمیر محاذ رائے شماری (جو نظریۂ خودمختار کشمیر کی داعی تھی) نے میرے تحریری احتجاج کے باوجود (میں فیصلے کے دنوں گلگت میں تھا) انتخابات میں حصہ لینے کا اعلان کیا اور اسکے اہم ارکان جی ایم لون، محمد مقبول بٹ، سردار رشید حسرت، صوفی زمان اور ڈاکٹر فاروق حیدر امیدوار نامزد ہوئے۔ بٹ صاحب تین حلقوں سے امیدوار تھے۔ بہر حال محاذ رائے شماری کا کوئی امیدوار نہیں جیتا۔ جی ایم لون واضح طور پر جیتے تھے لیکن پیپلز پارٹی کے روایتی ''جھرلو'' نے انہیں ناکام بنا دیا۔ انتخابات میں حصہ لینے کے اس انتہائی غلط فیصلے سے محاذ رائے شماری کی ساکھ بری طرح متاثر ہوئی۔

1985ء میں سردار عبدالقیوم خان آزاد کشمیر کے صدر اور سردار سکندر حیات خان وزیر اعظم منتخب ہوگئے۔ 1990ء میں پیپلز پارٹی کے راجہ ممتاز حسین راٹھور وزیر اعظم منتخب ہوئے لیکن انہوں نے چھ ماہ بعد اسمبلی توڑ دی اور نئے انتخابات کرائے۔ جس میں مسلم کانفرنس جیت گئی۔ سردار سکندر حیات خان صدر اور سردار عبدالقیوم خان وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ 1996ء میں پیپلز پارٹی برسر اقتدار آ گئی اور بیرسٹر سلطان

محمود چوہدری وزیراعظم بن گئے اور سردار محمد ابراہیم خان صدر منتخب ہو گئے۔ 2001ء کے انتخابات میں ایک بار پھر مسلم کانفرنس جیت گئی۔ سردار سکندر حیات خان وزیر عظم بن گئے لیکن خلاف توقع صدارت کا عہدہ سردار عبدالقیوم خان کی جگہ میجر جنرل (ر) سردار محمد انور خان کو دیا گیا تاکہ پاکستان کی فوج کا آزاد حکومت پر بھی کچھ کنٹرول رہے۔ سردار عبدالقیوم خان تقریباً ایک سال صدارتی کشمیر کمیٹی کے صدر رہے لیکن پاکستان میں جمہوری حکومت کے قیام کے بعد اس کشمیر کمیٹی کو ختم کیا گیا۔

لبریشن فرنٹ نے 1996ء کے انتخابات سے چند ماہ پہلے مطالبہ کیا کہ ایکٹ 1974ء کی تحریک مخالف شقیں یعنی الحاق پاکستان کے حلف کی شرط، آزاد حکومت کو مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی سے بے دخلی وغیرہ ایکٹ سے نکال دی جائیں اور اسمبلی میں گلگت بلتستان کو بھی نمائندگی دی جائے یا گلگت بلتستان میں بھی ایک بااختیار اسمبلی قائم کی جائے۔ ہمارے یہ مطالبے نہیں مانے گئے چنانچہ ہم نے ان انتخابات کا نہ صرف بائیکاٹ کیا بلکہ ان کے خلاف زبردست مہم چلائی۔ آزاد کشمیر کے ضلعی اور تحصیل ہیڈکوارٹر میں جلسے کئے اور انتخابات سے ایک ہفتہ پہلے سے ہی آزاد کشمیر کے ہر شہر اور قصبے میں ہمارے بینرز NO TO ELECTION- YES TO LIBERATION. آویزاں نظر آتے رہے ان کے علاوہ ان انتخابات سے متعلق میری نظم پر مبنی پوسٹر سارے آزاد کشمیر میں چسپاں کئے گئے۔

2001ء کے عام انتخابات کے بارے میں ہم نے فیصلہ کیا کہ اب کے ہم آزاد کشمیر اور مہاجرین کی تمام (36 کی 36) نشستوں کیلئے کاغذات نامزدگی داخل کریں گے البتہ نامزدگی فارم میں الحاق سے متعلق حلف کی جگہ پوری ریاست کی مکمل خودمختاری کا حلف اٹھائیں گے۔ چنانچہ ہم نے اسمبلی کی چھتیس کی چھتیس نشستوں کیلئے اپنے امیدوار کچھ کیلئے ایک سے زیادہ امیدوار نامزد کئے کچھ تکنیکی مشکلات کی وجہ سے کچھ کاغذات نامزدگی داخل نہ کر سکے۔ البتہ 33 نشستوں کیلئے امیدواروں نے کاغذات نامزدگی داخل کئے اور انہوں نے الحاق کی جگہ ریاست کی خودمختاری کا حلف اٹھایا۔

بجز حلقہ نمبر 29 (کراچی۔جموں) ہمارے تمام امیدواروں کے کاغذات نامزدگی الحاق کی بجائے خودمختاری کا حلف اٹھانے کی بناء پر مسترد ہوئے چنانچہ حلقہ نمبر 29 کے امیدواروں نے احتجاجاً انتخابات کا بائیکاٹ کیا۔ کاغذات نامزدگی مسترد کئے جانے پر ہمارے ممبروں نے احتجاج کیا تو آزاد کشمیر بھر سے تقریباً 300 ممبروں کو جن میں 16 امیدوار بھی شامل تھے گرفتار کر کے ان پر شدید تشدد کرنے کے بعد انہیں آزاد کشمیر کے مختلف جیلوں میں بند کر دیا گیا اور ساتھ ہی میرے آزاد کشمیر میں داخلے پر پابندی لگا دی گئی۔ 5 جولائی 2001ء کو آزاد کشمیر میں انتخابات ہونے والے تھے ادھر میرے پچاس سے زیادہ ساتھی کوٹلی جیل میں بند تھے۔ ان سے ملاقات کر کے ان کی حوصلہ افزائی کرنا میرا فرض تھا چنانچہ میں 30 جولائی کو صبح سویرے کوٹلی پہنچا تو تھوڑی دیر بعد ضلع کے ڈپٹی کمشنر اور ایس پی ہمارے دفتر آئے اور مجھ سے کہا آپ کے کوٹلی ضلع میں داخلے پر پابندی ہے اسلئے آپ یہاں سے چلے جائیں۔ میں نے انکار کیا اس پر ہمارے مابین تقریباً دو گھنٹے بحث رہی جس کے بعد مجھے گرفتار کیا گیا۔ اس دوران ہمارے دفتر کے

باہر اور ارد گرد کی چھتوں پر ہزاروں لوگ جمع ہو گئے اور میرے، لبریشن فرنٹ اور خود مختار کشمیر کے حق میں نعرے لگاتے رہے۔ اسی دوران نوجوانوں نے مجھے کاندھوں پر اٹھایا میں نے لوگوں کو پولیس پر پتھراؤ کرنے سے منع کیا۔ بہر حال مجھے پولیس گاڑی میں بٹھایا گیا ڈپٹی کمشنر اور ایس پی میرے ساتھ بیٹھ گئے اور ہم بھاری پولیس گارڈ میں کوٹلی سے روانہ ہو گئے۔ خاصی دیر بعد ہماری گاڑی جنگل کے کنارے ایک پولیس چوکی پر رکی۔ مجھے ایک کمرے میں بٹھایا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہاں ایک باوردی بر گیڈیئر صاحب پہنچ گئے۔ جنہوں نے مجھے بتایا کہ انہوں نے چند ماہ پہلے نیشنل ڈیفنس کالج اسلام آباد میں میرا خطاب سنا تھا۔ آپ کی تقریر سن کر ہمارے ذہنوں سے یہ خیال نکل گیا تھا کہ آپ پاکستان کے دشمن ہیں۔ انہوں نے کہا جنرل مشرف جلد ہی بھارتی وزیر اعظم سے ملنے بھارت (آگرہ) جا رہے ہیں اس سے پہلے آپ کی گرفتاری کی خبر سے کشمیر سے متعلق ان کی پوزیشن کمزور ہو جائے گی جس سے تحریک آزادی پر بھی منفی اثر پڑے گا اسلئے آپ گرفتار ہو کر میر پور جیل جانے کی بجائے آزادی سے راولپنڈی چلے جائیں۔ میں نے کہا بر گیڈیئر صاحب میں نے اس متوقع صورتحال سے حکومت کو بہت پہلے آگاہ کیا تھا لیکن اس کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ میرے درجنوں ساتھی کوٹلی جیل میں ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ دوسری جیلوں میں ہیں۔ میں یہاں سے آزادی کے ساتھ راولپنڈی کیسے جا سکتا ہوں۔ بہر حال میرے انکار پر بر گیڈیئر صاحب چلے گئے اور کوٹلی کے ڈپٹی کمشنر اور ایس پی نے مجھے میر پور پہنچایا جہاں کے ڈپٹی کمشنر اور ایس پی وہاں ڈی سی آفس میں میرے منتظر تھے۔ انہوں نے میرا طبی معائنہ کرانے کے بعد مجھے منگلا کے وائپڈ ریسٹ ہاؤس پہنچایا۔ دونوں کا رویہ مجھ سے خاصا دوستانہ تھا جس سے فائدہ اٹھا کر میں نے ان سے کچھ اچھی کتابوں کی فرمائش کی کیونکہ میرا خیال تھا کہ مجھے خاصے دن یہاں سرکاری مہمان رہنا پڑے گا۔ دوسری صبح ہی میرے ساتھی عبدالحمید بٹ، چوہدری سلطان محمود ایڈووکیٹ مجھ سے ملنے آئے اور خاصے اخبار لائے۔ میری گرفتاری کی خبر سب نے نمایاں طور پر شائع کی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایس پی صاحب کی طرف سے چند بہت اچھی کتابوں کا پارسل ملا اور میں نے ڈیڑھ دن میں ساری کتابیں پڑھ ڈالیں۔

2 جولائی 2001ء کو ایبٹ آباد میں میری اہلیہ کا آپریشن ہوا تھا اور میں اسے بے ہوش ہی چھوڑ کر راولپنڈی آیا تھا اور دوسری صبح سویرے کوٹلی روانہ ہوا تھا جہاں گرفتار ہو کر اب منگلا ریسٹ ہاؤس میں سرکاری مہمان تھا۔

5 جولائی کو کوئی پانچ بجے سہ پہر پولیس انسپکٹر آیا اور اس نے مجھے ڈی سی اور ایس پی کا پیغام دیا کہ مجھ کو رہا کر کے راولپنڈی پہنچایا جا رہا ہے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کی رہائی سے پہلے رہا ہونے سے انکار کیا۔ انسپکٹر نے کہا وہ بھی کل تک رہا ہو جائیں گے۔ آپ جلدی تیار ہو جائیں آپ کی اہلیہ کا ایبٹ آباد میں آپریشن ہوا تھا نا؟ اس کا یہ کہنا تھا کہ میں سمجھ گیا میری بیوی کو کچھ ہو گیا ہے۔ اور میں اس کے ممکنہ نتائج کے بارے میں سوچ میں پڑ گیا۔ انسپکٹر نے پھر جلدی کرنے کو کہا اور مجھے سامان سمیت جبراً گاڑی میں بٹھا دیا۔ راستے میں انسپکٹر نے کوئی بات نہیں کی اور میں بھی خیالوں میں گم رہا۔ ہم ڈیڑھ گھنٹے میں راولپنڈی

ہمارے دفتر پہنچے جہاں میرے ساتھی مجھے دیکھ کر حیران ہو گئے۔ میں نے فوراً ہی بیوی کے بارے میں پوچھا تو پتہ چلا کہ وہ ہسپتال میں ہی ہے اور اب بہتر ہے۔ دراصل پولیس نے مجھے رہا ہونے پر راضی کرنے کیلئے غلط بیانی کا یہ کھیل کھیلا تھا۔ چند دن کے بعد میرے ساتھی بھی رہا ہو گئے۔

اگرچہ بھارتی مقبوضہ کشمیر کے انتخابات میں انتہائی شدید قسم کی دھاندلیاں ہوتی رہی ہیں اور آزاد کشمیر کے انتخابات نسبتاً خاصے صاف ہوتے رہے ہیں لیکن امیدواروں کیلئے الحاق پاکستان کا حلف اٹھانے کی شرط ان انتخابات کی جمہوری روح کو ختم کرنے کے مترادف ہے۔ دراصل ایسے اقدامات پاکستان کی افسر شاہی کے احکامات کے تحت کئے جا رہے ہیں۔

آزاد کشمیر ایکٹ 1974ء وزارت امور کشمیر کی افسر شاہی کا تیار کردہ ہے جس پر آزاد کشمیر کے لیڈروں سے دستخط لئے گئے ہیں۔ ایسے ہی اقدامات کے نتیجے میں مسئلہ کشمیر پر پاکستان اور کشمیریوں کی پوزیشن خاصی کمزور ہو گئی ہے اور دن بدن کمزور سے کمزور تر ہوتی جا رہی ہے کیونکہ دنیا اب سمجھنے لگی ہے کہ بھارت کی طرح پاکستان کو بھی کشمیریوں کے مفاد اور جذبات میں نہیں سرزمین کشمیر کی ملکیت میں دلچسپی ہے۔

الغرض تحریک آزادی کے سیاسی محاذ پر لبریشن فرنٹ کی خاص کر خود میری سرگرمیوں کی درج بالا روداد تحریک میں ہماری کارکردگی کے معیار و مقدار کی آئینہ دار ہے۔ ہم نے اپنے فرائض کی ادائیگی کس حد تک کی ہے اس کا فیصلہ کرنا میرا نہیں قارئین اور تاریخ کا کام ہے۔

2- میڈیا کے اہم محاذ پر

دور جدید میں میڈیا (اخبارات، ریڈیو، ٹی وی کے علاوہ ٹیلیفون، فیکس، ای میل اور انٹرنیٹ وغیرہ) تحاریک آزادی کے لئے ایک اہم ہتھیار ہے۔ نفسیاتی جنگ اور کسی مسئلے پر رائے عامہ کو موافق یا مخالف بنانے میں تو میڈیا اہم ترین کردار ادا کرتا ہے علاوہ ازیں میڈیا انسان کیلئے ذاتی اور انفرادی طور پر بھی ضروری ہے اسلئے کہ اس کے مناسب استعمال سے انسان کے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ اسکی سوچ گہری ہو جاتی ہے اور اسکی نظر میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں میڈیا انسان کی زبان اور قلم کے فرائض بھی انجام دیتا ہے۔ چنانچہ سیاسیات اور تحاریک آزادی سے منسلک ایک انسان کیلئے میڈیا سے مسلسل رابطہ روٹی، کپڑے اور مکان کی طرح اسکی بنیادی ضروریات زندگی میں شامل ہو گیا ہے۔ چونکہ میرا اوڑھنا بچھونا تحریک آزادی ہی رہا ہے اسلئے میڈیا سے میرا مسلسل رابطہ ایک قدرتی امر ہے۔

میڈیا سے مختلف طریقوں سے استفادہ کیا جا سکتا ہے ان میں، پریس کانفرنسیں، فورم، سیمینار، جلسے جلوس، پریس ریلیز، اخباری بیانات اور مضامین معروف طریقے ہیں۔ مناسب ہے کہ ان تمام میں میری کارکردگی اور سرگرمیوں کو مختصراً لیکن الگ الگ بیان کیا جائے۔

پریس کانفرنسیں :اوائل 1987ء سے 2004ء تک کے 18 سالوں کے دوران میری درجنوں پریس کانفرنسیں ہوئی ہیں جن میں چار بیرونی ممالک میں ہوئی ہیں اور خاصی اہم تھیں اسلئے انہیں سفارتی سرگرمیوں کے باب میں شامل کیا گیا ہے۔اب تک آزاد کشمیر کے دارالحکومت مظفر آباد میں میری درجن بھر کانفرنسیں ہوئی ہیں جن میں 18 جون 1990ء (جس میں میں نے خودمختار جموں کشمیر کی عارضی حکومت کے قیام کا اعلان کیا تھا) کی تاریخی پریس کانفرنس کے علاوہ 10 فروری 1992ء اور 13 فروری کی جنگ بندی لائن عبور کرنے اور مظاہرین پر فائرنگ کے خلاف ہڑتال کی اپیل پر مشتمل پریس کانفرنسیں بھی شامل ہیں۔تینوں پر ہجوم تھیں اور انہیں قومی اور عالمی سطح پر وسیع کوریج ملی۔ان کے علاوہ دھیرکوٹ میں ایک، باغ میں دو، راولاکوٹ میں دو، عباسپور میں دو، تراڑکھل میں دو، ہجیرہ میں ایک، کوٹلی میں دو، نکیال میں ایک، چکسواری میں دو، اسلام گڑھ میں ایک، میرپور میں دو، بھمبر میں ایک، راولپنڈی میں دو اور اسلام آباد میں تقریباً بیس (میری اکثر اہم پریس کانفرنسیں اسلام آباد کے ہالیڈے ان، مارگلہ موٹل اور میریٹ ہوٹل میں ہوئی ہیں) گلگت میں دو، اسکردو ایک، سیالکوٹ ایک، لاہور پانچ، پشاور ایک اور کراچی میں چار پریس کانفرنسیں ہوئی ہیں۔ان پریس کانفرنسوں میں میں نے تنظیم کے نظریات (خاص کر فارمولا اور روڈ میپ)، اسکے پروگرام، مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی سے متعلق واقعات حاضرہ کے بارے میں لبریشن فرنٹ کے موقف اور پالیسی کی وضاحت کے علاوہ عوامی حقوق کے بارے میں لبریشن فرنٹ کے مطالبات کی وضاحت کی۔میں نے دو بار پاکستان آئے ہوئے بھارتی صحافیوں کی پریس کانفرنسیں کیں۔دونوں کو ناکام بنانے کیلئے پوری کوشش ہوئی لیکن میں بھارتی صحافیوں تک اپنا موقف پہنچانے میں کامیاب ہوا اور اسے بھارتی میڈیا میں خاصی کوریج ملی۔

فورم: گزشتہ تقریباً دو عشروں سے پاکستان کے اکثر بڑے اخبار اہم موضوعات پر فورم میں بحث کراتے ہیں جن میں ان موضوعات کے متعلق ملک کی اہم شخصیتیں ان پر اپنے اور اپنی پارٹی کے موقف بیان کرتی ہیں، اس سلسلے میں پہلا اہم فورم 25 فروری 1992ء کو روزنامہ جنگ لاہور کے ارشاد احمد حقانی صاحب اور حامد میر نے کرایا۔ہم نے اس سے صرف تقریباً دو ہفتے پہلے کشمیر میں جنگ بندی لائن عبور کرنے کی کوشش کی تھی جس سے ہماری تحریک، ہماری تنظیم اور ہمارے نظریئے کو عالمی سطح پر وسیع تشہیر ہوئی تھی۔فورم کا موضوع تھا (خودمختار کشمیر کا نعرہ اور پاکستان) اس فورم میں ایک طرف پاکستان پیپلز پارٹی کے مرکزی رہنما سلمان تاثیر، مسلم لیگ کے نائب صدر آصف ورگ، جمعیت العلمائے اسلام کے حافظ حسین احمد، جمعیت علمائے پاکستان کے نائب صدر جنرل اظہر، جماعت اسلامی کے صوبائی امیر اسلم سلیمی، جموں کشمیر مسلم کانفرنس کے سردار عتیق احمد اور کشمیر ایکشن کمیٹی کے کلیم اختر تھے۔اور دوسری طرف میں تھا جملہ اصحاب نے حسب توقع نظریۂ خودمختار کشمیر کی مخالفت کی جبکہ میں نے اہم دستاویزات اور حوالوں کی مدد سے اسکی حمایت کی البتہ سامعین کی اکثریت نے میری حمایت کی۔

روز نامہ جنگ لاہور نے دو سال بعد ایک بار پھر ایسے ہی فورم کا اہتمام کیا اور اس میں بھی میں نے اپنے نظریہ خود مختار کشمیر کی بھرپور ترجمانی کی۔ جنگ راولپنڈی کے راجہ جاوید بھٹی اور نوائے وقت کے سلطان سکندر اور کبھی کبھی طارق وارثی بھی مسئلہ کشمیر سے متعلق اہم رواں موضوعات پر فورم کا اہتمام کر کے مجھے بھی اپنے موقف کی ترجمانی کا موقعہ دیتے رہے ہیں ان کے علاوہ اخبارات روز نامہ اوصاف، مرکز، پاکستان، خبریں، صحافت، الاخبار اور کائنات وقتاً فوقتاً فورم منعقد کرتے رہے جن میں میں اپنی تنظیم کے نظریے اور پالیسی کی وضاحت کرتا رہا۔ میں خصوصی طور پر نوائے وقت کے سلطان سکندر صاحب کا ممنون ہوں کہ انہوں نے اس سلسلے میں میری بڑی مدد اور حوصلہ افزائی کی۔

سیمینار: 1987ء سے 2004ء تک میں نے لبریشن فرنٹ، دیگر سیاسی پارٹیوں، غیر سرکاری تنظیموں اور اخبارات کی طرف سے منعقد کئے گئے متعدد سیمینارز میں شرکت کر کے اپنے نظریے اور فارمولے کی وضاحت کی۔ ان میں سے مختلف عالمی اداروں کی مالی مدد سے لیکن عملاً روز نامہ دی نیوز اور روز نامہ جنگ کے امتیاز عالم صاحب اور ارشاد احمد حقانی صاحب کے زیر انتظام اسلام آباد میں چھ عدد پاک بھارت سیمینار ہوئے اور ان میں سے ہر ایک میں مجھے مہمان مقرر کی حیثیت سے مدعو کیا گیا۔ دوسرے مقررین میں بھارت اور پاکستان کے صف اول کے سیاسی رہنما، دانشور، سینئر صحافی، سفارتکار اور غیر ملکی سفیر شامل ہوتے تھے۔ ان میں سے اکثر میں میں واحد کشمیری تھا۔ ان کانفرنسوں کے دوران میں مندوبین سے ذاتی طور پر بھی ملتا مسئلہ کشمیر پر تبادلہ خیال کرتا اور انہیں تنظیم کا لٹریچر بھی دیتا رہا۔ اس سلسلے میں 1999ء تک ڈاکٹر حیدر حجازی میری مدد کرتے رہے۔ 10-11 اگست 2003ء اسلام آباد میں جنوبی ایشیا کے آزاد میڈیا کی تنظیم SAFMA کی طرف سے اور ناروے کی این جی او NORD کے مالی تعاون سے ایک تاریخی سیمینار ہوا جس میں بھارت اور پاکستان کی تمام معروف سیاسی پارٹیوں کے نمائندوں (پاکستانی پارٹیوں کے سربراہوں بھارتی پارٹیوں کے سربراہوں یا سینئر عہدہ داروں) دونوں ملکوں کے سینئر صحافیوں، دانشوروں اور سفارتکاروں نے شرکت کی۔ میں نے اور میرے سینئر ساتھی ایس ایم افضل نے پہلے ہی دن بھارت کی کشمیر کمیٹی کے سربراہ رام جیٹھ ملانی صاحب سے تفصیلی گفتگو کی اور انہیں تنظیم کے روڈ میپ کی ایک کاپی دیدی۔ جیٹھ ملانی صاحب نے ہمارے نظریے سے اتفاق تو کیا لیکن طریقہ کار سے تھوڑا اختلاف کیا۔ میں نے سیمینار کے پانچویں سیشن میں جس میں مسئلہ کشمیر زیر بحث آنا تھا خاص طور پر شرکت کی۔ مجھ سے منتظمین نے وعدہ کیا تھا کہ مجھے اپنا موقف پیش کرنے کا پورا موقع دیا جائے گا۔ لیکن کچھ مقررین کی طویل تقریروں کے نتیجے میں مقررہ وقت ختم ہونے کی وجہ سے مجھے موقعہ نہ ملا۔ ایک پاکستانی ممبر پارلیمنٹ نے ریاست جموں کشمیر کے تین ٹکڑے کرنے کی تجویز دی تھی یعنی لداخ اور جموں کو بھارت میں ضم کیا جائے۔ آزاد کشمیر گلگت بلتستان کو پاکستان میں ضم کی جائے اور وادیٔ کشمیر کو بھارتی اقتدار اعلیٰ کے حدود کے اندر کچھ اندرونی خود مختاری دی جائے اور ایک بھارتی سینئر صحافی نے اس تجویز کی تائید کی

روزنامہ خبریں (10) 13 اگست 2003ء

آزادی کیلئے جاری جدوجہد کشمیر کا مسئلہ عالمی ثالثی سے حل کرنے پر زور

لبریشن فرنٹ نے بندوق اٹھا کر مسئلہ کشمیر کو زندہ کیا، امان اللہ

کشمیر بھارتی آئوٹ لک سے پہلے پاکستان کا بھی رگ ہے، کروڑ کشمیریوں کے مستقبل کے فیصلے کا حق رکھتے ہیں، لبریشن فرنٹ کا اجلاس سے خطاب

تنازعہ کے حل کیلئے کشمیریوں کو اظہار خیال کا موقع نہیں دیا جا رہا، بھارت اور پاکستان کشمیر کے مالک بن کر اس کے مستقبل بارے تجاویز دے رہے ہیں

بقیہ نمبر 17 // امان اللہ

ریاست جموں کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق صرف ڈیڑھ کروڑ ریاستی باشندوں کو حاصل ہے۔ وہ بھارت اور پاکستان کے پارلیمنٹیرینز کے ایک اجلاس سے خطاب کر رہے تھے۔ اس سے قبل کسی کشمیری کو اظہار خیال کا موقع دیئے بغیر اجلاس کے اختتام کے اعلان کے خلاف زبردست احتجاج کرتے ہوئے امان اللہ خان نے کہا کہ بھارتی اور پاکستانی اپنے آپ کو کشمیر کے مالک تصور کر کے اس کے مستقبل کے بارے میں تجاویز پیش کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ بھارتی اور پاکستانی کشمیر کا فیصلہ کرنے والے کون ہوتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ باتیں تو کشمیر کے بندر بانٹ کی ہو رہی ہیں ایک کشمیر کو اظہار خیال کا موقع تک نہیں دیا جا رہا۔ انہوں نے ہاؤس سے پرزور مطالبہ کیا کہ وہ جنگ بندی لائن کے دونوں طرف کی کشمیری قیادت کو مل بیٹھنے کا موقع دیں تاکہ وہ مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کیلئے ایک متفقہ اور مشترکہ فارمولا اپنائے۔ امان اللہ خان نے کہا کہ کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے نہ پاکستان کی شہہ رگ' اس کے واحد مالک ریاست کے ڈیڑھ کروڑ باشندے ہیں اور وہی اس کے مستقبل کا تعین کرنے کے مجاز ہیں۔ لبریشن فرنٹ نے بندوق اٹھائی جس سے نیم مردہ مسئلہ کشمیر پھر سے زندہ ہو گیا۔ انہوں نے زور دے کر کہا کہ ہمیں کشمیر میں مسلح جدوجہد شروع کرنے پر فخر ہے ندامت نہیں۔

اسلام آباد (اپنے نمائندے سے) کشمیر لبریشن فرنٹ کے چیئرمین امان اللہ خان نے پاک بھارت پارلیمنٹیرینز کے اجلاس میں کہا کہ وہ بھارت و پاکستان کشمیر میں حق حاصل نہیں کر سکتے جو کشمیر کے مستقبل کا کوئی فیصلہ کرنے کا حق رکھتے ہیں۔

باقی صفحہ 8 کالم نمبر 7

پاک بھارت پارلیمنٹیرینز کے اجلاس میں
امان اللہ نے زبردست احتجاج کے ذریعے
خطاب کا حق حاصل کر کے تنظیم کا
روڈ میپ پیش کیا

تھی۔ سیشن کے خاتمے کے اعلان کے ساتھ ہی میں چیخ پڑا کہ یہاں کشمیر کے مستقبل کی باتیں ہوئیں۔ بھارتی اور پاکستان مندوبین نے کشمیر کو اپنے بزرگوں کی جاگیر سمجھ کر اسکی بندر بانٹ کی تجویزیں دی ہیں جبکہ یہاں میں اکیلا کشمیری ہوں جسے بولنے کا ٹائم تک نہیں دیا گیا۔ کیا یہی بھارت کی جمہوریت اور یہی پاکستان کی اسلامی اخوت ہے۔ آخر پاکستانی اور بھارتی ہوتے کون ہیں میرے وطن کی بندر بانٹ کی تجویزیں دینے والے۔ میں یہ سب کچھ مائیک پر انتہائی اونچی آواز میں کہتا رہا حتیٰ کہ دونوں طرف کے بہت سے مندوبین نے میرے احتجاج کو حق بجانب قرار دیکر انتظامیہ سے مطالبہ کیا کہ مجھے اپنا موقف پیش کرنے کا موقعہ دیا جائے چنانچہ مجھے پندرہ منٹ دیئے گئے (میرے ساتھ مقبوضہ کشمیر سے بھارتی پارلیمنٹ کے دو ممبران چوہدری لطیف اور مسٹر سنگھ کو بھی موقعہ دیا گیا) میں نے مسئلہ کشمیر کے حل کیلئے لبریشن فرنٹ کا فارمولہ اور روڈ میپ پیش کیا چونکہ یہ بند سیشن تھا اسلئے میرے شور وغوغا اور تقریر کی مناسب تشہیر نہیں ہوئی۔ البتہ جملہ حاضرین جو بھارت اور پاکستان کے سینئر سیاستدان، صحافی اور دانشور تھے تک میرا موقف پہنچ گیا۔ بہت سے سفارتکار ایک طرف بیٹھے یہ ڈراما دیکھتے رہے اور ایک سفارتکار نے میرے پاس آ کر مجھے مبارکباد دی۔ اس طرح میں اس اہم سیمینار کے ذریعے مسئلہ کشمیر سے متعلق اپنا اور تنظیم کا موقف دنیا تک پہنچاتا رہا۔

انٹرویوز: گزشتہ 18 سال کے دوران پاکستانی اخبارات میں دوسرے ممالک کے اخبارات کی نسبت میرے کم انٹرویو شائع ہوئے ہیں جن پاکستانی اخبارات میں اس طویل مدت میں ایک آدھ انٹرویو شائع ہوا ہے ان میں روزنامے۔ دی نیشن The Nation، دی ڈان THE DAWN، فرنٹیئر پوسٹ FRONTIER POST، آبزرور Observer اور ہفت روزوں میں فرائیڈے ٹائم Friday Times، فرنٹ لائن FRONTLINE اور ماہنامہ ہیرالڈ HERALD وغیرہ شامل ہیں۔ اردو اخباروں میں خبریں خاصی شائع ہوتی رہیں البتہ انٹرویو بہت کم ہوئے۔ سرکاری الیکٹرانک (ریڈیو، ٹی وی) نے 1992ء سے ہی مجھے بلیک لسٹ کیا ہوا ہے۔ اسکے مقابلے میں بھارت کے مشہور اخبارات ٹائمز آف انڈیا (TIMES OF INDIA) انڈین ایکسپریس (Indian Express)، دی ہندو (The Hindu)، دی ایشین ایج (The Asian Age) دی ٹربیون (THE TRIBUNE)۔ دی ٹیلیگراف (The Telegraph) اور ہفت روزوں میں دی آؤٹ لک (The Outlook)۔ فرنٹ لائن (FRONTLINE) اور انڈیا ٹوڈے (India Today) شامل ہیں۔ انڈیا کے ٹی وی چینلز سے بھی میرے انٹرویو ٹیلی کاسٹ ہوئے۔ جن بھارتی صحافیوں نے میرے انٹرویوز میں بہترین صحافیانہ دیانتداری کا مظاہرہ کیا۔ ان میں ٹائمز آف انڈیا کے دلیپ پڈگوانکر (Dilip padguankar) اور ونود شرما (Vinod Sharma)۔ ہندوستان ٹائمز کے بھارت بھوشن (Bharat Bushan)۔ ایشین ایج کی سیما مصطفےٰ (Seema Mustafa)۔ آؤٹ

لک کے امیت پرکاش (Amit Parkash)، انڈیا ٹوڈے کی ہرندر بھویجا (Harinder Bhaveja)۔ دی ہندو کے مسٹر بھروا (Mr. Barhwa) اور مرلی دھر ریڈی (Murlidar Reddy) اور این ڈی ٹی وی (NDTV) کی برکھادت (Barkha Dutt) اور ندی راز دان (Nidhi Razdan) شامل ہیں۔

بھارت اور پاکستان کے علاوہ مشرق وسطیٰ کے اخبارات۔ خلیج ٹائمز۔ گلف نیوز۔ عرب نیوز۔ المدینہ۔ الاہرام میں میرے طویل انٹرویو شائع ہوئے۔ کچھ نے اداریے بھی لکھے خاص کر جنگ بندی لائن پر ہمارے حملوں سے متعلق۔ ان کے علاوہ نیویارک ٹائمز۔ واشنگٹن ٹائمز۔ دی انڈی پینڈنٹ۔ دی گارڈین۔ دی ٹیلی گراف۔ ٹائمز آف لنڈن کے علاوہ امریکہ کے بہت سے علاقائی اخبارات نے میرے انٹرویو شائع کئے اور میری سرگرمیوں سے متعلق خبریں شائع کیں۔ ریڈیو میں سے بی بی سی۔ وائس آف امریکہ۔ وائس آف جرمنی۔ وائس آف ڈنمارک۔ ریڈیو ایران مجھ سے متعلق خبریں اور میرے انٹرویو نشر کرتے رہے۔ ٹی وی چینلز میں سے بی بی سی۔ سی این این۔ دی رائٹر۔ سی این این جرمنی۔ ترکی اور ہالینڈ کے چینلز کے علاوہ جاپان۔ آسٹریلیا۔ ابوظہبی۔ سہارا۔ الجزیرہ۔ دی سٹار۔ العربیہ شامل ہیں۔ ان میں سے کچھ نے میرے انٹرویو براہ راست بھی ٹیلی کاسٹ کئے۔ غیر ملکی نشریاتی اداروں کے جن پاکستانی اور کشمیری صحافیوں نے مجھے مناسب کوریج دی ان میں رائٹر کے راجہ اصغر۔ ناصر ملک۔ مزمل پاشا۔ وائس آف جرمنی اور ڈی پی اے کے امتیاز گل اور منصوری صاحب۔ وائس آف امریکہ کے ایاز گل۔ ریڈیو ایران کے سبطین نقوی۔ بی بی سی کے ظفر عباس اور ذوالفقار علی اور الجزیرہ کے جمال اسماعیل اور احمد زیدان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ پاکستان کے سرکاری ذرائع ابلاغ نے 1991ء سے ہی مجھے بلیک لسٹ کئے رکھا ہے البتہ جیو ٹی وی (GEO TV) والے میرے ساتھ خاصا انصاف کرتے رہے ہیں۔ جس کیلئے میں حامد میر، رؤف بٹ، ناصر بیگ چغتائی، قیصر بٹ، آصف بھٹی، مس آمنہ شاہین اور افتخار احمد کا مشکور ہوں۔ اسی طرح اے آر وائی (ARY ONE WORLD) اپنے اہم پروگرام آمنا سامنا میں مجھے موقعہ دیتا رہا۔ جس کیلئے میں جناب طلعت حسین اور مشتاق منہاس کا ممنون ہوں۔ ARY مجھے اپنی خبروں میں بھی مناسب کوریج دیتا رہا ہے۔ انڈس ٹی وی کے ندیم صاحب نے بھی مجھے کوریج دی۔

پریس ریلیز : میں مسئلہ کشمیر۔ تحریک آزادئ کشمیر اور عوامی، فلاحی، سیاسی، جماعتی اور انسانی حقوق سے متعلق ہر اہم واقعے یا نئی پیدا ہونے والی صورتحال کے بارے میں اپنا اور تنظیم کا موقف پریس ریلیز کے ذریعے قومی اور عالمی پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کو بھیجتا رہا ہوں اور ان میں سے اکثر کی مناسب کوریج ہوتی رہی ہے۔ گزشتہ 18 سال کے دوران میری ایک ہزار سے زیادہ پریس ریلیز جاری ہوئی ہیں۔

مضامین : میں نے گزشتہ 18 سال کے دوران مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی کے مختلف

پہلوؤں پر چالیس سے زیادہ طویل مضامین لکھے ہیں جو پاکستان کے اور کچھ بھارت کے صف اول کے روزناموں میں بھی شائع ہوئے۔

فیکس۔ ای میل اور انٹرنیٹ : گزشتہ عشرے کے دوران ہم فیکس۔ ای میل اور انٹرنیٹ کے ذریعہ بھی اپنے نظریئے سرگرمیوں اور مطالبات کو مطلوبہ حلقوں تک پہنچاتے رہے ہیں۔

الغرض میڈیا کے ذریعہ اپنے نظریئے۔ تحریک آزادی اور تنظیم کو قومی اور عالمی سطح پر پروجیکٹ کرنے کے سلسلے میں ہماری متذکرہ بالا سرگرمیاں اگرچہ اکثر دوسری کشمیری تنظیموں اور افراد کی سرگرمیوں سے کہیں زیادہ اور موثر ہیں لیکن میڈیا کی اہمیت کی مناسبت سے اور قومی اور عالمی حالات اس سے کہیں زیادہ کام کے متقاضی تھے۔ بہرحال مجبوریاں انسان کو کبھی اہم ترین فرائض کی ادائیگی سے بھی روکتی ہیں۔

3- ہماری مسلح جدوجہد آزادی

(i) پس منظر

دوسری جنگ عظیم (1939ء تا 1945ء) کے بعد دنیا بھر میں خاص کر ایشیا اور افریقہ میں نوآبادیاتی نظام کے خاتمے (Decolonisation) کی لہر دوڑ گئی اور صرف تین عشروں کے اندر اندر صدیوں سے غلام تقریباً ایک سو محکوم قومیں آزاد ہو گئیں۔ ان میں بہت سی قوموں نے حصول آزادی کے لئے سیاسی جدوجہد کے علاوہ مسلح جدوجہد بھی کی تھی۔ سفارتی سطح پر بھی محکوم قوموں کے حق خودارادیت کی حمایت نے زور پکڑا لیکن بدقسمتی سے نوآبادیاتی نظام سے آزاد ہونے والی کچھ قوموں نے خود نوآبادیاتی طرز عمل اپنایا۔ بھارت اور خاصی حد تک پاکستان نے بھی جو خود تقریباً ڈیڑھ صدی کی غلامی کے بعد آزاد ہوئے تھے کشمیر کے بارے میں بدترین نوآبادیاتی طرز فکر و عمل اپنایا۔

کشمیریوں نے 1947ء میں مسلح جدوجہد کے ذریعہ ریاست جموں و کشمیر کا تقریباً ایک تہائی حصہ آزاد کرایا تھا۔ اس میں انہیں پاکستان کی کچھ مدد حاصل رہی تھی خاص کر اس علاقے میں جو اب آزاد کشمیر کے نام سے جانا جاتا ہے جبکہ شمال میں گلگت بلتستان کے تقریباً 45 ہزار مربع میل (تقریباً ایک لاکھ پندرہ ہزار مربع کلومیٹر) علاقہ وہاں کے باشندوں نے خود آزاد کرایا تھا۔ لیکن بعد میں اس میں سے تقریباً 38 ہزار مربع کلومیٹر علاقے پر بھارتی فوج نے قبضہ کر لیا جس کی بہت سی وجوہات میں سے ایک وجہ پاکستان آرمی کے افسروں جو 1948ء میں وہاں بھیجے گئے تھے اور مقامی حریت پسند کمانڈروں کے مابین اتحاد فکر و عمل کا فقدان تھا۔ بہرحال یکم جنوری 1949ء کی (اقوام متحدہ کے زیر نگرانی اور کشمیریوں کو حق

خود ارادیت دینے کے وعدے پر ہونے والی) جنگ بندی کے بعد سالہا سال تک مسئلہ کشمیر اقوام متحدہ کے دفتر اور بھارت اور پاکستان کی وزارت ہائے خارجہ کے درمیان ہی گھومتا رہا۔ پاکستان نے 1965ء میں آپریشن جبرالٹر کے تحت مسلح افراد کشمیر بھیجے جن کی سرگرمیوں کے نتیجے میں پاکستان اور بھارت کے مابین جنگ ہوئی جو کشمیر کی حد تک بے فائدہ ہی نہیں رہی بلکہ اس نے ہماری تحریک آزادی کو خاصا نقصان بھی پہنچایا۔

میں مقبوضہ کشمیر سے 1952ء میں پاکستان آیا تھا۔ کچھ مدت تک راولپنڈی پشاور میں رہنے کے بعد کراچی چلا گیا۔ 1955ء کے بعد کشمیر سٹوڈنٹس فیڈریشن، کشمیر انڈیپنڈنس کمیٹی اور جموں کشمیر محاذ رائے شماری کے مرکزی عہدیدار کی حیثیت سے میں نے تحریک آزادی میں بھرپور حصہ لینا شروع کیا اور اس دوران میرا اس زمانے کی مشہور تحاریک آزادی سے تعلق پیدا ہوا ان میں الجزائر کی تحریک آزادی کی اہم ترین تنظیم FLN (قومی محاذ آزادی) ویت نام کی NLF (قومی محاذ آزادی) اور فلسطینیوں کی تنظیم الفتح قابل ذکر ہیں۔ یہاں تک کہ میں نے 1969ء میں لکھا اپنا پہلا کتابچہ ''ایف ایل این۔ الفتح اور کشمیری نوجوان'' الجزائر اور فلسطین کی تحاریک آزادی اور ان سے کشمیریوں کو ملنے والے سبق سے متعلق ہی لکھا۔ پاکستان میں ان تحریکوں اور تنظیموں کے نمائندوں سے میرے قریبی تعلقات تھے جن کی تفصیل جہدِ مسلسل کی پہلی جلد میں درج ہے۔

دنیا کی اہم تحاریک آزادی کے معاملات۔ ان کے طرز فکر و عمل اور ان کی حکمت عملیوں کے مشاہدے اور مطالعے کے نتیجے میں یہ بات میری سوچ کا اہم حصہ بن گئی تھی کہ حصول آزادی کے لئے سیاسی جدوجہد، سفارتی جدوجہد اور مسلح جدوجہد کے محاذوں پر پوری اور مربوط سرگرمی انتہائی ضروری ہے۔ میں ان تینوں محاذوں کو حصول آزادی کے لئے ناگزیر اور ایکدوسرے کے لئے لازم و ملزوم سمجھنے لگا تھا۔ اتفاق سے میرے کچھ قریبی ساتھی اور دوست جن میں شہید کشمیر مقبول بٹ، میر عبدالقیوم، میجر امان اللہ، جی ایم لون، مجید امجد بٹ، میر ہدایت اللہ، غلام دین عشائی، پیرزادہ غلام مصطفےٰ علوی وغیرہ پیش پیش تھے، بھی اسی طرز فکر کے حامی تھے۔ چنانچہ ہم نے اگست 1965ء میں مسلح جدوجہد آزادی کے لئے ایک زیرزمین تنظیم جموں کشمیر نیشنل لبریشن فرنٹ (NLF) قائم کی۔ میجر امان اللہ خان (آف ہائی ہامہ کپواڑہ جو دوسری جنگ عظیم کے دوران انگریز مخالف فوج انڈین نیشنل آرمی میں شامل تھے اور انہوں نے جاپان میں گوریلا جنگ میں تربیت حاصل کی تھی اور بعد ازاں کشمیر میں 1947ء کی جنگ آزادی میں بھرپور حصہ لینے کے بعد آزاد کشمیر فوج میں شامل ہو کر 1964ء میں میجر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے) این ایل ایف کے عسکری شعبے کے سربراہ، میر عبدالقیوم اور جی ایم لون مالی شعبے کے، میں سیاسی، سفارتی اور پبلسٹی کے شعبوں کا سربراہ مقرر ہوا اور مقبول بٹ کو ان تمام شعبوں کے مابین رابطے کا انچارج مقرر کیا گیا۔

این ایل ایف نے مقبوضہ کشمیر میں مسلح جدوجہد آزادی شروع کرنے کا پروگرام بنایا اور جون 1966ء میں میجر امان اللہ، مقبول بٹ، صوبیدار کالا خان، صوبیدار حبیب اللہ بٹ اور اورنگزیب جنگ

بندی لائن عبور کر کے مقبوضہ کشمیر چلے گئے جہاں وہ تین ماہ تک خاموشی سے نوجوانوں کو نظریاتی اور عسکری تربیت دیتے رہے۔ واپسی پر مقبول بٹ، کالا خان بھارتی فوج کے ہاتھوں گرفتار اور اورنگزیب شہید ہو گئے جبکہ میجر امان اللہ واپس آزاد کشمیر آنے میں کامیاب ہو گئے۔

مقبول بٹ کو انکے مقامی ساتھی میر احمد کے ساتھ سزائے موت سنائی گئی اور کالا خان کو عمر قید لیکن اس سزا پر عمل ہونے سے پہلے ہی دسمبر 1968ء میں مقبول بٹ، چوہدری یاسین اور میر احمد سرینگر جیل سے فرار ہو کر آزاد کشمیر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

جنوری 1971ء میں این ایل ایف نے بھارتی جہاز گنگا اغوا کرا کے سرینگر سے لاہور پہنچایا۔ لیکن اس سلسلے میں ابتدائی جوش وخروش کے بعد اپریل 1971ء میں ہائی جیکروں (اشرف اور ہاشم) مقبول بٹ، میر قیوم، میر منان، جی ایم لون سمیت این ایل ایف اور محاذ رائے شماری کے تقریباً تین سو ممبروں کو اس الزام میں گرفتار کیا گیا کہ گنگا بھارتی حکومت کے ایما پر اغوا کیا گیا تھا۔ میں نومبر 1970ء سے ہی گلگت جیل میں تھا۔ ہائی جیکروں اور مقبول بٹ اور ان کے ساتھیوں پر شاہی قلعے لاہور میں انسانیت سوز تشدد ہوا اور آخر مئی 1973ء میں ان کے کیس کا فیصلہ ہوا۔ عدالت نے ہاشم قریشی کے سوا تمام ملزموں کو محب وطن حریت پسند قرار دیکر بری کر دیا جبکہ ہاشم قریشی کو عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ اس پر الزام تھا کہ اس نے بھارت کے ایماء پر جہاز اغوا کر کے بھارت کو یہ جواز فراہم کیا کہ وہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے مابین ہوائی پروازوں پر پابندی لگائے۔ (ہاشم قریشی دس سال کی قید کاٹ کر 1980ء میں رہا ہو گیا)

مقبول بٹ دوسری بار 1976ء میں عبدالحمید بٹ اور ریاض ڈار کے ساتھ مقبوضہ کشمیر گئے لیکن بدقسمتی سے پھر گرفتار ہو گئے اور انہیں کشمیر میں رکھنے کی بجائے تہاڑ جیل دہلی بھیجا گیا جہاں انہیں 11 فروری 1984ء کو تختہ دار پر لٹکایا گیا۔ ان کے ساتھی حمید بٹ اور ریاض ڈار بارہ سال جیل کاٹنے کے بعد رہا ہو کر 1988ء میں پاکستان آ گئے۔

1976ء میں مقبول بٹ کے مقبوضہ کشمیر میں گرفتار ہونے کے بعد میں اپنے پہلے سے بنے پروگرام کے مطابق برطانیہ چلا گیا جہاں میں نے نئی ضرورتوں کے تحت وہاں قائم محاذ رائے شماری کا نام اور آئین بدل کر جموں کشمیر لبریشن فرنٹ رکھا۔ برطانیہ کے آئین کے تحت، ہم وہاں قائم اپنی تنظیم کے اغراض ومقاصد میں مسلح جدوجہد شامل نہیں کر سکتے تھے اسلئے تنظیم کا نام نیشنل لبریشن فرنٹ (NLF) کی بجائے صرف لبریشن فرنٹ رکھا۔ اس کے باوجود مسلح جدوجہد کی افادیت اور ضرورت سے متعلق میرے نظریئے میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بہرحال لبریشن فرنٹ کے اغراض ومقاصد میں مسلح جدوجہد کا کوئی ذکر نہ ہونے کے باوجود ستمبر 1985ء میں مجھے برطانوی حکومت نے ظاہراً دہشت گردی کے الزام میں اور اصل میں برطانیہ اور بھارت کی حکومتوں کے مابین ایک خفیہ معاہدے کے تحت گرفتار کیا اور سوا سال جیل میں رکھنے کے بعد اور عدالت سے بری ہونے کے باوجود برطانیہ بدر کر دیا۔

برطانیہ میں میری اسیری کے دوران پاکستان کی آئی ایس آئی نے ہماری آزاد کشمیر شاخ سے

رابطہ کر کے تجویز پیش کی تھی کہ ہم اس کے ساتھ اشتراک عمل سے مقبوضہ کشمیر میں مسلح جدوجہد آزادی شروع کریں۔ ہمارے ساتھی ڈاکٹر فاروق حیدر کا کہنا ہے کہ جب آئی ایس آئی نے ہم سے رجوع کیا اور ہمیں احساس ہوا کہ وہ مسلح جدوجہد آزادی میں ہماری غیر مشروط مدد کرنے میں سنجیدہ ہے تو ہم نے بھی اس سے سنجیدگی سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ ہماری ان سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ ان ملاقاتوں میں سے کچھ میں ہاشم قریشی بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ہاشم 1980ء میں جیل سے رہا ہو کر لبریشن فرنٹ کا ممبر بنا تھا۔ آئی ایس آئی والوں سے بات چیت کے دوران ہاشم کسی نہ کسی طرح پیسوں کا ذکر کرتا جس سے ہمیں سبکی محسوس ہوتی تھی۔ آخر ہم نے فیصلہ کیا کہ ان ملاقاتوں کے دوران کوئی بھی شخص پیسوں کا ذکر نہیں کرے گا۔ لیکن ایک تفصیلی ملاقات میں ہاشم نے تین لاکھ روپے نقد اور گاڑیوں کا مطالبہ کیا اور اجلاس کے بعد آئی ایس آئی والوں سے علیحدگی میں ملنے اسلام آباد پہنچ گیا لیکن ان کے وہاں نہ ملنے پر ان کے نام وہاں خط چھوڑ آیا۔ ڈاکٹر فاروق حیدر کا یہ بھی کہنا ہے کہ آئی ایس آئی والے ہاشم کی طرف سے بار بار پیسے کے مطالبے کی وجہ سے لبریشن فرنٹ سے ہی بدظن ہونے لگے تھے جس کا ذکر انہوں نے ایک اجلاس کے دوران کیا بھی۔

ہاشم قریشی سے متعلق اس کہانی کے یہاں ذکر کرنے کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ جو ہاشم قریشی آج ہمیں آئی ایس آئی کا آلہ کار ہونے کا سریحاً بے بنیاد الزام لگاتا ہے وہی میرے ساتھیوں کی ممانعت کے باوجود ہر اجلاس میں آئی ایس آئی والوں سے پیسے کا مطالبہ کرتا تھا۔ دراصل ہاشم قریشی کو پیسے دیکر اس سے کوئی بھی کام لیا جاسکتا ہے۔ وہ آئی ایس آئی سے تو غالباً کچھ نہ لے سکا اس لئے کہ میرے ساتھیوں نے ایسا ہونے نہیں دیا۔ لیکن بعد میں بھارتیوں نے پیسے دیکر اس سے خوب کام لیا۔ یاد رہے ہاشم قریشی نے 1985ء یا اس کے آس پاس پاکستان سے ہالینڈ جا کر وہاں یہ کہہ کر کہ پاکستان کشمیریوں کا دشمن ہے اور میری جان کو پاکستان میں خطرہ ہے ہالینڈ میں سیاسی پناہ لی۔ اس کی اوچھی حرکتوں کی وجہ سے لبریشن فرنٹ کی ہالینڈ برانچ نے اسے تنظیم سے خارج کر دیا۔ چنانچہ اس نے اپنی الگ پارٹی بنالی۔ لبریشن فرنٹ سے اخراج سے پہلے وہ اپنے آپ کو لبریشن فرنٹ کا بانی گردانتا رہا اور بھارتی صحافی اس کے اس بے بنیاد دعوے کو خوب پروجیکٹ کرتے رہے۔ اسی دوران اس نے بھارتیوں سے رجوع کیا جنہوں نے اس کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ ہر طریقے سے میری کردار کشی کرے۔ چنانچہ وہ خطوط، مضامین، کتابوں، کتابچوں اور انٹرنیٹ کے ذریعہ میرے خلاف ایسے ایسے بے بنیاد الزامات لگاتا رہا کہ گوئبلز کی روح بھی تڑپ اٹھی ہوگی۔

بہرحال ہاشم قریشی سے متعلق یہ باتیں ہر سبیل تذکرہ تھیں اور ان کا تذکرہ ضروری تھا۔ آیئے اب اصل موضوع کی طرف

دسمبر 1986ء میں میری برطانیہ بدری کے بعد لندن سے کراچی تک کے ہوائی سفر کے دوران میں نے مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی سے متعلق حالیہ معاملات خاص کر آندرون ریاست کسی جاندار تحریک کی

عدم موجودگی کے نتیجے میں عالمی برادری کی طرف سے مسئلہ کشمیر سے متعلق سرد مہری پر سنجیدگی سے غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ہمیں مسلح جدوجہد آزادی شروع کرنی چاہیئے۔ ویسے بھی مسلح جدوجہد آزادی اور جلاوطن حکومت کا قیام میرے طویل المعیاد پروگرام میں پہلے سے ہی شامل تھے۔ کیونکہ اس دوران کی تحاریک آزادی کے لئے یہ دونوں اقدام انتہائی مفید ثابت ہوئے تھے۔

کراچی میں کچھ مدت قیام کرنے کے بعد میں اوائل 1987ء میں راولپنڈی آیا۔ یہاں احباب سے اپنی نئی سوچ کے بارے میں سرسری سی بات کی اور احباب نے مجھ سے اصولی طور پر اتفاق کیا کہ کسی مخلص، بے غرض اور طاقتور حکومت یا ادارے کی طرف سے غیر مشروط حمایت کے بغیر ہمیں اپنے مشن میں انتہائی سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس سے پہلے ہم نے بیرونی امداد کے بغیر مسلح جدوجہد آزادی کی دو کوششیں کی تھیں اور دونوں میں ناکام رہے تھے بلکہ ان کوششوں کے نتیجے میں ہم اپنے ایک عظیم ساتھی مقبول بٹ سے محروم ہو گئے تھے اور اس سے قبل ہمیں بھارتی جہاز گنگا کے اغوا کی بھی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی تھی۔ البتہ ہم اس تلخ حقیقت سے بھی بے خبر نہیں تھے کہ بیرونی امداد بھی بڑے خطروں کی حامل ہوتی ہے۔

میں پاکستان کے وزیر خارجہ جناب آغا شاہی جن سے میری 1966ء سے علیک سلیک تھی ستمبر 1979ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس کے دوران نیویارک میں ملا اور بات چیت کے دوران تجویز پیش کی کہ کیوں نہ ہم کشمیری (لبریشن فرنٹ) کشمیریوں کے غیر محدود حق خودارادیت کے لئے عالمی سطح پر اور اندرون ریاست ایک بھرپور تحریک چلائیں جس میں اندرون ریاست مسلح جدوجہد بھی شامل ہو اور پاکستان اس میں براہ راست ملوث ہوئے بغیر ہماری حمایت اور مدد کرے۔ آغا شاہی نے کہا میں چند دن کے بعد پاکستان جا رہا ہوں وہاں میں آپ کی تجویز کے سلسلے میں صدر ضیاء الحق سے بات کروں گا۔ آغا شاہی صاحب کوئی دو ہفتے بعد دوبارہ نیویارک آئے اور مجھے اقوام متحدہ میں پاکستان کے سفیر جناب نیاز اے نائیک کے ذریعہ پیغام بھیجا کہ صدر پاکستان نے میری تجویز سے اتفاق نہیں کیا۔ آغا شاہی کا یہ پیغام پا کر مجھے بہت افسوس ہوا۔

میں غالباً 1983ء میں نیویارک میں عوامی جمہوریہ چین کی نائب وزیر خارجہ جو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کرنے نیویارک آئی ہوئی تھی سے ملا اور مسئلہ کشمیر کی تفصیلات، ہمارے نظریئے اور جدوجہد آزادی کے علاوہ مقبول بٹ جو اس وقت، تہاڑ جیل دہلی میں تھے سے متعلق معاملات کی تفصیلات بتائیں۔ انہوں نے تمام باتیں تفصیل سے سنیں۔ خاصے سوال بھی کئے جن کے میں نے تفصیلی جواب دیئے۔ آخر میں اس نے مجھ سے پوچھا کیا آپ چین سے مدد حاصل کرنے کے سلسلے میں پاکستان کے وزیر خارجہ آغا شاہی سے ہمارے نام ایک خط لا سکتے ہیں جس میں وہ کم از کم یہ بات لکھیں کہ اگر ہم تحریک آزادیٔ کشمیر کے سلسلے میں آپ کی کوئی مدد کریں تو پاکستان کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ آپ جانتے ہیں کہ پاکستان ہمارا دوست ہے اس کی مرضی کے بغیر یا خلاف ہم آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ بہر حال

میں نے بوجوہ مطلوبہ خط حاصل کرنے کی کوشش ہی نہیں کی نہ دوبارہ چینیوں سے رابطہ کیا۔

ایک بار میں نے ایک اہم اسلامی ملک کے وزیر خارجہ سے جدوجہد آزادئ کشمیر کے سلسلے میں ہماری عملی مدد کی درخواست کی تو انہوں نے یہ کہہ کر صاف انکار کیا کہ ہم اس بھارت کو ناراض کرنے کے متحمل ہی نہیں ہو سکتے جہاں پاکستان اور کشمیر سے کہیں زیادہ مسلمان رہتے ہیں جس سے ہمارے وسیع تجارتی تعلقات ہیں اور جو عالمی سیاسی کھیل کا ایک اہم کھلاڑی ہے۔

ہماری نظر میں دوسرا کوئی ایسا ملک نہیں تھا جو ہماری غیر مشروط مدد کرے چنانچہ ہم نے اس سلسلے میں کوششیں ہی ترک کر دیں۔

(ii) مسلح جدوجہد آزادی کی تیاریاں

1986ء میں میری برطانیہ بدری سے لیکر 1990ء تک میری مستقل رہائش آزاد کشمیر سے ڈیڑھ ہزار کلومیٹر دور کراچی میں تھی اور میں وقفے وقفے سے تحریکی اور تنظیمی معاملات کے سلسلے میں راولپنڈی اور آزاد کشمیر آیا جایا کرتا تھا۔ 1987ء میں ایک دن ڈاکٹر فاروق حیدر (ہمارے سینئر وائس چیئرمین) نے مجھے راولپنڈی سے کراچی فون کر کے کہا کہ یہاں راولپنڈی میں کچھ اہم سیاسی معاملے ہیں۔ آپ پنڈی آئیں تاکہ ان کے بارے میں باہمی مشورے سے حتمی فیصلہ کیا جائے۔ میں نے ان معاملات کی تفصیل پوچھی تو کہنے لگے فون پر بتانا مناسب نہیں۔ میں یہ سمجھتے ہوئے کہ کسی سیاسی جوڑ توڑ کا مسئلہ ہی ہوگا اور میں کچھ مصروف بھی تھا اس لئے میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا آپ کچھ سینئر ساتھیوں سے مشورہ کر کے اس معاملے کو نپٹا لیں۔ اس کے بعد یہ بات میرے ذہن سے ہی نکل گئی۔

کچھ مدت بعد میں راولپنڈی آیا تو ڈاکٹر صاحب نے مجھے بتایا کہ انہوں نے آئی ایس آئی کے تعاون سے بھارتی مقبوضہ کشمیر میں مسلح جدوجہد آزادی شروع کرنے کا پروگرام بنایا ہے اور اس سلسلے میں ابتدائی کام شروع بھی ہو گیا ہے۔ میں نے انتہائی حیرانگی سے پوچھا ڈاکٹر صاحب آپ نے اتنا بڑا اقدم مجھ سے اور تنظیم کی سنٹرل کمیٹی سے پوچھے بغیر کیسے اٹھایا۔ کہنے لگے ایک تو میں نے دو سینئر ساتھیوں سردار رشید حسرت اور راجہ مظفر کو اعتماد میں لینے کے بعد اور ان کی مرضی اور منظوری سے اٹھایا ہے اور دوسرے میں سمجھتا ہوں کہ معاملہ انتہائی راز داری کا متقاضی تھا اس لئے اس مرحلے پر دوسروں کو اعتماد میں لینا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ جہاں تک خود آپ کا تعلق ہے آپ نے تو خود فون پر اجازت دی تھی کہ معاملات کو آگے بڑھاؤ۔ میں نے کہا میں تو سمجھا تھا کہ معاملہ کچھ تنظیموں سے اتحاد کا تھا۔ میرے پوچھنے پر ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ پیشکش ہم نے نہیں آئی ایس آئی نے کی تھی اور آئی ایس آئی کے سربراہ جنرل اختر عبدالرحمٰن نے اپنی ہی نہیں صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق کی طرف سے بھی یقین دہانی کرائی ہے کہ نہ تو وہ ہمارے نظریئے کے راستے میں رکاوٹ بنیں گے نہ ہی ہماری تنظیمی پالیسیوں سے متعلق معاملات میں دخل دیں گے۔ میں ڈاکٹر صاحب کی باتیں سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ میرے اندازے اور معلومات کے مطابق صدر ضیاء الحق

ہمارے نظریۂ خودمختار کشمیر کے بارے میں خاصا نرم گوشہ رکھتے تھے۔ ایک بار انہوں نے اسلامی سربراہی کانفرنس سے واپسی پر اسلام آباد ایئرپورٹ پر پریس کانفرنس کے دوران مشہور کشمیری صحافی میر عبدالعزیز مرحوم کے ایک سوال کے جواب میں کہا تھا کشمیر بھی اسلامی کانفرنس کا ممبر بن سکتا ہے۔ جسکا واضح مطلب یہ تھا کہ کشمیر خودمختار ہوسکتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ جنرل ضیاء الحق نے واقعی یقین دہائی کروائی ہو کہ وہ ہمارے نظریئے اور ہماری تنظیم کے راستے میں رکاوٹ نہیں ڈالیں گے۔ پھر یہ تلخ حقیقت بھی تھی کہ بیرونی امداد کے بغیر کی گئی ہماری دو کوششیں مقصد کے حصول میں ناکام ہوگئی تھیں اور اہم بات یہ بھی تھی کہ ایک سینئر ساتھی نے (میری طرف سے فون پر اجازت ملنے کی) غلط فہمی کے تحت آئی ایس آئی سے وعدہ بلکہ معاہدہ کیا ہے اور وہ بھی دو اور سینئر ساتھیوں کے مشورے سے۔ اسلئے اب اس وعدے اور معاہدے سے انحراف، مناسب نہیں خاص کر جبکہ پاکستان کی طرف سے بالکل غیر مشروط مدد کا وعدہ ہوا ہے اور ہمارے پاس کوئی اور راستہ بھی نہیں۔ البتہ میں نے آئی ایس آئی کے متعلقہ افسروں سے ملنا چاہا تو میری ان سے کئی گھنٹوں پر محیط دو ملاقاتیں ہوئیں۔ بریگیڈیئر فاروق نے میرے استفسار بلکہ مطالبے پر وضاحت کی کہ

(1) آئی ایس آئی نے لبریشن فرنٹ کو غیر مشروط تعاون کی تجویز صدر جنرل ضیاء الحق کی منظوری بلکہ ہدایت پر پیش کی تھی۔

(2) آئی ایس آئی ہمارے تنظیمی اور نظریاتی معاملات میں کوئی مداخلت نہیں کریگی۔

(3) ہم مقبوضہ کشمیر سے نوجوان آزاد کشمیر لائیں گے اور ان کی ذہنی اور نظریاتی تربیت کریں گے۔ آئی ایس آئی والوں کا کام ان نوجوانوں کو صرف عسکری تربیت دینا اور انہیں اسلحہ فراہم کرنا ہوگا

(4) آئی ایس آئی اور لبریشن فرنٹ کا باہمی تعلق حاکم ومحکوم یا اجرت دینے والے اور اجرت لینے والے کا نہیں بلکہ کسی مقصد کے حصول کیلئے سرگرم عمل دو برابر رتبے والے شرکاء کار کا ہوگا اور میری تجویز بلکہ اصرار پر یہ بھی طے ہوا کہ

(5) لبریشن فرنٹ کے سیاسی اور سفارتی شعبے کا کوئی بھی ممبر یا ادارہ آئی ایس آئی سے کوئی نقد مدد نہیں لے گا۔ میں نے ان شرائط سے اتفاق کرنے سے پہلے دو باتوں کی وضاحت کی۔ اول یہ کہ نظریۂ خودمختار کشمیر ہمارے لئے سیاسی کلمے کا درجہ رکھتا ہے۔ اسلئے ہم کسی قیمت پر بھی اس سے دستبردار نہیں ہوسکتے اور دوم یہ کہ ہم جھکنا اور بکنا نہیں جانتے اسلئے ہم پر حکم چلانے یا ہمیں خریدنے کی کوشش نہ کی جائے۔ آئی ایس آئی کے نمائندوں نے کہا ہمیں آپ سے متعلق ان دونوں باتوں کا علم ہے اور ہم ان حقائق کو ہر گھڑی مدنظر رکھینگے۔ چنانچہ ہمارے مابین (زبانی طور پر) درج بالا شرائط پر مبنی ایک زبانی معاہدہ (Gentlemans Agreement) ہوگیا۔

اسی معاہدے کے تحت میرے دو کتابچے ''نظریۂ خودمختار کشمیر'' اور ''خودمختار کشمیر کیوں'' (جو

ہمارے نظریہ خودمختار کشمیر کی بنیادی تعلیم دیتے ہیں) بڑی مقدار میں آئی ایس آئی کی مدد سے بھارتی مقبوضہ کشمیر پہنچ کر وہاں تقسیم بھی ہو گئے اور ساتھ ہی مقبوضہ کشمیر سے نوجوانوں کو آزاد کشمیر لا کر یہاں عسکری اور نظریاتی تربیت دے کر واپس بھیجنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مقبوضہ کشمیر سے نوجوانوں کو آزاد کشمیر بھیجنے اور انہیں ہم تک پہنچانے کے سلسلے میں ابتدائی کام ترہگام ضلع کپواڑہ کے شیخ محمد افضل (جو آج کل لبریشن فرنٹ کے سینئر وائس چیئرمین ہیں) غلام نبی بٹ (برادر اکبر شہید کشمیر مقبول بٹ) ملک انور اور غلام محمد وانی، سرینگر کے بلال احمد صدیقی، کپواڑہ ضلع سے ناظم الدین (بابر) اور بشیر احمد پیر نے کیا اور انہوں نے آٹھ مقام آزاد کشمیر سے تعلق رکھنے والے لبریشن فرنٹ کے ممبروں شہید غلام نبی شانیا، ماما۔ بہاؤالدین کے ہمراہ نوجوان حریت پسندوں کا پہلا بیچ (Batch) مقبوضہ کشمیر سے آزاد کشمیر بھیج دیا۔ حریت پسندوں کے اس پہلے اور تاریخی قافلے میں جو فروری 1988ء میں آزاد کشمیر پہنچا عبدالحمید شیخ، ہلال احمد بیگ، وحید احمد، پیر علی محمد، غلام محمد گوجری، کیپٹن عبدالرشید، منظور احمد خان اور جاوید احمد شامل تھے۔

فروری 1988ء میں آنے والے حریت پسند عسکری اور نظریاتی تربیت لیکر واپس چلے گئے۔ انہیں ہدایت کی گئی کہ وہ کوئی ایکشن کرنے کی بجائے دوسرے نوجوانوں کو عسکری اور نظریاتی تربیت دیں۔ اور مرکز سے مزید ہدایات کا انتظار کریں۔ اس گروپ کے بعد نوجوانوں کا تانتا بندھ گیا۔ فروری سے جولائی 1988ء تک جو نوجوان تربیت کے لئے آزاد کشمیر آئے ان میں قابل ذکر (جنہوں نے بعد میں شہرت پائی) بلال احمد صدیقی، مقبول الائی، اعجاز احمد ڈار، محمد عبداللہ بھینگرو، حنیف چوہدری شامل تھے ان سب نے ہماری رکنیت حاصل کی تھی اور ہمارے نظریئے پر عمل کرنے کا تحریری حلف اٹھایا تھا۔ بعد میں بننے والی اہم تنظیموں حزب المجاہدین اور العمر کے بانیوں ماسٹر احسن ڈار اور مشتاق زرگر کی رکنیت کا عکس اگلے صفحوں پر ملاحظہ ہو۔

جون 1988ء میں ہم نے صلاح مشورے کے لئے غلام نبی بٹ، ایس ایم افضل اور غلام حسن لون کو آزاد کشمیر بلایا اور ان سے کئی دن کی مشاورت کے بعد ہم نے انہیں 13 جولائی (یوم شہدائے 1931ء) کو مسلح جدوجہد آزادی شروع کرنے کی ہدایت دے کر واپس مقبوضہ کشمیر بھیج دیا۔ اسی دوران آزاد کشمیر کے فضل احمد وانی اور منظور احمد بھی سرینگر گئے اور انہوں نے وہاں خاصا کام کیا۔ اس دوران ہم نے لبریشن فرنٹ کی سنٹرل کمیٹی کے اجلاس منعقدہ راولاکوٹ میں کمیٹی سے مسلح جدوجہد آزادی سے متعلق تمام معاملات کی منظوری لی تھی۔

(iii) مسلح جدوجہد آزادی کا آغاز

مسلح جدوجہد آزادی کی عملی ابتداء: 13 جولائی کی بجائے 31 جولائی 1988ء کو سرینگر میں امر سنگھ کلب اور سنٹرل پوسٹ اینڈ ٹیلیگراف آفس میں بموں کے دھماکوں سے ہوئی۔ مسلح جدوجہد آزادی کی اس پہلی کارروائی کا سہرا، ہمایوں آزاد، جاوید جہانگیر، شبیر احمد گورو، ارشد کول، غلام قادر راتھر اور

محمد رفیق کے سر ہے۔ کارروائی کی قیادت بلال احمد صدیقی نے کرنی تھی لیکن کسی فوری مجبوری کی وجہ سے وہ اس میں حصہ نہیں لے سکے۔ اسکے بعد اس قسم کی کارروائیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہاں تک کہ 18 ستمبر 1988ء کو سرینگر کا اعجاز احمد ڈار ایک مسلح کارروائی میں شہید ہو گیا۔ اعجاز احمد ڈار اس مسلح جدوجہد آزادی کا پہلا شہید تھا۔ اس مسلح جدوجہد آزادی کے سلسلے میں سب سے پہلے گرفتار ہونے والا نوجوان کپواڑہ کا منظور الاسلام تھا جو آزاد کشمیر سے واپسی کے فوراً بعد ہی گرفتار ہو گیا تھا۔ غلام نبی بٹ، ایس ایم افضل اور غلام حسن لون بھی آزاد کشمیر سے واپسی پر گرفتار ہو گئے۔

(iv) ہماری ایک فاش غلطی

1989ء کے دوران مختلف وجوہات کی بناء پر لبریشن فرنٹ کے چار کمانڈر، عبدالحمید شیخ، اشفاق مجید وانی، جاوید احمد میر اور محمد یاسین ملک نے بوجوہ کچھ زیادہ شہرت حاصل کی اور یہ چار حاجی گروپ (ناموں کے پہلے حروف کو ملا کر) کہلانے لگے۔ مجھے بلکہ آزاد کشمیر میں میرے قریب ترین ساتھیوں کو بھی اس معاملے کے پس منظر کا علم نہیں تھا۔ چنانچہ ہم نے بھی حاجی گروپ کو ہی زیادہ اہمیت دی جس کے نتیجے میں کچھ خاصے سرگرم اور مخلص کمانڈر ہم سے دور ہو گئے اور آخر انہوں نے 1990ء میں یا اس کے بعد براہ راست آئی ایس آئی کے زیر سرپرستی اور ہماری لاعلمی میں دوسرے گروپ بنا لئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ حاجی گروپ کو ہی اپنانا ہماری فاش غلطی تھی جس کے بعد میں سنگین نتائج نکلے۔

(v) رابعہ سعید کی یرغمالی

1989ء کی تیسری چوتھائی میں عبدالحمید شیخ اور نور محمد کلوال سمیت لبریشن فرنٹ کے کچھ اہم کمانڈر گرفتار ہو گئے تھے اور ان کو رہا کرانا ضروری تھا چنانچہ ہمارے کچھ نوجوانوں نے 8 دسمبر 1989ء کو بھارت کے اس وقت کے وزیر داخلہ مفتی محمد سعید (جن کا تعلق جنوبی کشمیر سے ہے اور جو اب بھارتی مقبوضہ کشمیر کے وزیر اعلیٰ ہیں) کی بیٹی ڈاکٹر رابعہ سعید کو سرینگر میں حراست میں لے لیا اور تنظیم کی خواتین ممبروں کی تحویل میں رکھ کر تنظیم کے پانچ کمانڈروں کی رہائی کا مطالبہ کر دیا۔ لبریشن فرنٹ اور بھارتی حکومت کے مابین چھ دن کے اعصاب شکن مذاکرات کے بعد آخر حکومت نے ہتھیار ڈال دیئے اور شیخ عبدالحمید، نور محمد کلوال، جاوید زرگر، الطاف احمد اور شیر خان کو رہا کر دیا۔ ہم یعنی مرکزی قیادت نے حاجی گروپ سے کہا تھا کہ حمید شیخ اور کلوال وغیرہ کے ساتھ شہید کشمیر مقبول بٹ کے بھائی غلام نبی بٹ کی رہائی کا مطالبہ بھی کیا جائے انہوں نے ہماری بات ماننے کی بجائے غلام نبی بٹ کی جگہ ایک عام سے بندوق بردار شیر خان کو رہا کروایا۔ غلام نبی بٹ بعد میں عدالت کے حکم پر رہا ہوئے لیکن نومبر 1994ء میں ظاہراً موٹر سائیکل کے ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے۔ اس سے پہلے غلام نبی بٹ اور یاسین ملک کے تعلقات کشیدہ ہو گئے تھے۔

الغرض لبریشن فرنٹ کے حریت پسندوں کی رہائی کے بعد ڈاکٹر رابعہ سعید کو اسی طرح رخصت کیا گیا جس طرح بھائی اپنی دلہن بہن کو گھر سے رخصت کرتے ہیں۔ رابعہ سعید نے بھی رہائی کے بعد ذرائع ابلاغ کے نمائندوں کو بتایا کہ حراست کے دوران بھی اس سے بہن کا سا برتاؤ کیا گیا اور وہ پورے عرصے خواتین کی نگرانی میں رہیں۔ اس واقعہ کی عالمی اور قومی ذرائع ابلاغ کے ذریعے بہت تشہیر بھی ہوئی اور اسکے نتیجے میں مسئلہ کشمیر، تحریک آزادیٔ کشمیر اور لبریشن فرنٹ بھی عالمی سطح پر خاصے اجاگر ہو گئے۔

رابعہ سعید سے متعلق بھارتی حکومت اور لبریشن فرنٹ کے مابین مذاکرات کے دوران ہی کسی نے اپنے آپ کو لبریشن فرنٹ کا ترجمان گردانتے ہوئے بی بی سی ریڈیو کو فون پر بتایا کہ لبریشن فرنٹ رابعہ سعید کو مسئلہ کشمیر حل ہونے تک رہا نہیں کرے گا۔ جس کے نتیجے میں مذاکرات میں ایک سنگین بحران کھڑا ہونے والا تھا۔ لبریشن فرنٹ کی طرف سے اس قسم کی شرط یا تو کسی بے وقوف یا جذباتی نوجوان نے رکھی تھی یا کوئی سازش تھی جس کا مقصد مذاکرات کو ناکام بنانا تھا۔ اتفاق سے بی بی سی کی خبر میں نے بھی سنی اور پریشان ہو گیا۔ لیکن وقت ضائع کیے بغیر میں نے بی بی سی کو راولپنڈی سے لندن فون کر کے لبریشن فرنٹ کے سربراہ کی حیثیت سے اس بات کی وضاحت کی کہ رابعہ سعید کیس کے سلسلے میں لبریشن فرنٹ کا واحد مطالبہ ہمارے کمانڈروں کی رہائی ہے۔ چنانچہ بی بی سی سے میرا بیان نشر ہوتے ہی مذاکرات میں پیدا ہونے والا بحران ٹل گیا اور بالآخر مذاکرات نتیجہ خیز ثابت ہو گئے۔

رابعہ سعید کیس کے سلسلے میں سوپور کی میر فیملی کو بڑی قربانی دینی پڑی۔ محمد زمان میر اور علی محمد میر طویل عرصے تک پابند سلاسل رہے۔ انجینئر جاوید میر اسی دوران آزاد کشمیر آ گئے جہاں انکا جوانی میں ہی انتقال ہو گیا۔ میر فیملی کے علاوہ رابعہ سعید کیس میں محاذ آزادی کے رہنما صوفی عبدالرحمٰن کی صاحبزادی کی خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں۔

(vi) کشمیریوں کا قتل عام

20 جنوری 1990ء کو سرینگر میں بھارتی فوج کے ہاتھوں کشمیریوں کا قتل عام ہوا۔ اس سے صرف ایک دن پہلے بھارت کی مشہور فرقہ پرست شخصیت جگ موہن نے کشمیر کے گورنر کے عہدے کا چارج لیا تھا۔ اور ایک دن بعد وزیر اعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے استعفیٰ دیا اور اس کے بعد اسمبلی توڑ کر صدر راج نافذ کر دیا گیا۔

(vii) اشفاق وانی کی شہادت

30 مارچ 1990ء کو لبریشن فرنٹ کا کمانڈر انچیف اشفاق مجید وانی بھارتی فوج کے ساتھ ایک تصادم میں شہید ہو گیا۔ حکومت کی طرف سے پابندی کے باوجود اس کے جنازے میں دسیوں ہزار افراد نے شرکت کی۔ اشفاق ایک انتہائی بہادر، صاف دل، محبِّ وطن، ملنسار، گہری فکر و نظر کا حامل، اعلیٰ

قائدانہ صلاحیتوں کا مالک اور جذبہ قربانی سے سرشار نوجوان تھا۔ اب تک ہم نے اشفاق کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر کئی کتابچے لکھے ہیں۔ گو اشفاق امر ہو گیا لیکن اس کی شہادت کے بعد ہمیں خاصی تنظیمی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

1990ء کے اوائل میں ہی لبریشن فرنٹ کی کال پر سرینگر میں تقریباً پانچ لاکھ افراد کا جلوس نکلا۔ 21 مئی 1990ء کو کچھ بندوق برداروں نے میرواعظ محمد فاروق کو ان کے دفتر میں گولیاں مار کر شہید کر دیا اور جب ان کا جسد خاکی ہسپتال سے گھر لے جایا جا رہا تھا تو بھارتی فوج نے مرحوم کا تابوت اٹھائے ہوئے لوگوں پر گولیاں برسائیں جس سے درجنوں افراد شہید اور بہت سے زخمی ہو گئے۔ 6 اگست 1990ء کو بجز جاوید میر لبریشن فرنٹ کی پوری قیادت اور پیپلز کانفرنس کے سربراہ عبدالغنی لون کے دونوں بیٹے بلال غنی لون اور سجاد غنی لون گرفتار ہو گئے۔ اس کے بعد 1991ء میں ہم نے مقبوضہ کشمیر کی تنظیم کو سیاسی اور عسکری شعبوں میں تقسیم کر دیا اور محمد یاسین ملک جو اس وقت جیل میں تھے کو بھارتی مقبوضہ کشمیر کے لئے تنظیم کا صدر اور عبدالحمید شیخ کو نائب صدر نامزد کیا۔ یاسین ملک اور حمید شیخ کو سیاسی شعبے سے منسلک کرنے کا بنیادی مقصد ان کی اسیری کو عالمی سطح پر خاص کر انسانی حقوق سے متعلق عالمی اداروں بالخصوص ایمنسٹی انٹرنیشنل کے نوٹس میں لا کر ان کی مدد حاصل کرنا تھا۔

اگست 1992ء میں عبدالحمید شیخ کو جو اگست 1990ء سے قید تھے رہا کر دیا گیا جس کے ساتھ ہی وہ تنظیم کے بھارتی مقبوضہ کشمیر زون کے قائم مقام صدر بن گئے جیل کے دوران ان میں قابل رشک ذہنی بلوغت اور سنجیدگی پیدا ہوئی تھی اور انہوں نے تنظیم کے منتشر معاملات کو سدھارنے کی بھرپور کوشش کی اور اس میں وہ پوری طرح کامیاب ہونے والے تھے کہ 18 نومبر 1992ء کو انہیں اس وقت شہید کیا گیا جب وہ ایک اہم تنظیمی اجلاس میں شرکت کر کے رات کے وقت کشتی میں دریائے جہلم عبور کر کے سرینگر کے ایک دوسرے علاقے میں جا رہے تھے۔ تراڑکھل آزاد کشمیر کے چوہدری جمیل اور سرینگر کے ڈسٹرکٹ کمانڈر مشتاق لون جو شیخ عبدالحمید کے ساتھ تھے بھی شہید ہو گئے۔ دوسرے کئی تحریکی شخصیتوں کے قاتلوں کی طرح حمید شیخ اور ان کے ساتھیوں کے اصل قاتلوں کا بھی کوئی پتہ نہیں چل سکا کہ کون تھے۔

نوے کے عشرے کے ابتداء میں ہی ایک بار لبریشن فرنٹ کی اپیل پر چار دن مسلسل ہڑتال رہی اور مسلسل سترہ دن کے کرفیو میں نرمی کے دوران لبریشن فرنٹ کے نوجوان لوگوں خاص کر غیر مسلموں کے گھروں تک ضروریات زندگی پہنچاتے رہے۔

(viii) طفل شودخانہ دار

1991ء میں ایک مغربی صحافی جو مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادئ کشمیر اور اس سے متعلق زمینی حقائق سے خاصی حد تک باخبر تھا اور ان ہی دنوں سرینگر سے ہو کر آیا تھا نے مجھے فون کر کے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں اسے میریٹ ہوٹل اسلام آباد میں ملا تو اس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا مسٹر خان آپ نے

بھارت کے زیر کنٹرول کشمیر میں اپنی تنظیم کی قیادت بچوں کے ہاتھ میں دیدی ہے۔ جو خودکشی سے کم نہیں وہاں عوام کی بھاری اکثریت آپ کی تنظیم اور اسکے نظریئے کی حامی ہے لیکن ناتجربہ کار اور محدود سوچ کی مالک قیادت کی غلطیوں کی وجہ سے یہ حمایت تیزی سے کم ہو رہی یعنی طفل شود خانہ دار خانہ شود ویران ہے۔ اسی دوران ایسا ہی تاثر مجھ سے راولپنڈی میں ایک طویل ملاقات کے دوران جنوبی ایشیا کیلئے نیویارک ٹائمز کی نمائندہ بابرا کراسٹ (Babra Crosset) نے بھی دیا جو خفیہ طور پر کئی بار سرینگر گئی تھیں۔

(ix) میرا اہم مشورہ

ایک مرحلے پر میں نے مشورہ دیا کہ لبریشن فرنٹ، صوفی محمد اکبر مرحوم کے محاذ آزادی اور عبدالغنی لون کی پیپلز کانفرنس کا اتحاد (Allaince) بنے، پیپلز کانفرنس اور محاذ آزادی والوں نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور میں نے اس کے لئے اغراض و مقاصد اور قواعد و ضوابط بھی مرتب کئے لیکن میرے سرینگر کے ساتھیوں نے بوجوہ تجویز کو ماننے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ اس تجویز کو عملی شکل نہیں دی جا سکی۔ اگر اس تجویز پر عمل ہوتا تو ہماری تاریخ کچھ اور ہوتی۔

غالباً 1990ء کے اوائل میں میری آئی ایس آئی کے ایک بریگیڈیئر سے جس نے یہ احمقانہ مطالبہ کیا تھا کہ لبریشن فرنٹ کے سنٹرل کمیٹی کے اجلاسوں میں آئی ایس آئی کے ایک سینئر افسر کو بھی بحیثیت مبصر بیٹھنے کی اجازت دی جائے، میری خاصی تلخی ہوگئی جسکے کچھ مدت بعد ہی ہمارا آئی ایس آئی سے قطع تعلق ہوگیا۔ ہم نے وزیراعظم پاکستان محترمہ بےنظیر بھٹو سے ملنے کی کوشش کی لیکن (غالباً آئی ایس آئی ہی کی مخالفت کی وجہ سے) یہ ملاقات نہ ہوسکی چنانچہ ہم نے راولپنڈی کے کشمیری نژاد پاکستانی سیاستدان شیخ رشید احمد سے رجوع کیا جنہوں نے غالباً اس وقت کے پنجاب کے چیف منسٹر میاں نواز شریف جو خود بھی کشمیری نژاد ہیں سے رجوع کیا۔ چنانچہ شیخ صاحب نے ہمارے حریت پسندوں کی رہائش اور کھانے پینے کے اخراجات کا بندوبست کیا۔ حریت پسندوں کی عسکری تربیت، آزاد کشمیر کے ریٹائرڈ فوجی جونیئر کمیشنڈ افسر کمانڈر فاروق خان جو لبریشن فرنٹ کے ممبر تھے اور کچھ مدت قبل ہی پاکستان کی ایس ایس جی کمانڈو رجمنٹ سے ریٹائر ہوئے تھے کی سربراہی میں ہمارے اپنے ساتھی دیتے رہے۔

(x) وزیراعظم پاکستان سے تلخ کلامی

مارچ 1990ء کو مظفر آباد میں میری وزیراعظم پاکستان محترمہ بےنظیر بھٹو سے تلخ کلامی ہوئی (تفصیلات کے لئے دیکھئے "پاکستان کے دو وزرائے اعظم سے دلچسپ مکالمے") تو محترمہ نے مبینہ طور پر آئی ایس آئی کو ہمارے پر کاٹنے کی ہدایت کی۔ اس تلخ کلامی کے دو ہفتے بعد میں تنظیمی اور سفارتی مشن پر امریکہ چلا گیا۔ جہاں بھارتی حکومت نے میرے اخباری بیانات اور پریس کانفرنسوں کو اپنے ہی معنی پہنانے کے علاوہ ایک زیر حراست حریت پسند شوکت بخشی کے میرے خلاف دیئے گئے اقبالی بیان کو بنیاد

بنا کر امریکی وزیر خارجہ جیمز بیکر کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ اس نے اپنے خصوصی اختیارات استعمال کرتے ہوئے میرا امریکی ویزا منسوخ کر دیا۔ ادھر بھارتی حکومت نے نیویارک کی عدالت سے رجوع کر کے اس سے میری گرفتاری کے احکامات جاری کرنے کی درخواست کی، لیکن اس درخواست پر عمل ہونے سے پہلے ہی میں اپنے اصلی پروگرام کے مطابق نیویارک سے پاکستان روانہ ہو چکا تھا۔ اس لئے گرفتار ہونے سے بچ گیا۔ میری امریکہ سے واپسی پر یہاں کچھ اور ہی سماں تھا۔ شیخ رشید پر بھٹو حکومت کا آئی ایس آئی کے ذریعے اتنا دباؤ پڑا کہ وہ ہماری مدد منقطع کرنے پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ مسلح جدوجہد آزادی کے سلسلے میں ہم تقریباً بے دست و پا ہو گئے۔ ادھر مقبوضہ کشمیر میں ہمارے ساتھی ان حقائق سے بے خبر ہم سے ناراض کہ ہم ان کی ضروریات پوری نہیں کر رہے۔ امریکہ جانے کے لئے راولپنڈی سے کراچی روانہ ہونے سے ایک دن پہلے (مارچ 1990ء کے چوتھے ہفتے کے اوائل میں) میری اشفاق مجید وانی سے فون پر بات ہوئی۔ انہوں نے بہت زور دیکر کچھ مطالبات کئے جن میں سے اہم ترین مطالبہ سامان اور پیسوں کا تھا۔ میں نے یہاں کی صورتحال سے متعلق اصل حقائق بتائے بغیر اس سے وعدہ کیا کہ ہم ہر ممکن کوشش کریں گے۔ (اشفاق سے یہ ٹیلیفونک گفتگو ہماری آخری ملاقات ثابت ہوئی کیونکہ وہ 30 مارچ کو شہید ہو گئے) اور ساتھ اپنے متعلقہ ساتھیوں خاص کر عسکری شعبے کے سربراہ سردار رشید حسرت کو ہدایت کی کہ وہ آزاد کشمیر کے مختلف سرحدی علاقوں میں پڑا ہوا سامان جلد از جلد پار پہنچا دیں۔ مزید خریدنا پڑے تو خریدیں۔ میں کراچی میں اپنا مکان بیچ کر قیمت ادا کروں گا۔ اور باقی معاملات میری امریکہ سے واپسی پر نپٹائے جائیں گے۔ واپسی پر پتہ چلا کہ کچھ عملی مشکلات کی وجہ سے سارا سامان پار نہیں جا سکا ہے اور پار گیا سامان بھی پورا ساتھیوں تک نہیں پہنچا ہے۔

(xi) حمید شیخ کی رہائی اور شہادت

30 مارچ 1990ء کو کمانڈر انچیف اشفاق مجید وانی شہید ہو گئے۔ اور 6 اگست 1990ء کو نئے کمانڈر انچیف یاسین ملک اور ڈپٹی کمانڈر انچیف شیخ عبدالحمید اور کمانڈر کاکا حسین (آف جموں) سمیت 9 سینئر کمانڈر گرفتار ہو گئے۔ سینئر کمانڈروں میں سے صرف جاوید میر گرفتاری سے بچ گیا تھا۔ اس لئے اسے ہی قائمقام بنایا گیا۔ جاوید میر اگرچہ بڑا سرگرم، متحرک اور نظریاتی نوجوان ہے لیکن تعلیم کی کمی، محدود نظر، ناتجربہ کاری اور دیگر کمزوریوں کی وجہ سے وہ تنظیم کو مطلوبہ طریقے سے نہ چلا سکا۔ لبریشن فرنٹ کی ابتدائی کمانڈ کونسل اصل میں دانشور، صاحب الرائے اور مقامی اور عالمی صورتحال اور تقاضوں پر گہری نظر رکھنے والے افراد خاص کر ڈاکٹر عبدالاحد گورو، غلام نبی بٹ، ڈاکٹر فاروق خان، ڈاکٹر معراج الدین، پروفیسر اے آر وانی، شبیر احمد صدیقی اور فاروق پاپا وغیرہ پر مشتمل ایک تھنک ٹینک تھی۔ ان میں سے اکثر شہید ہو گئے۔ کچھ ملک سے باہر چلے گئے۔ کچھ گرفتار ہو گئے اور باقی گوشہ نشین ہو گئے۔ اس طرح لبریشن فرنٹ انکی رہنمائی سے محروم ہو گیا اور عنان قیادت جاوید میر اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھ میں

رہی۔ اگست 1992ء میں حمید شیخ کی رہائی کے بعد وہ جاوید میر کی جگہ زونل صدر بن گئے اور انہوں نے تین ماہ کے قلیل عرصہ میں تنظیم اور تحریک کو مطلوبہ طرز پر منظم کرنے کی کوشش کی لیکن نومبر 1992ء میں انکی شہادت کے بعد تنظیم ایک بار پھر جاوید میر اور ساتھیوں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔

(xii) یاسین ملک کی بغاوت

1993ء میں جاوید میر آزاد کشمیر آئے۔ اس دوران یہاں اس کا رویہ نا قابل فہم تھا۔ کبھی وہ تنظیم، نظریات اور قیادت سے وابستگی کا بے مثال مظاہرہ کرتے اور کبھی بچوں کی سی باتیں اور حرکتیں۔ ان کے ساتھ نذیر احمد المعروف نذیر پوڈری بھی تھے اور ان سے پہلے جعفر کشمیری بھی پہنچے تھے۔ اکتوبر 1993ء میں میں یورپین پارلیمنٹ کی کشمیر کانفرنس کے سلسلے میں بیجیم جا کر وہاں گرفتار ہو گیا اور اڑھائی ماہ بعد دسمبر 1993ء میں میری واپسی سے پہلے ہی جاوید میر واپس سرینگر جا چکا تھا۔ اس کے یہاں سے جانے کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں گشت کر رہی تھیں لیکن میں نے حسب عادت سنی سنائی باتوں پر کان نہیں دھرا۔ کچھ مدت بعد جاوید میر گرفتار ہو گیا۔ جاوید میر کے یہاں قیام کے دوران مجھے شک ہوا تھا کہ جاوید اور یاسین کے مابین پس پردہ خاصی کشیدگی ہے لیکن اس موضوع پر ہماری براہ راست کبھی بات نہیں ہوئی۔ جاوید میر واپس جانے کے کچھ مدت بعد گرفتار ہو گیا۔ مئی 1994ء میں یاسین ملک رہا ہو گیا لیکن رہائی کے فوراً بعد اس نے ہم سے پوچھے بغیر جنگ بندی یعنی مسلح جدوجہد ترک کرنے کا اعلان کیا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے آل پارٹیز حریت کانفرنس (جس کے ہم ممبر تھے) کے خلاف بھرپور مہم شروع کر دی۔ معلوم ہوتا تھا اور عام تاثر بھی یہی تھا کہ مسلح جدوجہد آزادی اور حریت کانفرنس کو ختم کرانا ان شرائط میں شامل تھا جن کے تحت یاسین ملک کو رہا کیا گیا تھا۔ اسی دوران اس نے ایک ٹی وی پروگرام میں اعتراف کیا کہ وہ مہاتما گاندھی کے نظریات (اہنسا) کا پیروکار ہے جبکہ گرفتار ہوتے وقت وہ مسلح جدوجہد آزادی کے علمبردار مقبول بٹ کا پیروکار تھا۔ بہرحال یاسین ملک نے تنظیم کی آئین شکنی اور اپنی من مانی بار بار کی تنبیہہ کے باوجود جاری رکھی چنانچہ 21 ستمبر 1995ء کو اسے سنٹرل کمیٹی کے فیصلے کے بعد زونل صدر کے عہدے سے ہٹا کر اس کی جگہ شبیر صدیقی کو زونل صدر اور بشارت رضا کو عسکری شعبے کا زونل سربراہ مقرر کیا گیا۔ یاسین ملک نے مرکز سے بغاوت کر کے متوازی تنظیم بنائی اور خود اس کا سربراہ بن گیا اور ساتھ ہی اس حریت کانفرنس کا بھی ممبر بن گیا جس کی اس سے قبل شدید مخالفت کر رہا تھا۔ جاوید میر ستمبر 1995ء تک ہمارے ساتھ تھا لیکن یاسین ملک کی مرکز سے بغاوت کے بعد وہ بھی اس سے جا ملا۔ کہا جاتا ہے اس سلسلے میں اسے بلیک میل کیا گیا۔ 24 مارچ 1996ء کو بشارت رضا کو اس کے درجن بھر ساتھیوں (کمانڈروں) کے ساتھ درگاہ حضرت بل کے احاطے میں شہید کیا گیا اور اس کے ایک ہفتہ بعد 30 مارچ 1996ء کو شبیر صدیقی کو ان کے 26 ساتھیوں سمیت تنظیم کے مرکزی دفتر واقع متصل درگاہ حضرت بل میں شہید کر دیا گیا اور اس مقصد کے لئے گولیوں کی برسات کے علاوہ دفتر پر مارٹر بم بھی داغے گئے اور اس

قتل عام کے نتیجے میں ہماری مقبوضہ کشمیر کی عسکری کے ساتھ سیاسی قیادت کا بھی تقریباً خاتمہ ہوگیا۔ بھارتیوں کی اس وحشیانہ کارروائی میں انہیں ہمارے اپنوں کی بھی آشیر باد حاصل تھی۔ حریت کانفرنس کے ترجمان عبدالغنی بٹ نے انہیں ایک دن پہلے مشہور نیوز ایجنسی رائیٹرز کو دیئے گئے بیان میں اس کا سگنل دیا تھا۔ بہرحال 30 مارچ 1996ء کے سانحے کے بعد مدت تک ہم وہاں اپنے پاؤں دوبارہ نہ جما سکے جس کی کچھ دوسری وجوہات کے علاوہ اہم ترین وجہ یہ بھی ہے کہ اس سلسلے میں ہمیں بھارت اور پاکستان کے متعلقہ اداروں کے علاوہ حریت کانفرنس اور یاسین ملک گروپ کی مخالفت کا سامنا تھا۔

لبریشن فرنٹ خاص کر میں شروع سے ہی اپنی مسلح جدوجہد آزادی کے بارے میں تین اہم حقائق پر یقین رکھتے ہیں۔ اولاً یہ کہ کشمیر میں مسلح جدوجہد آزادی شروع کرنے کا بنیادی مقصد فراموش شدہ مسئلہ کشمیر کو عالمی سطح پر اجاگر کرنا اور اہل ریاست خاص کر نوجوانوں میں حصول آزادی کا جذبہ پیدا کرنا تھا۔ ثانیاً یہ کہ آزادی سیاسی، عسکری اور سفارتی محاذوں پر منظم طریقے سے لڑنے سے ہی حاصل ہوتی ہے اور ثالثاً یہ کہ نہ تو صرف بندوق ہمیں آزادی دلا سکتی ہے نہ بندوق کو یکسر ترک کر کے آسانی سے آزادی حاصل کی جا سکتی ہے۔

ہم نے 1988ء میں مسلح جدوجہد آزادی شروع کی اور 1990ء تک ہم نے پہلا مقصد یعنی مسئلہ کشمیر کو عالمی سطح پر دوبارہ اجاگر کرنا اور اپنے نوجوانوں میں حصول آزادی کی جدوجہد کا جذبہ پیدا کرنا پوری طرح حاصل کیا اور اگر مسئلے کو عالمی سطح پر اجاگر کرنے میں کوئی کمی رہ گئی تھی تو وہ کمی 1992ء میں ہماری طرف سے جنگ بندی لائن پر اجتماعی غیر مسلح اور اعلانیہ حملوں نے پوری کر دی جسکی عالمی سطح پر وسیع تشہیر ہوئی تھی۔

ہم 1990ء سے ہی مسلح جدوجہد آزادی جاری رکھنے میں دقت محسوس کر رہے تھے اس لئے کہ ایک حریت پسند کو عسکری تربیت دے کر اور مسلح کر کے مقبوضہ کشمیر پہنچانے میں کم از کم پچاس ہزار روپے صرف ہوتے تھے اور ہمارے مالی ذرائع اپنے ممبروں اور افراد کی طرف سے ملنے والی مالی مدد تک ہی محدود تھے۔ چنانچہ ہم نے اپنی ترجیحات میں ردوبدل کیا اور عسکری جدوجہد کو پہلی سے تیسری پوزیشن پر لائے اور زیادہ زور سیاسی اور سفارتی جدوجہد پر دینے لگے۔ اگرچہ 1994ء میں یاسین ملک کی طرف سے کی جانے والی جنگ بندی کا مرکزی تنظیم سے کوئی تعلق نہیں تھا کیونکہ ہم اس سے پہلے ہی عسکریت کو تیسری پوزیشن پر لائے تھے لیکن ترک نہیں کی تھی نہ ہی جنگ بندی کی تھی۔ جنوری 1999ء میں ہم نے اپنے عسکری شعبے کو سیاسی اور سفارتی شعبے سے الگ کر کے اس کا نام جموں کشمیر نیشنل لبریشن آرمی (NLA) رکھا۔ اور راجہ حق نواز خان آف سہنسہ کوٹلی کو اس کا سربراہ بنایا اور عسکری معاملات بشمول این ایل اے کو براہ راست تنظیم کی مرکزی پالیسی پلاننگ کمیٹی کی تحویل میں دے دیا۔ اس سے قبل ہم نے کچھ تکنیکی وجوہات کی بناء پر اپنے بہت سے حریت پسندوں خاص کر وادی کے سرحدی علاقوں سے تعلق رکھنے والوں پر مشتمل ایک الگ گروپ کاروانِ حیدر قائم کیا تھا جس نے مسلح جدوجہد میں اہم کارنامے انجام دیئے۔ کاروانِ حیدر کے

کمانڈروں میں چوہدری سراج دین (چیف کمانڈر) چوہدری علی محمد، چوہدری اقبال، ادریس، شاہین، اقبال، شمشاد، خادم جمال، نذیر چوہدری بشیر، چوہدری ہندی، رشید اور ارشاد کاظمی نمایاں تھے۔ کاروانِ حیدر کے بہت سے حریت پسند عظیم کارنامہ انجام دیتے ہوئے شہید ہو گئے اور چند سال بعد بوجوہ کاروان حیدر کے حریت پسند مختلف عسکری تنظیموں میں شامل ہو گئے اور کچھ گوشہ نشین ہو گئے۔

(xiii) مسلح سرگرمیوں کی معطلی

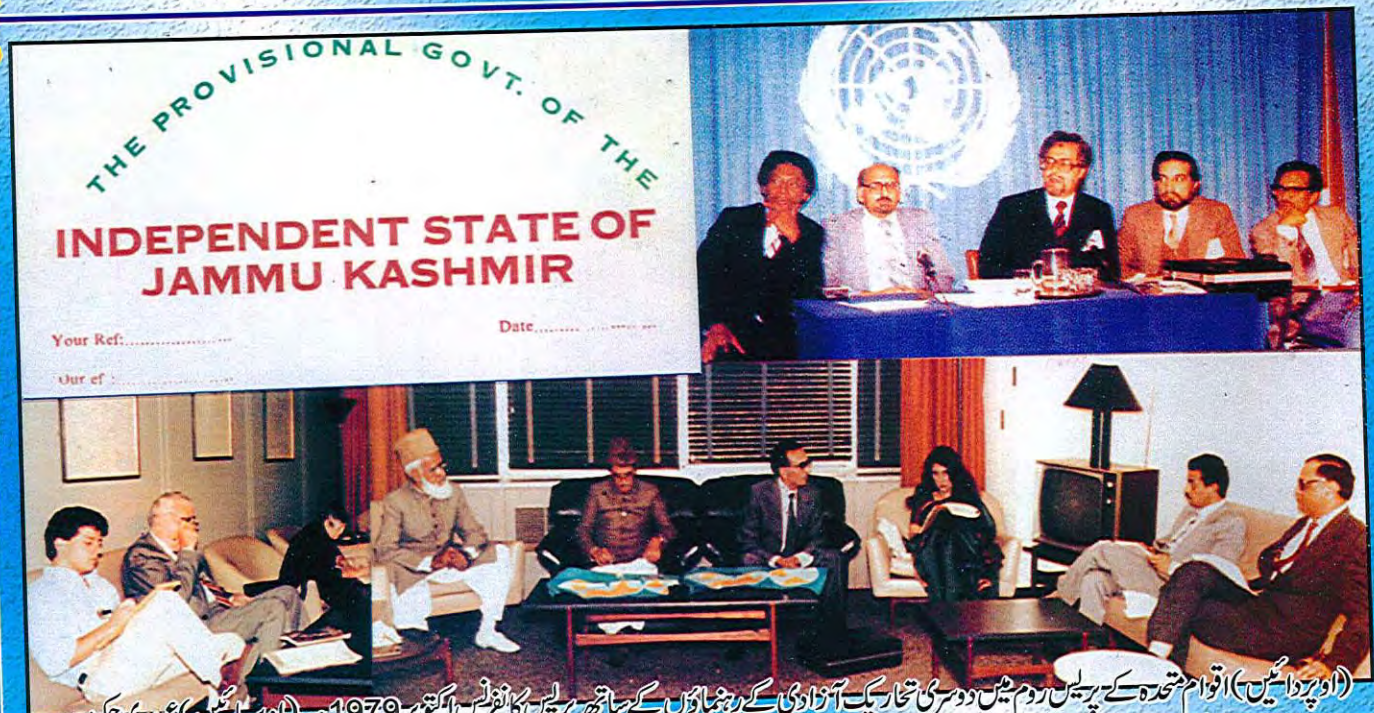
1999ء میں معرکہ کارگل اور اسکے بعد بھارتی پارلیمنٹ پر حملے اور ستمبر 2001ء کو نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کو زمین بوس کیے جانے کے بعد بھارت کی موثر سفارتی حکمت عملی کے نتیجے میں خالص مسلح تحاریک آزادی بمعہ مسلح جدوجہدِ آزادیٔ کشمیر پر بھی دہشت گردی کا لیبل لگایا جانے لگا۔ ادھر مالی مشکلات، پاکستان کا مخالفانہ رویہ اور عالمی فضا ہمیں عسکری کارروائیوں کی اجازت نہیں دیتی تھیں۔ چنانچہ ہم نے عسکری جدوجہد کو تا فیصلہ ثانی معطل (منسوخ نہیں) کیا اور 2003ء میں ہی این ایل اے کی سربراہی عبدالحمید بٹ کو دی جو اس سے پہلے تنظیم کے چیف آرگنائزر تھے اور انکی جگہ این ایل اے کے سربراہ راجہ حق نواز کو چیف آرگنائزر مقرر کیا گیا۔ یاد رہے عبدالحمید بٹ اور ریاض ڈار 1976ء میں مقبول بٹ شہید کے ساتھ مقبوضہ کشمیر جا کر وہاں گرفتار ہو گئے تھے اور بارہ سال کی قید کاٹ کر 1988ء میں واپس آئے تھے جبکہ مقبول بٹ شہید کو 11 فروری 1984ء کو تہاڑ جیل دہلی میں تختہ دار پر چڑھایا گیا تھا اور جیل کے احاطے کے اندر ہی دفن کیا گیا تھا۔ راجہ حق نواز نے تنظیم کے عسکری شعبے کو انتہائی محنت اور ٹھوس حکمت عملی سے منظم کیا تھا۔ وہ تنظیم کے گنے چنے کل وقتی سینئر اہلکاروں میں سے ایک ہیں۔ ان سے پہلے حریت پسندوں کو عسکری تربیت کمانڈر فاروق اور سردار افتخار آف منگ سدھنوتی آزاد کشمیر دیتے رہے۔ عسکری شعبے کو منظم کرنے میں سماہنی بھمبر آزاد کشمیر کے ساجد صدیقی نے بھی خاصی خدمات انجام دی ہیں۔

یہ تھی ہماری مسلح جدوجہدِ آزادی سے متعلق، حقائق اور موجودہ پوزیشن کی مختصر ترین رپورٹ مسلح، سیاسی اور سفارتی جدوجہد آزادی کے سلسلے میں نمایاں کارنامے انجام دینے والوں اور عظیم قربانیاں پیش کرنے والوں کی فہرست انشاءاللہ کتاب کی تیسری جلد میں شامل کی جائے گی۔

4- سفارتی محاذ کی سرگرمیاں

(i) جدوجہد آزادی کے محاذ

دور جدید میں جدوجہد آزادی کے نصف درجن بھر محاذ ہوتے ہیں جن میں سے تین اہم ہوتے



(اوپر دائیں) اقوام متحدہ کے پریس روم میں دوسری تحاریک آزادی کے رہنماؤں کے ساتھ پریس کانفرنس اکتوبر 1979ء۔ (اوپر بائیں) عبوری حکومت خود مختار مملکت جموں کشمیر کا لیٹر ہیڈ۔ (نیچے) اکتوبر 1989ء میں اقوام متحدہ (نیویارک) میں جنرل حیات خان اور مرحوم رشید عباسی کے ساتھ پریس کانفرنس۔



(اوپر) مظفر آباد میں لارڈ ایوبری کے ساتھ ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے (نیچے) اسلام آباد میں سفارتکاروں کو بریفنگ دیتے ہوئے۔



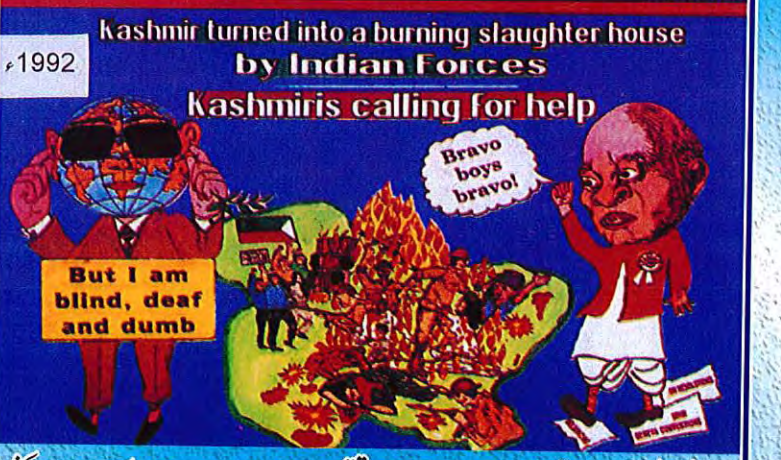
(اوپر دائیں) برسلز کانفرنس (اکتوبر 93ء) کے شرکاء فاروق عبداللہ، بھیم سنگھ اور سردار قیوم کے ساتھ۔ (بائیں) فاروق عبداللہ لبریشن فرنٹ کے ممبروں کے ساتھ (درمیان) سفارتی شعبے کے سربراہ ظفر خان اسلام آباد کے کشمیری صحافیوں کو بریفنگ دے رہے ہیں (نیچے) مقبوضہ کشمیر اور بھارت کے صحافیوں کو مظفر آباد میں بریفنگ دیتے ہوئے (27 دسمبر 2004ء)



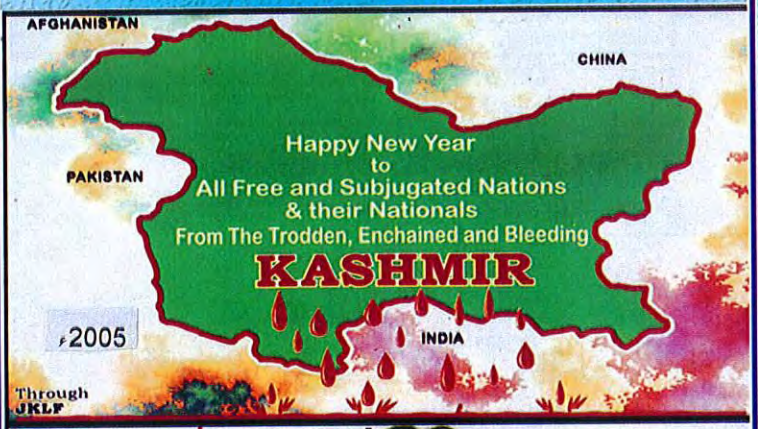
اسلام آباد (نیچے دائیں طرف) اور یورپ کے مختلف شہروں میں میری بیلجیم میں گرفتاری کے خلاف مظاہرے







عالمی سطح پر اور سفارتی حلقوں میں وسیع پیمانے پر تقسیم ہونے والے ہمارے کارٹون کارڈ مسئلہ کشمیر پر بھارت، پاکستان اور عالمی برادری کی پالیسیوں اور کشمیریوں کے مطالبات کی عکاسی کرتے ہیں



Eid Mubarak

from

JKLF

JAMMU KASHMIR
LIBERATION FRONT
B-144, Satellite Town, Murree Road,
Rawalpindi. - Pakistan.
Telefax : +92 +51 425669

to Muslim Members of every free nation of the world.
You are lucky to be celebrating Eid while enjoying the blessings, fruits and benefits of being members of independent nations.
We Kashmiris also wish to enjoy Eid as a nation free of forced foreign domination as we fully deserve it and were pledged too.
We sure will achieve this cherished goal, Insha Allah, if only we ourselves, those claiming to be our well-wishers and the nations, institutions, organisations and individuals the worldover, who really believe in human rights, fully perform their moral duties towards our just cause.

1994ء

ہم بھارتی مقبوضہ کشمیر، آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کے مکین اور پاکستان، مشرقِ وسطیٰ، یورپ اور دُنیا کے دوسرے حصّوں میں مقیم اپنے ہموطنوں کو غلامی کی ایک اور

عید مبارک

پیش کرتے ہوئے انہیں اندرونِ ریاست جاری جنگِ آزادی کے سلسلے میں اُن کے قومی اور اخلاقی فرائض کی یاد دہانی کرلاتے ہیں اور ان سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ ان فرائض کی انجام دہی میں کسی قسم کی غفلت نہ برتیں۔ یاد رکھیے آپ کی آج کی غفلت، خود غرضی اور تنگ نظری، ریاست کی آئندہ نسلوں کی ابدی غلامی کا باعث بن سکتی ہے۔

آپ کا ہموطن

(امان اللہ خان)
چیئرمین جموں کشمیر لبریشن فرنٹ

1999ء

ہیں یعنی سیاسی محاذ (جسکا ایک اہم سیکٹر میڈیا وار ہے)، عسکری محاذ اور سفارتی محاذ۔ اور تینوں ایک دوسرے کیلئے لازم وملزوم ہیں۔ یعنی ایک میں مضبوط پوزیشن دوسرے محاذوں کو بھی تقویت پہنچاتی ہے اور کسی ایک میں کمزوری کا منفی اثر دوسرے محاذوں کی پوزیشن پر بھی پڑتا ہے۔ اتنی ہی اہم یہ حقیقت بھی ہے کہ مقامی، قومی اور بین الاقوامی سطح کے حالات اور ضرورت کے پیش نظر تینوں محاذوں کی اہمیت بدلتی رہتی ہے۔ مثلاً 1988ء سے 1992ء تک ہم زیادہ توجہ عسکری جدوجہد پر دیتے رہے بلکہ ہمارے وقت، وسائل، ذہانت اور توانائی کا بڑا حصہ عسکریت پر صرف ہوتا تھا کیونکہ وہی وقت کی ضرورت اور مسئلہ کشمیر کی طرف عالمی توجہ حاصل کرنے کا سب سے موثر طریقہ تھا۔ میں نے نہ تو کشمیر میں عسکری جدوجہد شروع کرتے وقت نہ ہی بعد میں کبھی سوچا کہ صرف بندوق ہمیں آزادی دلا سکتی ہے۔ بہرحال 11 ستمبر 2001ء کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر نیویارک اور پینٹاگون واشنگٹن پر ہوائی حملوں کے بعد محکوم قوموں کی مسلح جدوجہد آزادی کو بھی دہشت گردی قرار دیا جانے لگا لیکن اندازہ ہے کہ اس عالمی طرز فکر کی عمر خاصی مختصر ہوگی۔

(ii) ترجیحات میں تبدیلی

1993-4ء کے بعد ایک تو کشمیر میں عسکریت کی نوعیت کے علاوہ لبریشن فرنٹ کے حالات بھی بدل گئے اور دوسرا عسکریت کا بنیادی مقصد یعنی دنیا کی توجہ مسئلہ کشمیر کی طرف مبذول کرانا بھی خاصی حد تک حاصل ہوگیا۔ اسلئے ہمارے لئے یہ بھی ضروری ہوگیا کہ ہم عسکریت کی نسبت سیاسی اور سفارتی محاذ پر زیادہ توجہ دیں۔

میں شروع سے ہی اس بات کا قائل رہا ہوں کہ عالمی برادری خاص کر طاقتور ملکوں کی حمایت یا مخالفت محکوم قوموں کی آزادی میں انتہائی اہم مثبت یا منفی اثر ڈالتی ہیں۔ نیلسن منڈیلا اور اس کی افریقن نیشنل کانگریس (اے۔این۔سی) کی قربانیوں کے ساتھ ساتھ عالمی رائے عامہ نے بھی جنوبی افریقہ کی آزادی میں انتہائی اہم کردار ادا کیا۔ فلسطین کی تقریباً 6 دہائیوں پر محیط عظیم جدوجہد اور قربانیوں کے باوجود اب تک حصول آزادی سے محروم رہنے کی بنیادی اور اہم ترین وجہ امریکہ کی طرف سے اسرائیل کی اندھی حمایت ہے۔

(iii) ہمارا طرۂ امتیاز

جموں کشمیر لبریشن فرنٹ پہلی کشمیری تنظیم ہے جس نے ریاست جموں کشمیر سے باہر (برطانیہ میں) جنم لیا اور اپنی جدوجہد آزادی کی ابتداء ہی سفارتی جدوجہد سے کی۔ تنظیم کے قیام (29 مئی 1977ء) کے صرف ایک ہفتہ بعد یعنی جون 1977ء کے پہلے ہفتے میں ہم نے لندن میں ہونے والی (دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کی) کانفرنس کے دوران لندن میں مسلسل پانچ دن مظاہرے کئے اور

مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادئ کشمیر سے متعلق اپنے پمفلٹ کی ہزاروں کاپیاں دولت مشترکہ کے وفود اور میڈیا میں تقسیم کیں لیکن چونکہ 1977ء سے 1986ء تک کے نو سالوں کے دوران سفارتی محاذ پر میری اور لبریشن فرنٹ کی سرگرمیوں کی تفصیل اس کتاب کی پہلی جلد میں درج ہے اسلئے یہاں 1987ء سے 2004ء تک سفارتی محاذ پر اپنی سرگرمیوں کو ہی مختصراً بیان کر رہا ہوں۔

(IV) کے۔ایل۔اے وفد کے ساتھ دورہ امریکہ

اگر چہ میں مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادئ کشمیر سے متعلق صورتحال اور اپنے نظریات کے بارے میں اخباری بیانات، پریس کانفرسوں، اخباری مضامین اور کتابچوں کے ذریعے دنیا کو باخبر رکھتا تھا اور اسلام آباد اور نئی دہلی میں دنیا کے اہم ملکوں کے سفارتخانوں اور انسانی حقوق سے متعلق عالمی تنظیموں سے بھی خط و کتابت کرتا تھا لیکن 1986ء کے بعد بیرونی دنیا کا میرا پہلا دورہ اکتوبر 1989ء میں کشمیر لبریشن الائنس (KLA) کے وفد کے ساتھ امریکہ کا دورہ تھا۔ اس وفد کی قیادت الائنس کے سربراہ سابق صدر آزاد کشمیر میجر جنرل (ر) محمد حیات خان کر رہے تھے اور اسکے دوسرے ممبروں میں آزاد کشمیر کے وزیر پیر ممتاز گیلانی، جماعت اسلامی آزاد کشمیر کے امیر مرحوم کرنل (ر) رشید عباسی اور مسلم کانفرنس کے سردار عتیق احمد خان شامل تھے۔ وفد نے نیویارک میں اقوام متحدہ کے سیکرٹریٹ کے باہر ایک زبردست مظاہرہ کیا جس میں نیویارک میں مقیم کشمیریوں کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔ مظاہرے کے بعد مظاہرین سڑک پر مارچ کرتے ہوئے بھارتی مشن پر پہنچے جہاں خاصی دیر تک نعرہ بازی کی۔ اسکے علاوہ ہم نے مظاہرے کے دوران لوگوں میں مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادئ کشمیر سے متعلق مختلف پمفلٹ بھی تقسیم کئے۔ مظاہرے کے دوران اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کے نام KLA کی ایک یادداشت سیکرٹری جنرل کے دفتر کے متعلقہ افسر کے حوالے کی گئی۔ اس کے علاوہ وفد کے ممبران کرنل رشید عباسی، جنرل حیات خان اور میں نے اقوام متحدہ میں متعین صحافیوں کی تنظیم UNCA کے پریس روم میں پریس کانفرنس سے بھی خطاب کیا۔

(V) میرا دورۂ امریکہ

اپریل 1990ء میں پھر امریکہ گیا جہاں میں نے UNCA میں 9 اپریل 1990ء کو پریس کانفرنس کی جس کی تفصیل ''میری چار اہم پریس کانفرنسیں'' کے عنوان کے تحت درج ہے۔ اس کے بعد میں واشنگٹن گیا جہاں کشمیر امریکن کونسل کے ڈاکٹر غلام نبی فائی صاحب کے ہمراہ صدر امریکہ کے نیشنل سیکورٹی ایڈوائزر کے دفتر میں برصغیر سے متعلق شعبے کی سربراہ سے تفصیلی ملاقات ہوئی۔ 20 اپریل کو میں نے نیشنل پریس کلب واشنگٹن میں مہمان مقرر کی حیثیت سے خطاب کیا۔ اس کی تفصیل بھی چار اہم پریس کانفرنسوں میں درج ہے۔ نیویارک ٹائمز کے انٹرویو کا پروگرام بھارتی حکومت کی طرف سے میرے

خلاف لگائے گئے بے بنیاد الزامات کی بناء پر آخری وقت پر منسوخ ہوا۔ اس سے پہلے میں لاس اینجلس گیا جہاں تحریک آزادی کے سرگرم کارکن محمد رفیق خان کے ہاں کیلیفورنیا میں مقیم کشمیریوں کی ایک بڑی تعداد سے تبادلہ خیال ہوا تھا۔ خان صاحب نے پریس کانفرنس کا بھی اہتمام کیا تھا لیکن کسی وجہ سے میڈیا کی حاضری توقع سے کم تھی۔ اس کے بعد میں نیو پورٹ گیا جہاں کشمیری ڈاکٹروں کی ایک بڑی تعداد برسرروزگار ہے۔ ان سے مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادیٔ کشمیر پر تبادلہ خیال ہوا۔ ان ہم وطنوں نے مجھے بہت احترام دیا۔ نیویارک واپسی پر سرگرم کشمیری رہنما فاروق کاٹھواری سے ملاقات ہوئی، کاٹھواری صاحب سے میری علیک سلیک کئی برسوں سے تھی اور انہوں نے میری خاصی مدد اور حوصلہ افزائی بھی کی ہے۔ وہ مدت سے مسئلہ کشمیر میں عملی دلچسپی رکھتے ہیں۔ چند سال قبل انہوں نے دو درجن بھر امریکی زعماً جن میں ممبران کانگریس، سابق سفیر اور دانشور شامل ہیں پر مشتمل کشمیر سٹڈی گروپ بنایا ہے جس نے مسئلہ کشمیر کو مرحلہ وار حل کرنے کیلئے تین متبادل حل پیش کئے ہیں اور اس سلسلے میں انہوں نے کشمیر کی آبادی اور علاقوں کی مختلف حیثیتوں سے تقسیم کے اعداد و شمار پر مشتمل چارٹ بنائے ہیں جن پر انہوں نے بہت محنت کی ہے۔ انہوں نے اس سلسلے میں صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف، اعلیٰ بھارتی حکام کے علاوہ دونوں طرف کی کشمیری قیادتوں سے بھی ملاقاتیں کی ہیں۔ (27 فروری 2000ء کو کاٹھواری صاحب پاکستان کے سابق سیکرٹری خارجہ نیاز اے نائیک جو کئی سال سے ٹریک ٹو ڈپلومیٹک سرگرمیوں میں مصروف ہیں، کے ساتھ راولپنڈی میں میرے دفتر آئے جہاں مسئلہ کشمیر سے متعلق ان کے فارمولے پر تفصیلی تبادلہ خیال ہوا۔) انہوں نے دسمبر 2004ء میں نیپال میں ہونے والی انٹرا کشمیر کانفرنس میں بھی شرکت کی۔

(VI) میرے ویزے کی منسوخی

اگرچہ اپریل 1990ء میں میرے قیام امریکہ کے دوران وہاں بھارتی سفارتخانے کے حکام کی دوڑ دھوپ سے میں کسی حد تک باخبر تھا۔ لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ امریکہ میں موجود بھارت کے وزیر خارجہ اندر کمال گجرال میری سرگرمیوں کے سلسلے میں اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل اور امریکہ میں موجود روسی وزیر خارجہ سے بھی ملے ہیں۔ مسٹر گجرال نے اقوام متحدہ کے سیکرٹریٹ کی حدود میں میری بھارت مخالف پریس کانفرنس کے بارے میں اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل سے احتجاج کیا اور روسی وزیر خارجہ سے ملکر امریکی وزیر خارجہ کو میری امریکی سرزمین سے مبینہ طور پر کشمیر میں دہشت گردی کی ہدایات دینے سے متعلق واقعات سے آگاہ کیا۔ بہرحال بھارتیوں کی اس تگ و دو کے نتیجے میں میرا امریکی ویزا (جو پانچ سال کا ملٹیپل ویزا تھا) امریکی وزیر خارجہ نے روسی وزیر خارجہ کی طرف سے پیش کئے گئے واقعات اور دلائل کی بناء پر اپنے خصوصی اختیارات استعمال کرتے ہوئے منسوخ کر دیا۔ بہرحال میں امریکی وزارت خارجہ کے اس اقدام سے بے خبر، اس پر عمل ہونے سے پہلے ہی اپنے اصل پروگرام کے مطابق نیشنل پریس کلب واشنگٹن سے خطاب کے کچھ دن بعد ہی امریکہ چھوڑ چکا تھا۔ میرے بارے میں روسی وزیر خارجہ کے

متذکرہ بالا اقدام کی خبر نیویارک کے ایک بھارتی ہفت روزے نے دی تھی جس کا علم مجھے بعد میں ہوا۔ (تفصیلات میری دوسری اہم پریس کانفرنس میں)

(VII) عالمی زعماً سے روابط

میں تحریک آزادی، مسئلہ کشمیر اور اپنے فارمولے کے بارے میں عالمی شخصیات کے علاوہ پاکستان میں متعین دنیا بھر کے سفیروں کو خطوط لکھتا رہا ہوں۔ گزشتہ 18 سالوں کے دوران امریکی صدر، وزیر خارجہ، اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل، سلامتی کونسل کے ممبروں، یورپی پارلیمنٹ اور اسلامی کانفرنس، بھارت اور پاکستان کے وزرائے اعظم اور سیاسی پارٹیوں کے سربراہوں کے نام درجنوں خط لکھ چکا ہوں۔ بھارت اور پاکستان کی سیاسی پارٹیوں کے سربراہوں، دانشوروں، انسانی حقوق کی علمبردار تنظیموں، سینئر صحافیوں اور عوام کے نام بھی متعدد مشترکہ کھلے خط لکھے جن میں ان سے اپیل کی کہ وہ مسئلہ کشمیر کو حقیقت پسندانہ زاویے سے دیکھ کر اسکے منصفانہ، جمہوری، پرامن اور مستقل حل کیلئے کوششیں کریں، میں پریس کانفرنسوں کے ذریعے جن میں عام طور پر عالمی میڈیا کے نمائندے خاصی تعداد میں شرکت کرتے ہیں، بھی بھارت، پاکستان اور عالمی برادری سے اپیل کرتا رہا ہوں کہ وہ اس مسئلے کے منصفانہ حل کیلئے کوششیں کریں۔ میں نے مسئلہ کشمیر کے حل کے بارے میں اپنے فارمولے کی کاپیاں دنیا بھر کے زعماً، بین الاقوامی تنظیموں، انسانی حقوق کے علمبرداروں اور پاکستان میں دنیا بھر کے سفیروں کو بھیجیں اور گزشتہ 18 سال کے دوران پاکستان کے اکثر انگریزی اخبارات میں مسئلہ کشمیر، تحریک آزادیٔ کشمیر، نظریۂ خودمختار کشمیر اور ہمارے فارمولے کے مختلف پہلوؤں پر میرے چالیس سے زیادہ طویل مضامین شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سے بہت سے بھارتی اور مشرق وسطیٰ کے اخبارات میں بھی شائع ہوئے۔ میں اسلام آباد میں بہت سے سفارتخانوں میں ان کے قومی دن کے موقع پر مدعو ہوتا رہا ہوں۔ اور اس دوران بھی سفارتکاروں، پاکستانی سیاستدانوں اور عالمی میڈیا کے نمائندوں سے مسئلہ کشمیر، تحریک آزادی، نظریۂ خودمختار کشمیر اور ہمارے فارمولے پر تبادلہ خیال ہوتا رہا ہے۔

میرے ساتھیوں اور دوسرے احباب کو معلوم ہے کہ جنگ آزادی میں میرے پسندیدہ محاذ سفارتی اور میڈیا کے محاذ ہیں۔ میں نے چونکہ اپنے قیام برطانیہ (1976ء تا 1986ء) کے دوران دنیا دیکھی ہے، بین الاقوامی تعلقات اور محکوم قوموں کی تحاریک آزادی میرے پسندیدہ موضوعات رہے ہیں اور میں ان کے بارے میں لکھتا اور بولتا، بحث کرتا اور پڑھتا رہا ہوں اسلئے سفارتکاروں اور میڈیا سے تبادلہ خیال خاصا نتیجہ خیز ثابت ہوتا ہے لیکن بھارت نے انٹرپول سے میرے خلاف بین الاقوامی وارنٹ گرفتاری جاری کروا رکھے ہیں اور پاکستان نے میرا پاسپورٹ ضبط کر رکھا ہے اسلئے میں پاکستان سے باہر نہیں جا سکتا چنانچہ بیرون ملک زعماً سے تعلقات پیدا نہیں کر سکا اور اسلام آباد میں کوئی سفارتخانہ مجھے ویزا دینے کیلئے تیار نہیں یہاں تک کہ سعودی عرب کے سفارتخانے نے میرا عمرے کیلئے جاری کیا ہوا ویزا

Foreign &
Commonwealth
Office

London SW1A 2AH
Telephone: 0171-

14 December 1999

Amanullah Khan
B-144, Satellite Town
Rawalpindi
Pakistan

Dear Mr Khan,

Thank you for your letter of 30 November to the Foreign Secretary enclosing a copy of your article "The Clinton Visit and Kashmir". I have been asked to reply.

We remain concerned by the situation in Kashmir, and continue to take every opportunity to urge the need for a just and lasting settlement there. The fighting in the Kargil area this year demonstrated the urgency and importance, for India, Pakistan and the people living in Kashmir, of finding a solution to the Kashmir issue. Britain played a constructive role in preventing the Kargil conflict from escalating, by urging Pakistan to use its influence to end the incursion on the Indian side of the Line of Control, and by urging India to moderate its response.

We regularly stress to India and Pakistan our concern over Kashmir. Peter Hain, Minister of State responsible for our relations with South Asia, raised Kashmir with the Indian Government, including the Indian Prime Minister, during his visit there in November.

The role for those countries and organisations that wish India and Pakistan well is to encourage them to find, through dialogue, a solution with which they can both live, and which is acceptable to the people living in Kashmir. We believe that any solution, if it is to last, must reflect and involve the views of the people of Kashmir. It is, however, for the parties directly concerned to determine the nature of such a solution, and how best to achieve it.

Yours sincerely

H Teasdale

Helen Teasdale
South Asian Department

برطانیہ کی وزارت خارجہ سے خط

The Bertrand Russell Peace Foundation Ltd

Founding President: the Earl Russell, OM FRS (1872-1970)

Directors: Michael Barratt Brown, Professor Ken Coates (*Chairman*), Ken Fleet FCA (*Secretary*), Regan Scott. *Publishing Manager:* Tony Simpson

Mr. Amanullah Khan,
Chairman,
Jammu Kashmir Liberation Front,
C.E.O. B-144,
Satellite Town,
Rawalpindi,

18th January, 2002

Dear Friend,

It is a year since we exchanged greetings at the beginning of 2001. Belatedly I realise that it is time to send my good wishes for 2002. Unfortunately, those who exercise authority over us seem determined to make all of us as miserable as possible during this year. I hope that, together, we may frustrate this intention!

I think that the time has come to relaunch a large-scale peace movement, because war and the threat of war dominates our landscape. For this reason, for the last two years, I have been trying to bring together the European peace movements to create a European Network which can respond to all these issues. The enclosed papers will tell you something about this initiative.

I would certainly invite you to join us, but our last meeting in Brussels does not inspire me with confidence that your safety could be assured!

However, I am also exploring the possibility of arranging a dialogue between European peace and human rights movements, and similar groupings in West Asia. We are exploring the idea of a seminar in Cordoba, which is a sympathetic city administration, and represents a very symbolic venue. These arrangements are not yet agreed, and I will inform you when the progress becomes tangible.

But meanwhile, I would appreciate your advice about this project. Do you think it could succeed? Have you some ideas about how it might be structured?

With kind regards.

Yours sincerely,

Ken Coates

From the Chairman 112 Church Street Matlock Derbyshire DE4 3BZ
Tel: 01629 57159 *Fax:* 01629 580672
e-mail: elfeam@compuserve.com www.russfound.org
Reg. No. 801680 (England)

برٹرنڈ رسل پیس فاؤنڈیشن کے سربراہ کی طرف سے خط

HOUSE OF COMMONS
LONDON SW1A 0AA

The Office of the Leader of
the Opposition

15 March 1985

Dear Mr Khan,

Thank you for your letter of March 8. I hope that you will understand that it is often more appropriate for letters on particular topics to be referred to the relevant Front Bench Spokesperson. I have therefore passed your letter on to the Rt Hon Denis Healey MP.

Thank you for writing to me.

Yours sincerely,

pp C.R. Kinnock

Neil Kinnock MP

Amanullah Khan
Chairman
Jammu Kashmir Liberation Front
Kashmir House
44 Westbourne Road
LUTON LU4 8JD

برطانوی پارلیمنٹ میں قائد حزب اختلاف کا خط

منسوخ کر دیا اور ایسا ہی فرانسیسی سفارتخانے نے بھی کیا۔ امریکی سفارتخانے نے مجھے ویزا دینے سے دوبار انکار کیا۔ بیلجیئم کے سفارتخانے نے مجھے اکتوبر 1993ء میں یورپین پارلیمنٹ کی طرف سے بلائی گئی کشمیر پر گول میز کانفرنس میں شرکت کیلئے ویزا جاری کیا تو وہاں مجھے انٹرپول نے گرفتار کر لیا اور پاکستان میں بیلجیئم کے سفیر کو اپنے منصب سے ہاتھ دھونا پڑا۔

(viii) پاکستان اور آزاد کشمیر آنے والوں سے ملاقاتیں

میں چونکہ پاکستان کی کسی بھی حکومت کا منظور نظر نہیں رہا ہوں اسلئے میں پاکستان کے دورے پر آئی ہوئی کسی سرکاری شخصیت سے ملنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ اسلئے کہ اس ملاقات کیلئے پاکستان کی خفیہ ایجنسی کی طرف سے سبز جھنڈی ضروری ہوتی ہے۔ پاکستان میں امریکی سفارتخانہ بھی 1990ء سے حال ہی تک مجھے عملاً ناپسندیدہ شخصیت (Persona- non- grata) تصور کرتا رہا ہے اسلئے اس کے ذریعہ سرکاری امریکی زعماً سے ملاقات بھی ناممکن ہے۔ اسکے باوجود میں گزشتہ 18 سال کے دوران درجنوں امریکی، برطانوی، یورپی، جاپانی، عرب، بھارتی اور بنگلہ دیشی پارلیمنٹیرینز، سفارتکاروں، انسانی حقوق کے علمبرداروں، ادیبوں، سینئر صحافیوں سے ملا ہوں اور ان سے گھنٹوں مسئلہ کشمیر پر تبادلہ خیال ہوتا رہا ہے۔ جن عالمی سطح کے نامور زعماً سے تفصیلی اور طویل گفتگو کا موقع ملا ان میں برطانیہ کے لارڈ ایریک ایوبری (Lord Eric Avebury)، شیڈو وزیر خارجہ جیرالڈ کافمین (Gerald Kaufman)، یورپین پارلیمنٹ میں سوشلسٹ گروپ کی اہم رہنما انیتا پولاک (Anita Polack)، مشہور مصنف الیسٹر لیمب (Alaister Lamb)، مشہور مصنفہ وکٹوریہ شوفیلڈ (Victoria Schofield) امریکہ کے مشہور مصنف اور دانشور سٹیفن کوہن (Stephan Cohen) (ان سے دس منٹ کیلئے طے شدہ ملاقات ڈیڑھ گھنٹے تک جاری رہی) دوسرے مصنف پروفیسر ولیم بیکر (William Baker)، پروفیسر ورسنگ (Prof. Wirsing)، مشہور دانشور پیٹر لینڈزمین (Peter Landsman)، مسٹر شوگرمین (Sugarman)، کانگریس میں سٹیفن سولارز (Stephen solars) کے نمائندے، ایمبیسیڈر اوکلے (Amb. Oklay)، ییل (Yale) یونیورسٹی کے مسٹر لارنس (Mr. Lawrance) کے علاوہ فرانس کی وزارت خارجہ اور وزارت دفاع کے سینئر ممبروں کے ایک بڑے وفد سے بھی طویل ملاقات ہوئی۔ دسمبر 2003ء میں پاکستان کے دورے پر آئے ہوئے یورپین پارلیمنٹ کے وفد سے طویل ملاقات ہوئی۔ بھارتی زعماً میں سے سابقہ سیکرٹری خارجہ جے۔ این۔ ڈکشٹ سے تفصیلی، دلچسپ اور تقریباً مزاحیہ گفتگو ہوئی۔ جب ہم نے فروری 1992ء میں جنگ بندی لائن عبور کرنے کا پروگرام بنایا تھا، اس وقت ڈکشٹ بھارت کے سیکرٹری خارجہ تھے اور انہوں نے ہی امریکی، روسی اور برطانوی سفیروں کے ذریعے ان کی حکومتوں کو اس بات پر آبادہ کیا کہ وہ پاکستان کی نواز شریف حکومت پر دباؤ ڈال کر اسے ہمیں جنگ بندی لائن تک پہنچنے سے بزور طاقت روکنے پر مجبور کریں۔ چنانچہ

نواز حکومت نے ہم پر گولیاں برسا کر ہمیں سیز فائر لائن تک پہنچنے سے روکا۔ ڈکشٹ سے 1998ء میں اسلام آباد میں طویل ملاقات ہوئی اور اس نے مان لیا کہ ہماری کوشش نے بھارت کی گردن میں واقعی پھندا ڈال دیا تھا لیکن بقول ڈکشٹ اس نے وہ پھندا انتہائی ہوشیاری سے نواز شریف کے گلے میں ڈال دیا۔ یاد رہے کہ میں نے 12 فروری 1992ء کو چکوٹھی کے نزدیک پاکستانی فوج کی طرف سے ہم پر گولیاں برسانے پر تبصرہ کرتے ہوئے عالمی میڈیا کو بتایا تھا کہ جو پھندا ہم نے بھارت کے گلے میں ڈالا تھا وہ نواز شریف نے بھارتی گلے سے نکال کر اپنی گردن میں ڈال دیا اور میرے اس ریمارک کی عالمی سطح پر بڑی تشہیر ہوئی تھی۔ ڈکشٹ کے علاوہ میری جن بھارتی رہنماؤں سے ملاقاتیں ہوئی ہیں یا مراسم ہیں انکی تفصیل کتاب کی تیسری جلد میں شامل ہوگی۔

گزشتہ 16 سالوں میں پرنٹ میڈیا کے علاوہ ریڈیو اور ٹی وی کے درجنوں نمائندوں نے میرے تفصیلی انٹرویوز کیے ہیں۔ سفارتکاروں کی ایک خاصی تعداد بھی میرے دفتر آ کر مجھ سے مسئلہ کشمیر، تحریک آزادی، نظریۂ خودمختار کشمیر اور میرے فارمولے پر تبادلہ خیال کر چکی ہے۔

سفارتی محاذ پر میرے علاوہ لبریشن فرنٹ کے سفارتی شعبے کے سربراہ راجہ ظفر خان نے بھی بہت کام کیا۔ راجہ ظفر خان نے اگست 1993ء میں جنیوا میں اقوام متحدہ کے کمیشن برائے انسانی حقوق سے خطاب کیا۔ ایسا کرنے والے وہ پہلے کشمیری تھے اور لبریشن فرنٹ پہلی تنظیم تھی۔ انہوں نے یورپ اور امریکہ میں بھی دانشوروں کے بہت سے اجتماعات سے خطاب کیا۔ 1997ء میں تنظیم سے عملی علیحدگی سے پہلے ہمارے سینئر وائس چیئرمین راجہ مظفر خان کو اسلام آباد میں سفارتی حلقوں سے رابطہ رکھنے کے فرائض سونپے گئے تھے۔ بہرحال وہ 1998ء میں اپنی فیملی سمیت امریکہ منتقل ہو گئے۔ برطانیہ، یورپ اور امریکہ میں ہمارے ساتھی مناسب موقعوں پر جلسے اور مظاہرے کرنے کے علاوہ عالمی زعماء کو یادداشتیں بھی بھیجتے رہے ہیں۔

گزشتہ 18 سال سے بیرونی ممالک کے سینکڑوں صحافی، سفارتکار اور وفود آزاد کشمیر، پاکستان کا دورہ کرتے رہے جن میں سے کچھ سے میرے علاوہ میرے ساتھی راجہ مظفر، ایس ایم افضل، ڈاکٹر حیدر حجازی، ڈاکٹر فاروق حیدر، طارق بٹ، زاہد امین کاشف، پرویز مرزا، حافظ انور سماوی، سردار صغیر خان ایڈووکیٹ، سردار آفتاب ایڈووکیٹ، سردار شمشاد ایڈووکیٹ، سردار مہتاب ایڈووکیٹ، کوٹلی میں اشرف مرزا ایڈووکیٹ، ڈاکٹر عباس راٹھور، ڈاکٹر توقیر گیلانی مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادئ کشمیر پر ان سے تبادلہ خیال کرتے رہے۔ مارچ 1996ء میں میرے ساتھی سردار صغیر ایڈووکیٹ اور سردار شمشاد ایڈووکیٹ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے کمیشن کے اجلاس میں شرکت کرنے جنیوا جانے کیلئے کراچی پہنچے تو پاکستانی حکام نے انہیں جہاز سے اتار دیا حالانکہ انہیں کانفرنس میں شرکت کیلئے دعوت ملی تھی۔ علاوہ ازیں 1991ء میں ترکی میں اسلامی کانفرنس کے اجلاس کے دوران وہاں میرے ساتھیوں حاجی غلام سرور اور عظمت خان نے لابنگ کی اور لٹریچر تقسیم کیا۔ میں نے ایمسٹرڈم، کوپن ہیگن، کویت اور پیرس میں بھی پریس

کانفرنسوں سے خطاب کیا۔ ہمارے سفارتی شعبے میں 1977ء سے اب تک جن لوگوں نے خاصا کام کیا ان میں برطانیہ میں راجہ ظفر خان کے علاوہ افضل جاتلوی مرحوم، شبیر چوہدری، نذیر ناز ش، ملک لطیف، ایم اے حسین، ظفر شریف، ڈاکٹر عاصم، بیلجیئم میں کبیر احمد اور ہالینڈ اور فرانس کے ساتھیوں کے علاوہ نیویارک میں حلیم خان، نعمت خان، سردار حلیم، منظور خان، امتیاز خان، سلطان محمود بھٹی، افتخار چوہدری شامل ہیں۔

(ix) رنگین کارٹون

ہم نے گزشتہ سولہ سال میں کئی بار مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی میں بھارت پاکستان اور عالمی برادری کے کردار کی عکاسی کرنے والے رنگین کارٹون شائع کیے۔ یہ سارے کارٹون میری ذہنی کاوش کا نتیجہ تھے جنہیں مرحوم شیخ شجاع الحق صاحب نے کارٹونوں کی شکل میں پیش کیا۔ کارٹونوں میں مسئلہ کشمیر کے بارے میں بھارت اور پاکستان کے حکمرانوں اور عالمی برادری کی کشمیر پالیسی کی عکاسی کی گئی ہے۔ ہم نے یہ کارٹوں عالمی زعماً، عالمی تنظیموں، اداروں، پاکستان میں دنیا بھر کے سفارتخانوں، بھارت اور پاکستان کے زعماً اور صحافتی اداروں کو بھیجے۔ پاکستان، بھارتی اور کشمیری اخبارات نے میرے بارے بھی کارٹون شائع کیے۔

(x) میری چار اہم پریس کانفرنسیں

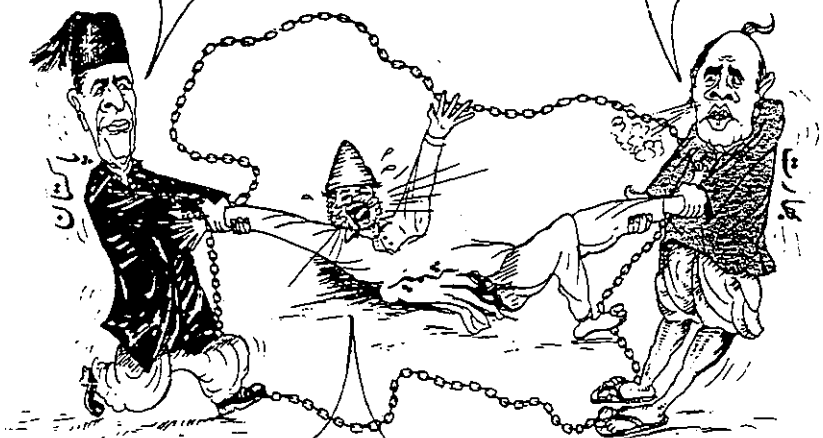
میں نے میڈیا سے رابطے کے سلسلے میں اپنی ان پریس کانفرنسوں کا ذکر جن کا بنیادی تعلق سیاسی میدان سے ہے اپنی سیاسی سرگرمیوں کے بارے میں ''میڈیا کے اہم محاذ پر'' کے عنوان کے تحت کیا ہے لیکن میری چار اہم پریس کانفرنسیں سیاسی سے کہیں زیادہ سفارتی نوعیت کی تھیں اسلئے ضروری سمجھتا ہوں کہ ان پریس کانفرنسوں کا تفصیلی ذکر سفارتی سرگرمیوں کے باب میں ہو۔

1987ء سے پہلے میری سب سے اہم پریس کانفرنس 18 اکتوبر 1979ء کو اقوام متحدہ کے مرکزی سیکرٹریٹ نیویارک کے سرکاری پریس روم میں فلسطین اور افغانستان کی تحاریک آزادی اور امریکی مسلمانوں کی تنظیم کے نمائندوں کے ساتھ ہوئی جس میں میں نے مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادئ کشمیر کی وضاحت کی اور میڈیا کے نمائندوں کے متعدد سوالوں کے جواب دیئے۔ اقوام متحدہ کے سرکاری پریس روم میں دوسری تحاریک آزادی کے نمائندوں کے ساتھ کسی کشمیری تنظیم کے سربراہ کی یہ پہلی اور اب تک کی آخری پریس کانفرنس تھی۔ اس کا تفصیلی ذکر کتاب کی پہلی جلد میں آیا ہے۔

1986ء کے بعد میری پہلی اہم پریس کانفرنس اکتوبر 1989ء میں کشمیر لبریشن الائنس کے کنوینیئر اور سابق صدر آزاد کشمیر جنرل (ر) محمد حیات خان اور جماعت اسلامی آزاد کشمیر کے امیر کرنل رشید مرحوم کے ساتھ اقوام متحدہ میں متعین دنیا بھر کے میڈیا کے نمائندوں کی تنظیم یونائیٹڈ نیشنز کارسپانڈنٹس ایسوسی ایشن (UNCA) کے پریس کلب (جو نیویارک میں اقوام متحدہ کی عمارت کے اندر ہے) میں

جی نہیں! اس پر دستاویز الحاق کا نہیں' اقوام متحدہ کی قرار دادوں کا اطلاق ہوتا ہے۔ گو ان قراردادوں میں سر ظفراللہ خان کی کرائی گئی ترمیم کے تحت اس کو آزاد چھوڑنے پر پابندی ہے اور یہ صرف میری یا آپ کی ملکیت بن سکتا ہے لیکن چونکہ مسلمان ہے اس لئے میری ہی ملکیت ہے۔ اسے آپ میرے حوالے کریں۔

اس کے مالک مہاراجہ ہری سنگھ نے اسے 27 اکتوبر 1947ء کو دستاویز الحاق کے تحت میرے ہاتھ فروخت کیا تھا جب سے یہ میری ملکیت ہے۔ مجھے حق ہے کہ میں اس سے جو سلوک چاہوں کروں۔ آپ کون ہوتے ہیں اعتراض کرنے والے۔



ظالمو! میں کوئی بھیڑ بکری نہیں ایک باشعور انسان ہوں۔ ہری سنگھ اور سر ظفراللہ مجھے بیچنے یا میرے حق کو محدود کرنے والے کون ہوتے ہیں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میں خود اپنے بارے میں بہتر فیصلہ کر سکتا ہوں۔

JKLF

کی۔اس میں ہم نے مسئلہ کشمیر اور اندرون کشمیر جاری جدوجہد آزادی کی تفصیلات بیان کیں اور صحافیوں کے سوالات کے جواب دیئے۔

میری دوسری اہم بلکہ سنسنی خیز پریس کانفرنس بھی (9اپریل 1990ء کو) UNCA کے پریس کلب میں ہوئی۔ان دنوں مقبوضہ کشمیر میں مسلح جدوجہد عروج پر تھی اور ہمارے سٹوڈنٹ ونگ (سٹوڈنٹس لبریشن فرنٹ) کے سربراہ ہلال بیگ اور ساتھیوں نے کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر مشیر الحق کو اغوا کیا تھا۔جس کا علم مجھے نیویارک پہنچ کر ہوا تھا۔میں نے پریس کانفرنس سے ایک گھنٹہ پہلے اس بنا پر کہ شاید پریس کانفرنس کے دوران اس بارے میں سوال ہوں اصل اور تازہ ترین صورتحال جاننے کیلئے نیویارک سے سرینگر فون کیے لیکن کسی ذمہ دار شخص سے رابطہ نہ ہوسکا۔اس کے بعد مظفر آباد راجہ مظفر کو فون کیا ان کا فون مسلسل مصروف ملا تو راولپنڈی ڈاکٹر فاروق حیدر کو فون کیا۔انہوں نے کہا کہ مشیر الحق کو ہلال بیگ وغیرہ نے میعاد ختم ہونے کے باوجود مطالبات پورے نہ ہونے کی بناء پر ہلاک کر دیا۔میں نے پریس کانفرنس میں اپنے نظریات اور کشمیر میں تازہ ترین صورتحال کی وضاحت کی۔پریس کانفرنس میں بھارتی صحافی بڑی تعداد میں موجود تھے۔ UNCA کی صدر ایک انتہائی سخت گیر امریکی خاتون تھیں۔بھارتی صحافیوں کے مشیر الحق کے اغوا سے متعلق بار بار کے سوالات کے جواب میں میں نے کہا کہ میری معلومات کے مطابق مشیر الحق ہلاک ہو چکا ہے۔اس پر امریکی خاتون صحافی طیش میں آ گئی اور مجھے کہا تم لوگ دہشت گرد ہو۔میں نے کہا محترمہ ایک مشیر الحق مارا گیا آپ آسمان سر پر اٹھا رہی ہیں آپ ان دس ہزار کشمیریوں کے بارے میں کیوں بات نہیں کر رہی ہیں جنہیں بھارتی فوج نے اب تک قتل کیا ہے۔اس پر وہ کچھ ڈھیلی پڑ گئی۔میری طرف سے مشیر الحق کے ہلاک ہونے کی خبر کسی بھارتی صحافی نے فوراً بھارت بھیج دی۔پریس کانفرنس کوئی ڈیڑھ گھنٹے جاری رہنے کے بعد ختم ہوگئی۔جب میں اپنے ساتھیوں اور صحافیوں کے ساتھ پریس کلب سے باہر نکل رہا تھا تو ایک صحافی نے دوڑتے ہوئے آ کر کہا کہ مشیر الحق زندہ ہے۔تھوڑی دیر کے بعد خبر الیکٹرانک نیوز بورڈ پر بھی آ گئی اور میں خاصا پریشان ہوا کہ اصل حقیقت کیا ہے اور ڈاکٹر فاروق حیدر نے غلط بیانی کر کے مجھے کیوں مشکل میں ڈلوایا۔میں نے سرینگر فون کیے لیکن پھر کوئی ذمہ دار شخص نہیں ملا۔پھر راولپنڈی فون کیا ڈاکٹر صاحب نے خاصے غیر سنجیدہ لہجے میں کہا امان صاحب ہلال بیگ نے 24 گھنٹے کا وقت دیا تھا جب آپ نے پہلے فون کیا تو ہلال بیگ کی 24 گھنٹے کی مہلت کا ٹائم ختم ہو گیا تھا میں سمجھا مشیر الحق کو ہلاک کیا گیا ہوگا اسلئے آپ کو بتایا کہ اسے ہلاک کیا گیا ہے۔(دراصل ڈاکٹر صاحب کے اس قسم کے غلط اندازوں نے پہلے بھی ایک سے زیادہ بار تحریک کو سخت نقصان پہنچایا تھا) بہر حال اس ساری صورتحال سے بھارتی صحافیوں اور سفارتخانے نے یہ کہانی گھڑی کہ میری پریس کانفرنس کے وقت مشیر الحق زندہ تھا اور میں نے پریس کانفرنس میں اس کی ہلاکت کا ذکر کر کے دراصل ہلال بیگ وغیرہ کو اشارہ دیا تھا کہ مشیر الحق کو ہلاک کر دو چنانچہ اسے دوسرے دن ہلاک کر دیا گیا حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔میں نے پوری کوشش کی تھی کہ ہلال بیگ سے فون پر رابطہ کر کے اسے سختی سے منع کروں کہ

مشیر الحق کو ہلاک نہ کیا جائے لیکن دن بھر کی کوششوں کے باوجود اس سے رابطہ نہ ہوسکا (یاد رہے کہ اس قسم کی ہلاکتیں لبریشن فرنٹ اور سٹوڈنٹس لبریشن فرنٹ کی پالیسی میں شامل نہیں تھیں چنانچہ ہم نے بعد میں ہلال بیگ سے سختی سے باز پرس کی جس کے نتیجے میں اس نے اپنی الگ تنظیم اخوان المسلمین قائم کی) بہر حال ڈاکٹر فاروق حیدر کی انتہائی لاپرواہی اور غیر ذمہ دارانہ غلط بیانی نے بھارتی حکومت کو سنہری موقع فراہم کیا اور بھارتی حکومت نے براہ راست بھی اور روسی وزیر خارجہ ایڈوارڈ شیوڈ ناڈزے (Advard Shavednadze) جو ان دنوں امریکہ کے ساتھ مصالحتی گفت وشنید کے سلسلے میں امریکہ میں تھے کے ذریعہ بھی امریکی حکومت خاص کر سیکرٹری آف سٹیٹ جیمز بیکر سوم کو یہ باور کرایا کہ امان اللہ خان امریکی سرزمین سے کشمیر میں ہلاکتوں کے حکم نامے جاری کرتا ہے اور اس کے ثبوت میں مشیر الحق کی ہلاکت سے متعلق من گھڑت کہانی کو مزید نمک مرچ لگا کر پیش کیا جسکے نتیجے میں امریکی وزیر خارجہ نے اپنے خصوصی اختیارات استعمال کر کے میرا امریکی ویزا منسوخ کر دیا۔

میں بھارتی حکومت کی ان پس پردہ سرگرمیوں سے بالکل بے خبر اپنے کام میں مصروف رہا اور نیویارک کی متذکرہ پریس کانفرنس کے بعد لاس اینجلس اور نیوپورٹ جا کر کشمیریوں سے ملا۔ ادھر کشمیر امریکن کونسل کے مینجنگ ڈائریکٹر ڈاکٹر غلام نبی فائی کی کوششوں سے میرا نیویارک ٹائمز کے ساتھ انٹرویو اور نیشنل پریس کلب واشنگٹن میں میٹ دی پریس کا پروگرام بنا۔ بھارتی حکومت اور بھارتی لابی نے بڑی دوڑ دھوپ کے بعد میرا نیویارک ٹائمز سے انٹرویو تو منسوخ کر دیا لیکن پریس کانفرنس منسوخ کرانے میں ناکام رہی۔

میری تیسری اہم پریس کانفرنس 20 اپریل 1990ء کو دنیا کے سب سے بڑے پریس کلب یعنی نیشنل پریس کلب واشنگٹن میں ہوئی اور وہ بھی مہمان مقرر کی حیثیت سے۔ یہ کلب یہ حیثیت عالمی سطح کی شخصیات کو ہی دیتا ہے۔ کچھ بھارتی صحافیوں نے یہاں بھی صحافتی بددیانتی کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے ابتداء میں ہی انہیں میری نیویارک والی پریس کانفرنس کے بارے میں غلط بیانی اور غلط تشریح کرنے پر امریکی صحافیوں کے سامنے خاصا ڈانٹا۔ اس کے بعد بھارتی خود تو خاموش ہو گئے البتہ ایک امریکی صحافی سے براہ راست یہ سوال کرایا ''مسٹر خان کیا آپ دہشت گرد ہیں'' میں نے اس سے پوچھا آیا وہ امریکی ہے۔ اسکے اثباتی جواب پر میں نے اس سے پوچھا آیا وہ جارج واشنگٹن کو بھی دہشت گرد سمجھتا ہے اس کے ہاتھوں اور اسکی تحریک کے نتیجے میں تو بے شمار لوگ مارے گئے تھے۔ اس نے کہا کہ وہ تو امریکہ کو متحد رکھنے کے لئے جنگ لڑ رہا تھا۔ میں نے کہا اسی طرح ہم کشمیری بھی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ وہ آزادی (حق خودارادیت) جو ہمارا پیدائشی حق ہے جس کو امریکہ سمیت عالمی برادری نے بھی تسلیم کیا ہے اور وہ آزادی جسے بھارت اور پاکستان دونوں نے تسلیم کر کے ہمیں دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن اب بھارت ہمیں یہ آزادی دینے سے انکار کر رہا ہے۔ ہم نے چالیس سال کے طویل عرصے کی پرامن جدوجہد کی لیکن بھارت کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی چنانچہ ہم کشمیریوں نے بندوق اٹھائی جسکا بنیادی مقصد لوگوں کو

مارنا نہیں بلکہ دنیا کی توجہ اپنے کاز کی طرف مبذول کرانا ہے۔ میں نے کہا اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے بھی اپنی قرارداد نمبر 2621 کے ذریعے محکوم قوموں کو یہ حق دیا ہے کہ وہ حصول آزادی کیلئے مسلح جدوجہد سمیت ہر طریقہ استعمال کریں۔ میں نے کہا میں گذشتہ دس سال سے جنرل اسمبلی کے اجلاس کے دوران نیویارک آتا رہا ہوں۔ میں نے یہاں پر ہر اہم ملک کے سفیر کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن میری کسی نے نہ سنی اسلئے مجبوراً ہم نے مسلح جدوجہد آزادی شروع کی۔

بہرحال میں امریکی صحافیوں کو یہ تاثر دینے میں کامیاب ہوگیا کہ کشمیر میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ دہشت گردی نہیں کشمیریوں کی مسلح جدوجہد آزادی ہے۔ پریس کانفرنس میں موجود ایک عمر رسیدہ جوڑے نے تو یہ ریمارک تک دیا کہ مسٹر خان دہشت گرد نہیں بلکہ کسی یونیورسٹی کے ایک ایسے پروفیسر معلوم ہوتے ہیں جسے اپنے مضمون پر خاصا عبور حاصل ہے جو دوسروں سے اپنے موقف کو صحیح تسلیم کرانے کے فن میں ماہر ہیں اور اپنے موقف کے حق میں ٹھوس دلائل دیتے ہیں۔ بہرحال اکثر بھارتی صحافیوں نے حسب عادت خبر بھیجی کہ امان اللہ خان نے دہشت گردی کے الزام کی تردید کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

میری چوتھی اہم پریس کانفرنس 18 جون 1990ء کو مظفر آباد میں ہوئی جس میں میں نے خودمختار مملکت جموں کشمیر کیلئے عارضی حکومت کے قیام کا اعلان کیا۔ (تفصیلات سیاسی سرگرمیوں کے باب میں) اس پریس کانفرنس کی کوریج کے لئے اسلام آباد میں متعین عالمی میڈیا کے نمائندوں کی بڑی تعداد بھی مظفر آباد آئی تھی۔ میرے اس اعلان اور اسکے بعد مجھ سے کئے گئے انٹرویوز کی عالمی سطح پر وسیع کوریج ہوئی البتہ اسے پاکستان کے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا نے بالعموم اور سرکاری میڈیا نے بالخصوص نظرانداز کر دیا۔

(xi) سفارتکاروں کو بریفنگز

دور جدید میں کسی محکوم قوم کی جدوجہد میں اسکی کامیابی کی بنیادی ضروریات میں سے ایک اہم ضرورت عالمی رائے عامہ یا اور بڑی طاقتوں کی حمایت ہوتی ہے۔ مسئلہ کشمیر بنیادی طور پر کشمیریوں کے حق خودارادیت کا مسئلہ تھا لیکن ایک طرف بھارت کی انتہائی موثر کشمیر پالیسی اور دوسری طرف پاکستان کی فاش غلطیوں کے علاوہ کشمیریوں میں اتحادِ فکر و عمل کے فقدان کے نتیجے میں دنیا کی مختلف قومیں آج مسئلہ کشمیر کو کشمیریوں کے بنیادی انسانی حق اور انصاف کی قدروں کی بجائے بھارت اور پاکستان سے اپنے تعلقات کے ترازوں سے تولتی ہیں چنانچہ جدوجہد آزادی میں مصروف کشمیریوں کو عالمی رائے عامہ اور بڑی طاقتوں کی حمایت حاصل کرنے کے لئے بڑی اور متحد جدوجہد کرنی چاہیئے تھی لیکن ایسا نہیں ہو رہا۔ میری مشکل یہ ہے کہ میرے خلاف ایک طرف بھارت نے انٹرپول سے بین الاقوامی وارنٹ گرفتاری جاری کروا رکھا ہے اور دوسری طرف پاکستان نے میرا نام ان لوگوں کی فہرست میں شامل کر رکھا ہے جن کے پاکستان سے باہر جانے پر پابندی ہے۔ یہی نہیں بلکہ 17 جولائی 2003ء کو میرا پاسپورٹ بھی ضبط

کرلیا گیا۔ چنانچہ میں گزشتہ گیارہ سال سے پاکستان سے باہر نہیں جاسکا ہوں اسلئے عالمی سطح پر کسی اہم شخصیت سے بالمشافہ بات نہیں ہوسکی اور چونکہ میں حکومت پاکستان کی نظروں میں (اپنے نظریہ خودمختار کشمیر کی وجہ سے) ایک ناپسندیدہ شخصیت ہوں اسلئے پاکستان کے دورے پر آنے والی عالمی شخصیات سے ملاقات بھی نہیں ہوسکتی۔ ادھر تنظیم کے سفارتی شعبے (جو بوجوہ اتنا مضبوط نہیں جتنا اسے ہونا چاہیئے) کی کارکردگی اس خلاء کو پر کرنے کے لئے کافی نہیں البتہ میری دنیا کی اہم حکومتوں، بین الاقوامی اداروں اور پاکستان میں دنیا بھر کے سفارتی نمائندوں سے خط وکتابت کے علاوہ اسلام آباد میں سفارتکاروں کو مسئلہ کشمیر کے مختلف پہلوؤں پر بریفنگ اس خلا کو کسی حد تک پورا کرتی ہے۔

جہاں میں گذشتہ اٹھارہ سال کے دوران اسلام آباد میں متعین سفارتکاروں کو خطوط لکھنے کے علاوہ انہیں اپنی پالیسی بیانات کی کاپیاں بھی بھیجتا رہا ہوں وہاں میں نے اس دوران چھ بار اسلام آباد میں متعین سینئر سفارتکاروں کو بریف کیا۔ آیئے ذرا تفصیل میں جائیں۔

پہلی بریفنگ ۔ میری طرف سے سفارتکاروں کو پہلی بریفنگ 3 دسمبر 1992ء کو مارگلہ موٹل اسلام آباد میں ہوئی جس میں میں نے تنظیم کے نظریات خاص کر نظریہ خودمختار کشمیر اور اس سے بھارت اور پاکستان کو پہنچنے والے فوائد کی وضاحت کرنے کے علاوہ مسئلہ کشمیر کی تاریخ اور مسلح جدوجہد آزادی سے متعلق معاملات کی تفصیلات بھی بیان کیں جسکے بعد میں نے سفارتکاروں اور صحافیوں کی طرف سے پوچھے جانے والے سوالات کے جواب دیئے۔ زیادہ تر سوالات نظریہ خودمختار کشمیر اور مسلح جدوجہد آزادی سے متعلق تھے۔

دوسری بریفنگ ۔ سفارتکاروں کو میں نے دوسری بریفنگ 5 جولائی 1994ء کو اسلام آباد میں ہی دی۔ اب کے موضوع مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کیلئے لبریشن فرنٹ کی تین متبادل تجاویز تھیں۔ پہلی تجویز یہ تھی کہ مسئلہ کشمیر سے متعلق اقوام متحدہ کی قراردادوں کو اس ترمیم کے ساتھ عملی جامہ پہنایا جائے کہ کشمیریوں کے لئے بھارت یا پاکستان سے الحاق کے علاوہ پوری ریاست کی مکمل خودمختاری کا دروازہ بھی کھلا ہو اور رائے شماری سے پہلے ریاست سے بھارت اور پاکستان کی فوجوں کا مکمل انخلاء ہو۔ دوسری تجویز یہ تھی کہ ریاست کے تینوں حصوں یعنی بھارتی مقبوضہ کشمیر آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کے سیاسی اکابرین کو مل بیٹھنے کا موقع دیا جائے تاکہ وہ سیر حاصل بحث کے بعد مسئلہ کشمیر کا کوئی متفقہ یا غالب اکثریتی حل وضع کر کے اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے بھارت پاکستان اور عالمی برادری کے سامنے رکھیں اور تیسری تجویز یہ تھی کہ منقسم ریاست جموں کشمیر کو ایک بین الاقوامی کمیٹی کے زیر نگرانی دوبارہ متحد کر کے ایک ایسی خودمختار مملکت بنایا جائے جس کے بھارت اور پاکستان دونوں سے دوستانہ تعلقات ہوں کچھ مدت بعد وہاں ایک آزادانہ ریفرنڈم کے ذریعہ لوگ یہ فیصلہ کریں کہ آیا ریاست کی خودمختاری کو ہی مستقل شکل دی جائے یا ریاست کو

بھارت یا پاکستان کا حصہ بنایا جائے اور اسی عوامی فیصلے کو مسئلہ کشمیر کا حتمی حل تسلیم کر کے عملی جامہ پہنایا جائے۔

بریفنگ کے اختتام پر بھارتی مقبوضہ کشمیر میں بھارتی افواج کی طرف سے انسانی حقوق کی پامالی سے متعلق ایک فلم بھی دکھائی گئی۔

تیسری بریفنگ ۔ میری سفارتکاروں کو تیسری بریفنگ 18 جون 1998ء کو ہوئی۔ اس بریفنگ کے تقریباً دو ہفتے قبل 4 جون کو پہلے G-8 کے ممبر ممالک کے سربراہان حکومت نے اور 6 جون 1998ء کو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے اپنی متفقہ قرارداد نمبر 1172 کے ذریعہ اعلان کیا تھا کہ وہ بھارت اور پاکستان کے درمیان کشیدہ تعلقات کے خاتمے کے لئے اسکے اسباب خاص کر مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔ ان حقائق کی روشنی میں میں نے اسلام آباد میں متعین سفارتکاروں کے ذریعہ عالمی برادری پر ٹھوس دلائل کے ذریعہ واضح کیا کہ مسئلہ کشمیر کا بہترین قابل عمل، منصفانہ، آبرومندانہ اور مستقل حل یہ ہے کہ منقسم ریاست جموں کشمیر کو دوبارہ متحد کر کے اسے ایک ایسی آزاد مملکت بنایا جائے جس کے بھارت اور پاکستان دونوں سے دوستانہ تعلقات ہوں۔ پندرہ سال بعد وہاں اقوام متحدہ کے زیر اہتمام ریفرنڈم ہو جس میں کشمیری عوام یہ فیصلہ کریں کہ آیا کشمیر کی خودمختاری کو ہی مستقل شکل دی جائے یا اسے بھارت یا پاکستان کا حصہ بنایا جائے اور مسئلہ کشمیر کے جملہ فریق اس عوامی فیصلے کو مسئلے کا حتمی حل تسلیم کر کے اسے عملی جامہ پہنائیں۔

چوتھی بریفنگ ۔ میں نے اسلام آباد میں متعین سفارتکاروں کی چوتھی بریفنگ 2 ستمبر 1999ء کو دی جس میں 14 اکتوبر 1999ء کو جنگ بندی لائن کو اجتماعی غیر مسلح اور اعلانیہ طور پر عبور کرنے کے فیصلے کا پس منظر، طریقہ کار اور مقصد بیان کیا اور عالمی برادری سے اپیل کی کہ وہ ہمارے اس مقصد کی حمایت کرے جس کیلئے ہم اتنا رسک لے رہے ہیں۔ میں نے واضح کیا کہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ عالمی برادری کے علاوہ بھارت اور پاکستان بھی سمجھ لیں کہ مسئلہ کشمیر کو منصفانہ، پرامن، آبرومندانہ اور کشمیری عوام کے جذبات اور آزادانہ طور پر ظاہر کی گئی رائے کے مطابق حل کئے بغیر نہ تو جنوبی ایشیا میں مستقل امن قائم ہو سکتا ہے نہ بھارت اور پاکستان کے سر پر لٹکتی ایک تباہ کن جنگ کی تلوار ہٹ سکتی ہے اور نہ ہی دونوں ملکوں کیلئے کسی خوشحال مستقبل کی گارنٹی دی جا سکتی ہے۔

پانچویں بریفنگ ۔ اسلام آباد میں ہی سفارتکاروں کو 21 اپریل 2000ء کو دی جانے والی بریفنگ میں میں نے واضح کیا کہ ریاست جموں کشمیر کے پڑھے لکھے لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد منقسم ریاست کی وحدت کی بحالی اور مکمل خودمختاری کے حق میں ہے۔ جبکہ بھارت اور پاکستان آزادی پسند کشمیریوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکنے والی بتاتے ہیں جو کہ سفید جھوٹ ہے۔ میں نے 70375

کشمیریوں کے دستخطوں سے کی گئی اپیل پڑھ کر سنائی جو یہ تھی ''ہم زیر دستخطی مستقل باشندگان ریاست جموں کشمیر اس بات میں یقین رکھتے ہیں کہ ہمارے منقسم مادر وطن ریاست جموں کشمیر جس میں وادیٔ کشمیر، جموں، لداخ، آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کے علاقے شامل ہیں کو دوبارہ متحد کر کے اسے ایک آزاد وخودمختار مملکت بنانا کشمیر، بھارت، پاکستان، عالمی امن اور عالمی اقتصادی نظام کے بہترین مفاد میں ہے۔ اسلئے ہم بھارت اور پاکستان کی حکومتوں اور سیاسی پارٹیوں کے علاوہ عالمی برادری خاص کر امریکہ کے صدر کلنٹن، اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کوفی عنان، سلامتی کونسل کے مستقل ممبروں، یورپی یونین، غیر جانبدار تحریک اور اسلامی کانفرنس سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ منقسم ریاست کی وحدت کی بحالی اور مکمل خودمختاری کیلئے مناسب اقدام کریں۔''

اس اپیل پر کل 70375 ریاستی باشندوں نے دستخط کئے تھے جن میں سے 63749 کا تعلق آزاد کشمیر سے 5194 کا گلگت بلتستان سے اور 1432 کا بھارتی مقبوضہ کشمیر سے ہے۔ جواب آزاد کشمیر پاکستان یا دوسرے ممالک میں رہتے ہیں۔ ان دستخط کنندگان میں 10010 (دس ہزار دس) پوسٹ گریجویٹ اور گریجویٹ (پروفیسر، وکیل، سیاستدان، ادیب، صحافی، ڈاکٹر، انجینئر اور تاجر) 55925 انڈر گریجویٹ طلبا، اساتذہ اور غیر سرکاری ملازم اور 4440 نیم خواندہ اور ناخواندہ ہیں۔ ان میں سے اکثر دستخط کنندگان آزاد کشمیر، گلگت بلتستان اور پاکستان کے قصبوں اور شہروں میں رہتے ہیں۔ ہم دیہات میں رہنے والے لوگوں تک نہیں پہنچ سکے۔ ان دستخط کنندگان میں سے 1868 مشرق وسطیٰ میں 280 یورپ میں اور 83 امریکہ میں برسرروزگار ہیں۔

سفارتکار یہ اعداد وشمار دیکھ کر خاصے حیران ہوئے خاص کر جب انہیں معلوم ہوا کہ ان میں بھاری اکثریت پڑھے لکھے لوگوں کی ہے۔ دراصل بھارت، پاکستان اور کشمیر میں ان کے آلہ کاروں نے عالمی سطح پر یہ تاثر دیا ہے کہ کشمیر میں ریاست کی مکمل خودمختاری کے حامی لوگوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔

چھٹی بریفنگ ۔ پاکستان میں متعین دنیا بھر کے سفارتکاروں کو میری چھٹی بریفنگ 13 جون 2003ء کو ہوئی جب میں نے مسئلہ کشمیر کے حل کیلئے لبریشن فرنٹ کا روڈ میپ لانچ کیا۔ یہ روڈ میپ مسئلہ کشمیر کو پرامن، منصفانہ، آبرومندانہ، جمہوری اور مستقل طور پر حل کرنے کے لئے لبریشن فرنٹ کے فارمولے پر مبنی ہے۔ روڈ میپ کی تفصیل اس سے متعلق باب میں ہے البتہ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ اس کی وضاحت کے دوران سفارتکاروں نے میری باتیں اور دلائل غور سے سننے کے بعد مجھ سے سوالات بھی کئے اور بعد میں چائے نوشی کے دوران بھی مجھ سے مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادیٔ کشمیر کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں سوالات پوچھتے رہے۔

یہ تھی گزشتہ بارہ سال کے دوران سفارتکاروں کو میری چھ بریفنگز کی سرسری سی رپورٹ۔

حاضری کی اوسط تقریباً پندرہ تھی اگر چہ دو بار حاضری بیس سے تجاوز کر گئی تھی۔ اس حقیقت کے پیش نظر کہ حکومت پاکستان میری اس قسم کی سرگرمیوں کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتی ہے جسکا سفارتی حلقوں کو پورا علم ہے اس کے باوجود اتنی تعداد میں سفارت کاروں کا میری بریفنگز میں شمولت کرنا ایک خوشگوار حیرت ہے۔ کشمیری سیاسی پارٹیوں میں لبریشن فرنٹ واحد تنظیم ہے جس نے اتنی مدت میں اتنی بار سفارتکاروں کو بریف کیا ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے راستے میں روڑے بھی اٹکائے گئے۔ ایک سے زائد بار ہماری بریفنگ کے وقت ہی وزارت خارجہ میں سفارتکاروں کی بریفنگ رکھی گئی۔ ایک بار آئی ایس آئی کا ایک اہلکار ہمارے کاؤنٹر سے سفارتکاروں کا رجسٹر حاضری ہی لے بھاگا۔ ہمارے دونو جوانوں نے دور تک اس کا پیچھا کیا لیکن وہ مارگلہ موٹل اسلام آباد کے متصل واقع جنگل میں گھس کر آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

یہ ہے گزشتہ اٹھارہ سالوں (1987ء تا 2004ء) کے دوران سفارتی محاذ پر لبریشن فرنٹ کی اور میری سرگرمیوں کی ایک مختصر سی رپورٹ۔ اگر چہ کشمیر میں جنگ بندی لائن پر ہمارے چار اجتماعی، غیر مسلح اور اعلانیہ حملے، بیلجیئم میں گول میز کشمیر کانفرنس اور میری گرفتاری اور میرے خلاف انٹرنیشنل وارنٹ گرفتاری کا اجراء بھی ہماری اہم سفارتی سرگرمیوں کے اہم حصے ہیں لیکن اُن عنوانات کو بوجوہ الگ ابواب میں شامل کیا گیا ہے۔

5- بیلجیئم کشمیر کانفرنس

میری اسیری۔ کچھ دلچسپ واقعات

قوت ارادی کے کرشمے۔ کچھ اہم نتیجے

پس منظر

لبریشن فرنٹ بالعموم اور ذاتی طور پر میں بالخصوص عالمی رائے عامہ اور عالمی حکومتوں اور بین الاقوامی اداروں کی حمایت حاصل کرنے کی جدوجہد کو جنگ آزادی کا ایک اہم محاذ سمجھتے ہیں۔ اس سلسلے میں یورپین پارلیمنٹ میں قائم مختلف گروپوں خاص کر سوشلسٹ گروپ جس میں برطانیہ کی لیبر پارٹی سے

تعلق رکھنے والے ممبران کی خاصی تعداد تھی سے میری خط و کتابت خاصی مدت سے تھی۔ برطانیہ کی پارلیمنٹ کے بہت سے لیبر ممبروں سے میرے ذاتی تعلقات تھے۔ فروری 1992ء میں ہم نے جب جنگ بندی لائن کو اجتماعی، غیر مسلح اور اعلانیہ طور پر عبور کرنے کی کوشش کی تو اس کے صرف ایک ماہ بعد یورپین پارلیمنٹ نے کشمیریوں کے حق خودارادیت کے حق میں ایک قرارداد منظور کی تھی۔ بڑی مدت کے بعد یہ پہلی بار ہوا تھا کہ کسی بین الاقوامی ادارے میں کشمیریوں کے حق خودارادیت کی حمایت کی گئی ہو۔ یہی نہیں بلکہ اس قرارداد میں ہماری جنگ بندی لائن عبور کرنے کی کوشش کو کشمیری عوام کی انتہائی فرسٹیشن کا ثبوت قرار دیا گیا تھا۔

مجھے دعوت

اگست یا ستمبر 1990ء میں مجھے اطلاع ملی کہ یورپین پارلیمنٹ کا سوشلسٹ گروپ اکتوبر میں برسلز بیلجیئم میں مسئلہ کشمیر پر ایک گول میز مباحثے کا اہتمام کر رہا ہے۔ ان دنوں لبریشن فرنٹ میں اندرونی انتشار تھا اور برطانیہ کے شبیر چوہدری ہم سے الگ ہو گئے تھے۔ مجوزہ گول میز مباحثے کے اکثر انتظامات یورپین پارلیمنٹ کے ایک معروف بھارت نواز برطانوی ممبر (Dick Gupwell) کے ہاتھ میں تھے جس نے میرے علاوہ شبیر چوہدری کو بھی دعوت نامہ بھیجا۔ میں غالباً 16 اکتوبر 1993ء کو بیلجیئم پہنچا۔ اسی دوران بھارتی فوج نے سرینگر میں درگاہ حضرت بل کا محاصرہ کر لیا جس سے ساری وادی میں سیاسی بھونچال آ گیا اور جنوبی ایشیائی معاملات سے متعلق عالمی میڈیا کی توجہ سرینگر کی طرف مبذول ہو گئی جسکے نتیجے میں برسلز کانفرنس کسی حد تک پس منظر میں چلی گئی البتہ بی بی سی اردو سروس اور روزنامہ جنگ لندن جسکے نمائندے مرحوم زیڈ یو خان برسلز میں موجود تھے۔ کانفرنس سے متعلق تیاریوں کو کور کرتے رہے۔

کانفرنس سے ایک دن پہلے آزاد کشمیر کے وزیراعظم سردار عبدالقیوم خان اپنے ساتھیوں شاہ غلام قادر (وزیر)، طارق مسعود (ڈپٹی چیف سیکرٹری) اور چوہدری رشید انفارمیشن آفیسر کے ہمراہ برسلز پہنچے اور وہاں ہلٹن ہوٹل میں قیام کیا۔ شام کو جموں کشمیر پیپلز پارٹی کے صدر پروفیسر بھیم سنگھ آف جموں سے سردار عبدالقیوم کے سیوٹ میں ملاقات ہوئی۔ مسئلہ کشمیر پر گول میز بحث 18 اکتوبر 1993ء کی سہ پہر کو یورپین پارلیمنٹ کے کانفرنس روم میں شروع ہونے والی تھی۔ میرے تنظیمی ساتھیوں میں بیلجیئم اور ہالینڈ والوں کے علاوہ برطانیہ سے مرحوم افضل جاتلوی، محمود حسین، چوہدری حنیف، راسب کشمیری، چوہدری عبدالرحمٰن اور مسٹر محمود برسلز پہنچے تھے۔ ہم کانفرنس شروع ہونے سے کوئی ایک گھنٹہ پہلے پارلیمنٹ ہاؤس پہنچے۔ تو باہر یورپ میں مقیم کشمیریوں کا مظاہرہ تھا۔ یہ لوگ مسئلہ کشمیر کو کشمیریوں کے حق خودارادیت کی بنیاد پر حل کئے جانے پر زور دے رہے تھے۔ ان مظاہرین کی بھاری اکثریت کا تعلق ہماری تنظیم سے تھا۔ میں نے دور سے ہی ہاتھ ہلا ہلا کر ان کو شاباش دی اور شکریہ ادا کیا۔ میں نے دیکھا کہ این ایل ایف کے جی ایم میر، نذیر ناز ش اور جبار بٹ، پی این پی کے شوکت کشمیری، افضل طاہر اور خالد پرویز بھی لابی

میں کھڑے ہیں۔ اسی دوران ڈاکٹر فاروق عبداللہ بھی پچھلے دروازے سے لابی میں داخل ہوگئے۔ وہ خاصے نروس نظر آرہے تھے۔ (بعد میں اس نے مجھے بتایا کہ اسے ڈر تھا کہ کہیں آزاد کشمیر والے اس پر حملہ نہ کریں۔ میں فاروق عبداللہ کو 1974ء سے جانتا تھا جب وہ ہمارے محاذ رائے شماری کی برطانیہ شاخ کے نائب صدر تھے اور محاذ کے کنونشن کے سلسلے میں پاکستان و آزاد کشمیر بھی آئے تھے) میں نے علیک سلیک کے بعد ذرا طنزاً کہا۔ فاروق قوم مر رہی ہے اور تم موٹے ہوتے جارہے ہو۔ فاروق نے فوراً جواب دیا ''قوم کو مروا کون رہا ہے'' ہم ایک دوسرے پر طنزیہ فقرے کس ہی رہے تھے کہ سردار قیوم صاحب ساتھیوں کے ساتھ لابی میں داخل ہوگئے۔ میں نے دونوں کا ایک دوسرے سے تعارف کرایا۔ اسی اثناء میں اطلاع ملی کہ کانفرنس شروع ہونے والی ہے۔ اس لئے ہم اوپر والی منزل کی طرف چلے گئے۔ وہاں پہنچتے ہی بھارت کی جنتا دل پارٹی کے رہنما جارج فرنڈس سے ملاقات ہوئی۔ جارج فرنڈس مجھ سے پرتپاک طریقے سے ملے اور کہنے لگے کہ اگر آپ بھارتیوں کو یہ یقین دلائیں کہ آپ کا مجوزہ خودمختار کشمیر صحیح معنوں میں سیکولر اور غیر جانبدار ہوگا، پاکستان کا کٹھ پتلی نہیں ہوگا اور وہاں غیر مسلموں کے حقوق محفوظ ہونگے تو آپ کو بھارت میں خاص کر بھارتی دانشوروں میں بہت ہمدرد اور حامی ملیں گے لیکن آپ اس طرف کوئی توجہ نہ دیکر ایک فاش غلطی (بلنڈر) کررہے ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ اس موضوع پر کانفرنس کے بعد بات کریں گے کیونکہ کانفرنس شروع ہونے والی تھی۔

کانفرنس کے شرکاء

مسئلہ کشمیر پر گول میز بحث جیسا کہ کانفرنس کا عنوان تھا گول میز نہیں بلکہ چوکور تھی۔ ایک سائیڈ پر یورپین پارلیمنٹ کے سوشلسٹ گروپ کے سربراہ مسٹر سٹیونسن (Mr.Stevenson) (جو صدارت کر رہے تھے) مسز انیتا پولاک (Anita Pollack) اور کین کوٹس (Ken Coates) سمیت پارلیمنٹ کے ممبران اور ان کے پیچھے بہت سے اور ممبران تھے۔ دوسری سائیڈ پر ہم آزاد کشمیر اور پاکستان سے تعلق رکھنے والے یعنی سردار عبدالقیوم اور ساتھی، بیرسٹر افتخار، جی ایم میر، نذیر نارش، شبیر چوہدری، راجہ مظفر اور میں تھے۔ تیسری سائیڈ پر مسئلہ کشمیر کے ماہر ڈاکٹر ڈیوڈ ٹیلر (Dr. D. Tailor) اور امریکن انسٹیٹیوٹ آف پیس کے ڈاکٹر ٹموتھی سسک (Timothy Sisk) بھارت میں انسانی حقوق کے علمبردار راوی نیر (Ravi Nair) اور ایمنسٹی انٹرنیشنل کے کچھ اہلکار تھے۔ اور چوتھی طرف یعنی بھارتی سائیڈ پر جارج فرنڈس، فاروق عبداللہ، کے این پنڈت، پروفیسر بھیم سنگھ اور پی این پی (آزاد کشمیر) کے شوکت کشمیری، افضل طاہر اور خالد پرویز تھے۔ شوکت کشمیری اور ساتھیوں کا انڈین بنچ پر ہونا سب کے لئے باعث تعجب تھا اور کانفرنس کے دوران ان کا موقف بھی بھارت نواز تھا۔

کارروائی کا آغاز میزبان اور سوشلسٹ گروپ کے صدر جارج سٹیونسن (George Stevenson) کی طرف سے کانفرنس کے انعقاد کے مقصد سے ہوا۔ اس کے بعد مسٹر ایسووائر

(Eisso Voltjer) اور انیتا پولاک (Anita Pollack) نے خطاب کیا۔ دونوں نے مسئلہ کشمیر کے جمہوری پرامن اور منصفانہ حل پر زور دیا اور امید ظاہر کی کہ یہ کانفرنس اس سلسلے میں ایک اہم سنگ میل ثابت ہوگی۔ اس کے بعد مسئلہ کشمیر کے ماہر اور لندن سکول اور ٹیکل اینڈ افریقین اسٹڈیز کے پروفیسر ڈاکٹر ٹیلر (Dr. David Taylor) نے مسئلہ کشمیر کے پس منظر اور موجودہ صورتحال پر روشنی ڈالی۔ انسانی حقوق کی بھارتی تنظیم کے راوی نیر (Ravi Nair) نے کشمیر میں انسانی حقوق کی پامالی کا تفصیلی نقشہ کھینچا۔ انہوں نے بھارت کے انسانی حقوق کے کمیشن کے طرز عمل پر بھی تنقید کی اور اس صورتحال سے نپٹنے کیلئے ٹھوس تجاویز پیش کیں۔ جارج فرنڈس نے تجویز کیا کہ مسئلہ کشمیر کو معاہدہ شملہ کے تحت اور کشمیریوں کی رائے کے مطابق حل کیا جائے۔ انکے بعد ڈاکٹر فاروق بولے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ مسئلہ کشمیر حل کرانے نہیں بلکہ کشمیر پر بھارت کی وکالت کرنے آئے ہیں۔ انہوں نے زور دیکر کہا میں نہیں چاہتا کہ کشمیر پاکستان کا حصہ بنے یا میں پاکستانی بنوں۔ پروفیسر بھیم سنگھ نے ریاست کی سالمیت کی بحالی کی بات کرنے کے علاوہ جموں کے حقوق کی بھی بات کی۔ پروفیسر کے این پنڈت کی تقریر گو عالمانہ لگ رہی تھی لیکن ہندو فرقہ پرست ذہنیت کی پوری عکاسی کرتی تھی۔ شوکت کشمیری نے حسب روایت مسئلہ کشمیر کی بجائے گلگت بلتستان کی بات کی اور یہ باور کرایا کہ اگر وادی میں بھارت ظلم کر رہا ہے تو گلگت بلتستان میں پاکستان کے مظالم وادی میں ہونے والے بھارتی مظالم سے کسی طرح کم نہیں۔ جسکا بنیادی مقصد پاکستان کو بھارت کی سطح پر لانا تھا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے بیرسٹر افتخار نے تجویز پیش کی کہ کشمیر میں جاری تحریک کو بھارت اور پاکستان دونوں کشمیریوں کی قومی آزادی کی تحریک تسلیم کریں۔ سردار عبدالقیوم خان نے اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق کشمیریوں کے حق خودارادیت پر زور دیا۔

میری تقریر اور فاروق عبداللہ کو جواب

میں نے کشمیریوں کے غیر محدود حق خودارادیت (بشمول حق خودمختاری)، بھارت، پاکستان، کشمیر اور عالمی برادری کے لئے اس کے فوائد کے حصول کے تین متبادل طریقوں پر مشتمل ایک دستاویز کی کاپیاں شرکائے کانفرنس میں تقسیم کرائیں اور دستاویز کے مندرجات کی مختصر سی وضاحت کرنے کے بعد ڈاکٹر فاروق عبداللہ سے مخاطب ہو کر کہا مسٹر فاروق میں بھی نہیں چاہتا کہ آپ پاکستانی بنیں لیکن آپ کشمیر میں بھارتی مفادات کے محافظ کا لبادہ اتار کر کشمیری تو بنیں اور میں سردار عبدالقیوم صاحب سے بھی گزارش کرتا ہوں کہ وہ بھی پاکستانی سے زیادہ کشمیری بنیں۔ اگر ڈاکٹر فاروق، سردار قیوم اور امان اللہ (جو کشمیر کے مستقبل سے متعلق تین معروف نظریوں کی نمائندگی کرتے ہیں) صرف کشمیریوں کے مفاد کے محافظ بن جائیں تو مسئلہ کشمیر آسانی سے حل ہو سکتا ہے۔ میرے اس ریمارک کو وہاں موجود پارلیمنٹ کے ممبروں کے علاوہ انسانی حقوق کے علمبرداروں نے بھی سراہا۔ میرے بعد شبیر چوہدری اور جی ایم میر نے بھی نظریہ خودمختار کشمیر کی حمایت میں دلائل دیئے۔ اس کے بعد سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ شوکت کشمیری کے

ساتھی خالد پرویز نے سردار عبدالقیوم سے سوال کیا ''سردار صاحب آپ آزاد کشمیر کے وزیراعظم ہیں۔ آپ آزاد کشمیر میں جاری ہندوؤں کے قتل عام کو کیوں نہیں روکتے''۔ یاد رہے کہ آزاد کشمیر میں ایک بھی ہندو آباد نہیں چنانچہ وہاں ہندوؤں کے قتل عام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (اس حقیقت سے یورپین پارلیمنٹ والے بے خبر ہیں) لیکن ایسے سوال کرنے والوں کا مقصد تو سامعین کو گمراہ کر کے پاکستان کو بھارت کی سطح پر لانے کی کوشش کے سلسلے میں اپنے فرائض انجام دینا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنا مقصد پورا کرنے کی بھرپور کوشش کر کے اپنے آقاؤں کی آشیر باد حاصل کی۔ دراصل مسئلہ کشمیر کے حل نہ ہونے کے بنیادی عناصر میں وہ لوگ سرفہرست ہیں جو بیرونی آقاؤں کے مفادات کا تحفظ کرنے کے لئے سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ قرار دیتے ہیں۔ خواہ یہ بیرونی آقا بھارت کی شکل میں ہوں یا پاکستان کی۔

فاروق عبداللہ سے تفصیلی بات چیت

کانفرنس کا پہلا دن اختتام پذیر ہوا تو اعلان ہوا کہ سوشلسٹ گروپ کی طرف سے کانفرنس کے شرکاء کے اعزاز میں استقبالیہ ہوگا۔ چنانچہ ہم دوسرے ہال میں چلے گئے۔ موقع غنیمت جان کر میں فاروق عبداللہ کو ہال کے دوسرے کونے تک لے گیا۔ پہلے تو فاروق نے گلہ کیا کہ آپ نے اپنی سوانح عمری ''جہدِ مسلسل'' میں میرے والد (مرحوم شیخ محمد عبداللہ) پر غلط الزامات لگائے ہیں۔ میں نے کہا اگر آپ ایک الزام کو بھی غلط ثابت کریں تو جو چور کی سزا وہ میری۔ اس کے بعد میں نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔ فاروق صاحب اگر آپ کے والد سے کچھ فاش قسم کی غلطیاں سرزد نہ ہوتیں تو وہ یقیناً صحیح معنوں میں بڈشاہ ثانی بن کر امر ہو جاتے لیکن ان سے یہ غلطیاں سرزد ہوئیں جن کا نتیجہ سب کے سامنے ہے۔ اب وقت آیا ہے کہ شیخ محمد عبداللہ کا بیٹا تحریک آزادی میں بھرپور شرکت کر کے اپنے باپ کی ان غلطیوں کا ازالہ کرے۔ فاروق نے کہا میں اسے تحریک آزادی تسلیم ہی نہیں کرتا۔ یہ تو شیر بکرا لڑائی ہے۔ (یاد رہے کہ وادیٔ کشمیر میں 1932ء سے 1947ء سے کئی سال بعد تک شیخ محمد عبداللہ کے حامی شیر اور میر واعظ یوسف شاہ کے حامی بکرا کہلاتے تھے اور ان میں اکثر ٹکر ہوتی رہتی تھی) اپنے استدلال کی وضاحت کرتے ہوئے فاروق عبداللہ نے کہا کہ میرے کزن شیخ رشید کا عملی سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن لٹرم (مشتاق زرگر جو میر واعظ نواز عسکری گروپ العمر کا سربراہ ہے) نے اسے مروا دیا صرف اسلئے کہ وہ شیر اور میرا کزن تھا۔

ہم دونوں باتیں کر رہے تھے کہ سردار عبدالقیوم صاحب نے آدمی بھیج کر ہمیں بلایا۔ دراصل باقی سب لوگ ہال کے دوسرے کونے میں چائے پیتے ہوئے ہمیں گھور رہے تھے کہ انکے مابین راز و نیاز کی کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ انکی طرف جاتے ہوئے میں نے فاروق سے کہا کہ ہمیں پھر ملنا چاہئے اور تفصیل سے بات کرنی چاہیئے۔ فاروق نے اس سے اتفاق کیا۔ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ دوسرے دن میں کسی ساتھی کے ہاں یا کسی مخصوص جگہ پر فاروق کے علاوہ سردار قیوم صاحب کو بھی بلاؤں گا تاکہ تینوں کی کوئی نتیجہ خیز سنجیدہ بات ہو سکے لیکن بعد کے حالات نے میرے اس پروگرام پر پانی پھیر دیا۔

میری گرفتاری

اسی دوران پتہ چلا کہ کانفرنس کے شرکاء کو یورپین پارلیمنٹ کے سپیکر نے رات کے کھانے پر مدعو کیا ہے سردار صاحب نے کہا کہ کانفرنس کے پاکستان اور آزاد کشمیر سے تعلق رکھنے والے مندوبین کو یورپین یونین کیلئے پاکستان کے سفیر رفعت مہدی صاحب نے بھی رات کے کھانے پر مدعو کیا ہے۔ میں نے سردار صاحب سے کہا آپ پاکستان کے سفیر کے ہاں جائیں اور میں اور دوسرے کچھ ساتھی یورپین پارلیمنٹ کے سپیکر کے ڈنر میں شرکت کرینگے۔ مسز انیتا پولاک (Anita Pollock) نے مجھے اور شبیر چوہدری کو ڈنر کی جگہ تک پہنچانے کیلئے سوشلسٹ گروپ کے صدر مسٹر سٹیونسن (Mr. Stevenson) کی گاڑی میں بٹھا دیا۔ میں راستے میں مسٹر سٹیونسن سے اپنے برطانوی ممبران پارلیمنٹ دوستوں کے بارے میں پوچھتا رہا اور وہ خاصے مزاحیہ انداز میں میرے ان دوستوں کے بارے میں بتاتے رہے۔ اسی دوران ایک جگہ سرخ بتی پر ہماری گاڑی رک گئی تو کئی گاڑیوں نے ہماری گاڑی کو گھیرے میں لے لیا اور ان گاڑیوں میں سے سول کپڑوں میں ملبوس انتہائی خطرناک ڈاکو دکھائی دینے والے لوگ نکلے اور ہم سے پوچھنے لگے آپ لوگوں میں سے امان اللہ خان کون ہے۔ میں نے کہا میں ہوں۔ انہوں نے مجھے باہر آنے کے لئے کہا۔ میں باہر آیا تو انہوں نے مجھے چوزے کی طرح اٹھا کر اپنی گاڑی میں ڈال دیا اور یہ جا وہ جا۔ مسٹر سٹیونسن اور شبیر چوہدری چیختے رہے۔ مجھے گاڑی میں ڈال کر لے جانے والے سول کپڑوں میں انتہائی ڈراؤنی شکل کے لوگ تھے اور انہوں نے مجھے گاڑی میں سینڈوچ بنا رکھا تھا اور گاڑی انتہائی تیز بھاگ رہی تھی۔ میں سمجھا یہ مجھے مار ڈالنے کے لئے بھارت کی طرف سے کرائے کے قاتل ہیں۔ اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں طرح طرح کے سوال اٹھتے رہے۔ بہرحال آخر کوئی آدھ گھنٹے کے بعد ایک جگہ گاڑی رکی اور ایک شٹر اوپر اٹھ گیا اور سامنے پولیس وردی میں ایک آدمی نظر آیا تب مجھے یقین آیا کہ میں اغوا نہیں گرفتار ہوا ہوں اور یہ بھی پتہ چلا کہ مجھے انٹرپول نے گرفتار کیا ہے۔ رات بارہ بجے کے قریب پاکستان کے سفیر رفعت مہدی صاحب تھانے آئے اور میری گرفتاری پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہم آپ کے لئے وکیل کا انتظام کر رہے ہیں۔ دوسرے دن مجھے عدالت سے ریمانڈ حاصل کرنے کے بعد فارسٹ جیل بھیج دیا گیا۔ جیل کیا تھا ایک فور سٹار ہوٹل تھا جہاں کوٹھڑی میں ٹی وی سے لیکر فون تک ہر چیز میسر تھی۔ سات قسم کے کھانوں میں سے کوئی سے چار کھانے منتخب کرنے ہوتے تھے (یہ اور بات ہے کہ میں ایک دن بھوکا رہا اور بعد میں بریڈ کے ساتھ صرف ابلی ہوئی سبزی کھاتا رہا کیونکہ دوسرے کھانوں میں سور کا گوشت ہوتا یا وہ کھانے سور کی چربی میں پکے ہوتے تھے)۔

دوسرے دن بہت سے وکیل مجھ سے ملنے آئے اور میں نے ان میں سے ایک مسٹر Pascal VanderVeeren کو منتخب کیا۔ اگلے دن وکیل صاحب آئے اور مجھے خوشخبری سنانے لگے کہ میں نے آپ کی ضمانت کی درخواست تیار کی ہے۔ منظوری کے امکانات خاصے روشن ہیں۔ میں نے انتہائی

Amanullah talks to 'The Muslim'

No normalisation with India at cost of Kashmir

برطانیہ کا امان اللہ کے داخلے پر پابندی اٹھانے سے انکار

ملک میں امان اللہ کی موجودگی تو بھی سلامتی کے منافی ہے، وزیر داخلہ کا لارڈ ایوبری کے نام خط

برطانوی عدالت میں امان اللہ خان کے خلاف مقدمے کی سماعت شروع ہو گئی

اس ایکٹ کی رو سے ممتاز قانون دانوں کی نظر میں امان اللہ کا قانونی دفاع کمزور ہے

بھارت کے ساتھ تعلقات معمول پر لانے کیلئے مسئلہ کشمیر کا حل ناگزیر ہے

عدالت کے باہر ہزاروں پاکستانیوں اور کشمیریوں کا مظاہرہ، مظاہرین کی گاڑیوں کا جلوس

وکلاء صفائی کے دلائل کل عدالت دو ہفتے کیلئے اٹھ گئی

امان اللہ کو قید تنہائی میں رکھنے پر برطانوی پارلیمنٹ کا بھی احتجاج

بیرسٹر امجد ملک کی کشمیریوں کی قربانیوں سے زیادہ اہم نہیں، امان اللہ

نیل میں ہمارے ساتھ کیا جانے والا سلوک کشمیریوں کی قربانیوں سے زیادہ اہم نہیں، امان اللہ

Amanullah foresees 'third option' as Kashmir's solution

THE NEWS Sunday October 29, 1989

The Daily جنگ کی خصوصی تصاویر Jang London



جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کے چیئرمین امان اللہ خان سخت حفاظتی اقدامات میں اپنے خلاف بھارتی وارنٹ کی سماعت کے لئے برسلز کی اپیل کورٹ جا رہے ہیں

5 Oct. 1993



امان اللہ خان کے وکلاء بیرسٹر التجار احمد، پاسکل وندروین اور ایس ایم ظفر مقدمہ کی سماعت سے قبل مشورہ کر رہے ہیں۔



بیرسٹر افتخار احمد اور ایس ایم ظفر دوسرے وکلاء کے ہمراہ کمرہ عدالت سے باہر جا رہے ہیں

غصے میں اسے کہا آپ کو ضمانت کی درخواست دینے کی اجازت کس نے دی جو آپ نے درخواست تیار کی۔ اس نے حیران ہو کر پوچھا تو کیا آپ ضمانت پر رہا ہونا نہیں چاہتے؟ میں نے کہا ہرگز نہیں۔ میری گرفتاری اور اسیری کی وجہ سے میری تحریک آزادی عالمی سطح پر اجاگر ہو رہی ہے (میری گرفتاری کو یورپ کے میڈیا نے خاصی کوریج دی تھی اور کچھ اخبارات نے اداریئے بھی لکھے تھے جن میں بھارت اور جنیم کی حکومتوں کی مذمت کی گئی تھی) ان حالات میں مجھے طویل اسیری بھی قبول ہے۔ وکیل صاحب منہ کھولے حیرانگی سے میری طرف دیکھتے رہے۔ انہیں شک ہو رہا تھا کہ شاید میرا ذہنی توازن ٹھیک نہیں کیونکہ جدید خاص کر مغربی یورپ میں تحریک آزادی نام کی کسی چیز کے لئے اسیری برداشت کرنے کا تصور ہی نہیں۔ وکیل صاحب نے کئی بار سوال کیا۔ کیا واقعی آپ سنجیدگی سے بات کر رہے ہیں؟ میرے مثبت جواب پر کچھ بڑبڑاتے رہے اور آخر میں کہنے لگے کہ مجھے یقین نہیں آتا کہ آج بیسویں صدی کے اواخر میں بھی لوگ آزادی اور اصولوں کیلئے قید و بند کی صعوبتیں جھیلنے کیلئے رضا کارانہ طور پر تیار ہو جاتے ہیں۔ بہرحال میں نے اسے ضمانت کی درخواست دینے سے منع کر دیا۔ میرے وکیل صاحب نے اس عجیب معاملے کا ذکر دوسرے وکلاء سے کیا۔ چنانچہ تیسرے دن بہت سے وکیل مجھ سے ملنے آئے۔ میں نے انہیں مسئلہ کشمیر اور اپنے جیل آنے کی وجہ سمجھائی۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت (بھارت) اپنی وہ آزادی جسکا ان سے وعدہ کیا گیا تھا مانگنے والوں کے ساتھ یہ سلوک بھی کر سکتی ہے۔ میں نے انہیں حالات و واقعات کی مثالیں دیکر یقین دلایا۔ دو دن بعد مسٹر سٹیونسن اور انیتا پولاک ملنے آئے اور میری گرفتاری پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کشمیر کانفرنس کے دوسرے سیشن کی کارروائی زیادہ تر آپ ہی سے متعلق تھی۔ ہم نے ایک قرارداد کے ذریعہ آپ کی گرفتاری کی مذمت کرتے ہوئے آپ کی فوری رہائی کا مطالبہ کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ قرارداد پر آزاد کشمیر اور پاکستان سے تعلق رکھنے والے اصحاب کے علاوہ جارج فرنڈس، ڈاکٹر فاروق عبداللہ اور پروفیسر بھیم سنگھ اور یورپین پارلیمنٹ کے ممبروں کے بھی دستخط ہیں۔ قرارداد کی تجویز بھارت کے جارج فرنڈس نے دی اور اس کی تائید پاکستان کے بیرسٹر افتخار نے کی۔ انہوں نے قرارداد کی ایک کاپی بھی مجھے دیدی۔

ایشیائی طرز کے جیل میں منتقلی اور سگریٹ نوشی کو طلاق

کوئی ڈیڑھ ماہ بعد مجھے فارسٹ جیل سے ایک اور جیل St. Gilles میں منتقل کیا گیا۔ یہ جیل جنوبی ایشیا کی جیلوں سے بھی گئی گزری تھی۔ میں تقریباً چالیس سال سے چین سموکر (کثرت سے سگریٹ پیتا) تھا۔ میرے پیسے پہلی جیل سے دوسری جیل منتقل نہیں ہوئے تھے۔ میرے پاس تھوڑا سا تمباکو تھا اور سگریٹ بنانے کے کچھ کاغذ، ماچس بھی نہیں تھی۔ مجھے جس کوٹھڑی میں ڈالا گیا تھا اس میں ایک کونے میں گندا سا کموڈ تھا اور اس کے ساتھ ہی پیشاب کیلئے بالٹی۔ دونوں سے بدبو آ رہی تھی۔ کوٹھڑی میں ایک سانولا سا نوجوان بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے انگریزی میں اسکا نام پوچھا اسکی سمجھ میں کچھ نہیں آیا لیکن اسکے

لہجے سے معلوم ہوا کہ صحارائی عرب ہے میں نے اسم (نام) پوچھا تو کہنے لگا محمد۔ میں نے اشاروں میں کہا میں بھی مسلمان ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے سگریٹ پینے کی خواہش ہوئی کیونکہ محمد سگریٹ پینے لگا تھا۔ میں نے دیسی سگریٹ بنا کر اس سے ماچس مانگی تو اس نے منہ سا بنایا۔ بہر حال ایک تیلی مجھے بادل ناخواستہ دے ہی دی۔ تھوڑی دیر بعد دوپہر کا کھانا آیا۔ دونوں کی پلیٹوں میں سور کے گوشت کی خاصی مقدار تھی۔ میں نے اپنی پلیٹ کونے میں رکھ لی اور یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ محمد کھانا مزے سے کھا رہا ہے۔ میں نے ٹوٹی پھوٹی عربی میں کہا ''محمد ! ہذا لحم الخنزیر'' ! محمد نے کندھے اچکتے ہوئے کوئی بات کی جو میری سمجھ میں تو نہیں آئی لیکن معلوم ہوا جیسے کہہ رہا ہو کیا فرق پڑتا ہے، سارا یورپ کھا رہا ہے۔ بہر حال وہ مزے سے کھانا کھاتا رہا۔ آخر میں مجھ سے کچھ طنزیہ انداز میں اشاروں میں پوچھنے لگا تم کھانا نہیں کھاؤ گے۔ میں نے نفی میں جواب دیا تو اشاروں سے ہی پوچھنے لگا میں تمہارے حصے کا تھوڑا سا گوشت کھاؤں۔ میں نے کسی قدر غصے سے کہا سارا کھالو اور اس نے میرے حصے کا آدھا گوشت بھی چٹ کر لیا۔ ادھر میری طبیعت خراب ہوگئی معلوم ہوتا تھا الٹی آجائے گی چنانچہ الٹی سے بچنے کیلئے میں نے سگریٹ بنایا اور اس سے ماچس مانگی تو کہنے لگا میرے پاس تیلیاں کم ہیں میں نہیں دے سکتا۔ گو یہ ساری باتیں اشاروں میں ہی ہو رہی تھیں لیکن اسکے اشاروں میں بھی خاصی کرختگی تھی۔ گوشت والے معاملے میں ہونے والی کوفت میں اسکی اس کرختگی کے اضافے کے نتیجے میں میری انا، خودداری، میرا ضمیر اور میرے اندر کا مسلمان مجھ سے پوچھنے لگا امان اللہ کیا تم سگریٹ کا نشہ پورا کرنے کیلئے اس شخص سے ماچس مانگتے رہو گے؟ (مجھے بتایا گیا تھا کہ پہلے جیل میں جمع میری رقم یہاں ایک ہفتہ بعد پہنچے گی) کیا تم سگریٹ نوشی کے اتنے غلام ہو کہ اس کیلئے ایک ہفتے تک اپنی شخصیت کے اتنے اہم حصوں (انا، خودداری، ضمیر اور اسلامی تشخص) کی دھجیاں اڑاتے رہو گے؟ اور اچانک میرا فیصلہ آیا۔ نہیں نہیں ایسا نہیں ہوگا اور چالیس سال تک اوسطاً چالیس سگریٹ روزانہ پینے والے امان اللہ نے اپنی انا، خودداری، ضمیر اور اسلامی تشخص کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اس لعنت سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا حاصل کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنا باقی ماندہ تمباکو اور سگریٹ بنانے کا کاغذ ''محمد'' کے حوالے کر دیا اور سگریٹ نوشی کو طلاق دیدی۔ آج گیارہ سال بعد جب میں سوچتا ہوں کہ میں نے کتنا مشکل کام کتنی آسانی سے کر دیا تھا تو انتہائی خوشگوار حیرت ہوتی ہے واقعی ''محمد'' میرے لئے خیر مستور (A Blessing in disguise) ثابت ہوا اور یہ کہ مضبوط قوت ارادی انسان سے معجزے کرواتی ہے۔

انگریز لیڈی ڈاکٹر

دوسرے دن ایک نوجوان خوبصورت لیڈی ڈاکٹر راؤنڈ پر آ گئی۔ معلوم ہوا کہ انگریز ہے اور نام بھی ڈاکٹر مس ہیلی (Dr. Miss Healey) ہے۔ میں نے انگریزی میں بات کرتے ہوئے جب اسے بتایا کہ میں برطانیہ میں دس سال رہا ہوں اور میرا آپریشن کرنے والے ڈاکٹر کا نام بھی ہیلی تھا تو وہ بہت خوش ہوئی۔ کہنے لگی ''یہاں سب فرانسیسی یا بیلجین زبان بولتے ہیں مجھے کوئی انگریزی بولنے والا ملے تو

خوشی ہوتی ہے۔ دراصل زبان انسانی تعلقات میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ میں نے اس سے کہا مہربانی کر کے مجھے بھی کسی ایسی کوٹھڑی میں منتقل کراؤ جہاں کوئی انگریزی بولنے والا ہو اور ساتھ ہی دوسری جیل سے میرے پیسے جلدی منتقل کراؤ کیونکہ میں مسلمان ہوں، سور کا گوشت اور سور کی چربی میں پکا کھانا نہیں کھا تا کل دوپہر سے بھوکا ہوں۔ بہر حال ڈاکٹر ہیلی نے مجھے دوسرے دن ہی دوسری کوٹھڑی میں منتقل کرایا جہاں سپین کا ایک مشہور سمگلر قید تھا۔ وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی جانتا تھا۔

میرے بائیں جبڑے کے باہر اور دائیں کان کے پیچھے وقفے وقفے سے پھوڑے ظاہر ہو جاتے تھے انکی ابتداء برطانیہ میں میرے قیام کے وقت ہی ہوئی تھی وہاں انکا علاج نہیں ہو سکا تھا اور پاکستان میں بھی نہیں ہوا۔ کبھی کبھی ان سے پانی اور خون نکلنے لگتا۔ جس سے مجھے تکلیف ہوتی اور شرمندگی بھی۔

ایک اور مصیبت سے نجات

ایک دن ڈاکٹر ہیلی (Dr. Healey) اپنی ڈیوٹی ختم کر کے گپ شپ کے لئے میری کوٹھڑی میں آئی تو میں نے باتوں باتوں میں اسے کہا میں تمہیں تب ایک اچھی انگریز ڈاکٹر تسلیم کروں گا جب تم مجھے میرے ان دانوں سے مستقل طور پر نجات دلاؤ گی۔ اس نے میرے چہرے کا معائنہ کرنے کے بعد کہا کوشش کروں گی۔ دوسرے یا تیسرے دن ایک ٹیوب لے آئی اور کہنے لگی اسے ہر دس دن کے بعد لگائیں۔ چند ماہ میں پھوڑے ہمیشہ کیلئے ختم ہو جائیں گے اور ایسا ہی ہوا۔ اور مجھے اس عذاب سے ہمیشہ کیلئے نجات ملی۔ مجھے دوائی دینے کے چند دن بعد سے ڈاکٹر ہیلی پھر دکھائی نہیں دی۔ غالباً جیل ڈیوٹی ختم ہو گئی تھی۔ میں زندگی میں پانچ انگریز خواتین کا انتہائی مشکور ہوں جنہوں نے مختلف طریقوں سے میری بڑی مدد کی۔ یہ خواتین لیسٹر جیل کی ڈاکٹر پینٹا (Dr. Penta)، برطانیہ میں میری وکیل مس لوئس کرسچین (Miss Luis Christian)، گرابی روڈ ہسپتال کی ڈاکٹر (نام یاد نہیں رہا)، برکسٹن جیل کی گورنر مس کنگسلے (Miss Kingsley) اور برسلز جیل کی ڈاکٹر ہیلی (Dr. Miss Healey) ہیں۔

میری گرفتاری کے خلاف آزاد کشمیر، پاکستان اور یورپ میں شدید مظاہرے ہوئے۔ 26 اکتوبر 1993ء کو اسلام آباد کے مظاہرے میں آزاد کشمیر اور پاکستان کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے ہزاروں افراد نے مظاہرہ کیا۔ پولیس کی طرف سے لاٹھی چارج اور آنسو گیس کے استعمال کے نتیجے میں کئی افراد بشمول خواتین زخمی ہوئے۔ ڈاکٹر حیدر حجازی، سردار انور، سردار اظہر، محمد شفیق، جان محمد مجاہد، شکیل مجاہد اور لاہور میں زیر تعلیم لیپہ کے تین نوجوان گرفتار ہوئے اور گیارہ دن جیل میں رہے۔ برسلز میں بھی دو بار زبردست مظاہرے ہوئے۔ برطانیہ والے بھی پیچھے نہیں رہے۔ کراچی میں بھی آزاد کشمیر والوں اور گلگت بلتستان والوں کی طرف سے الگ الگ مظاہرے ہوئے۔ کراچی میں میرے عزیز اسلم عبداللہ اور ایک پختون لیڈر عبدالعزیز خلجی نے ''امان اللہ خان کو رہا کرو کمیٹی'' بنائی تھی۔

میری گرفتاری کے کوئی ڈیڑھ ماہ بعد عدالت میں میرے کیس کی سماعت شروع ہوئی۔ بھارت

والے منوں وزن کی دستاویزات لائے جن میں میرے کشمیر میں دہشت گردی میں ملوث ہونے سے متعلق ''دستاویزی ثبوت'' تھے۔ خود میں نے 16 دسمبر 1993ء کو عدالت میں اپنا تحریری بیان داخل کیا جس میں مسئلہ کشمیر کی اصل نوعیت، اس پر بھارت کا بے بنیاد موقف، مجھ پر لگائے جانے والے الزامات کا مقصد اور ان الزامات کی اصل حقیقت تفصیلاً درج تھے۔ (میرے اس بیان کو بعد میں میری پارٹی نے پمفلٹ کی شکل میں ''ظالم بنام مظلوم' کے عنوان سے انگریزی اور اردو میں شائع کیا) میرے تینوں وکیلوں نے میرا کیس انتہائی ماہرانہ طریقے سے پیش کیا۔ (بیلجین وکیل کے علاوہ میرا دفاع پاکستان پیپلز پارٹی کے بیرسٹر افتخار اور پاکستان کے صف اول کے وکیل ایس ایم ظفر دونوں بغیر فیس کے کر رہے تھے) جج صاحبان بھی ان سے خاصے متاثر اور بھارتی اہلکاروں سے خاصے نالاں نظر آئے تھے۔ خاص کر اس لئے کہ انہوں نے مجھے بھارت کا شہری اور میری جائے پیدائش گلگت کو بھارت کا حصہ قرار دیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ بھارتی پولیس نے مجھ پر الزامات لگائے تھے کہ میں نے اکتوبر 1989ء میں شوکت بخشی کو مظفر آباد میں ہدایات دی تھیں کہ وہ بھارتی مقبوضہ کشمیر میں دہشت گردی کی کارروائیاں کرے جبکہ میرا پاسپورٹ بتا رہا تھا کہ میں نے اکتوبر نومبر 1989ء کے مہینے امریکہ میں گزارے تھے۔ کیس کی سماعت کے آخری دن برطانیہ اور یورپ کے دوسرے ملکوں میں مقیم سینکڑوں کشمیریوں نے جن کی اکثریت ہمارے ممبروں کی تھی ایک زبردست مظاہرہ کیا۔ 26 دسمبر 1993ء کو مجھے جیل کے حکام نے تحریری اطلاع دی کہ بیلجیئم کی حکومت نے مجھے بھارت کے حوالے کرنے کی بھارتی درخواست مسترد کر دی ہے۔ خود مجھے پوری امید تھی کہ ایسا ہی ہوگا کیونکہ میرے خلاف بھارتی الزامات لغویات کا پلندہ تھے۔ میرے وکیلوں کے دلائل بھی بہت وزنی اور ماہرانہ تھے۔ اس کے علاوہ آزاد کشمیر کے وزیراعظم سردار عبدالقیوم خان نے بھی بیلجیئم کی عدالت کو ایک خط میں میرے خلاف دہشت گردی کے الزامات کو بے بنیاد قرار دیا تھا۔ میرا اپنا بیان بھی خاصا وزنی تھا۔

میری رہائی اور جبری بیلجیئم بدری

27 دسمبر کی شام کو مجھے شک ہوا کہ مجھے شاید ایک یا دو دن میں رہا کیا جائے گا۔ میں نے دوسرے دن اپنے بیلجین وکیل سے اپنے اندازے کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا آپ کی رہائی میں ابھی مہینہ بھر لگ سکتا ہے۔ بہرحال میں اپنے موقف پر قائم رہا۔ دوسرے دن یعنی 29 دسمبر کو صبح پانچ بجے جیل حکام نے مجھے میری کوٹھڑی سے نکالا اور دفتری کارروائی کے بعد مجھے میری مرضی کے خلاف ایئرپورٹ پہنچا دیا۔ میرا مطالبہ تھا کہ مجھے اپنے وکیل اور پاکستانی سفیر سے ملاقات کرائی جائے لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ برسلز سے مجھے پولیس کی نگرانی میں ترکی پہنچایا گیا جہاں سے میں نے فون پر برطانیہ کے ساتھیوں سے رابطہ کرنے کے علاوہ رائٹرز نیوز ایجنسی کو انٹرویو بھی دیا۔ وہاں کئی گھنٹے انتظار کرنے کے بعد رات اڑھائی بجے کراچی ایئرپورٹ پہنچا جہاں میرے سینکڑوں ساتھی اور عزیز میرے منتظر تھے۔

بدلا ہوا امان اللہ

اس طرح مجھے دبوچ لینے کی بھارت کی ایک اور کوشش ناکام ہوگئی اور میں سگریٹ نوشی کی لعنت اور چہرے پر بار بار نمودار ہونے والے انتہائی تکلیف دہ پھوڑوں سے بھی نجات حاصل کرنے کے علاوہ مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادئ کشمیر کو عالمی سطح پر وسیع پبلسٹی ملنے کا باعث بننے اور تقریباً اڑھائی ماہ قید رہنے کے بعد واپس پاکستان پہنچ گیا۔ اڑھائی ماہ کی اس اسیری اور اس دوران پیش آنے والے واقعات نے اپنے نظریئے کی سچائی پر میرے یقین، اخلاقی قدروں کے بارے میں میرے عقیدے، خلوص کی طاقت اور قوت فیصلہ کے کرشموں کے بارے میں میرے اندازوں کو ناقابل یقین تقویت بخشی تھی۔ یہی نہیں بلکہ میری یہ سوچ بھی یقین میں بدل گئی کہ انسان اپنا فرض خلوص اور جذبہ قربانی کے ساتھ ادا کرے تو عام طور پر اسکے نتائج انسان کی بہترین توقعات سے بھی زیادہ فائدہ مند نکلتے ہیں۔ چنانچہ واپسی پر میں خاصا بدلا ہوا امان اللہ تھا۔

حصہ ہفتم

کشمیریوں کو ابھی تک آزادی کیوں نہیں ملی

اسباب

1- بھات کا طرزِ عمل
2- پاکستان کا طرزِ عمل
3- عالمی برادری کا طرزِ عمل
4- کشمیری قیادت کا کردار

کشمیریوں کو ابھی تک آزادی کیوں نہیں ملی؟

ایک حساس اور محبِّ وطن کشمیری کو یہ تلخ حقیقت کہ گذشتہ 57 سال کے دوران جہاں دنیا کی ایک سو چالیس محکوم قومیں آزادی سے ہمکنار ہو گئیں وہاں کشمیری ان آزاد شدہ قوموں میں سے اکثر قوموں کی نسبت کہیں زیادہ قربانیاں دینے کے باوجود ابھی تک بقول اقبالؒ ''محکوم و مجبور و اسیر'' ہیں، انتہائی ذہنی اذیت میں مبتلا کر دیتی ہے

اسباب

ریاست جموں کشمیر کے ڈیڑھ کروڑ باشندے نظریاتی طور پر چار حصوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک وہ جو پوری ریاست کے پاکستان سے الحاق کو آزادی تصور کرتے ہیں، دوسرے وہ جو ریاست کے بھارت سے الحاق کو آزادی سمجھتے ہیں، تیسرے وہ جو آزادی (خود مختاری) کو ہی آزادی سمجھتے ہیں اور کچھ ریاست کی کسی نہ کسی قسم کی تقسیم کو مسئلے کا حل سمجھتے ہیں۔ لیکن ابھی تک آزادی ان چار حلقوں میں سے کسی کو بھی نہیں ملی۔ میں اس موضوع پر گھنٹوں سوچتا رہا ہوں اور میں نے اس انتہائی تکلیف دہ حقیقت کے مختلف پہلوؤں پر بہت کچھ لکھا اور کہا بھی ہے۔ بہر حال قانون قدرت کے اس عجیب پہلو یعنی ''کسی کا ایک آنسو بھی ثُریا کو رُلاتا ہے۔ کسی کا عمر بھر رونا یونہی برباد جاتا ہے'' کے باوجود میری نظر میں کشمیریوں کے اب تک آزادی حاصل نہ کر سکنے کی چار بنیادی وجوہات ہیں (1) کشمیر کے بارے میں بھارت کا نو آبادیاتی اور سفاکانہ طرزِ عمل۔ (2) پاکستان کی خود غرضی، تنگ نظری اور اسکی کشمیر پالیسی میں عدم استقلال۔ (3) مسئلہ کشمیر کے بارے میں عالمی برادری کا خود غرضانہ، غیر منصفانہ اور غیر ذمہ دارانہ طرزِ عمل اور (4) کشمیری قیادت کی مہلک کمزوریاں۔ آیئے ان چاروں پر ایک تفصیلی نظر ڈالیں۔

1- بھارت کا مکر و فریب اور سفاکانہ طرزِ عمل

اگرچہ بھارت دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت اور انسانی حقوق کا علمبردار ہونے کا دعویٰ کرتا ہے لیکن جتنا غیر جمہوری اور غیر انسانی طرزِ عمل اس نے کشمیریوں کے ساتھ اختیار کیا ہے ایسا طرزِ عمل انگریزوں نے بھی ہندوستانیوں کے ساتھ اختیار نہیں کیا تھا۔ بیسویں صدی کے عظیم مفکر، انسان دوست اور حقوق انسانی کے عظیم علمبردار ارل برٹرنڈ رسل (Earl Bertrand Russel) نے اپنی شہرہ آفاق کتاب New Hopes for a Changing World (ایک بدلتی دنیا کیلئے نئی امیدیں)

میں بھارت کی خاصی تعریف کرنے کے بعد صفحہ 145-6 پر لکھا ہے کہ بھارت کی ان خوبیوں کے باوجود جب اسکی کشمیر پالیسی پر نظر پڑتی ہے تو بھارت کی عظمت اچانک زمین بوس ہوتی نظر آتی ہے۔ آیئے برٹرنڈ رسل کے اس ریمارک کا مشاہدہ کشمیر کے بارے میں بھارت کے طرزِ عمل کی روشنی میں کریں کیونکہ اسکا طرزِ عمل بھی کشمیریوں اور انکی آزادی کے درمیان ایک بڑی رکاوٹ بنا ہوا ہے۔

(ا) کشمیر پر بھارت کا بے بنیاد دعویٰ ملکیت

اس بات میں کوئی شک نہیں اور حقیقت پسند بھارتی بھی اسے، خاموشی سے ہی سہی، تسلیم کرتے ہیں کہ ریاست کشمیر پر بھارت کا دعویٰ ملکیت آئینی، جمہوری اور اخلاقی لحاظ سے انتہائی کمزور ہے۔ آئینی طور پر اسلئے کہ بھارت مہاراجہ کشمیر کی طرف سے ریاست کے بھارت کے ساتھ جس الحاق کو اپنے دعوے کی بنیاد جتاتا ہے اسے خود بھارت نے مہاراجہ کے نام بھارت کے گورنر جنرل کے 27 اکتوبر 1947ء کے خط کے مطابق مشروط طور پر قبول کیا تھا اور وہ شرط یعنی الحاق کی کشمیری عوام کی طرف سے رضا کارانہ اور آزادانہ طور پر توثیق، بھارت نے آج تک پوری نہیں کی اور اس سے بھی اہم بات یہ کہ بھارت اپنے اس دعوے (یعنی ریاست جموں کشمیر بھارت کا آئینی حصہ ہونے) سے عملاً اس وقت کلی طور پر دستبردار ہو گیا تھا جب اس نے اقوام متحدہ کی ان قراردادوں پر دستخط کر لئے جن کے تحت ریاست جموں کشمیر کی آئندہ آئینی حیثیت کا تعین وہاں اقوام متحدہ کے زیر اہتمام ہونے والی رائے شماری کے ذریعہ کیا جانا تھا۔ ان قراردادوں پر دستخط کر کے بھارت نے عملاً یہ اعلان کیا تھا کہ ریاست جموں کشمیر اس کا آئینی حصہ نہیں کیونکہ کوئی بھی ملک اپنے ہی آئینی حصے کے مستقبل کے بارے میں عالمی برادری کے زیر اہتمام رائے شماری کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔

بھارت کا کشمیر پر دعویٰ ملکیت اخلاقی اور جمہوری قدروں کے تحت اسلئے انتہائی کمزور ہے کہ ریاستی باشندوں کی بھاری اکثریت بھارت کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی اور اس حقیقت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ بھارت کشمیر میں رائے شماری کے بارے میں پہلے ٹال مٹول کرتا رہا اور اب انکار کر رہا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ رائے شماری میں کشمیری عوام کی بھاری اکثریت اسکے خلاف ووٹ دیگی۔

(ب) پس پردہ سازشیں:

انڈین نیشنل کانگریس کی نظریں برصغیر کی تقسیم سے قبل ہی کشمیر پر لگی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک طرف جموں کشمیر نیشنل کانفرنس کی قیادت خاص کر شیخ محمد عبداللہ کو ریاست کی مکمل خودمختاری کا لالچ دیکر اپنا حامی بنالیا تھا اور دوسری طرف ریاست کو بھارت کا حصہ بنانے کے لئے پس پردہ سازشوں میں مصروف تھی۔ مہاتما گاندھی نے جولائی 1947ء کے اواخر میں اپنے ''غیر سیاسی'' دورہء کشمیر کے دوران مہاراجہ کو ریاست کی مکمل خودمختاری کے کٹر حامی مقامی وزیر اعظم پنڈت رام چندر کاک کو اس کے عہدے سے ہٹانے

پر آمادہ کیا چنانچہ بھارت کے خودمختار مملکت کی حیثیت سے وجود میں آنے سے صرف چار دن پہلے یعنی 11 اگست 1947ء کو رام چند کاک کو وزارت عظمیٰ سے ہٹا کر اسکی جگہ پہلے جموں کے جنرل جنک سنگھ کو اور بعد میں مہر چند مہاجن کو ریاست کا وزیراعظم مقرر کیا گیا۔ مہر چند مہاجن وہی ذات شریف تھے جنہوں نے باؤنڈری کمیشن کے ممبر کی حیثیت سے پنجاب کے گرداسپور ضلع کی دو مسلم اکثریتی تحصیلوں کو پاکستان کی بجائے بھارت کا حصہ بنا کر بھارت اور کشمیر کے درمیان سڑک کے ذریعہ رابطہ پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ ریاست جموں کشمیر کا وزیراعظم مقرر ہونے کے بعد، جس میں مہاتما گاندھی، سردار پٹیل نائب وزیراعظم بھارت اور ریاستوں سے متعلق مرکزی سیکرٹری وی پی مینن کا خاصا ہاتھ تھا، مہاجن نے کشمیر پر بھارت کی گرفت مضبوط کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ بھارت کی حکومت ریاستی حکومت کے ساتھ جوں کا توں معاہدہ (Standstill Agreement) پر دستخط کرنے میں بھی ٹال مٹول کرتی رہی کیونکہ اس پر دستخط کرنے سے ایک طرف بھارتی حکومت بہت سے معاملات میں پابند ہو جاتی تھی اور دوسری طرف ایسا کرنا ریاست جموں کشمیر کی خودمختار حیثیت کو تسلیم کرنے کے مترادف ہوتا۔ بھارت کے برعکس پاکستان نے جوں کا توں معاہدے پر دستخط کئے تھے۔

(ج) الحاق کا ڈرامہ :

وسط اگست سے اوائل اکتوبر 1947ء تک بھارتی لیڈروں اور کشمیر گورنمنٹ کے مابین پس پردہ مذاکرات اور سازشیں جاری رہیں۔ 22 اکتوبر کو پاکستان کے قبائلی علاقوں کے لشکر مظفر آباد کے راستے ریاست میں داخل ہو گئے اور دو دن کے اندر اندر سرینگر کے دروازے پر دستک دینے لگے۔ انہوں نے راستے میں لوٹ مار کی۔ غیر مسلموں یہاں تک کہ بارہمولہ کے عیسائی ہسپتال کی نرسوں تک کو قتل کیا۔ اسی دوران مہاراجہ دارالحکومت سرینگر سے بمعہ اہل خانہ جموں روانہ ہو گیا۔ روانگی سے پہلے اس نے پاکستان سے احتجاج کیا اور بھارت سے مدد مانگی تاکہ وہ ان قبائل کو کشمیر سے باہر نکال دے۔ بھارتی حکومت نے جواب دیا کہ بھارتی مدد کیلئے کشمیر کا بھارت سے الحاق کرنا ضروری ہے چنانچہ وی پی مینن نے مبینہ طور پر 26 اکتوبر کو جموں پہنچ کر مہاراجہ کو ریاست کے بھارت سے الحاق کی دستاویز پیش کی جس پر مہاراجہ نے بحالت مجبوری (Under Duress) دستخط کئے۔ ایک مغربی قلمکار الیسٹر لیمب نے اپنی کتاب (Birth of a Tragedy page96) میں واقعات اور حقائق کی بنیاد پر دعویٰ کیا ہے کہ 26 اکتوبر کو مہاراجہ کشمیر سے دستاویز الحاق پر دستخط لینا عملاً ناممکن تھا اسلئے الحاق پر مہاراجہ کے دستخط 26 اکتوبر کو نہیں بعد میں ہوئے ہیں اور اب یہ بات تو ناقابل تردید حد تک ثابت ہو چکی ہے کہ ریاست کے بھارت سے الحاق کی دستاویز پر مہاراجہ کے دستخط سے پہلے بھارتی فوج ہوائی جہاز سے سرینگر میں اتر چکی تھی۔ بہرحال ریاست کے بھارت سے الحاق کی درخواست بھارت کے گورنر جنرل لارڈ مونٹ بیٹن نے اس شرط پر منظور کر لی کہ الحاق کا حتمی فیصلہ کشمیری عوام کریں گے اور یہ شرط ابھی تک پوری نہیں ہوئی۔ یہ

حقیقت بھی ایک معمہ ہے کہ بھارت نے مہاراجہ کشمیر کی دستاویز الحاق کی اصل کاپی کبھی کسی ادارے (بشمول اقوام متحدہ) میں پیش نہیں کی۔

(د) اقوام متحدہ میں متضاد مواقف:

بھارت نے دسمبر 1947ء میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل سے رجوع کیا اور پاکستانی قبائل کے کشمیر پر حملے کی شکایت کر کے پاکستان کو کشمیر پر حملہ آور قرار دیکر اسے کشمیر سے نکل جانے کی ہدایت کرنے کی درخواست کی۔ 15 جنوری 1948ء کو سلامتی کونسل سے خطاب کرتے ہوئے بھارت کے نمائندے گوپال سوامی آینگر (سابق وزیراعظم جموں کشمیر) نے واضح طور پر اعلان کیا کہ بھارت کشمیریوں کے اس حق کو تسلیم کرتا ہے کہ کشمیر میں حالات معمول پر آنے کے بعد وہ خود آزادانہ طور پر یہ فیصلہ کریں کہ وہ بھارت کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں، پاکستان کا حصہ بننا چاہتے ہیں یا ایک آزاد مملکت بن کر اقوام متحدہ کی رکنیت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اقوام متحدہ نے کشمیر پر کمیشن مقرر کیا جس نے 13 اگست 1948ء کو ایک قرارداد پر بھارت اور پاکستان سے دستخط لئے جس میں دونوں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ ریاست کے مستقبل کا فیصلہ ریاستی عوام ہی ریاست میں اقوام متحدہ کے تحت ہونے والی رائے شماری کے ذریعہ کرینگے۔ اس قرارداد کے تحت ہی یکم جنوری 1949ء کی جنگ بندی ہوئی اور جولائی 1949ء میں جنگ بندی لائن قائم ہوئی۔ البتہ اس کے بعد کمیشن کی قراردادوں کی مختلف اور متضاد تشریحات کی بنا پر سیز فائر لائن کے قیام کے بعد کے مجوزہ اقدامات یعنی افواج کے انخلاء، ناظم رائے شماری اور اس کے عملے کے تقرر اور رائے شماری کے انعقاد پر اتفاق رائے نہ ہوسکا چنانچہ کمیشن نے اس صورتحال سے تنگ آ کر اور رائے شماری کے انعقاد سے متعلق اقدامات پر فریقین کو راضی نہ کر سکنے کے نتیجے میں اپنی ناکامی کا اعلان کیا اور سلامتی کونسل نے کمیشن کی ناکامی کے بعد یکے بعد دیگرے تین نمائندے مقرر کئے جنہوں نے فریقین کو مسئلے کے منصفانہ حل پر راضی کرنے کی بھرپور کوششیں کیں لیکن ناکام رہے۔ ان نمائندوں نے اپنی ناکامی کی زیادہ تر ذمہ داری بھارت کی بے جا ہٹ دھرمی پر ڈالی۔

(ر) شیخ محمد عبداللہ کو لالچ اور ٹھوکر:

جنگ بندی کے بعد بھارت ایک طرف کشمیر میں رائے شماری کرانے کے اپنے وعدے کو عملی جامہ پہنانے میں مختلف بہانوں سے ٹال مٹول کرتا رہا تو دوسری طرف اس نے کشمیر کے مقبول ترین لیڈر شیخ محمد عبداللہ کو ریاست کی مکمل خودمختاری کے سبز باغ دکھا کر انہیں ریاست کیلئے ایک آئین ساز اسمبلی (جو خودمختار مملکتوں کا آئین مرتب کرتی ہے) کے قیام پر آمادہ کیا۔ جب اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے اس پر اعتراض کیا تو بھارت نے اسے یقین دلایا کہ وہ (بھارت) اس آئین ساز اسمبلی کے (ریاست کے

مستقبل کے بارے میں) کسی فیصلے کو تسلیم نہیں کریگا (اور آج بھارت اسی اسمبلی کی طرف سے نام نہاد الحاق کی توثیق کو ہی ریاست پر دعویٰ ملکیت کی بنیاد گردانتا ہے) چنانچہ سلامتی کونسل نے ایک قرارداد منظور کی جس میں کہا گیا کہ ریاست جموں کشمیر کی آئین ساز اسمبلی ریاست کے آئینی مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی۔ بہر حال آئین ساز اسمبلی قائم ہوئی جس میں دھاندلیوں کے عالمی ریکارڈ توڑ دیئے گئے۔ مثلاً اسمبلی کے 75 ممبروں میں سے 72 بلا مقابلہ کامیاب قرار دیئے گئے۔ ان کے مقابلے میں کھڑے ہونے والوں میں سے کچھ کو گرفتار کیا گیا، کچھ کے کاغذات نامزدگی مسترد کئے گئے اور کچھ کو خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیکر انتخابات میں حصہ لینے ہی نہیں دیا گیا۔ صرف ہائی ہامہ (کپواڑہ) گاؤں ہی کے درجنوں افراد گرفتار کئے گئے جن میں وہ لوگ بھی شامل تھے جنکا سیاست سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ ان گرفتاریوں کا ذکر میں نے خاص طور پر اسلئے کیا کہ میں انکا عینی شاہد ہوں۔ ان گرفتار ہونے والوں میں میرے بہنوئی ماسٹر ہاشم علی خان بھی شامل تھے۔ بلا مقابلہ منتخب ہونے والے ان جملہ ممبروں کا تعلق نیشنل کانفرنس سے تھا۔ اس طرح بننے والی آئین ساز اسمبلی نے ریاست کے لئے اپنا آئین مرتب اور منظور کیا جس کے تحت ریاست کا اپنا صدر، اپنا وزیر اعظم، اپنا قومی پرچم اور اپنی قومی زبان کے علاوہ اپنے بہت سے قوانین تھے جس میں 1927ء سے نافذ یہ قانون بھی کہ کوئی بھی بھارتی باشندہ یا بھارتی حکومت ریاست میں کوئی غیر منقولہ جائیداد (زمین مکان وغیرہ) نہیں خرید سکتے تھے۔ صرف دفاع، امور خارجہ اور مواصلات کے محکمے بھارت کے پاس تھے اور ریاست کی اس آئینی حیثیت کو بھارتی آئین میں بھی اسکی دفعہ 370 کے تحت تسلیم کیا گیا۔ ادھر اقوام متحدہ کے کمیشن نے اپنی ناکامی کا اعلان کیا ادھر کشمیر سے متعلق بھارت کے تیور بھی بدلنے لگے جسے شیخ محمد عبداللہ نے بھی محسوس کیا اور اس کے خلاف (دھیمی سی ہی سہی) آواز اٹھائی۔ بھارتی حکومت نے غالباً اس خیال کے تحت کہ کشمیر پر اسکے پنجے ابھی پوری طرح جمے نہیں، شیخ صاحب کو 1952ء کے دہلی معاہدے کا لولی پاپ دیکر خاموش کرنے کی کوشش کی اس کے باوجود طرفین ایک دوسرے کے خلاف موثر اور نتیجہ خیز اقدام کرنے کے موقعے کی تلاش میں رہے لیکن اس سلسلے میں بھی بازی بھارتی حکومت لے گئی اور اس نے 9 اگست 1953ء کو شیخ صاحب کو وزارت عظمٰے سے معزول کر کے انہیں انکے سینکڑوں ساتھیوں سمیت گرفتار کر کے گیارہ سال تک پس دیوار زنداں رکھا۔ یہ وہی شیخ عبداللہ تھا جس کے بارے میں بھارت کے چوٹی کے لیڈر خاص کر پنڈت جواہر لال نہرو کہا کرتے تھے ''عبداللہ کشمیر ہے اور کشمیر عبداللہ، یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں'' اور اب شیخ عبداللہ کا واحد قصور یہ تھا کہ وہ بھارتی حکومت سے مطالبہ کر رہے تھے کہ وہ ان (شیخ صاحب) سے، انکی قوم سے اور عالمی برادری سے کئے گئے وعدے پورے کرے۔ یہ ہے اصل چہرہ بھارت کی نام نہاد جمہوریت اور بھارتی لیڈروں کے اخلاقی معیار کا۔

(س) عالمی سطح پر سودے بازی:

1957ء تک بھارت کشمیر میں موعود رائے شماری کرانے میں ٹال مٹول کرتا رہا اور اس کے بعد اس نے یہ دعویٰ کرتے ہوئے کہ کشمیر بھارت کا آئینی حصہ ہے رائے شماری کرانے سے صاف انکار کرنا شروع کیا اور اس سلسلے میں اس نے روس کی طرف سے ہنگری اور چیکوسلواکیا کی آزادی کی تحریکوں کو انتہائی سفاکی سے دبانے میں روس کی بالواسطہ طور پر حمایت کرنے کے بدلے روس سے 1957ء اور 1962ء میں کشمیر سے متعلق سلامتی کونسل کی قراردادوں کو ویٹو کرادیا۔ 1962ء کی چین بھارت جنگ کے دوران بھارت نے امریکہ کے ذریعہ پاکستان کو یقین دہانی کرائی کہ اگر جنگ کے دوران اس (پاکستان) نے بھارت کے لئے مشکلات پیدا نہیں کیں تو بھارت جنگ کے بعد مسئلہ کشمیر کو بات چیت کے ذریعہ حل کریگا حالانکہ اس جنگ سے صرف چھ ماہ پہلے جب امریکہ کے صدر کینیڈی نے مسئلہ کشمیر حل کرانے کے لئے بھارت اور پاکستان کو اپنی خدمات پیش کی تھیں تو بھارتی وزیراعظم نے کشمیر کو بھارت کا اٹوٹ انگ قرار دیکر کینیڈی کی پیشکش کو ٹھکرادیا تھا۔ بہرحال 1962ء کی چین بھارت جنگ کے بعد پاک بھارت مذاکرات (بھٹو سورن سنگھ مذاکرات) کے پانچ دور ہوئے لیکن بھارت نے اپنی ہٹ دھرمی نہیں چھوڑی چنانچہ مذاکرات ناکام ہوگئے۔ 1971ء کی پاک بھارت جنگ پاکستان کے خلاف بھارت کی ننگی جارحیت تھی جس کے بعد دونوں کے درمیان معاہدہ شملہ ہوا جس میں بھارت نے فاتح فریق کی حیثیت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا یعنی (1) اس نے بین الاقوامی مسئلے (مسئلہ کشمیر) کو دوطرفہ مسئلے میں تبدیل کرالیا۔ (2) جنگ کے دوران بھارت نے کرگل سیکٹر میں جن انتہائی اہم پہاڑوں پر قبضہ کرلیا تھا ان پر اس کا قبضہ جاری رہا جسے پاکستان نے تسلیم کیا۔ (3) معاہدہ شملہ میں نہ تو کشمیریوں کے حق خودارادیت کا کوئی ذکر ہے نہ ہی انہیں مسئلہ کشمیر کا فریق تسلیم کیا گیا ہے حالانکہ وہ اس مسئلے کے سب سے اہم فریق ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ڈیڑھ کروڑ کشمیریوں کی قسمت کے فیصلے کا حق کشمیری عوام سے چھین کر بھارت اور پاکستان کے سربراہان حکومت کو دیا گیا۔

(ش) کشمیری لیڈروں کے ساتھ سلوک:

بھارتی حکومت کشمیری لیڈروں کو کارتوس بنا کر اپنے ہی ساتھیوں اور کشمیریوں کی آزادی کو مار دینے کیلئے استعمال کرتی رہی اور مطلب نکلنے کے بعد انہیں خالی کارتوس کی طرح پھینکتی رہی۔ شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ کیا جانے والا سلوک پہلے ہی بیان کیا جاچکا ہے۔ شیخ صاحب کے خلاف جس بخشی غلام محمد کو استعمال کیا گیا اسکی افادیت ختم ہوتے ہی اسے کامراج پلان کے تحت اقتدار سے باہر کردیا گیا اور اسکی جگہ ایک بالکل ہی غیر معروف شخص شمس الدین کو مسندِ اقتدار پر بٹھایا گیا اور اس کو بھی چند ماہ کے اندر اندر چلتا کردیا گیا اور اسکی جگہ جی ایم صادق کو پرائم منسٹر بنایا گیا۔ صادق صاحب نے ریاست کی صدارت اور

وزارت عظمےٰ کے عہدے ختم کر کے ریاست کی انفرادیت پر سب سے بڑا وار کیا۔ اسے بھی اس کے پیشروؤں کا راستہ دکھایا جانے والا تھا کہ یہ فرض حضرت عزرائیل نے انجام دیا۔ ان کی وفات کے بعد ان کی جگہ میر قاسم صاحب کو گدی پر بٹھایا گیا لیکن ضرورت پڑتے ہی انہیں مکھی کی طرح اٹھا کر ایک طرف پھینک دیا گیا اور ان کی جگہ شیخ محمد عبداللہ کو بٹھایا گیا جو نہ تو خود اسمبلی کا ممبر تھا نہ اسکی پارٹی کو اسمبلی میں کسی قسم کی نمائندگی حاصل تھی۔ جمہوریت کا یہ بھارتی برانڈ مسلمہ جمہوری قدروں کا منہ چڑھاتے ہوئے مختلف بھیس بدل کر اب تک کشمیر پر مسلط ہے۔ 5-1984ء میں جی ایم شاہ کو وزیر اعلیٰ بنایا گیا حالانکہ اسے اسمبلی کے 75 میں سے صرف 14 ممبروں کی حمایت حاصل تھی اور وہ بھی اسلئے کہ تقریباً ہر ایک کو وزیر بنایا گیا تھا۔ بھارت کشمیری لیڈروں کی مایوسی سے بھی بھرپور فائدہ اٹھاتا رہا۔ 1971ء کی پاک بھارت جنگ میں پاکستان کی شکست کی وجہ سے کشمیری لیڈروں میں مایوسی پھیل گئی (جسکا واضح تاثر شیخ صاحب کے میرے نام خط جو اس کتاب کی پہلی جلد کے دستاویزات کے باب میں شامل ہے سے ملتا ہے) جسکے نتیجے میں بھارت نے شیخ صاحب کو 1975ء کے اندرا عبداللہ معاہدے پر دستخط کرنے پر مجبور کیا جسکے پہلے ہی جملے میں ریاست جموں کشمیر کو بھارت کا آئینی حصہ تسلیم کیا گیا ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کی نظر میں کشمیریوں کے منتخب نمائندوں کی کیا وقعت ہے اسکا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ 2000ء میں ریاستی اسمبلی کی دو تہائی اکثریت نے ریاست کی اندرونی خودمختاری کی بحالی کا مطالبہ کیا تو اس قرارداد کو بھارتی حکومت نے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔

الغرض بھارت کشمیری لیڈروں کو استعمال کرتا اور مطلب نکلتے ہی انہیں چلتا کرتا رہا اور اسے کشمیریوں کے جذبات اور احساسات کا قطعاً کوئی احساس نہیں۔

(ص) بے ضمیری اور سفاکی کی انتہا

بھارت نے 1947ء سے 1988ء تک کشمیر سے متعلق جھوٹ، غلط بیانیوں، وعدہ خلافیوں اور مکروفریب سے کام لیکر کشمیر پر اپنا جبری تسلط قائم رکھا جسکے نتیجے میں کشمیری مسلح جدوجہد آزادی شروع کرنے پر مجبور ہو گئے لیکن 1988ء سے 2004ء تک بھارت نے عوامی جذبات پر غور کرنے کی بجائے جس سفاکی اور درندگی کا مظاہرہ کیا اسکی مثال تاریخ عالم میں بہت کم ملتی ہے۔ کشمیر پر بھارتی جبری تسلط کے خلاف پانچ پانچ لاکھ افراد پر مشتمل جلوسوں کے فلک شگاف نعرے بھی جمہوریت کے نام نہاد علمبردار بھارتیوں کے مردہ ضمیر اور انکی نوآبادیاتی سوچ کو جھنجھوڑنے میں ناکام رہے۔ بھارتی فوج کے کارناموں میں درجنوں کشمیری خواتین کی ایک ساتھ اجتماعی عصمت دری اور اس طرز عمل کو اپنی فوجی حکمت عملی کا حصہ بنانا شامل ہے جو اسکے اخلاقی دیوالیہ پن اور حواس باختگی کا واضح ثبوت ہے۔ ہزاروں رہائشی مکانوں کو انکے مکینوں سمیت بموں سے اڑا دینا، دسیوں ہزار کشمیری نوجوانوں کو گولیوں کا نشانہ بنانا اور کشمیریوں کی باجواز جدوجہد آزادی کو دہشت گردی قرار دینا بدترین سفاکی نہیں تو اور کیا ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں

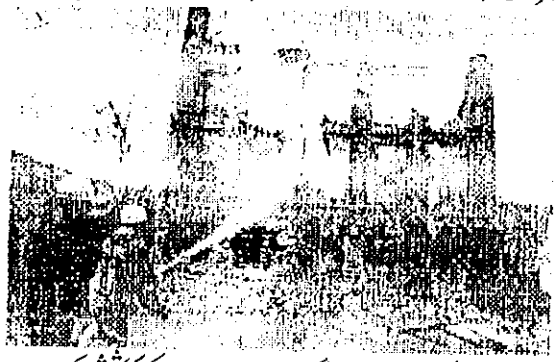
کشمیر میں بھارت کی سفاکی کے چند مناظر



کشمیری خواتین اپنے خاکستر شدہ مکانوں کے کھنڈرات پر نوحہ کناں



لبریشن فرنٹ کے شہدا کی لاشیں دفتر کے صحن میں بکھری پڑی ہیں



تباہ شدہ عمارت کو مقامی فائر بریگیڈ والے بجھانے کی کوشش کر رہے ہیں



مقبوضہ کشمیر میں ہڑتال لبریشن فرنٹ کے سربراہ سمیت 22 مجاہدین سپرد خاک

روزنامہ جنگ راولپنڈی (4) پیر کم اپریل 1996ء

بھارت نے کے ایل ایف پر پابندی لگا دی

مقبوضہ کشمیر میں مکمل ہڑتال، آزادی کی تحریک چلانے والی جماعتوں کا کریک ڈاؤن جاری

The News, Rawalpindi 1st April 1996

JKLF chief Shabbir, 29 others slain in Valley

Times London 4 April 1991

Kashmiri villagers tell of gang rapes by Indian soldiers

From CHRISTOPHER THOMAS IN KISHANGANGA

400,000 Kashmiris stage anti-India rally

Feb. 24 , 1990

کشمیر کے بارے میں بھارت کے طرز فکر و عمل کو بیسویں صدی کے پہلے نصف والی بدترین مغربی نوآبادیاتی طاقتوں کے طرز فکر و عمل سے بھی بدتر قرار دیا جائے تو کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔

الغرض کشمیریوں کے اب تک آزادی سے محروم رہنے میں بہت بڑا ہاتھ کشمیر پر بھارت کے جھوٹ، فریب اور درندگی کے بل بوتے پر قابض رہنے کا بھی ہے۔

2- پاکستان کا طرز عمل

پاکستان ظاہراً کشمیریوں کا ہمدرد اور کشمیریوں کی آزادی کا داعی رہا ہے اور اس حقیقت سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اگر پاکستان مسئلہ کشمیر کے بارے میں علاقائی اور عالمی سطح پر سرگرم نہ رہتا تو عین ممکن ہے کہ کشمیر کا مسئلہ بھی ریاست حیدرآباد دکن اور جونا گڑھ کے مسئلوں کی طرح قصہ پارینہ بن چکا ہوتا۔ لیکن ذرا گہرائی میں جا کر دیکھا جائے تو خود غرضی، کوتاہ اندیشی اور عدم استقلال پر مبنی پاکستان کی کشمیر پالیسی بھی کشمیریوں کے حصول آزادی کے راستے کی بڑی رکاوٹ ثابت ہوئی ہیں۔ آیئے ذرا تفصیل میں جائیں۔

(ا) پاکستان کی کشمیر پالیسی میں عدم استقلال

اگرچہ پاکستان کی حکومتیں مسئلہ کشمیر پر اپنے ''اصولی موقف'' کا ڈنڈھورا مسلسل پیٹتی رہی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ پاکستان نے اب تک کشمیر پر ایک درجن سے زیادہ بار اپنے موقف اور طرز عمل بدلے ہیں یعنی یوٹرن (U-turn) لئے ہیں۔

1940ء میں قرارداد پاکستان کی منظوری سے لیکر 1947ء کی ابتداء تک آل انڈیا مسلم لیگ برٹش انڈیا اور شخصی ریاستوں سمیت برصغیر کے جملہ مسلم اکثریتی علاقوں کو مطلوبہ پاکستان میں شامل تصور کرتی اور اس کا مطالبہ کرتی رہی چنانچہ مسلم لیگ کی طرف سے شائع شدہ برصغیر کے نقشے میں ریاست جموں کشمیر کو واضح طور پر مطلوبہ پاکستان کا حصہ دکھایا گیا تھا۔ لیکن جب تقسیم برصغیر یعنی مطالبہ پاکستان اصولاً تسلیم ہوا (یعنی برٹش انڈیا کے مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل پاکستان اور غیر مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل آزاد بھارت) تو اس طرز تقسیم میں برصغیر کی شخصی ریاستیں شامل نہیں تھیں۔ آل انڈیا نیشنل کانگریس کا مطالبہ تھا کہ ریاستوں کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق ان ریاستوں کے عوام کو دیا جائے جبکہ مسلم لیگ یہ حق ریاستوں کے حکمرانوں کو دینا چاہتی تھی۔ اصل میں دونوں کے موقف اصولوں کے بجائے خود غرضی پر مبنی تھے۔ مسلم لیگ انکے مسلمان حکمرانوں کے ذریعہ جونا گڑھ، مانا ودر اور منگرول کی ریاستوں جن کے عوام کی اکثریت غیر مسلم تھی کو پاکستان کا حصہ اور نواب حیدرآباد کے ذریعہ اس بڑی اور امیر ریاست کو خود مختار دیکھنا چاہتی تھی تاکہ وہ اسکے کام آسکے اور کشمیر کو وہ بوجوہ اپنی جیب میں سمجھتی تھی۔ اسکے برعکس کانگریس حیدرآباد،

جونا گڑھ وغیرہ ان غیر مسلم اکثریتی ریاستوں کو انکی اکثریت کی بنا پر اور کشمیر کو نیشنل کانفرنس اور ریاستی ہندوؤں کی حمایت سے بھارت کا حصہ دیکھنا چاہتی تھی۔ بالآخر اور بوجوہ ریاستوں کے مستقبل کے بارے میں مسلم لیگ کا موقف تسلیم کیا گیا یعنی ان ریاستوں کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق انکے حکمرانوں کو دیا گیا چنانچہ 77 فیصد مسلمان آبادی والی ریاست جموں کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق اسکے غیر مسلم حکمران کو دلا کر مسلم لیگ نے اپنے دوقومی نظریئے سے پہلا اور سب سے زیادہ نقصان دہ انحراف کیا۔ مسلم لیگ کا اپنی پالیسی سے یہ پہلا یوٹرن تھا۔ پاکستان کے اپنے ابتدائی نظریئے سے اس انحراف کو عملی شکل اس وقت ملی جب ہندو اکثریت والی ریاست جونا گڑھ کے مسلمان نواب نے اپنی ریاست کا الحاق پاکستان سے کیا اور پاکستان نے اس الحاق کو منظور کر کے مسلم اکثریتی ریاست جموں کشمیر کے ہندو مہاراجہ کو اپنی ریاست کے بھارت سے الحاق کیلئے عملی اور اخلاقی جواز مہیا کیا۔ اس انحراف نے پاکستان کی ہی نہیں بلکہ کشمیر کی تاریخ کا بھی رخ بدل دیا۔ اگر ریاستوں کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق شخصی حکمرانوں کی بجائے عوام کو ملا ہوتا تو کشمیر آج یقیناً وہ نہ ہوتا جو آج ہے نہ ہی پاکستان موجودہ قابل رحم حالت میں ہوتا۔

3 جون 1947ء کے اعلان آزادئ ہند کے دو ہفتے بعد مسلم لیگ نے اعلان کیا کہ برصغیر کی ریاستوں کو بھارت یا پاکستان سے الحاق کرنے کے علاوہ مکمل خودمختاری کا اعلان کرنے کا بھی حق حاصل ہے۔ 11 جولائی کو کشمیری تنظیم مسلم کانفرنس کے صدر سے ملاقات کے بعد مسلم لیگ کے صدر قائداعظم محمد علی جناح نے کہا کہ اگر مہاراجہ کشمیر خودمختاری کا اعلان کرے تو پاکستان کو خودمختار کشمیر سے ایسے معاہدے کرنے میں خوشی ہوگی جو دونوں کیلئے فائدہ مند ہوں۔ قیام پاکستان کے ساتھ ہی حکومت پاکستان نے ریاستی حکومت سے جوں کا توں معاہدہ کیا۔ اس اعلان اور معاہدے کی شکل میں مسلم لیگ کے اپنے ابتدائی نظریئے سے یہ دوسرا بڑا انحراف تھا۔ ادھر 14 اکتوبر کو کچھ کشمیریوں نے ریاست کیلئے ایک جلاوطن جمہوریہ کے قیام کا اعلان کیا تو پاکستان کے سرکاری ذرائع ابلاغ نے اس کی پوری تشہیر کی۔ 24 اکتوبر کو اس جلاوطن جمہوریہ کا نام ''آزاد کشمیر گورنمنٹ'' میں تبدیل کر دیا گیا لیکن اس سے دو دن پہلے پاکستان کے قبائلی علاقوں کے لشکر حکومت پاکستان کی گاڑیوں میں مظفر آباد کے راستے ریاست میں داخل ہو گئے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ اس اقدام کو حکومت پاکستان کی خاموش حمایت حاصل تھی۔ یہ پاکستان کا تیسرا بڑا یوٹرن تھا یعنی باوردی فوج کو ملوث کئے بغیر کشمیر پر بزور طاقت قبضہ کرنے کا فیصلہ۔ اس کے بعد مسئلہ کشمیر اقوام متحدہ میں چلا گیا اور وہاں 13 اگست 1948ء کی قرارداد کے تحت طے ہوا کہ ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کشمیری عوام اقوام متحدہ کے زیر نگرانی ہونے والی رائے شماری کے ذریعہ کرینگے۔ پاکستان نے اس قرارداد کو تسلیم کر کے اس پر دستخط کئے جو اسکے 22 اکتوبر 1947ء کے اقدام سے متصادم تھا۔ لیکن صرف چار ماہ بعد پاکستان نے ایک اور پینترا بدل کر اقوام متحدہ سے مطالبہ کیا کہ کشمیریوں کے حق خودارادیت کو ریاست کے بھارت یا پاکستان سے الحاق تک محدود کیا جائے اور اس نے اپنا یہ مطالبہ اقوام متحدہ کے کمیشن برائے بھارت و پاکستان کی 5 جنوری 1949ء کی قرارداد کے تحت منوالیا۔ اس طرح پاکستان نے اپنی طرف سے کشمیر اور

گلگت بلتستان کے عوام کو ان کے آئینی اور سیاسی حقوق سے محروم رکھنے پر پاکستان مسئلہ کشمیر کے حوالے سے بھارت کی سخت مذمت کا حق کھو بیٹھا ہے

پاکستان کی وفاقی گلگت بلتستان کے عوام کو ان کے حقوق سے محروم رکھنے کے علاوہ ان سے پاکستان کی کالونی جیسا برتاؤ کرتی ہے

مسئلہ کشمیر پر کامل عمل جمہوری اور پائیدار حل یہ ہے کہ منقسم ریاست جموں کشمیر کو دوبارہ متحد کر کے اسے خود مختار ڈومینین بنایا جائے

اندرون کانفرنس تحریک آزادی کشمیر میں تب تک عمل نہیں ہو گی کانفرنس کا پرامن کارکن ہونے کے ناطے میں پر امن طریقوں سے تحریک چلاؤں گا

روزنامہ جنگ (انٹرنیشنل) لندن، جمعہ 1 مئی 1998ء

حکومت پاکستان کی کشمیر پالیسی تضادات کا مجموعہ ہے، امان اللہ

امان اللہ خان پر آزاد کشمیر میں داخلے کی پابندی ختم کی جائے

ایمرجنسی پیرس ڈرفٹ کو فوری طور پر کام بند کرنے کا حکم، ہوائی جہاز نہیں اڑ سکے گا

الجزائر پاکستان کی فتح کی آرزو میں لبریشن فرنٹ کے کانفرنس مسترد کرنا ظلم ہے، اہل ایل ایف

1st May 1998

امان اللہ خان کی گرفتاری کے خلاف مختلف تنظیموں کا مظاہرہ

چیئرمین اور سینکڑوں کارکنوں کی گرفتاری انسانی حقوق کی کھلی خلاف ورزی ہے: مظاہرین

Dawn Karachi 23 Nov. 1994

India trapped, says Assef

Pakistan offers six options on Kashmir

Daily Jang Rawalpindi 28 Feb. 1998

خود مختار کشمیر بھارت پاکستان دونوں کے مفاد میں ہے۔ امان اللہ

گلگت بلتستان کشمیر کا حصہ ہیں، خود مختاری ملنے تک عوام کو آئینی حقوق ملنے چاہئیں کراچی میں جلسہ سے خطاب

کنٹرول لائن شملہ معاہدے کی ناجائز اولاد ہے' امان اللہ'

14 اکتوبر کو کنٹرول لائن کو توڑ کر ثابت کر دیں گے کہ ہم غیرت مند قوم ہیں

تاریخ مجھ سے سردار قیوم کا نہیں میرا احتساب مانگے گی' دھیر کوٹ میں جلسہ عام سے خطاب

Ausaf 24 June 2000

پاک بھارت کو مسئلہ کشمیر پر تلخ حقائق تسلیم کر کے آگے بڑھنا ہوگا امان اللہ

جے کے ایل ایف نے آسان فارمولہ پیش کر کے دونوں ممالک کیلئے آسانی پیدا کی ہے

[redacted]

[redacted]

کشمیری اپنی آزادی پاک بھارت دوستی پر قربان نہیں کر سکتے' امان اللہ

پاکستان اور بھارت کا طرز عمل برصغیر کو ایٹمی جنگ کے خطرے سے دوچار کر سکتا ہے

[redacted]

Benazir rejects third option on Kashmir

The Nation Feb. 17, 1996

کشمیریوں کو خود مختاری کے حق سے محروم کرادیا۔ پاکستان کا یہ چوتھا انتہائی قابل افسوس یوٹرن تھا۔ کشمیر میں رائے شماری نہ ہونی تھی نہ ہوئی البتہ 1962ء میں بھارت مسئلہ کشمیر پر پاکستان سے مذاکرات پر مجبور ہوا اور بھٹو سورن سنگھ مذاکرات شروع ہوئے تو پہلے ہی اجلاس میں پاکستان نے پیشکش کی کہ وہ مذاکرات کے دوران کشمیریوں کے حق خودارادیت کی بات نہیں کریگا بشرطیکہ بھارت اٹوٹ انگ کی رٹ چھوڑ دے۔ اس طرح فیصلہ ہوا کہ ان مذاکرات کے دوران ''کچھ لو کچھ دو'' کے ''اصول'' کو اپنایا جائے۔ یہ پاکستان کا اپنے نام نہاد اصولی موقف سے ایک اور بڑا انحراف تھا۔ ان مذاکرات کی ناکامی کے صرف ڈیڑھ سال بعد اگست 1965ء میں پاکستان نے ''آپریشن جبرالٹر'' کے تحت مقبوضہ کشمیر میں مسلح افراد بھیجے جس کے نتیجے میں 1965ء کی پاک بھارت جنگ شروع ہوگئی۔ پاکستان کا یہ اقدام بھی سابقہ اقدام سے متصادم (یوٹرن) تھا۔ 1974ء میں مقبوضہ کشمیر کے ڈاکٹر فاروق عبداللہ جوان دنوں برطانیہ میں ڈاکٹری پریکٹس کررہے تھے اور محاذ رائے شماری سے وابستہ تھے، محاذ رائے شماری (برائے آزاد کشمیر و پاکستان) کے سالانہ کنونشن میں شرکت کیلئے آزاد کشمیر آئے۔ یہاں انہوں نے اس وقت کے وزیراعظم پاکستان مرحوم ذوالفقار علی بھٹو سے ملاقات کی۔ میں ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے ساتھ تھا لیکن بھٹو صاحب کی خواہش پر مجھے ان ''مذاکرات'' سے باہر رکھا گیا۔ بھٹو صاحب مجھے جانتے تھے۔ ان سے میری اس سے پہلے (جب وہ اقتدار سے باہر تھے) دو بار ملاقاتیں ہوئیں تھیں۔ ایک اپنے کراچی کے ساتھیوں کے ساتھ اور دوسری بھارتی مقبوضہ کشمیر کے مشہور صحافی اور دانشور مرحوم شمیم احمد شمیم کے ساتھ۔ شمیم صاحب ایس پی کالج سرینگر میں میرے ہم جماعت تھے اور 1969ء میں پاکستان آئے تھے۔

فاروق عبداللہ اور بھٹو صاحب کی بات چیت کوئی ڈیڑھ گھنٹہ جاری رہی اور فاروق عبداللہ نے باہر نکل کر گاڑی میں بیٹھتے ہی مجھے کہا کہ بھٹو صاحب نے مجھے کہا ہے کہ پاکستان آئندہ کم از کم دس سال تک آپ لوگوں (کشمیریوں) کی کوئی مدد کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے اسلئے فی الحال بھارت سے جو کچھ ملتا ہے لے لو۔ یہ پاکستان کا ایک اور یوٹرن تھا۔ یاد رہے کہ ان دنوں بھارتی نمائندے مسٹر پارتھا سارتھی اور شیخ محمد عبداللہ کے مابین مذاکرات جاری تھے۔ ظاہر ہے فاروق عبداللہ نے بھٹو صاحب کا پیغام شیخ صاحب تک پہنچایا ہوگا۔ چنانچہ شیخ صاحب نے مسز اندرا گاندھی وزیراعظم بھارت کے ساتھ اندرا عبداللہ معاہدہ (1975ء) کیا جس کے تحت شیخ صاحب کو کشمیر اسمبلی کا ممبر نہ ہونے بلکہ اسمبلی میں ان کا ایک بھی ممبر نہ ہونے کے باوجود ریاست کا چیف منسٹر بنایا گیا اور شیخ صاحب نے اندرا عبداللہ معاہدے پر دستخط کئے جس کے پہلے ہی جملے میں تسلیم کیا گیا تھا کہ ریاست جموں کشمیر بھارت کا آئینی حصہ ہے۔

متذکرہ بالا بھٹو فاروق بات چیت اکتوبر 1974ء میں ہوئی تھی۔ اس سے قبل 1971ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد جولائی 1972ء میں معاہدہ شملہ ہوا جس کے تحت نہ تو کشمیریوں کو مسئلہ کشمیر کا فریق تسلیم کیا گیا تھا نہ ہی اس میں کشمیریوں کے حق خودارادیت کا کوئی ذکر تھا بلکہ ڈیڑھ کروڑ کشمیریوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا حق بھارت اور پاکستان کے سربراہان حکومت کو دیا گیا تھا۔ یہ بھی پاکستان کا اپنے

''اصولی موقف'' سے سراسر انحراف تھا۔

1987ء میں حکومت پاکستان کے متعلقہ شعبے (آئی ایس آئی) نے ہم (جموں کشمیر لبریشن فرنٹ) سے رجوع کیا جس میں ہمیں یقین دہانی کرائی گئی کہ اگر ہم بھارتی مقبوضہ کشمیر میں مسلح جدوجہد شروع کریں تو پاکستان ہماری عملی مدد کرے گا۔ وہ نہ تو ہمارے نظریۂ خودمختار کشمیر کو آگے بڑھانے میں کوئی رکاوٹ ڈالے گا نہ ہمارے تنظیمی معاملات میں مداخلت کریگا، نہ ہی مقبوضہ کشمیر سے آئے ہوئے حریت پسندوں کی ذہنی اور نظریاتی تربیت کے سلسلے میں دخل اندازی کرے گا۔ ہم خود بھی کسی طرف سے غیر مشروط اور مخلصانہ مدد کی تلاش میں تھے اسلئے ہم نے پیشکش قبول کی۔ یہاں تک کہ ہمارے نظریے سے متعلق میرے لکھے ہوئے دو کتابچے ''نظریۂ خودمختار کشمیر'' اور ''خودمختار کشمیر کیوں؟'' کی سینکڑوں کاپیاں حکومت پاکستان کے متعلقہ شعبے کی مدد سے بھارتی مقبوضہ کشمیر پہنچ کر وہاں تقسیم ہوگئیں۔ لیکن جونہی مقبوضہ کشمیر میں تحریک آزادی ہماری اور ان کی بہترین توقعات سے بھی کہیں زیادہ تیزی سے آگے بڑھنے لگی تو حکومت پاکستان کے متعلقہ شعبے کی رال ٹپکنے لگی اور اس نے بدترین طوطا چشمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہماری قیمت پر الحاق پاکستان کی حامی تنظیم کھڑی کی جس کا ابتدائی نعرہ تھا ''ہمارا دشمن نمبر ایک لبریشن فرنٹ اور دشمن نمبر دو بھارت'' حکومت پاکستان کی یہ طوطا چشمی جتنی ہمیں مہنگی پڑی اس سے کہیں زیادہ خود پاکستان کو مہنگی پڑی۔ اسکے بعد حکومت پاکستان نے فروری 1999ء میں اعلان لاہور پر دستخط کئے جسکے کچھ ہی ماہ بعد سانحہ کرگل ہوا جو اعلان لاہور سے سراسر انحراف تھا۔ 6 جنوری 2004ء کا مشترکہ بیان کشمیر کے بارے میں بھارت اور پاکستان کے بدترین نوآبادیاتی طرز فکر و عمل کی نشاندہی کرتا ہے اور اس تلخ حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ دونوں ملک کشمیریوں کو بھیڑ بکریاں سمجھتے ہیں۔ انہیں ہمارے جذبات سے نہیں ہمارے مادر وطن کی ملکیت سے غرض ہے۔

الغرض پاکستان کی کشمیر پالیسی میں عدم استقلال ہماری آزادی کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ رہی ہے۔

(ب) اقوام متحدہ میں فاش غلطیاں

پاکستان سے کشمیر کے بارے میں اقوام متحدہ میں بھی بہت سی فاش غلطیاں سرزد ہوئیں۔ ابتداء میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں مسئلہ کشمیر پر بحث کا عنوان جموں کشمیر کی صورتحال (The Situation in Jammu Kashmir) تھا جسے 20 جنوری 1948ء کو پاکستان کے مطالبے پر ''بھارت پاکستان کا مسئلہ'' (India Pakistan Question) میں تبدیل کیا گیا جس سے مسئلہ کی نوعیت میں بنیادی تبدیلی آ گئی جو کشمیر اور پاکستان کے لئے نقصان دہ ثابت ہوئی۔ پاکستان نے ابتداء میں اقوام متحدہ کو یہ تاثر دیا تھا کہ کشمیر میں پاکستان کی افواج نہیں لڑ رہی ہیں لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ پاکستان کی فوج کشمیر میں ہے چنانچہ اقوام متحدہ نے اپنی 13 اگست 1948ء کی قرارداد میں پاکستان سے

کہا کہ وہ کشمیر سے اپنی فوج نکال کر اس پوزیشن پر جائے جس کا اس نے ابتداء میں اعلان کیا تھا یعنی کشمیر میں پاکستانی فوج کی عدم موجودگی۔ چنانچہ پاکستان کی ابتدائی غلط بیانی کے نتیجے میں پاکستان کو آزاد کشمیر سے اپنی فوج نکالنے کیلئے کہا گیا اور پاکستان کا ایسا کرنا بھارت کیلئے میدان کھلا چھوڑنے کے مترادف ہوتا چنانچہ پاکستان اپنی فوج کے اس طرح انخلا پر راضی نہیں ہوا جو اس قرارداد پر عمل نہ ہونے کا موجب بنا۔ پاکستان نے کمیشن کی 5 جنوری 1949ء کی قرارداد کے تحت کشمیریوں کو حق خودمختاری سے محروم کرایا جس سے عالمی برادری کو یہ تاثر ملا کہ بھارت کی طرح پاکستان کی دلچسپی بھی کشمیری عوام کے جذبات اور خواہشات میں نہیں سرزمین کشمیر کی ملکیت میں ہے جس سے اس مسئلے پر اسکی پوزیشن پر گہرا منفی اثر پڑا۔ یہی نہیں بلکہ اس طرح مسئلہ کشمیر کشمیریوں کے حق خودارادیت کے مسئلے سے بھارت اور پاکستان کے مابین زمین کی ملکیت سے متعلق ایک تنازعے میں تبدیل ہوگیا جس سے اس مسئلے میں عالمی برادری کی دلچسپی کم ہوگئی اور کشمیری اس کی حمایت سے محروم ہوگئے اور اس کا خمیازہ پاکستان اور کشمیریوں دونوں کو بھگتنا پڑا۔

پاکستان سے اقوام متحدہ میں مسئلہ کشمیر سے متعلق اور بھی بہت سی غلطیاں اور مجرمانہ غفلتیں سرزد ہوئیں ہیں جن کی کشمیریوں کے علاوہ خود پاکستان کو بھی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ ان میں سے چند ایک کا خود میں عینی شاہد ہوں اور ایک کا تفصیلی ذکر میں نے ''جہدِ مسلسل'' کی پہلی جلد میں صفحہ نمبر 163 پر کیا ہے۔

(ج) پاکستان کا آزاد حکومت سے برتاؤ

آزاد کشمیر حکومت ابتداً 4 اکتوبر 1947ء کو ''خودمختار کشمیر کی عبوری جمہوری حکومت'' کے نام سے قائم ہوئی جس کی 24 اکتوبر کو تنظیم نو کی گئی۔ پہلی حکومت ایک خودمختار انقلابی جمہوریہ تھی جبکہ دوسری کے قیام کے اعلان کے آخر میں کہا گیا کہ یہ حکومت ایسے اقدام کریگی جن کے ذریعہ ریاستی عوام یہ فیصلہ کرینگے کہ ریاست کو بالآخر پاکستان کا حصہ بننا چاہیئے یا بھارت کا۔ موخرالذکر عبارت کچھ اس طرح ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس عبارت کا اضافہ بعد میں کیا گیا ہے۔

آزاد حکومت کے قیام کے ڈیڑھ سال بعد پاکستان اور آزاد کشمیر کی حکومتوں کے مابین 28 اپریل 1949ء کو معاہدہ کراچی کے تحت آزاد کشمیر کے دفاع اور امور خارجہ کے علاوہ گلگت بلتستان کے علاقے بھی براہ راست حکومت پاکستان کی تحویل میں دیئے گئے جو مسئلہ کشمیر سے متعلق اقوام متحدہ کی قراردادوں کی سریحاً خلاف ورزی تھی۔ اس کے بعد آزاد حکومت، حکومت پاکستان خاص کر اس کی وزارت امور کشمیر کے رحم وکرم پر رہتی رہی۔ پاکستان کی وزارت امور کشمیر کا جوائنٹ سیکرٹری گلگت بلتستان کا ریذیڈنٹ اور آزاد کشمیر حکومت کا چیف ایڈوائزر (مشیر اعلیٰ) بھی ہوتا تھا۔ میں اس واقعے کا عینی شاہد ہوں کہ ایک بار آزاد کشمیر کے ایک صدر صاحب اپنے پاکستانی مشیر اعلیٰ امان اللہ خان نیازی (جو اس حیثیت سے صدر آزاد کے ماتحت اور حکومت آزاد کشمیر کے ملازم تھے) سے ملاقات کے انتظار میں ان کے

دفتر کے باہر ان کے پرسنل سیکرٹری کے پاس تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھے رہے تب جا کر ان کے پاکستانی ماتحت نے انہیں شرف ملاقات بخشا۔ یہ تھی پہلے تقریباً پندرہ سال تک آزاد کشمیر کے صدر کی حیثیت۔ اس سے قبل آزاد کشمیر کے پہلے منتخب صدر مرحوم کے ایچ خورشید (بانی پاکستان کے سابق پرائیویٹ سیکرٹری) نے اسی امان اللہ خان نیازی کے دربار میں حاضری دینے سے یہ کہہ کر انکار کیا کہ میں عوام کا منتخب صدر ہوں اسلئے میرا اپنے ماتحت کے دفتر میں حاضری دینا کشمیری عوام کی تضحیک وتذلیل کے مترادف ہے۔ تو تھوڑی ہی مدت کے بعد اس (خورشید صاحب) کی چھٹی کر دی گئی۔ آزاد کشمیر میں پہلی بار انتخابات آزاد حکومت کے قیام کے 14 سال بعد 1961ء میں ہوئے۔ اس کے بعد بھی آزاد کشمیر کے منتخب صدر اپنے پاکستانی ماتحتوں کے ہاتھوں اپنے عہدوں سے محروم ہوتے رہے۔ آزاد کشمیر کے کسی سربراہ حکومت (سردار سکندر حیات خان) نے پہلی بار قیام آزاد کشمیر کے تقریباً تینتالیس سال بعد 1990ء میں اپنی معیاد پوری کر کے چارج نو منتخب سربراہ حکومت (راجہ ممتاز حسین راٹھور) کو دیدیا۔ جہاں تک آزاد کشمیر کی اقتصادی ترقی کا تعلق ہے خاص کر میر پور، کوٹلی، پونچھ اور سدھنوتی میں جو خوشحالی نظر آ رہی ہے وہ بنیادی طور پر بیرون ملک (مشرق وسطی، یورپ اور امریکہ میں) برسر روزگار ان علاقوں کے لاکھوں باشندوں کی مرہون منت ہے۔ گو تعلیم، ذرائع آمدورفت اور بجلی وغیرہ میں کچھ ترقی ہوئی ہے خاص کر جنرل حیات خان کے دور اقتدار میں لیکن معیار تعلیم انتہائی پست ہے۔ آزاد کشمیر کے طلباء ریاست کی تاریخ خاص کر تاریخ تحریک آزادی سے بالکل نابلد ہیں اس لئے کہ وہاں اس کی پڑھائی ہی نہیں ہوتی۔

الغرض حکومت پاکستان کا آزاد کشمیر سے یہ برتاؤ بھی کشمیریوں کی آزادی کے راستے میں رکاوٹ رہا ہے۔

(د) پاکستان کا گلگت بلتستان سے برتاؤ

گلگت بلتستان کا علاقہ جسے پاکستان کی افسر شاہی کا شیطانی ذہن شمالی علاقے گردانتا ہے ریاست جموں کشمیر کے شمالی حصے میں تقریباً 70 ہزار مربع کلومیٹر علاقے پر پھیلا ہوا ہے۔ ان علاقوں کو شمالی علاقے کا نام دیتے وقت کہا گیا کہ یہ ریاست جموں کشمیر کے شمالی علاقے ہیں لیکن پاکستان کی افسر شاہی ہی نہیں اب اس کا ٹی وی بھی گلگت بلتستان کو پاکستان کا حصہ دکھاتا ہے۔ 1947ء میں ریاست جموں کشمیر کا رقبہ تقریباً 85 ہزار مربع میل تھا۔ پاکستان ٹی وی آج ریاست جموں کشمیر کو صرف 42 ہزار مربع میل علاقے پر مشتمل یعنی اصل کا نصف دکھاتا ہے۔ باقی حصہ غالباً پاکستان کشمیریوں کے ''کاز'' کی ''وکالت'' کی فیس کے طور پر اپنے اور اپنے دوست چین کے کھاتے میں ڈال رہا ہے۔ افسر شاہی کی نوآبادیاتی سوچ اب اس سے بھی آگے جا کر گلگت بلتستان کے پاکستان سے کسی نام نہاد الحاق کو ثابت کرنے کیلئے کبھی میر آف نگر کو، کبھی 1947 میں گلگت میں تعینات میجر براؤن کی بیوہ کو اور کبھی کسی نام نہاد قاصد کو استعمال کر رہی ہے لیکن حقیقت صرف اور صرف یہ ہے کہ گلگت بلتستان کے علاقے اس ریاست جموں کشمیر کا حصہ ہیں

جس کے مستقبل کا فیصلہ ہونا ابھی باقی ہے اور جس کے کسی حصے کا کسی ملک سے الحاق نہیں ہوا ہے۔

پاکستان کی افسر شاہی کے شیطانی ذہن نے وزارت امور کشمیر کا نام بھی بدل کر وزارت امور کشمیر و شمالی علاقہ جات رکھا ہے تا کہ یہ تاثر دیا جائے کہ یہ علاقے ریاست جموں کشمیر کا حصہ نہیں۔

70 ہزار مربع کلومیٹر کا یہ وسیع علاقہ یہاں کے غیور اور بہادر عوام نے بغیر کسی بیرونی مدد کے ریاست کے شخصی راج سے آزاد کرایا تھا تا کہ وادیٔ کشمیر جموں اور لداخ کی طرح یہ علاقے بھی بھارت کے قبضے میں نہ چلے جائیں۔ لیکن پاکستان کی افسر شاہی نے ان علاقوں کو قصداً آزاد کشمیر اور کشمیری سیاست یعنی تحریک آزادیٔ کشمیر سے الگ تھلگ رکھا۔ 1947ء تک گلگت بلتستان کے بڑے حصوں (بلتستان اور استور) کی نمائندگی سرینگر اسمبلی میں تھی لیکن اس کے بعد مزید علاقوں کے منتخب نمائندوں کو قانون سازی کا حق دینے کی بجائے ان لوگوں سے بھی یہ حق چھینا گیا جنہیں یہ حق ڈوگرہ راج میں حاصل تھا۔ پاکستان کی افسر شاہی ان علاقوں کو اپنی کالونی سمجھتی ہے۔ ان تلخ حقائق کے نتیجے میں گزشتہ سالوں میں پاکستان کے لئے گلگت بلتستان کے عوام کے جذبات میں مجموعی طور پر گہری منفی تبدیلی آئی ہے۔

الغرض گلگت بلتستان کو کشمیر اور تحریک آزادیٔ کشمیر سے جبراً الگ تھلگ رکھنے سے بھی تحریک آزادیٔ کشمیر پر منفی اثر پڑا ہے۔

(ر) نظریۂ خودمختار کشمیر سے برتاؤ

اگرچہ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے اپنے 17 جون، 11 جولائی اور 30 جولائی 1947ء کے تاریخی پالیسی بیانات کے ذریعہ نظریۂ خودمختار کشمیر کی بالواسطہ اور بلاواسطہ حمایت کی تھی لیکن ان کی وفات کے بعد اس نظریئے کے بارے میں پاکستان کی حکومت نے پورا یوٹرن لے لیا۔ اس سلسلے میں پہلی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اقوام متحدہ کے کمیشن کی 5 جنوری 1949ء کی قرارداد کے تحت کشمیریوں کا حق خودارادیت ریاست کے بھارت سے یا پاکستان سے الحاق تک ہی محدود ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ کشمیریوں کے اس حق کو بھارت یا پاکستان سے الحاق تک محدود خود پاکستان نے کرایا ہے۔ ''بنے ہیں اہل ہوس مدعی بھی منصف بھی۔ کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں'' کتنے افسوس کی بات ہے کہ پاکستان کشمیریوں کو یہ حق تو دیتا ہے کہ وہ (کشمیری) اس (پاکستان) کے دشمن بھارت کا حصہ بن جائیں لیکن پاکستان کو کشمیریوں کی آزادی قبول نہیں۔ حیف صد حیف! پاکستان کی ایک دلیل یہ ہے کہ چونکہ ریاست جموں کشمیر مسلم اکثریتی ریاست ہے اسلئے دوقومی نظریئے کے تحت اسے پاکستان کا حصہ بننا چاہیئے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ریاستوں کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق مسلم لیگ ہی کے مطالبے پر ریاستوں کے حکمرانوں کو دیا گیا تھا اور اسی نام نہاد اصول کے تحت پاکستان نے ہندو اکثریتی ریاست جونا گڑھ کا پاکستان سے الحاق قبول کیا تھا۔

پاکستان کی حکومتوں کی طرف سے نظریۂ خودمختار کشمیر سے برتاؤ کا کچھ اندازہ اس حقیقت سے

لگایا جاسکتا ہے کہ پاکستان ٹی وی کم از کم گزشتہ بارہ سال سے مجھے بالکل بلیک آؤٹ کئے ہوئے ہے صرف اسلئے کہ دنیا مجھے نظریۂ خودمختار کشمیر کے سب سے زیادہ سرگرم علمبردار کے طور پر جانتی ہے۔ پاکستان نے مجھ پر ملک سے باہر جانے پر بھی پابندی لگا رکھی ہے تاکہ میں باہر جا کر نظریۂ خودمختار کشمیر کا پرچار نہ کرسکوں۔ اس نظریئے کے ساتھ پاکستان کے اس رویئے سے کشمیریوں کے ساتھ پاکستان کا خلوص بری طرح مشکوک ہوجاتا ہے۔ اگر پاکستان نظریۂ خودمختار کشمیر کی اصولی اور عملی حمایت کرتا تو وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ کشمیر کب کا آزاد ہوگیا ہوتا۔ جو خود پاکستان کے بھی بہترین مفاد میں تھا۔

(س) کشمیری قیادت میں اتحاد پیدا کرنے میں عدم دلچسپی

پاکستان کی مختلف حکومتوں اور اسکے متعلقہ اداروں نے کشمیری قیادت میں اتحاد فکر و عمل پیدا کرنے میں متوقعہ کردار ادا نہیں کیا بلکہ اس اتحاد (حریت کانفرنس) کو توڑنے میں خاصا کردار ادا کیا۔ عام تاثر یہ بھی ہے کہ بہت سے اہم کشمیری رہنماؤں کے قتل میں پاکستان نواز کشمیری عسکری تنظیموں کا ہاتھ تھا اور یہ کہ وہ تنظیمیں پاکستان کی رضامندی کے بغیر یا اس کی خواہش کے خلاف ایسا نہیں کرسکتی تھیں۔ اس تاثر نے بھی کشمیریوں کے جذبات پر گہرا منفی اثر ڈالا۔

الغرض پاکستان کی حکومتوں کی طرف سے مسئلہ کشمیر سے متعلق انتہائی خودغرضانہ، بار بار بدلتا ہوا اور کوتاہ اندیشانہ طرز فکر و عمل کشمیریوں کی آزادی کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔

3- عالمی برادری کا طرز عمل

اس میں کوئی شک نہیں کہ اقوام متحدہ نے ابتدائی تقریباً 9 سال تک مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اس سلسلے میں اقوام متحدہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے کشمیریوں کے حق خودارادیت کو خود بھی تسلیم کیا اور بھارت اور پاکستان سے بھی کروایا ورنہ 1947ء میں مسلم لیگ اور کانگریس نے تو کشمیریوں کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق مہاراجہ ہری سنگھ کو دیا تھا۔ گو 13 اگست 1948ء کی قرارداد کے تحت دیئے گئے اس حق کو اقوام متحدہ کے کمیشن کی 5 جنوری 1949ء کی قرارداد کے تحت ریاست کے بھارت یا پاکستان سے الحاق تک محدود کرکے کشمیریوں سے انکا حق خودمختاری چھین لیا گیا لیکن اس میں قصور اقوام متحدہ سے کہیں زیادہ پاکستان کا ہے جس نے (اپنے 25 دسمبر 1948ء کے خط کے ذریعے) اسکا مطالبہ کیا اور بھارت کا ہے جس نے پاکستان کے اس مطالبے کی مخالفت نہیں کی۔ البتہ کشمیر کے سلسلے میں اقوام متحدہ کا جرم یہ ہے کہ اس نے ایسا کرنے کی قانونی پوزیشن میں ہونے کے باوجود مسئلہ کشمیر پر اپنے چارٹر کے چیپٹر سات (Chapter7) کا اطلاق نہیں کیا اور اس پر کارروائی چیپٹر 6 کے تحت کرتی رہی۔ چیپٹر سات کا اطلاق وہاں ہوتا ہے جہاں دو ملکوں کے مابین جنگ کا خطرہ ہو تو اقوام متحدہ

ان ملکوں کی رضامندی کے برعکس بھی جنگ کے خطرے کو ٹالنے یا جنگ ختم کرنے کے لئے عملی اقدامات کرسکتی ہے جبکہ چیپٹر چھ کا اطلاق دو ملکوں کے مابین ایسے تنازعے سے متعلق ہوتا ہے جسکا جنگ میں منتج ہونے کا کوئی خطرہ نہ ہو۔ کشمیر کے بارے میں بھارت اور پاکستان دونوں نے مختلف موقعوں پر کئی بار کہا تھا کہ کشمیر میں پاک بھارت جنگ کا خطرہ ہے چنانچہ اقوام متحدہ چیپٹر سات کے تحت وہاں کارروائی کرسکتی تھی لیکن اس نے چیپٹر چھ کا اطلاق جاری رکھا جس کے تحت اقوام متحدہ کی طرف سے کسی کارروائی کے لئے فریقین کی رضامندی ضروری ہوتی ہے۔

اقوام متحدہ میں مسئلہ کشمیر عالمی سیاست کا شکار ہوگیا۔ 1948ء سے 1957ء تک روس (جو اس زمانے میں سوویت یونین کہلاتا تھا جسکے 1989ء میں درجن بھر ٹکڑے ہوگئے) مسئلہ کشمیر میں غیر جانبدار تھا اور اس نے اقوام متحدہ کی (کشمیر سے متعلق) کسی قرارداد میں ووٹ نہیں دیا تھا لیکن اس نے 20 فروری 1957ء کو کشمیر میں رائے شماری کرانے سے متعلق قرارداد کو ویٹو کردیا۔ روس نے دوسرا ویٹو 22 جون 1962ء کی سلامتی کونسل کی قرارداد کو کیا۔ اس کے بعد 1965ء کی جنگ کے دوران 6 ستمبر اور 20 ستمبر کو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے کشمیر پر قراردادیں منظور کیں۔ اگرچہ 20 ستمبر والی قرارداد میں (مسئلہ کشمیر کا براہ راست نام لئے بغیر) کہا گیا کہ سلامتی کونسل پاک بھارت جنگ کے پس منظر میں موجود مسئلے کو حل کرنے پر غور کریگی لیکن جنگ بندی کے بعد اس پر کبھی بحث نہیں ہوئی اور جولائی 1972ء کے معاہدہ شملہ کے بعد اقوام متحدہ نے کشمیر میں کسی قسم کی کارروائی کرنے سے یہ کہہ کر انکار کرنا شروع کیا کہ مسئلہ کشمیر اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے ایجنڈے میں آرٹیکل چھ کے تحت دائر ہے جس میں اقوام متحدہ کی طرف سے کسی کارروائی کے لئے دونوں فریقوں (بھارت اور پاکستان) کی رضامندی ضروری ہے اور چونکہ بھارت اس کے لئے رضامند نہیں ہوتا اس لئے اقوام متحدہ کچھ نہیں کرسکتی اور ثانیاً یہ کہ معاہدہ شملہ کے تحت بھارت اور پاکستان نے مسئلہ کشمیر کو ایک پاک بھارت دوطرفہ تنازعہ قرار دیکر اسے باہمی مذاکرات کے ذریعہ حل کرنے پر اتفاق کیا ہے اس لئے اقوام متحدہ اس مسئلے کو بھارت اور پاکستان پر ہی چھوڑتی ہے اور امید رکھتی ہے کہ وہ اس مسئلے کو حل کردیں گے۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے جون 1998ء کی اپنی متفقہ قرارداد نمبر 1172 میں واضح کیا تھا کہ وہ بھارت اور پاکستان کے مابین کشیدگی کا باعث بننے والے مسائل کو حل کرنے میں ان کی مدد کرے گی لیکن وہ قرارداد بھی کاغذوں تک ہی محدود رہی۔ غیر جانبدار تحریک اور سارک جس کے بھارت اور پاکستان دونوں ممبر ہیں کے قواعد وضوابط دو ممبر ملکوں کے مابین تنازعات پر بحث کی اجازت نہیں دیتے۔ دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم نے ابتدائی عشرے کے دوران اس مسئلے کو حل کرانے کی کوشش کی تھی لیکن ناکام رہے۔ آسٹریلیا کے وزیراعظم آنجہانی رابرٹ مینزیز نے ایک بار لندن میں دولت مشترکہ کے سربراہان حکومت کی کانفرنس کے دوران بھارت اور پاکستان کے وزرائے اعظم کو ایک کمرے میں بند کرکے کہا تھا کہ میں آپ لوگوں کو اس وقت تک کمرے سے باہر نہیں آنے دوں گا جب تک آپ مسئلہ کشمیر کے کسی حل پر متفق نہ ہوں لیکن پنڈت نہرو نے اس پر شدید برہمی کا

اظہار کیا جس پر مسٹر مینز یز نے ہتھیار ڈال دیئے۔

اسلامی کانفرنس اگرچہ اقوام متحدہ کی قرارداد کے مطابق مسئلہ کشمیر کے حل پر زور دیتی رہی ہے لیکن اس نے اس مسئلے میں کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا اسلئے کہ اس کے اکثر ممبر بوجوہ بھارت کو ناراض کرنا نہیں چاہتے۔

میری ذاتی معلومات اور سفارتی حلقوں سے ملنے والے تاثرات کے مطابق اکثر مسلمان ملک کشمیر کی مکمل خودمختاری کو اس مسئلے کا بہترین حل سمجھتے ہیں لیکن وہ اسکا اظہار اسلئے نہیں کرتے کہ بھارت اور پاکستان دونوں کشمیر کی مکمل آزادی کے خلاف ہیں اور یہ مسلمان ملک کشمیر کی آزادی کی بات کر کے دونوں کو ناراض کرنا نہیں چاہتے۔

الغرض ابتدائی کوششوں کے باوجود عالمی برادری گذشتہ تقریباً چار عشروں سے مسئلہ کشمیر میں کوئی سنجیدہ دلچسپی نہیں لے رہی جس کی بنیادی وجہ اقوام متحدہ کے بااثر ممبروں کے قومی مفادات ہیں۔ ایک بار میرے اس سوال پر کہ مغرب خاص کر امریکہ کشمیر پر جبری بیرونی قبضے کے خلاف کوئی قدم کیوں نہیں اٹھاتا جبکہ اس نے کویت پر عراقی قبضے کے خلاف اتنا بڑا قدم اٹھایا اور کشمیر پر بھارت کئی عشروں سے قبضہ جمائے ہوئے ہے تو اسلام آباد میں متعین ایک سینئر سفارتکار نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ''اسلئے کہ کشمیر میں کویت کی طرح تیل نہیں نکلتا''۔

الغرض عالمی سیاست پر آج کل صرف جسکی لاٹھی اسکی بھینس کے نام نہاد اصول کی حکمرانی ہے۔ حق وانصاف، رواداری، وعدے مواعد کا احترام اور انسانی حقوق نام کی چیزیں قصہء پارینہ ہوگئی ہیں۔ چھوٹی، خاص کر محکوم قوموں کے مفادات کو بڑی طاقتیں اپنے مفادات کے لئے استعمال کرتی ہیں۔ آج کی بین الاقوامی سیاست بدترین منافقت، دوہرے معیار اور طوطا چشمی کی بدترین مثالیں پیش کرتی ہے۔ یہاں قول وفعل اور ظاہر و باطن میں ہم آہنگی نام کی کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی۔ سفارتکاروں کے بارے میں تو ویسے بھی کہا جاتا ہے کہ

"They don't say what they mean, they don't mean wat they say"

''یعنی جو ان کے دل میں ہوتا ہے وہ زبان پر نہیں لاتے اور جو کہتے ہیں وہ ان کے دل کی بات نہیں ہوتی۔''

اسلئے اگر کشمیریوں کی آزادی جیسی چیزیں عالمی سیاست کی گندگی کے سیلاب میں بہہ گئیں تو تعجب کی کوئی بات نہیں۔

ایسٹ تیمور کو اس لئے اتنی جلدی آزادی مل گئی کہ (وہاں کی قیادت میں اتحاد فکر وعمل ہونے کے علاوہ) اس کی پیٹھ پر بین الاقوامی عیسائی برادری کی پوری طاقت تھی۔ ہم اس لئے بھی ابھی تک غلام ہیں کہ ہماری بین الاقوامی مسلمان برادری ذاتی اور قومی مصلحتوں کی شکار ہے۔

4 - کشمیری قیادت کا کردار

گو کہ کشمیریوں کی حصول آزادی میں ناکامی میں بھارت کی فریب و مکاری اور سفاکی، پاکستان کی خودغرضی اور کوتاہ اندیشی اور عالمی برادری کی خودغرضی کا بھی بڑا ہاتھ ہے جس کی تفصیل پچھلے صفحوں میں بیان کی گئی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ کشمیریوں کی حصول آزادی میں ناکامی کی سب سے زیادہ ذمہ داری کشمیری قیادت پر عائد ہوتی ہے۔ کشمیری کا مطلب صرف وادیٔ کشمیر کے باشندے یا کشمیری بولنے والے نہیں بلکہ وادی، جموں، لداخ، آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان سمیت پوری ریاست جموں کشمیر کے باشندے ہیں۔ میری نظر میں کشمیری قیادت کی مندرجہ ذیل غلطیاں کشمیر کی آزادی کے راستے کی اہم ترین رکاوٹیں ہیں۔

(ا) قوم کے لئے باہر سے آقا درآمد کرنا

کشمیری قیادت کی سب سے بڑی غلطی بلکہ اپنے مادر وطن اور ہم وطنوں کے ساتھ اسکا سب سے بڑا ظلم یہ ہے کہ وہ اپنی قوم کیلئے باہر سے آقا درآمد کرتی رہی ہے۔ سولہویں صدی کے اواخر میں خودمختار کشمیر (جس کے اس وقت کے حکمران اہل تشیع تھے) کے سنی مسلمان رہنماؤں نے ہندوستان کے مغل حکمرانوں کو کشمیر پر قبضہ کرنے کی دعوت دی جسکے نتیجے میں کشمیر بالآخر اپنی خودمختاری کھو بیٹھا۔ افغان حکمرانوں حتیٰ کہ رسوائے زمانہ چراغ بیگ کو بھی کشمیری زعماء نے ہی اپنی قوم پر مسلط کر دیا تھا۔ پنجاب کے سکھوں کو کشمیری پنڈت بیربل دھر نے کشمیر پر قابض ہونے کی ترغیب دی اور 1947ء میں جب ریاست جموں کشمیر آسانی سے ایک خودمختار مملکت بن سکتی تھی جسکے نتیجے میں اس کے لئے ایک پرامن، خوشحال اور باوقار مستقبل یقینی ہو جاتا اس کے نیشنل کانفرنسی لیڈروں نے بھارت کو اپنے آقا کے طور پر درآمد کیا اور مسلم کانفرنس نے پاکستان کو چنانچہ دونوں کی حکومتیں کشمیر کے ایک ایک حصے پر قابض ہو گئیں اور اب ہماری جان نہیں چھوڑ رہیں۔

(ب) اتفاق فکر و عمل کا فقدان

ریاستی قیادت کی دوسری بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ ریاست کے مستقبل کے بارے میں ایک متفقہ رائے رکھنے کی بجائے کئی متضاد نظریوں میں بٹی ہوئی ہے جس کی وجہ سے ان کی صلاحیتیں، قوت، وسائل اور وقت حصول آزادی کی بجائے ایک دوسرے کے خلاف استعمال ہوتے ہیں۔ حصول آزادی کے لئے قومی قیادت، کم از کم اسکی اکثریت میں اتحاد فکر و عمل ضروری ہوتا ہے لیکن ہمارے ہاں یہ بنیادی

ضرورت ہی مفقود ہے اور جب یہ لوگ عالمی سطح پر جا کر مختلف اور متضاد مطالبات کرتے ہیں تو عالمی برادری پر اسکا منفی اثر پڑتا ہے اور وہ کشمیریوں کی کسی قسم کی مدد کرنے سے معذرت کا اظہار کرتی ہے۔

(ج) کشمیر فروشی

کشمیری قوم کی ایک اور بدقسمتی یہ ہے کہ اس کی اکثر سیاسی جماعتیں اور سیاسی لیڈر اپنے قومی مفاد سے کہیں زیادہ اپنے بیرونی آقاؤں کے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں اور ان خدمات کے عوض ان سے نقد، جنس یا عہدوں کی شکل میں مراعات حاصل کرتے ہیں۔ مجھے 1996ء میں مقبوضہ کشمیر واپس گئے اپنے ایک سابقہ ساتھی نے فون پر بتایا کہ ''امان صاحب کشمیر میں 'را' (RAW) اور 'آئی ایس آئی' کے پیسوں کا سیلاب آیا اور آپ کے نظریہ خودمختار کشمیر کو بہا لے گیا''۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کشمیری لیڈروں اور مجاہدوں، حریت پسندوں اور ٹاسک فورس والوں کی ان تنخواہوں اور وظیفوں (خواہ بھارت کی طرف سے ملتی ہوں یا پاکستان کی طرف سے) اور 75 لاکھ روپے کی اس رقم میں کوئی فرق نہیں جس کے عوض 1846ء میں (معاہدہ امرتسر کے تحت) کشمیر بکا تھا۔ فرق ہے تو صرف اتنا کہ 1846ء میں کشمیر فروش انگریز حکومت تھی اور آج کشمیر فروشی کشمیر کے اپنے فرزند کر رہے ہیں۔ حیف صد حیف!

(د) قیادت میں اصولوں اور قدروں کا فقدان

آج کشمیر کی سیاسی قیادت حب الوطنی، اصول پرستی، سیاسی قدروں، اخلاقیات، حق گوئی، وسیع القلبی، کردار و گفتار اور ظاہر و باطن میں ہم آہنگی، قومی غیرت، انصاف پسندی اور جذبہ ایثار و قربانی سے محروم ہوتی جا رہی ہے۔ اس سلسلے میں درجنوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن میں صرف تین پر اکتفا کروں گا۔

(I) ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے کم از کم دو الیکشن ریاست کی اندرونی خودمختاری کی بحالی کے نام پر جیتے۔ پھر اسمبلی نے دو تہائی اکثریت سے اندرونی خودمختاری کی بحالی کا مطالبہ کیا لیکن دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہونے کی دعویدار بھارتی حکومت نے کشمیر اسمبلی کے اس اکثریتی فیصلے کو نہایت حقارت سے ٹھکرا کر کشمیریوں کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ مارا تھا لیکن قومی غیرت سے محروم فاروق عبداللہ اور اس کے ساتھی اس کے باوجود اسی تنخواہ پر کام کرتے رہے۔ یہی نہیں بلکہ فاروق عبداللہ اور ساتھیوں کے لئے (آقا بنانے کے سلسلے میں) بھارتی کانگریس، جنتا دل اور بی جے پی میں کوئی فرق نہیں جو انہیں اقتدار کی لنگڑی کرسی پر بٹھائے رکھے، وہی ان کا آقا۔

(II) کشمیر میں ایسے لیڈروں کی بھی کمی نہیں جو ریاستی اسمبلی کے ممبر رہ چکے ہیں اور کئی بار الیکشن کے دوران بھارتی اور ریاستی آئین (یہ دونوں آئین پوری ریاست کو بھارت کا آئینی حصہ قرار دیتے ہیں) سے وفاداری اور اسے تسلیم کرنے کا تحریری طور پر حلف اٹھانے کے بعد سیاسی سٹیج پر اعلان

کرتے ہیں کہ وہ ریاست کو بھارت کا حصہ تسلیم ہی نہیں کرتے یہاں تک کہ خود کو کٹر پاکستانی بھی قرار دیتے ہیں۔ کیا یہ حقیقت ان لوگوں کے اخلاقی دیوالیہ پن کا بین ثبوت نہیں؟ میں ایسے لیڈر بھی ہیں جو اپنے ان سیاسی اعلانات کے باوجود اسمبلی ممبر کی حیثیت سے اسکی تمام مراعات بشمول تنخواہ، الاؤنس اور پنشن بھی وصول کرتے ہیں۔ کشمیر میں ایسے لیڈر بھی ہیں جو بھارتی سیاسی اور صحافتی زعما کو بھارت نواز ہونے کا یقین دلاتے ہیں لیکن بھاری رقوم پاکستان سے لیتے ہیں۔ قول و فعل کے اس مجرمانہ تضاد کو کیا نام دیا جائے؟ اگر یہ کہا جائے کہ کشمیری سیاست میں منافقت اور دوہرے معیار کا غلبہ ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

(III) آزاد کشمیر کی سیاسی قیادت اگرچہ تحریک آزادی سے گہری وابستگی کا دعویٰ کرتی ہے لیکن یہ دعویٰ حقیقت سے کہیں زیادہ صرف دکھاوا ہے۔ میں نے ریاست کی تحریک آزادی اور سیاسی وحدت سے وابستگی کے بلند بانگ دعوے کرنے والے اہم پوزیشنوں کے حامل آزاد کشمیری لیڈروں کو تحریک آزادی کو ذاتی پبلسٹی اور ذاتی مفادات کے حصول کے لئے ہی استعمال کرتے اور علاقائی بنیادوں پر دلائل دیتے دیکھا اور سنا ہے۔

(IV) کشمیری لیڈروں کا ذاتی کردار

کسی محکوم قوم کی حصول آزادی میں کامیابی اور ناکامی کا خاصا دارومدار اس کے قائدین کے اجتماعی اور انفرادی کرداروں پر ہوتا ہے۔ جنوبی افریقہ کو بدترین نسلی امتیاز سے نجات دلانے میں افریقن نیشنل کانگریس کی جہدِ مسلسل اور دنیا کے باضمیر اور انصاف پسند حلقوں کی طرف سے عملی حمایت کے علاوہ جنوبی افریقہ کے عظیم لیڈر نیلسن منڈیلا کی عظیم قربانیوں، وسیع القلبی اور وسیع النظری کا بھی بہت بڑا ہاتھ تھا۔ شومئی قسمت کہ کشمیر اس سلسلے میں بھی بڑا بدقسمت ثابت ہوا ہے۔ کشمیری قیادت کے اجتماعی کردار کی کچھ مثالیں پچھلے صفحوں میں بیان ہوئی ہیں۔ کشمیری لیڈروں کی وہ ذاتی اور انفرادی کمزوریاں جنہوں نے تحریک آزادی پر بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر منفی اثر ڈالا ہے یا اس کے راستے میں رکاوٹ بنی ہیں ہزاروں کی تعداد میں گنی جاسکتی ہیں۔ لیکن میں یہاں ان کا ایک بہت چھوٹا حصہ ہی پیش کروں گا اور اس سے پہلے اس بات کا اعتراف بھی کرتا چلوں کہ جن اصحاب کی کمزوریوں کی نشاندہی کر رہا ہوں ان میں خوبیاں بھی ہونگی بلکہ یقیناً ہیں لیکن یہاں موضوع ان کی خوبیوں کا نہیں ان کی ان کمزوریوں کا ہے جو تحریک آزادی کے لئے نقصاندہ اور حصول آزادی کے راستے میں رکاوٹ ثابت ہوئیں اور ہو رہی ہیں (اور 1947ء کے بعد کی قیادت ہی کی کمزوریوں کی نشاندہی کرونگا)۔

بھارتی مقبوضہ کشمیر کی گذشتہ نصف صدی کی بالائی قیادت کو شیخ محمد عبداللہ، بخشی غلام محمد، مرزا افضل بیگ، ڈاکٹر فاروق عبداللہ اور اب ظاہراً اور میڈیا کی حد تک آل پارٹیز حریت کانفرنس (APHC) کی قیادت تک محدود کیا جاسکتا ہے۔ آیئے ان کے ذاتی کردار کے منفی پہلوؤں پر ایک سرسری نظر ڈالیں۔

شیخ محمد عبداللہ کو کشمیر کا بے تاج بادشاہ قرار دینے میں گو مبالغہ آرائی زیادہ تھی البتہ وادیٔ کشمیر کی حد تک اس میں خاصا وزن تھا اور اگر وہ غلطی پر غلطی نہ کرتے تو انہیں بڈشاہ ثانی کہنا بھی کچھ غلط نہ ہوتا۔ لیکن ان کی کوتاہ بینی جوان کے ذاتی کردار کی بڑی کمزوری تھی نے ان سے بھارتی لیڈر آنجہانی پنڈت نہرو پر ضرورت سے کہیں زیادہ اعتماد کرایا جس کے نتیجے میں کشمیر بھارت کے چنگل میں پھنس گیا۔ شیخ صاحب نے انتہائی نازک موقعوں پر انتہائی غلط فیصلے کئے اور 'لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی' کے مصداق ان کی لمحوں کی خطاؤں کی سزا پوری قوم نصف صدی سے بھگت رہی ہے۔ شیخ صاحب کی یہ غلطیاں جن میں سے کچھ کا خود انہوں نے اعتراف کیا۔ ہے اب ایک کھلی کتاب ہیں البتہ کچھ باتیں ابھی وادی سے باہر کی دنیا سے مخفی ہیں۔ جن کا یہاں مختصر ذکر ضروری ہے۔

شیخ صاحب کی آمرانہ طبیعت خاص کر ساتھیوں کی خدمات کو نظر انداز کرنے اور ان سے ذاتی وفاداری کے حلف لینے کی روش نے ریاست میں جمہوری قدروں کو پنپنے نہیں دیا۔ ان کی خودغرضی نے ریاست کے مہاراجہ ہری سنگھ کے خاندانی راج کے خلاف طویل جدوجہد کے باوجود اپنا خاندانی راج قائم کرایا۔ انہوں نے اپنے مخلص، محبِ وطن اور طویل قومی خدمات کے حامل ساتھیوں کو نظر انداز کر کے اپنے بیٹے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو جس کی سیاسی خدمات نہ ہونے کے برابر تھیں، پہلے بھارتی پارلیمنٹ کا ممبر اور پھر نیشنل کانفرنس کا صدر بنا کر اس کے لئے چیف منسٹر بننے کا راستہ صاف کر دیا۔ اس سے پہلے انہوں نے چیف منسٹری حاصل کرنے کے لئے 1975ء کے اندرا عبداللہ معاہدے کے تحت پوری ریاست جموں کشمیر کو بھارت کا آئینی حصہ تسلیم کیا تھا۔ خودغرضی کا یہ حال تھا کہ انہوں نے اپنے داماد غلام محمد شاہ کو لجسلیٹو کونسل کا ممبر بنانے کے لئے اپنے دیرینہ، مخلص اور وفادار ساتھی مرزا محمد افضل بیگ کو (جو اپنے داماد غلام قادر بیگ کو کونسل کی اس نشست پر منتخب کرانا چاہتے تھے) وزارت سے برطرف کر دیا اور بعد میں نیشنل کانفرنس سے بھی نکال دیا۔ اس پائے کے قومی لیڈروں کی اس قسم کی طوطا چشمی اپنی مثال آپ ہے۔ 1977ء کے ریاستی اسمبلی کے انتخابات میں شیخ صاحب کی پارٹی کو دو تہائی اکثریت سے بھی زیادہ نشستیں مل گئیں۔ چنانچہ اگر شیخ صاحب اپنی اس مضبوط پوزیشن کو قومی حقوق کے حصول کے لئے استعمال کرتے تو ان کی بات میں بہت وزن ہوتا اور بھارت کے علاوہ عالمی برادری بھی ان کی بات ماننے پر مجبور ہو جاتی لیکن انہوں نے اپنی اس مضبوط پوزیشن کو اپنے ذاتی اور خاندانی مفاد کے حصول اور تحفظ کے لئے استعمال کیا۔ دولت کی لالچ بھی زندگی کے آخری سالوں میں ان کی شخصیت کا حصہ بن گئی تھی۔ الغرض شیخ صاحب کی فکری کمزوریوں، خودغرضی، دولت کی لالچ اور آمرانہ طبیعت کی کشمیریوں کو انتہائی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔

بخشی غلام محمد جسے خالدِ کشمیر کا خطاب دیا گیا تھا (شیخ محمد عبداللہ کو شیرِ کشمیر، چوہدری غلام عباس کو قائدِ ملت اور رئیس الاحرار، مرزا افضل بیگ کو فخرِ کشمیر، مولانا مسعودی کو مفکرِ کشمیر اور غلام محی الدین قرہ کو بلبلِ کشمیر کا خطاب دیا گیا تھا) شیخ صاحب کا دستِ راست اور مارچ 1948ء سے اوائل اگست 1953ء تک ریاست کا ڈپٹی پرائم منسٹر تھا۔ 1952ء کے دہلی اکارڈ کے باوجود شیخ صاحب اور بھارت کی مرکزی

حکومت، جو شیخ صاحب سے کیے گئے اپنے وعدوں سے تیزی سے منحرف ہو رہی تھی، کے مابین اختلافات کی خلیج بڑھتی جا رہی تھی۔ انہی دنوں کشمیر میں افواہ پھیل گئی کہ بھارتی حکومت بخشی غلام محمد کو شیخ صاحب کے خلاف استعمال کرنا چاہتی ہے تو بخشی غلام محمد نے ایک اخباری بیان کے ذریعہ اعلان کیا کہ دوسرے مسلمانوں کیلئے تو ایمان کے پانچ ستون ہوتے ہیں لیکن بخشی غلام محمد کے لئے چھ ستون ہیں اور چھٹا ستون اپنے قائد شیخ محمد عبداللہ سے وفاداری کا ہے اور بخشی غلام محمد، شیخ محمد عبداللہ کی اطاعت اور اس سے وفاداری کو اپنے ایمان کا حصہ تصور کرتا ہے لیکن اس اعلان کے صرف ایک ہفتہ بعد اسی بخشی غلام محمد نے ڈاکٹر کرن سنگھ صدرِ ریاست، بھارت کے جنرل بی۔ ایم۔ کول اور کشمیر کیبنٹ کے وزیر درگا پرشاد دھر سے ملکر شیخ محمد عبداللہ کو وزارت عظمیٰ سے معزول کرا کے انہیں ان کے سینکڑوں ساتھیوں سمیت پس دیوارِ زندان بھیج دیا اور خود اس کی جگہ وزیر اعظم بن بیٹھا۔ یہ تھا ہمارے چوٹی کے لیڈروں کا ذاتی کردار۔ بخشی غلام محمد کے اس کردار نے کشمیر پر بھارت کے استبدادی پنجے مضبوطی سے گاڑنے میں انتہائی اہم کردار ادا کیا۔

بخشی غلام محمد کی غداری کے بعد مرزا افضل بیگ شیخ صاحب کے بہت نزدیک رہے۔ سالہا سال تک پس دیوارِ زنداں رہے اور اپنی، شیخ صاحب کی اور دوسرے ساتھیوں کی اس جدوجہد کو کشمیریوں کو انکی عزت و آبرو واپس دلانے کیلئے جدوجہد قرار دیتے رہے اس دوران کشمیری عوام نے بھی ان دونوں کیلئے بے مثال قربانیاں دیں جن میں 1500 سے زیادہ افراد کی جان کی قربانی، ہزاروں کی لمبی قید و بند اور اس سے بھی بڑی تعداد کی ذرائع معاش سے محرومی شامل تھیں۔ لیکن بیگ صاحب کے بھارتی وزیر اعظم کے نمائندے پارتھا سارتھی کیساتھ طویل مذاکرات کے نتیجے میں اندرا عبداللہ معاہدہ ہوا جسکے تحت شیخ صاحب اور بیگ صاحب نے معاہدے کے پہلے ہی جملے میں ریاست جموں کشمیر کو بھارت کا آئینی حصہ تسلیم کیا۔ جسکے عوض شیخ صاحب کو ریاست کی چیف منسٹری اور بیگ صاحب کو ڈپٹی چیف منسٹری ملی اور انہوں نے 25 فروری 1975ء کو ان عہدوں کا حلف اٹھایا۔ یہی نہیں بلکہ کچھ مدت بعد بیگ صاحب نے اقتدار کے نشے میں چور ہو کر اپنی، شیخ صاحب کی اور عوام کی قربانیوں بھری جدوجہد کو اسمبلی میں تقریر کے دوران "22 سالہ سیاسی آوارہ گردی" قرار دیا۔ یہ تھی "فخرِ کشمیر" کے سیاسی کردار کی ایک جھلک۔

1993ء میں قائم ہونے والی آل پارٹیز حریت کانفرنس (APHC) ریاست کے سیاسی حالات اور پاکستان کی مکمل حمایت کے بل بوتے پر ریاستی عوام کی نمائندگی کی دعویدار بن گئی۔ اس تنظیم کے لیڈروں میں خاصی تعداد ان لیڈروں کی ہے جنہوں نے بھارت سے وفاداری کا حلف اٹھا کر اسمبلی کے الیکشن لڑے یا ان الیکشن لڑنے والوں کے پولنگ ایجنٹ رہے۔ ہر امیدوار کو کاغذات داخل کرتے وقت بھارتی آئین یا ریاستی آئین سے وفاداری کا حلف اٹھانا پڑتا ہے اور یہ دونوں آئین ریاست جموں کشمیر کو بھارت کا آئینی حصہ قرار دیتے ہیں۔ اسمبلی کے انتخابات میں کامیاب ہونے والے کو ایک بار پھر اسمبلی کے ممبر کی حیثیت سے حلف اٹھانا پڑتا ہے کہ وہ آئین کا وفادار ہے اور رہے گا۔ پھر اسمبلی کے ممبر کی حیثیت سے اسے بڑی مراعات بمعہ الاؤنسز حاصل ہوتی ہیں۔ لیکن ہمارے کچھ لیڈر اس حلف اور مراعات کے

روزنامہ مرکز (6) جمعہ 6 اگست 1999ء

مدح گواہ ہے

کشمیریوں کے سب سے بڑے مخالف انکے اپنے لیڈر ہیں

امان اللہ خان

کشمیریوں کے سب سے بڑے دشمن ماضی اور حال کے وہ کشمیری لیڈر ہیں جو کشمیریوں کے اجتماعی مفاد کی قیمت پر پاک بھارت حکومت کے کٹھ پتلی بنے رہے ہیں

ماضی سے یہ تاثر ابھرا ہے کہ کشمیری پاک بھارت کی ہاں میں ہاں ملانے والے لوگ ہیں' اس لئے کشمیریوں کے مفاد کو نظر انداز کیا گیا ہے

مسئلہ کشمیر بھارت کے لئے آج بھی اتنا ہی تکلیف دہ ہے جتنا کئی عشرے پہلے تھا اور اس وقت تک تکلیف دہ رہیگا جب تک کشمیریوں کی مرضی کے مطابق حل نہ کیا جائے

روزنامہ جنگ راولپنڈی پنجگل 19 اگست 03

کشمیری لیڈروں کی تضاد بیانی سے تحریک کو نقصان پہنچ رہا ہے، امان اللہ

سردار قیوم اور بیرسٹر سلطان نے پاک بھارت کانفرنس کا بائیکاٹ کر کے اچھا نہیں کیا

کانفرنس میں شرکت سے کشمیری تنازعے کا اہم فریق تسلیم ہو سکتے تھے، چیئرمین لبریشن فرنٹ

کشمیری اپنی آزادی پاک بھارت دوستی پر قربان نہیں کر سکتے، امان اللہ

لبریشن فرنٹ کے سربراہ امان اللہ خان کی کشمیر کونسل کے صدر سے ملاقات

قوم کے دو بیٹوں کی جدائی کا دکھ ہمیشہ رہیگا، اختلافات کو بھلا کر سب کو مل کر آگے بڑھنا ہوگا، سردار عتیق

کشمیر کونسل کے سیکرٹریٹ میں صدر سردار عتیق احمد خان سے لبریشن فرنٹ کے سربراہ امان اللہ خان (اے این پی)

باوجود حلف کی دھجیاں اڑاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان لیڈروں کی نظر میں حلف کی کوئی وقعت نہیں اور جھوٹ بولنا کوئی بری بات نہیں۔ حریت کانفرنس کے ایک دھڑے کے چیئرمین سید علی شاہ گیلانی صاحب نے کم از کم چھ بار بھارت سے وفاداری کا حلف اٹھایا ہے اور آج (2004ء میں) بھی اسمبلی کے سابقہ ممبر کی حیثیت سے پنشن وصول کرتے ہیں۔ انہوں نے عمر رسیدہ لوگوں کو ملنے والی مراعات حاصل کرنے کیلئے 2003ء میں متعلقہ محکمے میں حلفیہ بیان دیا کہ وہ 65 سال سے زیادہ عمر کے بھارتی شہری ہیں یعنی چند ٹکوں کیلئے ریاست کو بھارت کا حصہ اور اپنے آپ کو بھارتی شہری تسلیم کیا۔ یہ ہے ہمارے سیاسی لیڈروں کا ذاتی کردار۔ یہی نہیں ہمارے اہم ترین مجاہدین کا کردار بھی زیادہ مختلف نہیں۔ حزب المجاہدین کے سپریم کمانڈر اور متحدہ جہاد کونسل کے سربراہ محمد یوسف شاہ صاحب (صلاح الدین صاحب) نے بھی 1987ء کے انتخابات میں بھارتی آئین سے وفاداری کا حلف اٹھا کر انتخاب لڑا تھا۔

محمد یاسین ملک 1994ء سے مسلسل اعلان کر رہے ہیں اور بھارتیوں اور عالمی برادری کو یقین دلا رہے ہیں کہ انہوں نے عسکریت ترک کی ہے۔ لیکن اس اعلان کے بعد کئی سال تک اسکے ساتھی (بمعہ کمانڈر انچیف) مظفر آباد میں قائم جہاد کونسل کے ممبر بلکہ عہدہ دار رہے اور تمام مراعات حاصل کرتے رہے اس طرزِ عمل کو کس نام سے پکارا جائے؟

حریت کانفرنس کے جن لیڈروں کے پاس 1988ء تک سائیکل بھی نہیں تھی آج ان میں سے اکثر کی جائیداد کروڑوں تک پہنچی یا پہنچنے والی ہے۔ اور یہی حال بہت سے عسکری کمانڈروں کا ہے۔ حریت کانفرنس کے اکثر لیڈروں (خاص کر پاکستان اور آزاد کشمیر میں مقیم لیڈروں) کے بچے اور رشتہ دار کشمیری شہیدوں کے بچوں کے لئے مختص نشستوں پر میڈیکل اور انجینئرنگ کالجوں میں زیرِ تعلیم ہیں۔ اور کچھ یورپ، امریکہ میں زیرِ تعلیم ہیں۔ شہیدوں کے ورثا کے لئے مختص بھاری رقوم کا خاصا حصہ بھی لیڈروں اور کمانڈروں کی الماریوں کی زینت بنا رہتا ہے یا ان سے بڑی بڑی کوٹھیاں اور پلازے بن رہے ہیں۔

الغرض سیاسی اور تحریک آزادیٔ کشمیر کی قیادت کے دعویدار لیڈروں کی بھاری اکثریت کا انفرادی اور اجتماعی کردار اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں جو تحریک آزادی کی کامیابی کیلئے لازمی ہے۔

یہ تھا ایک انتہائی مختصر سا تجزیہ بھارتی مقبوضہ کشمیر کے لیڈروں کے ذاتی طرزِ فکر و عمل کا۔ آیئے اب آزاد کشمیر کی طرف چلیں۔

جہاں تک آزاد کشمیر کی سیاسی قیادت کا تعلق ہے ساٹھ کی دہائی کے آخر تک یہ قیادت مرحوم چوہدری غلام عباس، مرحوم میر واعظ یوسف شاہ، مرحوم سردار محمد ابراہیم خان، مرحوم کے ایچ خورشید اور سردار عبدالقیوم خان کے گرد گھومتی تھی۔ اپنے سیاسی پس منظر اور غیر منقسم ریاست سے ان کے براہ راست تعلق کی بناء پر انہیں تحریک آزادی سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ گو (سوائے مرحوم کے ایچ خورشید جو ایک آزاد نظریئے کے حامل تھے) یہ سب اصحاب ریاست کے پاکستان سے الحاق کے داعی تھے البتہ مرحوم سردار ابراہیم خان نے اپنی سوانح عمری (Kashmir Saga) کے دوسرے ایڈیشن میں ریاست کو ایک آزاد

ملک بنانے کو بھی ایک اچھی تجویز قرار دیا ہے۔

آزاد کشمیر کی موجودہ سیاست اقتداری اور تحریکی سیاست میں منقسم ہے۔ موجودہ اقتداری قیادت (مسلم کانفرنس اور پیپلز پارٹی) یعنی سردار عبدالقیوم خان، سردار سکندر حیات، سردار عتیق احمد اور بیرسٹر سلطان محمود چوہدری پر مشتمل ہے۔ سردار عبدالقیوم صاحب کی تحریک آزادی سے خاصی دلچسپی کے باوجود وہ عام طور پر حکومت پاکستان کی کشمیر پالیسی کی حمایت کرتے رہے ہیں یہاں تک کہ انہوں نے 6 جنوری 2004ء کے پاک بھارت مشترکہ اعلان کا بھی خیر مقدم کیا اور اس پر دستخط کرنے والے جنرل پرویز مشرف کے اس اقدام کو سراہا حالانکہ اس اعلان میں نہ تو کشمیریوں کے حق خودارادیت کا کوئی ذکر ہے نہ کشمیریوں کو مسئلہ کشمیر کا فریق تسلیم کیا گیا ہے۔ دوسرے متذکرہ روایتی (اقتداری) سیاسی لیڈروں کے بارے میں مختصر ترین الفاظ میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ تحریک آزادی سے ان کی وابستگی کے بلند بانگ دعوؤں کے باوجود عملاً ان کی وابستگی حصول آزادی سے کہیں زیادہ حصول اقتدار و تحفظ اقتدار سے ہے۔ لبریشن لیگ کے سربراہ ملک عبدالمجید باتیں تو آزادی کی کرتے ہیں اور وہ بھی خاصے مدبرانہ اور فلسفیانہ انداز میں، لیکن عملی پہلو انتہائی کمزور ہے۔ انہوں نے الحاق پاکستان کا حلف اٹھا کر آزاد کشمیر کا الیکشن بھی لڑا۔ آزاد کشمیر کی جماعت اسلامی تحریکی سیاست کی دعویدار ہے لیکن انتخابات میں بھی حصہ لیتی ہے البتہ اب تک ان کے سابق امیر عبدالرشید ترابی ہی ایک بار آزاد کشمیر اسمبلی کے ممبر منتخب ہو سکے ہیں۔ سردار اعجاز افضل کی امارت کے دوران یہ تنظیم خاصی سرگرم اور متحرک ہوگئی ہے اور اب تک اس کی نمایاں بلکہ تاریخی کامیابی آزاد کشمیر کی سیاسی قیادت کو گلگت بلتستان لے جا کر وہاں 15-16 مئی 2004ء کو وحدت کشمیر کانفرنس منعقد کرانا ہے۔ جموں کشمیر پیپلز پارٹی کے سردار خالد ابراہیم خاصی حد تک ایک اصول پرست سیاستدان ہیں البتہ کشمیر کو پاکستان کا قدرتی حصہ قرار دیتے ہیں۔ مولانا محمد یوسف اور پیر عتیق الرحمٰن سیاسی پارٹیوں کے سربراہ ہونے کے باوجود بنیادی طور پر مذہبی رہنما ہیں۔ جنرل محمد حیات خان ایک مرحلے پر آزاد کشمیر میں سب سے بڑی اپوزیشن پارٹی کے سربراہ تھے لیکن فوجی طرز فکر و عمل کے باعث وہ پوزیشن برقرار نہ رکھ سکے۔ ان کا کہنا ہے کشمیر ہے ہی پاکستان کا حصہ۔ آزاد کشمیر کی تحریکی سیاست میں سرفہرست لبریشن فرنٹ ہے جو ریاست کے تینوں حصوں کے علاوہ عالمی سطح پر بھی سرگرم عمل ہے۔ خودمختاری کی داعی دوسری تنظیمیں کشمیر فریڈم موومنٹ، شوکت مقبول بٹ کا این ایل ایف، نیشنل عوامی پارٹی، پی این پی کے دو گروپ اور لبریشن فرنٹ کا یاسین ملک گروپ اور روف کشمیری گروپ اور ان تمام پر مشتمل آل پارٹیز نیشنل الائنس یعنی 'اپنا' ہے ان پارٹیوں کا دعویٰ ہے کہ وہ خودمختاری کی حامی ہیں لیکن ان میں سے کچھ الحاق پاکستان کے نظریے کو تسلیم کرنے کا حلف اٹھا کر انتخابات میں حصہ بھی لیتی رہی ہیں۔ جہاں تک گلگت بلتستان کی قیادت کا تعلق ہے وہاں پاکستان کی افسر شاہی نے قیام پاکستان کے بعد اڑھائی عشروں تک سیاسی قیادت کی پیدائش پر ہی پابندی لگائے رکھی۔ البتہ گزشتہ تین عشروں سے قیادت ابھر رہی ہے لیکن فی الحال وہ گلگت بلتستان کے مقامی، سیاسی، قانونی اور آئینی مسائل میں ہی پھنسی ہوئی ہے۔ اگرچہ وہاں کی درجن بھر تنظیموں

کے اتحاد گلگت بلتستان نیشنل الائنس نے ان علاقوں کو ریاست جموں کشمیر کا حصہ تسلیم کیا ہے لیکن اس کی کچھ اہم رکن پارٹیاں الائنس کے طرز عمل سے مطمئن نہیں۔ پاکستانی حکام کے علاوہ فرقہ وارانہ ذہنیت کے مقامی مذہبی رہنما بھی عوام میں سیاسی یکجہتی پیدا ہونے نہیں دیتے۔

قصہ مختصر، کشمیریوں کے آزادی سے محروم رہنے کی بڑی وجوہات میں کشمیریوں کی سیاسی قیادت میں مطلوبہ معیار کے جذبہ آزادی، حب الوطنی اور بے غرضی کا فقدان، باہر سے آقا درآمد کرنے کی بیماری، کوتاہ اندیشی اور بدترین قسم کی خودغرضی شامل ہیں۔ مالی مفادات اور اقتدار پر قومی مفاد کو قربان کرنا اس لیڈر شپ کی نظر میں کوئی بُری بات نہیں یہاں تک کہ اس میں اتحاد فکر و عمل جیسی بنیادی ضرورت بھی ناپید ہے۔

بھارت پر اسکے مقبوضہ کشمیر کا اسکے قبضے سے نکل جانے یا آزاد کشمیر بھی اسے مل جانے سے کوئی بڑا منفی یا مثبت اثر نہیں پڑے گا اسی طرح پاکستان کیلئے بھارتی مقبوضہ کشمیر ملنے، آزاد کشمیر بھی ہاتھ سے جانے سے بہت بڑا فرق نہیں پڑیگا کیونکہ وہ دونوں آزاد ہیں اور مسئلہ کشمیر کے ایک یا دوسرے فیصلے سے کم از کم ان کی آزادی متاثر نہیں ہوگی لیکن کشمیر کو آزادی ملنی اور نہ ملنی کشمیریوں کیلئے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے اسلئے تحریک آزادی کے سلسلے میں کشمیری قیادت کی چھوٹی سی غلطی بھی کشمیر کے مستقبل پر گہرا منفی اثر ڈالتی ہے۔

الغرض بھارت پاکستان اور عالمی برادری کے درج بالا غلط طرز ہائے عمل کے باوجود کشمیر کے ابھی تک آزاد نہ ہونے کی سب سے بڑی وجہ کشمیری قیادت کی مہلک کمزوریاں ہیں۔

ان حقائق کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ کشمیریوں کی غلامی کی 30 فیصد ذمہ داری بھارت پر، 20 فیصد پاکستان پر، 10 فیصد عالمی برادری پر اور 40 فیصد ذمہ داری کشمیری قیادت پر عائد ہوتی ہے۔

کشمیر اب بھی آسانی سے آزاد ہوسکتا ہے بشرطیکہ کشمیری قیادت بھارت یا پاکستان کے مفاد کے تحفظ پر کشمیر کے مفاد کو ترجیح دے، اسکی نظر میں وسعت ہو، ذاتی مفادات اس کی نظر سے دور ہوں، اس کے قول و فعل اور ظاہر و باطن میں ہم آہنگی ہو، منافقت اور دوہرا معیار اس کے نزدیک نہ جائیں، جنگ بندی لائن کے آر پار کی قیادت میں اتحاد و اتفاقِ فکر و عمل ہو اور سب سے اہم یہ کہ اس کے سامنے ایک واضح مشترکہ منزل اور اس کے حصول کے لئے بھی ایک واضح راستہ ہو اور پوری قیادت اس راستے پر متحد و منظم ہو کر چلے۔ الغرض

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جسکو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

حصہ ہشتم

گلگت بلتستان سے متعلق

1- علیحدہ باب کیوں؟
2- 1947ء کے کارنامے نظر انداز کیوں؟
3- حقوق کیلئے عوامی جدوجہد
4- تین تاریخی اجتماع، دو اہم فیصلے
5- ادب شاعری اور صحافت
6- گلگت بلتستان والوں کے شکوے
7- میری ذاتی کارکردگی
8- ممبران کشمیر اسمبلی
9- ممبران این اے کونسل
10- مفید کتابیں

CHIEF SECRETARIAT-POLITICAL

Order No.B. 480/47-P.B
17th July, 1947

His Highness the Maharaja Bahadur has been pleased to command that:

(1) The administration of the entire Gilgit territory i.e. former Gilgit Wazarat north of the Indus and all political districts be taken over on 1st August

(2) The above together with Bonji will form the Gilgit Frontier Province.

(3) A post of Governor in the grade of 700-40-900 with the usual Frontier allowance and a sumptuary allowance of Rs.200 p.m is sanctioned.

(4) Brigadier Ghansara Singh is appointed Governor. He will draw his personal pay Rs.1000 together with Frontier and sumptuary allowances.

(5) For revenue and general administration work three officers-one Revenue Assistant and two Naib-Tehsildars are sanctioned. These officers, will draw Frontier allowances according to rules. Brigadier Ghansara Singh will personally select the above officers.

(6) Services of two British officers, one as Assistant Governor Chilas and one as Commander Gilgit Scouts be taken over for a period of one year each. The emoluments of these officers will be sanctioned later when we know the class of officers we are getting.

(7) The Company stationed at. Bonji may be re-enforced by one more company.

(8) The Budget for the Gilgit Frontier province will be sanctioned when full details are known and have been scrutinized.

By Command,

(Sd.) R.C Kak,
Prime Minister.

ریاست جموں کشمیر کے مہاراجہ کے احکامات کے تحت ریاست کے وزیراعظم پنڈت رام چند کاک نے 17 جولائی 1947ء کو آرڈر جاری کیا جس میں انگریزی کے زیر انتظام گلگت کو دوبارہ ریاست کی تحویل میں آنے اور اسے ریاست کا تیسرا صوبہ بنانے کی تفصیلات درج ہیں

HEADS OF AGREEMENT WITH HON'BLE MINISTER WITHOUT PORTFOLIO AND THE PRESIDENT ALL J&K MUSLIM CONFERENCE AND THE PRESIDENT AZAD KASHMIR GOVT.

III. Division of functions between the Government of Pakistan and Azad Kashmir Government and the All J&K Muslim Conference.

A. Matters with the purview of the Pakistan Government.

I. Defence (as modified under C.R. No. 149/49).

II. Foreign Policy of Azad Kashmir. III. Negotiations with UNCIP.

IV. Publicity in Foreign countries and in Pakistan V. Coordination of arrangements of relief and Rehabilitation of Refugees. VI. Coordination of publicity in connection with Plebiscite. VII. all activities within Pakistan regarding Kashmir such as procurement of food, civil supplies, transoport, running of refugee camps and medical aid. VIII. All affairs of Gilgit, Ladakh under control of Political Agent.

B. Matters with the purview of AK Government.

I. Policy with regard to administration of AK Territory. II. General supervision of administration in AK Territory III. Publicity with regard to the activities of Azad Kashmir Government and administration. IV. Advise to Hon'ble Minister without Portfolio with regard to the negotiations with UNCIP. V. Development of economic resources of AK Territory.

C. Matters with the purview of Muslim Conference

I. Publicity with regard to Plebiscite within AK Territory II. Field work and publicity in the Indian occupied area of the State III. Organization of Political activities in the AK Territory in Indian occupied area of the State IV. Preliminary arrangements in connection with the Plebiscite. V. Organization of contesting the Plebiscite. VI. Political work and publicity among the Kashmiri refugees in Pakistan. VII. Advise the Hon'ble Minister without Portfolio with regard to the negotiations with UNCIP.

I agree to this in so far as this concerns with the part regarding the Muslim Conference
Sd/- Ghulam Abbas
President,
All J&K Muslim Conference.

Sd/- Mohd. Ibrahim Khan
President,
Azad Kashmir Government.

Sd/-
(M. A. Gurmani)
Minister without Portfolio
Government of Pakistan

28 اپریل 1949ء کے معاہدہ کراچی کا متن جسکے تحت گلگت بلتستان اور مسئلہ کشمیر سے
متعلق معاملات کو حکومت پاکستان کی تحویل میں دیا گیا

گلگت بلتستان سے متعلق

1۔ علیحدہ باب کیوں؟

2۔ 1947-48ء کے کارنامے نظر انداز کیوں؟

میں نے ''جہدِ مسلسل'' کی پہلی جلد میں بھی گلگت بلتستان کے لئے ایک الگ باب مختص کیا تھا جس میں گلگت بلتستان کی تاریخ اور جغرافیے کے علاوہ 48-1947ء کی جنگ آزادی کی کچھ تفصیلات بھی درج تھیں۔ اپنی سوانح عمری میں گلگت بلتستان کیلئے ایک الگ باب مختص کرنے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ان علاقوں کی تاریخ وجغرافیے کے بارے میں بیرونی دنیا خاص کر آزاد کشمیر، بھارتی مقبوضہ کشمیر اور پاکستان میں لوگوں کو بہت کم معلومات حاصل تھیں بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ دنیا کو ان علاقوں سے متعلق حقائق سے قصداً بے خبر رکھا گیا تھا۔ میں کتاب کی دوسری جلد میں بھی گلگت بلتستان کیلئے ایک الگ باب اسلئے رکھ رہا ہوں کہ دنیا ان اہم علاقوں کی آئینی حیثیت اور اپنے حقوق کے لئے یہاں کے عوام کی جدوجہد کے علاوہ یہاں کی سیاسی، سماجی، معاشی صورتحال اور تہذیب وتمدن کے بارے میں بھی آگاہی حاصل کرے۔

اس بات کے بارے میں دو آراء نہیں کہ 48-1947ء کا مختصر سا عرصہ گلگت بلتستان کی طویل تاریخ کا سنہرا بلکہ سب سے زیادہ قابل فخر باب ہے۔ کیونکہ اس قلیل عرصے میں یہاں کے عوام، گلگت سکاؤٹس اور کشمیر آرمی کے اکثر مسلمان افسروں نے بغیر قابل ذکر بیرونی امداد کے ستر ہزار (70000) مربع کلومیٹر سے زیادہ علاقہ بھارتی اور ڈوگرہ شخصی راج کے تسلط سے آزاد کرایا۔

گذشتہ کچھ عرصے کے دوران گلگت بلتستان کے اس تاریخ ساز عہد کے بارے میں بہت سی کتابیں منظر عام پر آئی ہیں جن کی وجہ سے جہاں اس عہد سے متعلق بہت سے اہم حقائق کے بارے میں تفصیلات سامنے آئی ہیں وہاں اس دور کے کچھ اہم حالات وواقعات کے بارے میں انتہائی خطرناک قسم کا ابہام بھی پیدا ہو رہا ہے جسکے نتیجے میں آئندہ نسلوں اور دنیا کی نظر میں ان علاقوں کی تاریخ کے اس قابل فخر باب کی اہمیت میں کمی بھی آسکتی ہے اور اس ابہام کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ کتابیں لکھنے والوں میں سے اکثر نے تاریخ نویسی کے اس بنیادی اصول یعنی مورخ کو جج ہونا چاہیئے وکیل نہیں، سے سراسر انحراف کیا ہے۔ جج کی کوئی ذاتی رائے نہیں ہوتی وہ مصدقہ حالات وواقعات اور زبانی، حالاتی اور دستاویزاتی گواہی کی بنیاد پر فیصلہ دیتا ہے خواہ وہ فیصلہ کتنا ہی تلخ کیوں نہ ہو جبکہ وکیل ہر ممکن طریقے سے اپنے (موکل کے) موقف کو

سچ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے خواہ اسے اس سلسلے میں غلط بیانی یا حقائق سے چشم پوشی ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ عام طور پر وکیل اپنے مثبت نکات اور حریف کے منفی نکات کو بڑھا چڑھا کر اور حریف کے مثبت نکات اور اپنے منفی نکات کو بہت ہی گھٹا کر پیش کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر وکیل جج کو قائل نہ کر سکے تو اسے کنفیوز کرنے کی کوشش کرتا ہے یعنی اسکے ذہن میں ابہام پیدا کرتا ہے اور وکیلوں کے اس طرزِ عمل کے نتیجے میں اصل حقائق ان مباحثوں کے ملبے تلے دب کر سطحی نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور گنے چنے کچھ محققوں کے سوا عوام کی نظریں اس سلسلے میں سطحی ہی ہوتی ہیں۔ اسطرح گلگت بلتستان کی تاریخ کے اس قابل فخر باب سے متعلق کچھ انتہائی اہم معاملات کے بارے میں شدید ابہام پیدا ہو گیا ہے اور اس ابہام میں حکومتی پالیسی نے مزید اضافہ کیا ہے۔

میں 48-1947ء میں سولہ سترہ سال کا نوجوان تھا اور وادیٔ کشمیر میں زیرِ تعلیم تھا۔ اسلئے گلگت بلتستان کے اس دور کے حالات و واقعات کا عینی شاہد نہیں نہ میرے پاس اب اتنا وقت ہے کہ میں عشروں کی تفصیلی تحقیق کے ذریعہ اس دور کے بارے میں کی گئی غلط بیانیوں، مبالغہ آرائیوں اور چشم پوشیوں کی مدلل اور نا قابل تردید بنیادوں پر تصحیح کر سکوں۔ اسلئے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میں اس باب کو نہ ہی چھیڑوں تو بہتر ہے تا کہ اس ابہام میں مزید اضافہ نہ ہو۔

مجھے امید ہے مستقبل کا کوئی محنتی نوجوان اور غیر جانبدار محقق گلگت بلتستان کی تاریخ کے اس اہم ترین باب سے منسلک اہم ترین واقعات کے بارے میں اصل اور نا قابل تردید حقائق سامنے لائے گا لیکن یہ کوشش مستقبل قریب میں ہونی چاہیئے کیونکہ وقت بھی عام طور پر حقائق پر پردہ ڈالتا ہے اور حقائق تاریخ کا حصہ بنائے گئے وقت کی گرد تلے دب کر کچھ مدت بعد دکھائی کبھی نہیں دیتے۔

3- گلگت بلتستان کے عوام کی اپنے حقوق کیلئے جدوجہد

1946ء میں مشہور کشمیری لیڈر شیخ محمد عبداللہ اپنے پہلے سیاسی دورے پر استور آئے لیکن اس علاقے کے لوگوں میں کسی قسم کی سیاسی بیداری نہیں تھی۔ بلکہ بجز چند افراد کے کسی کو پتہ ہی نہیں تھا کہ شیخ محمد عبداللہ کون ہے، کیا چاہتا ہے اور سیاسی حقوق کیا ہوتے ہیں چنانچہ شیخ صاحب یہ تبصرہ کر کے کہ ان علاقوں کے عوام کو سیاسی طور پر جاگنے میں ابھی ایک صدی لگ سکتی ہے، واپس سرینگر چلے گئے لیکن بقول اقبال ''بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں''۔ اسے معجزہ ہی کہئے کہ وہ لوگ جن کے بارے میں شیخ صاحب نے وہ تبصرہ کیا تھا وہ یہی نہیں کہ ایک صدی کی بجائے صرف ایک سال بعد جاگے بلکہ انہوں نے غلامی کا طوق بھی اتار پھینکا۔ لیکن آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا کے مصداق گلگت بلتستان کے عوام ڈوگرہ شخصی غلامی سے آزادی کے بعد پاکستان کی افسر شاہی کے چنگل میں پھنس گئے۔ جہاں انہیں شخصی راج سے آزادی ملی



اگست 1999ء میں (اوپر) اسکردو میں مقامی زعما سے خطاب۔ (درمیان اور نیچے) روپل ان گلگت میں مقامی زعما سے خطاب



(اوپر دائیں) لبریشن لیگ کی گلگت بلتستان کانفرنس 1993ء کے مقررین شیر ولی ایڈووکیٹ گلگت، میں، خواجہ فاروق، سردار قیوم، بیرسٹر سلطان اور سردار ابراہیم مرحوم (بائیں)
میری طرف سے گلگت بلتستان اور مقبوضہ کشمیر کے زعماء کو استقبالیہ (اسلام آباد) (نیچے) گلگت بلتستان ڈویژن کے کچھ ساتھی تنظیم کے کچھ مرکزی عہدہ داروں کے ساتھ













(اوپر) اکتوبر 1996ء میں اسلام آباد میں منعقد کی گئی گلگت بلتستان کانفرنس کے کچھ مناظر۔ (سامنے) میری طرف سے مرحوم محمد اسحاق آف بلتستان مقیم کراچی کی یاد میں منعقد کی گئی تقریب سے میرے علاوہ جسٹس مجید ملک، افضل علی شگری، محمد اقبال صاحب اور وجاہت حسن خان مرحوم کو خراج عقیدت پیش کر رہے ہیں۔



(اوپر) گلگت کے 1971ء کے کچھ سیاسی قیدی (بیٹھے بائیں سے دائیں) صوبیدار ایوب، قربان محمد، نثار ولی، بیں، ذوالفقار علی، محمد یونس (کھڑے) شیر ولی، پونیالی، غلام رسول، امیر حمزہ، سعید احمد، محمد نگین۔ فوٹو 1987ء (درمیان) عبدالخالق تاج، میں، جمشید دکھی، خوشی محمد طارق اور سیف الدین بٹ گلگت کے قوم پرست شاعر فضل الرحمن عالمگیر (دائیں سے دوسرے) کے ساتھ گلپور 2004ء (درمیان) کراچی میں زیر تعلیم گلگت بلتستان کے طلباء کو اپنے سکول میں عید ملن پارٹی دینا مدت تک میرا معمول رہا۔ (نیچے) پریس کلب راولپنڈی میں یوم آزادی گلگت بلتستان کے سلسلے میں ہونے والی تقریب 2002ء کے دوران شرکا کے اصرار پر خود کرنل (ر) کریم مجھے گلگتی لوک ناچ سکھا رہے ہیں۔

وہاں ان سے سیاسی نمائندگی چھن گئی اور ساتھ ہی ایف سی آر کا کالا قانون استور اور بلتستان پر بھی نافذ کیا گیا۔ سیاسی سرگرمی کا تو تصور ہی لوگوں کے ذہن سے نکال دیا گیا تا آنکہ 1951ء میں کشمیری رہنما مرحوم چوہدری غلام عباس نے گلگت بلتستان کا دورہ کر کے یہاں سیاسی سرگرمی شروع کی۔ گلگت استور اور اسکردو میں ان کا شاہانہ استقبال ہوا اور انہوں نے عظیم الشان جلسوں سے خطاب کیا اور تینوں جگہ آل جموں کشمیر مسلم کانفرنس کی شاخیں قائم کیں۔ بلتستان کیلئے انہوں نے مسلم کانفرنس کی سربراہی وزیر غلام مہدی ایم اے ایل ایل بی علیگ کو، استور کیلئے میرزادہ محمد عالم صاحب کو اور گلگت کیلئے غلام محمد گون اور جوہر علی خان کو دی۔ لیکن پاکستانی افسر شاہی نے نہ ہی مسلم کانفرنس کو قائم رہنے دیا نہ کشمیری سیاست کو پیر جمانے دیا۔ متذکرہ بالا اصحاب کو افسر شاہی نے اتنا تنگ کیا کہ اکثر کو گلگت چھوڑنا پڑا۔ محمد عالم صاحب کو استور کی انتظامیہ نے گرفتار کیا تو عوام نے حوالات کا دروازہ توڑ کر انہیں رہا کرایا۔ آخر انہوں نے مجبوراً سرکاری ملازمت اختیار کی۔ وزیر غلام مہدی پر جھوٹا کیس بنایا گیا جسے چوہدری صاحب غلام عباس مرحوم نے بڑی مشکل سے ختم کرایا اور گون صاحب اور جوہر علی مرحوم کو خاصی مدت تک گلگت سے باہر رہنا پڑا۔ گلگت بلتستان سے مسلم کانفرنس بلکہ سیاست کی بیخ کنی کے بعد مدت تک مکمل خاموشی رہی۔ آخر مرحوم کرنل حسن خان نے گلگت لیگ قائم کی لیکن سر منڈاتے ہی اولے پڑ گئے۔ تھوڑے ہی عرصے بعد اکتوبر 1958ء میں پاکستان میں مارشل لا کے نفاذ کے بعد گلگت لیگ بھی ختم ہوگئی۔ ادھر کراچی میں مقیم گلگت بلتستان کے لوگوں نے گلگت بلتستان یونائیٹڈ آرگنائزیشن بنائی تھی۔ اسکے صدر مرحوم محمد اسحاق آف بلتستان اور سیکرٹری میں تھا۔ ہم گلگت بلتستان کے عوامی حقوق کے بارے میں آواز اٹھاتے رہے بلکہ مارشل لا کے نفاذ سے کچھ ہی دن پہلے ہم نے وزیر اعظم پاکستان فیروز خان نون سے ملاقات کا وقت لیا تھا لیکن ملاقات سے پہلے ہی مارشل لا لگ گیا۔ بہر حال پچاس کے عشرے سے ساٹھ کے عشرے کے وسط تک بجز صدر آزاد کشمیر مرحوم کے ایچ خورشید گلگت بلتستان کے بارے میں کوئی موثر آواز نہیں اٹھی۔ (خورشید صاحب گلگت میں پیدا ہوئے تھے ان کے والد مولوی محمد حسین گلگت میں ہیڈ ماسٹر تھے) چھٹے عشرے کے وسط میں آزاد کشمیر میں جموں کشمیر محاذ رائے شماری قائم ہوا اور میں اسکا سیکرٹری جنرل منتخب ہوا۔ ہم نے تنظیم کے قیام کے ساتھ ہی تحریک آزادی کے ساتھ گلگت بلتستان سے متعلق معاملات پر بھی توجہ دی۔ ہم نے ''گلگت بلتستان میں ایجنسی نظام کیوں'' ''دستاویز غلامی'' کے عنوان سے دو کتابچے شائع کر کے پاکستان کے حکومتی ایوانوں کے علاوہ آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان میں تقسیم کئے۔ 1970ء میں آزاد کشمیر میں عام انتخابات ہوئے تو ہم نے مطالبہ کیا کہ گلگت بلتستان میں بھی منتخب حکومت قائم کی جائے۔ حکومت خاموش رہی تو ہم نے احتجاجاً ہفتہ گلگت بلتستان منایا اور پاکستان اور آزاد کشمیر کے اہم شہروں میں جلسے منعقد کرنے کے بعد 29 اکتوبر 1970ء کو ہم (محاذ رائے شماری کے مرکزی عہدہ دار) گلگت گئے جہاں ہمیں اسی رات بارہ بجے بھیڑ بکریوں کی طرح ایک جیپ میں ٹھونس کر ڈیڑھ سو میل دور علاقہ غیر میں پھینکا گیا جہاں سے تین دن کے بعد ہم راولپنڈی پہنچے جہاں ہمارے صدر عبدالخالق انصاری صاحب کو گرفتار کر کے ان پر ہفتہ گلگت بلتستان

کے دوران ایبٹ آباد میں گلگت بلتستان میں رائج طرز حکومت کے خلاف باغیانہ تقریر کرنے کے الزام میں مارشل لا کے تحت تین ماہ کی قید بامشقت سنا کر سنٹرل جیل ہری پور بھیج دیا گیا۔ ہم یعنی میں اور میرے ساتھی مقبول بٹ شہید، میر عبدالمنان، پیرزادہ غلام مصطفےٰ علوی اور جی ایم میر ایک ماہ بعد 27 نومبر 1970ء کو پھر گلگت پہنچے اور جلسے کی اجازت نہ ملنے پر گاڑی پر لاؤڈ سپیکر لگا کر تقریر کرتے ہوئے فضل الرحمٰن عالمگیر کی نظم ''سونی وطن گلگیت'' کا ریکارڈ بجاتے ہوئے شہر کے دو چکر لگائے اور عوام کو انکے حقوق کا احساس دلاتے رہے۔ تیسرے چکر پر ہمیں گرفتار کیا گیا۔ میرے ساتھیوں کو رات کو گلگت سکاؤٹس کے کوارٹر گارڈ (حوالات) میں رکھ کر صبح راولپنڈی روانہ کیا گیا اور مجھ پر بغاوت کا کیس بنا کر جیل بھیج دیا گیا۔ جہاں نوجوان امیر حمزہ سے ملاقات ہوئی جسے 29 اکتوبر کو ہمارے ساتھ ہی گرفتار کیا گیا تھا اور ہمیں واپس بھیج کر اسے جیل بھیج دیا گیا تھا۔

جموں کشمیر محاذ رائے شماری اور کے ایچ خورشید کے علاوہ گلگت بلتستان کے حقوق کیلئے چھٹے عشرے کے وسط میں بننے والا گلگت بلتستان جمہوری محاذ بھی خاصا کام کر رہا تھا۔ اسکے کرتا دھرتا پونیال کے فضل الرحمٰن عالمگیر، شیر ولی، خلیل الرحمٰن، گلگت کے رسول میر، متولی خان، استور کے امیر حمزہ اور فقیر محمد اور دریل تانگیر کے ملک مسکین تھے۔ یہ لوگ گلگت بلتستان کو آزاد کشمیر کا حصہ بنانا چاہتے تھے۔ ان تین تنظیموں کی ان سرگرمیوں نے حکومت پاکستان خاص کر وزارت امور کشمیر کو خاصا پریشان کر دیا تھا۔ آخر فیصلہ کیا گیا کہ گلگت بلتستان کیلئے ایک مشاورتی کونسل قائم کر کے یہاں کے عوام کا منہ بند کیا جائے اور ان پارٹیوں کی چیخ وپکار کو بے اثر کر دیا جائے۔ میرے جیل پہنچنے کے دوسرے تیسرے دن امیر حمزہ کو رہا کر دیا گیا۔ تاکہ ہم دونوں جیل میں کوئی خطرناک پروگرام نہ بنا سکیں۔ میں نے اس کی رہائی سے پہلے امیر حمزہ کو مشورہ دیا کہ وہ استور سے مجوزہ مشاورتی کونسل کا انتخاب لڑے جسکا اس نے رہا ہوتے ہی اعلان کیا۔ میں نے اپنے ایک رشتہ دار ٹھیکیدار مراد خان آف ہرچو اور ایک دوست عبدالرحمٰن لون آف استور خاص کو جو الیکشن لڑ رہے تھے درخواست کر کے امیر حمزہ کے حق میں دستبردار کرایا۔ چنانچہ امیر حمزہ استور کے راجہ خاندان کے اہم رکن اور سابق ممبر کشمیر اسمبلی کا چو محمد شاہ کو ہرا کر کونسل کا ممبر منتخب ہو گیا۔

27 نومبر کو گلگت میں میری موبائل تقریر اور گرفتاری نے عوام پر خاصا اثر ڈالا تھا۔ ادھر مشاورتی کونسل کے انتخابات کی گہما گہمی بھی تھی۔ اسی دوران گلگت میں ایک مقامی سیاسی پارٹی تنظیم ملت کا قیام عمل میں آیا۔ جوہر علی خان ایڈووکیٹ اسکے صدر اور سعید احمد ایڈووکیٹ جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے۔ جنوری 1971ء کے اوائل میں ایک بدنام اور راشی میجر یونس کی بیوی نے لڑکیوں کے سکول کی ہیڈ مسٹریس جو ایک شہید کی بیوہ اور گلگت میں خاصی ہر دل عزیز تھیں کے ساتھ اسکے دفتر جا کر بدتمیزی کی جسکے خلاف عوام خاص کر وکلا نے صدائے احتجاج بلند کیا تو انتظامیہ نے ان وکلا اور دیگر زعما کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا اور جیل والوں نے انہیں میری کوٹھڑی میں رکھا۔ ان اصحاب میں الطاف حسین، محمد عیسیٰ اور شیر ولی پونیالی (وکلا) کے علاوہ استور کے انجینئر محمد علی اور کریم خان شامل تھے۔ ہم رات دیر تک صورتحال پر غور کرتے

رہے۔ دوسرے دن صبح ہی شہر کے تقریباً پانچ ہزار افراد نے پتھروں، کلہاڑوں اور لاٹھیوں سے جیل پر حملہ کیا اور جیل کا بڑا دروازہ اور ہماری کوٹھڑی کا دروازہ توڑ کر اسیر وکلا کے ساتھ مجھے بھی جیل سے نکالا اور ہمیں کاندھوں پر اٹھا کر شہر کی طرف چل دیئے۔ راستے میں گلگت بلتستان کے حاکم اعلےٰ (ریذیڈنٹ) اے آر صدیقی نے گلگت سکاؤٹس کو حکم دیا کہ وہ جلوس پر گولی چلائیں لیکن گلگت سکاؤٹس نے (جو سب مقامی تھے) صرف ہوائی فائر کیے۔ اس پر ریذیڈنٹ نے ایک سپاہی سے رائفل چھین کر خود جلوس پر فائر کیے جس سے ایک شخص رجب علی شہید ہوا اور مذکورہ بالا عبدالرحمٰن لون سمیت سات افراد زخمی ہو گئے۔ رجب علی نے میرے زانو پر سر رکھ کر آخری ہچکی لی۔ ہم رجب علی کی لاش کو ہسپتال لے گئے لیکن ڈاکٹروں نے (احکامات بالا کے نتیجے میں) اسکا پوسٹ مارٹم کرنے سے انکار کیا۔ آخر پرائیویٹ ڈاکٹر اعجاز خان نے اعلیٰ اخلاقی جرأت اور حب الوطنی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسکا پوسٹ مارٹم کیا اور شام کو اسے سپرد خاک کیا گیا۔ رات کو میں اور کچھ وکلا برمس میں ماسٹر عادل خان کے ہاں رہے جنہوں نے اپنی ملازمت کا رسک لیکر ہمیں اپنے گھر رکھا۔ دوسرے دن ہمیں پتہ چلا کہ ہماری تلاش میں فوج گھر گھر تلاشی لینے والی ہے۔ لاؤڈ سپیکر پر اعلان بھی ہوتا رہا کہ جو شخص ہمیں پناہ دے اور ہماری کسی جگہ موجودگی کا علم ہونے کے باوجود حکام کو اطلاع نہ دے اسے کئی سال کی سزا دی جائے گی۔ ہم نے یہ سوچ کر کہ فوج کی طرف سے گھر گھر تلاشی کے نتیجے میں خونریزی ہو سکتی ہے۔ اپنے آپ کو خود ہی فوج کے حوالے کر دیا جس نے ہمیں اور جوہر علی خان کو جیل بھیج دیا جہاں ہمیں 27 دن تک دو دو کر کے دن رات ایک دوسرے سے باندھ کر رکھا گیا۔ اس اثنا میں بڑے پیمانے پر گرفتاریاں ہوئیں اور ان کے لئے جیل میں جگہ بنانے کیلئے خواتین قیدیوں، حوالاتیوں یہاں تک کہ عمر قید والے قیدیوں کو بھی رہا کر دیا گیا۔ جن مزید لوگوں کو گرفتار کیا گیا ان میں مرحوم امیر حمزہ آف استور اور غلام مصطفےٰ آف بگروٹ ممبران مشاورتی کونسل، ہنزہ کے صوبیدار صفی اللہ بیگ، مرحوم عبدالحمید آف مناور گلگت، ذالفقار علی ہنزہ مرتضیٰ آباد، عبدالرحیم (آف کشروٹ)، لطیف حسن مرحوم گلگت، سلمان بیگ مرحوم آف ہنزہ، خوشحال خان گلگت، قربان محمد کشروٹ گلگت، محمد نگین گلگت، دیدار علی گلگت، مرحوم صوبیدار محمد ایوب بسّین گلگت، مرحوم غلام محمد بٹ گلگت، محمد یونس کباڑی گلگت، سرزمان گلگت، دیار محمد گلگت، غلام مرتضیٰ مجنی محلّہ گلگت، عباس علی شاہ گلگت، عبدالقیوم گلگت، گل علی خان گلگت، تیفور شاہ اپھری گلگت، تیفور شاہ مجنی محلّہ گلگت، شاروی خان پونیال، عرب شاہ چلاس، غلام مصطفےٰ مجنی محلّہ گلگت، غلام اکبر بگروٹ، نادعلی گلگت، سلطان میر امپھری شامل تھے۔ ان میں سے امیر حمزہ اور غلام مصطفےٰ کو چند دن بعد رہا کیا گیا اور شاروی خان اور تیفور شاہ مجنی محلّہ بھی چند دن ہی جیل میں رہے۔

گلگت میں جیل سے باہر کام کرنے والوں میں کشروٹ کے گلباز چاچا، شکور محمد، یوسف جمال (اب ایڈووکیٹ)، ٹھیکیدار فضل احمد مرحوم، ٹھیکیدار فقیر محمد مرحوم بونجی اور ٹھیکیدار علی احمد جان ڈموٹ نے خاصا کام کیا۔ ممبران مشاورتی کونسل امیر حمزہ، غلام مصطفےٰ، محمد خورشید خان (اب چیف جسٹس) نے بھی کام کیا۔ ان دنوں راولپنڈی میں قیام پذیر گلپور کے فضل الرحمٰن عالمگیر، خلیل الرحمٰن، جگلوٹ کے شیر ولی

روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی / اسلام آباد (۳) ۲۷ فروری ۱۹۹۸ء

گلگت بلتستان، عوام بھیڑ بکریاں نہیں جن کا سودا کیا جائے: امان اللہ

انہیں ان کے آئینی حقوق فوراً دیئے جائیں

گلگت، لبریشن فرنٹ کے چیئرمین پولیس لاٹھی چارج سے شدید زخمی

لبریشن فرنٹ کا احتجاجی جلسہ، سوموار کو بعد از دوپہر دوبارہ ہوگا، پولیس اور مظاہرین میں پتھراؤ کا تبادلہ

امان اللہ کو گلگت سے گرفتار کر کے اسلام آباد روانہ کر دیا گیا

شمالی علاقوں کی غیر سیاسی فضا میں ہیجان، امان اللہ گلگت میں مظاہرے کے سلسلہ میں گئے تھے

Amanullah among Gilgit JKLF arrested activists

فضل اکبر حسن لنگر، نظام مصطفیٰ اور ملک شاہ ولایتی میں ایک پریس کانفرنس میں

11 جنوری 1971ء کے گلگت کے واقعات کی تفصیلات بیان کر رہے ہیں۔

The News International, Wednesday, April 29, 1998.

اور گلگت کے غلام مصطفےٰ، متولی خان اور مالک شاہ نے گلگت کے حالات سے دنیا کو آگاہ کرنے کیلئے بہت دوڑ دھوپ کی۔ طلبا تنظیم کے حشمت اللہ (اے آئی جی) محبوب علی خان (سابق ممبر قانون ساز کونسل) حسن خان (اب ڈپٹی کمشنر) اور عیسیٰ خان وغیرہ نے خاصی تگ و دو کی۔ کچھ مدت بعد حکومت کی چاپلوسی کرنے والوں پر مشتمل ایک جرگہ بٹھایا گیا جس نے جوہر علی خان، صفی اللہ بیگ، عبدالرحیم، عبدالحمید، صوبیدار ایوب، نادعلی، عباس علی شاہ، دیار محمد، غلام اکبر، گلی علی خان، محمد یونس کباڑی، غلام مرتضےٰ شاہ اور عرب شاہ کو عمر قید اور دوسری طویل سزائیں دیکر سنٹرل جیل ہری پور بھیج دیا۔ وکلا کے علاوہ انجینئر محمد علی، غلام محمد بٹ، کریم خان اور لطیف حسن کو گوپس قلعے بھیج دیا گیا۔ مجھ پر فرنٹیئر کرائمز ریگولیشنز (ایف سی آر) اور پاکستان پینل کوڈ کی جتنی دفعات کے تحت کیس رجسٹر ہوا ان کی کل سزا تین سزائے موت اور 191 سال کی قید ہوتی تھی۔

1972ء میں پاکستان میں پیپلز پارٹی کی حکومت آئی جس نے عمر قید والوں کو رہا کر دیا۔ باقی پہلے ہی رہا ہو چکے تھے۔ اور میں جو سب سے پہلے یعنی 27 نومبر 1970ء کو گرفتار ہوا تھا سب کے بعد یعنی 25 فروری 1972ء کو (ایک سال تین ماہ بعد) رہا ہو گیا۔

1972ء میں گلگت بلتستان جمہوری محاذ والوں یعنی فضل الرحمٰن، حشمت اللہ خان، متولی خان، خلیل الرحمٰن نے آزاد کشمیر اسمبلی سے گلگت بلتستان کے بارے قرارداد پاس کرائی لیکن اسکو عملی جامہ نہ پہنایا جاسکا۔

1974ء میں پاکستان کے وزیراعظم مرحوم ذوالفقار علی بھٹو نے گلگت بلتستان میں انتہائی دوررس مثبت نتائج کی حامل اصلاحات کیں۔ ادھر قراقرم ہائی وے پر آمدورفت شروع ہونے سے اقتصادی صورتحال خاصی تبدیل ہوگئی۔

گذشتہ تقریباً ڈیڑھ عشرے کے دوران گلگت بلتستان میں پاکستان اور کشمیری تنظیموں کی شاخوں اور مقامی سیاسی تنظیموں کی بھرمار ہوگئی ہے۔ چنانچہ خاصی تگ و دو کے بعد ستمبر 2002ء میں یہاں کی 14 تنظیموں یعنی پاکستان پیپلز پارٹی، مسلم لیگ (ق)، پاکستان مسلم لیگ (ن)، جمعیت علمائے اسلام (ف)، جماعت اسلامی آزاد کشمیر، جموں کشمیر لبریشن فرنٹ، پاکستان عوامی تحریک، متحدہ قومی پارٹی، بلاورستان نیشنل فرنٹ، قراقرم نیشنل موومنٹ، نادرن ایریاز رائٹس فورم، گلگت بلتستان تھنکرز فورم غریب قومی موومنٹ اور متحدہ طلبا محاذ گلگت بلتستان شامل ہیں پر مشتمل ایک اتحاد کا قیام عمل میں آیا جس کا نام گلگت بلتستان نیشنل الائنس رکھا گیا۔ اس الائنس کا مطالبہ ہے کہ مسئلہ کشمیر کے سلسلے میں ہونے والے مذاکرات میں گلگت بلتستان کے عوام کو بھی نمائندگی دی جائے اور مسئلہ کشمیر کے حتمی حل تک گلگت بلتستان کے عوام کو یہاں کیلئے حق حکمرانی دیکر یہاں آزاد کشمیر طرز کی حکومت قائم کی جائے اور کشمیر کونسل میں آزاد کشمیر کے برابر نمائندگی دی جائے۔ گلگت بلتستان نیشنل الائنس کے پہلے عہدہ داروں میں چیئرمین غریب قومی موومنٹ کے عنایت اللہ شمالی، وائس چیئرمین جمعیت العلماء اسلام کے مولانا عطاء اللہ شہاب، سیکرٹری جنرل پیپلز پارٹی کے

قربان علی، ڈپٹی سیکرٹری جنرل قراقرم موومنٹ کے محمد اقبال ایڈووکیٹ، سیکرٹری مالیات مولانا عبدالسمیع اور سیکرٹری اطلاعات انجینئر محبوب آف عوامی تحریک شامل تھے۔ انکے علاوہ بلاورستان نیشنل فرنٹ کے سربراہ نواز خان ناجی، متحدہ قومی موومنٹ کے میجر حسین شاہ، جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کے مقامی صدر ضیاء الحق، جماعت اسلامی کے مشتاق احمد ایڈووکیٹ تھنکر زفورم کے مرزا وجاہت حسن اسکے اہم ممبران سنٹرل کمیٹی ہیں۔ 2004ء میں عارضی انتخابات ہوئے جن میں میجر حسین شاہ صدر اور مشتاق احمد ایڈووکیٹ جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے۔ الائنس نے اب تک گلگت بلتستان، آزاد کشمیر اور پاکستان کے کچھ دورے کئے ہیں لیکن ابھی تک کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کی ہے۔ گذشتہ کچھ مدت کے دوران اسکی کچھ اہم ممبر پارٹیوں نے علیٰحدگی بھی اختیار کی۔ اگر یہ اتحاد قائم رہے اور مقاصد کے حصول کیلئے متحدہ جدوجہد ہوتی رہے تو بہت اچھی بات ہوگی۔

مشاورتی کونسل گذشتہ 35 سال میں قانون ساز کونسل میں تبدیل ہوگئی ہے۔ اسکا ایک ممبر ڈپٹی چیف ایگزیکٹو، ایک سپیکر، ایک لیڈر آف دی اپوزیشن اور چند ایک مشیر بنکر بڑی بڑی تنخواہیں اور مراعات لیتے ہیں۔ ان کی گاڑیوں پر پاکستان کا جھنڈا ابھی لہراتا ہے لیکن اختیارات کے لحاظ سے وہی لکیر کے فقیر۔ 2003ء میں پیپلز پارٹی کے ممبر سید جعفر شاہ نے گلگت بلتستان کیلئے آزاد کشمیر کے طرز کا ایک مسودہ آئین کونسل میں پیش کیا تھا لیکن ابھی تک اس پر بحث نہ ہوسکی نہ ہی غالباً ہوسکے گی۔ سیاسی تنظیموں کے علاوہ گلگت بلتستان کے آئینی اور سیاسی حقوق کیلئے سب سے زیادہ جدوجہد سنٹرل بار ایسوسی ایشن گلگت، طلبا تنظیموں خاص کر گلگت بلتستان سٹوڈنٹس سنٹرل آرگنائزیشن، بلتستان سٹوڈنٹس فیڈریشن، ناردرن ایریاز سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن (NASA)، حلقہ ارباب ذوق اور صحافیوں کی تنظیم نے کی ہے۔ گذشتہ ایک عشرے کے دوران گلگت بلتستان کے تعلق سے نصف درجن بھر ہفت روزے جاری ہوگئے ہیں جن میں کے ٹو، بادِ شمال، وادی، سیاچین، نقارہ، اذان اور چٹان شامل ہیں۔ کے ٹو، وادی اور نقارہ اب ایک پبلشنگ ادارے قراقرم پبلشنگ نیٹ ورک (KPN) کے زیر اہتمام شائع ہو رہے ہیں جس کے کرتا دھرتا راجہ حسین خان مقپون آف روندو بلتستان، سید مہدی صاحب آف گانچھے اور سعادت علی مجاہد آف گلگت ہیں۔ بادشمال آج سے کوئی چالیس سال قبل لاہور سے مرحوم غلام محمد بلتستانی شائع کرتے تھے جو چند سال ہی جاری رہ سکا۔ اب اسکے ایڈیٹر عابد عبداللہ صاحب ہیں اور اسلام آباد سے شائع ہوتا ہے۔ تازہ ترین اضافہ ہفت روزہ اذان کا ہوا ہے جسکے چیف ایڈیٹر مشہور شاعر، ادیب اور صحافی خوشی محمد طارق ہیں۔ اگر یہ ہفت روزے ہمت کریں تو علاقے کے عوام کو ان کے جائز جمہوری، آئینی اور سیاسی حقوق دلانے میں کہیں زیادہ موثر ثابت ہوسکتے ہیں۔

الغرض اگرچہ گذشتہ تقریباً چار عشروں کے دوران گلگت بلتستان میں عوامی سطح پر خاصی بیداری آئی ہے اور کچھ سیاسی حقوق بھی ملے ہیں لیکن جس رفتار سے دنیا آگے بڑھ رہی ہے گلگت

بلتستان والوں کی یہ سیاسی بیداری اور یہ حقوق ان حقوق اور سیاسی بیداری کے عشر عشیر کے برابر بھی نہیں جسکے گلگت بلتستان کے عوام مستحق ہیں اور جو انتہائی تیزی سے آگے دوڑنے والی دنیا کو جا لینے کیلئے ضروری ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے بڑی رکاوٹیں حکومت کی جمہوریت دشمن پالیسی اور فرقہ واریت کے علاوہ موافق ماحول اور عوام میں مناسب سیاسی شعور کی کمی ہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ موخر الذکر دو اولذکر کی ہی پیداوار ہیں تو بالکل غلط نہ ہوگا۔

4- گلگت بلتستان کے عوامی حقوق اور آئینی حیثیت
تین تاریخی اجتماع۔ دو اہم عدالتی فیصلے

1947ء سے ہی پاکستان کی افسر شاہی نے مخصوص مقاصد کے تحت گلگت بلتستان کے علاقوں کی آئینی حیثیت کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کئے اور وہاں کے عوام کو آئینی اور سیاسی حقوق سے محروم رکھا۔ چنانچہ گذشتہ چار عشروں سے زائد مدت کے دوران عوامی گروپوں اور سیاسی پارٹیوں کی طرف سے افسر شاہی کے اس طرز فکر وعمل کے خلاف آوازیں اٹھتی رہیں۔ اس سلسلے میں بے شمار اجتماعات ہوئے اور عدالتوں کے دروازے بھی کھٹکھٹائے گئے اور تحریکیں بھی چلائی گئیں۔ ان مقاصد کیلئے کی جانے والی سیاسی جدوجہد کی تفصیل ''آئینی اور سیاسی حقوق کیلئے جدوجہد'' کے عنوان کے تحت بیان کی گئی ہے موضوع کی نوعیت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ کچھ اہم اجتماعات اور عدالتی فیصلوں کی تفصیلات بھی تاریخ کا حصہ بنادی جائیں۔

اجتماعات

پہلا اجتماع : گلگت بلتستان کے عوامی حقوق کے حوالے سے سب سے پہلا اہم اجتماع 2 اپریل 1993ء کو اسلام آباد کے میریٹ ہوٹل میں جموں کشمیر لبریشن لیگ کے زیر اہتمام ہوا۔ اس میں آزاد کشمیر کے دو سابق صدور سردار محمد ابراہیم خان اور سردار عبدالقیوم خان، کئی وزراء، لبریشن لیگ کے سربراہ بیرسٹر سلطان محمود، محاذ رائے شماری کے بانی صدر عبدالخالق انصاری اور میرے علاوہ سنٹرل بار ایسوسی ایشن گلگت کے صدر شیر ولی ایڈووکیٹ میر اور رانی آف ہنزہ اور گلگت بلتستان سے کچھ اور لوگوں نے بھی شرکت کی۔ میر اور رانی آف ہنزہ نے گلگت بلتستان کے آئینی حقوق اور آئینی حیثیت کے بارے میں سرکاری موقف

کی حمایت کی۔ آزاد کشمیر کے تمام لیڈروں نے گلگت بلتستان کے عوام کو جمہوری حقوق دینے کا مطالبہ کیا۔ میں نے تحریری طور پر تجاویز پیش کیں جن کی کاپیاں شرکاء میں تقسیم کی گئیں اور ان تجاویز کے حق اور مخالفت میں تقریریں ہوئیں۔ اسی دوران مجھے اپنے دفتر سے اطلاع ملی کہ سرینگر میں ہمارے متحرک اور انتہائی ذی شعور ساتھی ڈاکٹر عبدالاحد گورو شہید ہو گئے ہیں اور انکی تجہیز و تکفین کے دوران بھارتی فوج نے سوگواروں کے اجتماع پر فائرنگ کر کے دوسروں کے علاوہ ان کے برادر نسبتی کو بھی شہید کیا ہے۔ اس سلسلے میں بی بی سی ریڈیو والوں کے علاوہ سرینگر میں میرے ساتھی بھی مجھ سے فون پر بات کرنا چاہتے ہیں چنانچہ میں اس سلسلے میں خاصی دیر مصروف رہا اور جب کانفرنس ہال میں واپس آیا تو کانفرنس اختتام پر تھی اور فیصلہ ہوا تھا کہ سردار ابراہیم خان اور بیرسٹر سلطان محمود پر مشتمل ایک کمیٹی گلگت بلتستان کے عوامی حقوق کے بارے میں وزیراعظم پاکستان سے بات کریگی۔ یہ کمیٹی ابھی پروگرام بنا ہی رہی تھی کہ پاکستان میں حکومت ہی تبدیل ہوگئی اور یہ کمیٹی اپنے مقصد میں کوئی خاص کامیابی حاصل نہ کرسکی۔

دوسرا اجتماع : گلگت بلتستان کے عوامی حقوق سے متعلق دوسرا بڑا اجتماع ''قراقرم جرنلسٹس اور رائٹرز فورم'' نامی ایک تنظیم جسکے سرگرم اراکین میں تین صحافی حبیب الرحمٰن گلگتی، عبدالبشیر اور ممتاز نگری شامل تھے کے زیر اہتمام 20 اکتوبر 1996ء کو ''ہالیڈے ان اسلام آباد'' میں ہوا۔ میں نے اس تاریخی کانفرنس کے انعقاد میں بھی خاصی دوڑ دھوپ کی۔ اس اجتماع میں آزاد کشمیر کی پوری سینئر قیادت کے علاوہ گلگت بلتستان کی سیاسی، صحافتی اور ادبی شخصیات نے بھی شرکت کی، آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان سے جن تنظیموں کے سربراہوں اور نمائندوں نے شرکت کی ان میں آزاد کشمیر سے آل جموں کشمیر مسلم کانفرنس، لبریشن فرنٹ، لبریشن لیگ، جماعت اسلامی، محاذ رائے شماری، مسلم لیگ (ج)، کشمیر فریڈم موومنٹ، نیشنل عوامی پارٹی، تحریک فقہ جعفریہ آزاد کشمیر، تحریک اسلامی جمہوریہ کشمیر، سنٹرل بار ایسوسی ایشن مظفر آباد، گلگت بلتستان سے میزبان تنظیم اور گلگت بلتستان یونائیٹڈ فورم فار سیلف رول، متحدہ قومی پارٹی گلگت بلتستان، قراقرم نیشنل موومنٹ، بلاورستان نیشنل فرنٹ، انجمن اہلسنت والجماعت گلگت، تحریک جعفریہ گلگت بلتستان، سنٹرل بار ایسوسی ایشن گلگت بلتستان، گلگت بلتستان اہل فکر فورم، حلقہ ارباب ذوق گلگت اور قراقرم رائٹرز فورم کے سربراہ یا نمائندے شامل تھے۔ یہ صحیح معنوں میں ایک تاریخی اور نمائندہ اجتماع تھا۔

کانفرنس کے دو سیشن ہوئے۔ صدارت حبیب الرحمٰن گلگتی نے کی اور سٹیج سیکرٹری کے فرائض عبدالبشیر اور وقار ظفر تاج نے انجام دیئے۔ ایک سیشن کے مہمانان خصوصی سردار عبدالقیوم خان اور میجر حسین شاہ اور دوسرے کے جسٹس مجید ملک اور مرحوم امیر حمزہ تھے۔ تلاوت کلام پاک اور میزبان تنظیم کی طرف سے استقبالیہ کلمات کے بعد میں نے کانفرنس کے انعقاد کے اغراض و مقاصد بیان کرنے کے بعد 15 قراردادوں کا مسودہ پیش کیا اور شرکاء میں اس کی کاپیاں بھی تقسیم کیں اور مقررین سے گزارش کی کہ وہ انہی قراردادوں پر اپنی رائے دیں۔ چنانچہ دن بھر تقریریں ہوئیں۔ شعراء نے اپنے کلام بھی پیش کئے جن

میں گلگت بلتستان کی سیاسی زبوں حالی کا نقشہ کھینچا گیا تھا۔ گلگت کے مشہور شاعر جمشید دکھی کے اشعار

مری دھرتی تو میری آبرو ہے — تری تصویر پیہم رو برو ہے
شب ظلمت کا ہوگا کب سویرا — اندھیرا ہی اندھیرا چار سو ہے
پتہ سسرال کا ہو تو خبر لیں — میری ماں تو بتا کس کی بہو ہے

اور عبدالخالق تاج کے اشعار

بڑی مشکل سے آزادی ملی ہے — مگر آئین سے خالی ملی ہے
حقوق آئینی کی بات کی جب — ہمیں آگے سے اک گالی ملی ہے

کو بہت داد ملی

چھ گھنٹے کی نشست اور بیشمار تقاریر کے بعد میری پیش کردہ قراردادیں منظور کی گئیں۔ جن کا لب لباب یہ تھا کہ گلگت بلتستان کے عوام کو ان کے جائز آئینی، سیاسی اور معاشی حقوق اور جمہوری نظام حکومت دیا جائے۔ جس کا آزاد کشمیر کے ساتھ صدارتی سطح پر جوڑ ہو۔ سپریم کورٹ، الیکشن کمیشن اور پبلک سروس کمیشن ایک ہو۔ آزاد فورس اور گلگت سکاؤٹس کا احیا کیا جائے وغیرہ وغیرہ۔ ان قراردادوں پر عملدرآمد کیلئے میری سربراہی اور شریک تنظیموں کے سربراہوں پر مشتمل ایک کمیٹی بنی۔ اس کمیٹی کے کئی اجلاس ہمارے دفتر میں ہوئے۔ جہاں اس کمیٹی کو مستقل تنظیمی شکل دیکر اسکا نام کشمیر قراقرم سالیڈٹی موومنٹ رکھا گیا اور گلگت بلتستان یونائیٹڈ فورم فار سیلف رول کی سربراہ اور سابق ممبر این اے کونسل محترمہ فوزیہ سلیم عباس کو موومنٹ کی سیکرٹری جنرل منتخب کر کے تنظیم کیلئے ایک ٹھوس پروگرام مرتب کیا گیا لیکن محترمہ نے اس پروگرام میں کوئی دلچسپی نہیں لی اور میری طرف سے بار بار کی یاددہانیوں کے باوجود موومنٹ کا کوئی اجلاس تک نہیں بلایا۔ جس کے نتیجے میں دوسرے ممبر بھی بددل ہوکر خاموش ہوگئے۔ چنانچہ فوزیہ سلیم صاحبہ کے اس غیر ذمہ دارانہ طرز عمل کے نتیجے میں گلگت بلتستان کے عوامی حقوق کیلئے کی جانے والی جدوجہد کے سلسلے میں کی گئی ٹھوس ابتدا ناکامی پر منتج ہوگئی۔ آزاد کشمیر کی قیادت نے گلگت بلتستان سے متعلق ان معاملات میں پوری دلچسپی لی تھی اور انکی تجویز پر ہی بلتستان کی خاتون کو تنظیم کی سربراہی دی گئی تھی لیکن محترمہ نے سب کو ناامید کر دیا۔

تیسرا اجتماع: اس سلسلے کا تیسرا بڑا اجتماع جماعت اسلامی آزاد کشمیر کے زیر اہتمام 16 مئی 2004ء کو گلگت میں ''وحدت کشمیر کانفرنس'' کے عنوان سے ہوا۔ یہ تاریخ میں پہلا موقع تھا کہ آزاد کشمیر کی جملہ معروف تنظیموں کے سربراہ بشمول مسلم کانفرنس کے صدر سردار عتیق احمد خان، لبریشن لیگ کے صدر جسٹس ملک عبدالمجید، پیپلز پارٹی کے سردار سوار خان، جماعت اسلامی کے سردار اعجاز افضل، جمعیت العلماء اسلام کے جناب نذیر فاروقی، پیپلز پارٹی شہید بھٹو گروپ کے چوہدری منیر اور مسلم کانفرنس کے برطانیہ کے صدر محمود ریاض صاحب شامل تھے۔ میری حیثیت مہمان کی بھی تھی اور میزبان کی بھی۔ پاکستان کی متحدہ مجلس عمل کی نمائندگی جماعت اسلامی پاکستان کے امیر قاضی حسین احمد صاحب نے کی۔ گلگت کی تقریباً جملہ

تنظیموں کے نمائندوں نے اجتماع میں شرکت کی اور اکثر نے اظہار خیال بھی کیا۔ اور بجز ایک مقرر (آغا رضی الدین رضوی) سبوں نے گلگت بلتستان کو ریاست جموں کشمیر کا حصہ قرار دیکر یہاں کے عوام کو جمہوری، آئینی اور سیاسی حقوق دینے کا مطالبہ کیا۔ اس موقع پر جماعت اسلامی آزاد کشمیر کی طرف سے ایک اعلامیہ بھی جاری کیا گیا۔ آزاد کشمیر اور پاکستان کے رہنماؤں نے اپنے تین روزہ قیام گلگت کے دوران کئی اجتماعات سے خطاب کرنے کے علاوہ اہل گلگت کی انتہائی مخلصانہ مہمان نوازی سے بھی خوب استفادہ کیا۔ مشتاق احمد ایڈووکیٹ امیر جماعت اسلامی آزاد کشمیر گلگت کی سربراہی میں ہونے والے انتظامات بھی قابل تعریف تھے۔ اس طرح اپنی نوعیت کی یہ پہلی اور تاریخی کانفرنس بہت سی میٹھی (اور ایک آدھ کڑوی) یادوں کے ساتھ اختتام کو پہنچی۔

دو اہم عدالتی فیصلے

جیسا کہ اس باب کی ابتداء میں کہا گیا ہے کہ گلگت بلتستان کے عوام اپنے حقوق کیلئے اسیریاں برداشت کرنے اور اجتماعات کرنے کے علاوہ عدالتوں کے دروازے بھی کھٹکھٹاتے رہے ہیں اس سلسلے میں اختصار کی ضرورت کے پیش نظر صرف دو اہم کیسوں کا مختصر ذکر کروں گا۔

پہلا فیصلہ:

گلگت بلتستان کی آئینی حیثیت سے متعلق پہلا کیس 16 اکتوبر 1990ء کو (آزاد کشمیر کے عبوری آئین کی دفعہ 44 کے تحت رٹ پٹیشن نمبر (1990/61ء) آزاد جموں کشمیر ہائی کورٹ میں بعنوان ملک مسکین ولد عبدالرحمٰن (2) حاجی محمد امیر خان ولد بر بینو ساکنان داریل تانگیر ضلع دیامر گلگت (یہ دونوں اصحاب گلگت بلتستان کی مشاورتی کونسل کے سابق ممبر ہیں اور ملک مسکین آج کل این اے کونسل کے سپیکر ہیں) بنام (1) حکومت پاکستان بذریعہ وزارت امور کشمیر و شمالی علاقہ جات (2) آزاد حکومت ریاست جموں کشمیر بذریعہ چیف سیکرٹری آزاد جموں کشمیر (اصل رسپانڈنٹ) (3) سردار محمد عبدالقیوم خان صدر آل جموں کشمیر مسلم کانفرنس (4) راجہ ممتاز حسین راٹھور پاکستان پیپلز پارٹی آزد کشمیر (5) محمد شریف طارق صدر لبریشن لیگ (6) چوہدری سلطان محمود آزاد مسلم کانفرنس (7) میجر جنرل محمد حیات خان صدر تحریک عمل (8) عبدالرشید ترابی امیر جماعت اسلامی آزاد کشمیر (9) امان اللہ خان چیئرمین جموں کشمیر لبریشن فرنٹ۔ (10) عبدالخالق انصاری بانی صدر محاذ رائے شماری (11) جناب جی ایم میر صدر این ایل ایف (پروفارما رسپانڈنٹس) دائر ہوئی۔ سماعت جناب (ر) جسٹس عبدالمجید ملک چیف جسٹس (2) جسٹس خواجہ محمد سعید اور (3) جسٹس ریاض اختر چوہدری نے کی۔

درخواست میں کہا گیا تھا کہ شمالی علاقہ جات ریاست جموں کشمیر کا حصہ ہیں اور ان علاقوں کی ریاست جموں کشمیر سے علیحدگی غیر قانونی ہے۔ شمالی علاقوں کو آزاد جموں کشمیر سے علیحدہ کیے جانے کے

نتیجے میں ان علاقوں کے عوام کو آزاد کشمیر کی حکومت، اسمبلی، کونسل اور دیگر اداروں میں نمائندگی کے علاوہ بنیادی اور سول حقوق سے محروم رکھا گیا ہے۔ اور یہ کہ ان علاقوں میں کسی قانونی جواز اور حق کے بغیر ہی حکومت کی جارہی ہے۔ درخواست میں ان علاقوں کے حکام کے ان علاقوں پر حکومت کرنے کے حق کو چیلنج کرتے ہوئے استدعا کی گئی تھی کہ وہ آزاد حکومت کو ہدایت کرے کہ وہ شمالی علاقوں کا انتظام سنبھالے اور یہ بھی ہدایت دے کہ شمالی علاقوں کے عوام کو آزاد کشمیر گورنمنٹ، آزاد کشمیر اسمبلی اور جموں کشمیر کونسل میں نمائندگی دی جائے اور شمالی علاقوں میں انتظامی اور عدالتی نظام قائم کرے جیسا کہ آزاد کشمیر کے عبوری آئین میں درج ہے۔

کیس کے سائلان اور مسئولین علیھا نے اپنے اپنے موقف کے حق میں درجنوں دستاویزات کتابچے اور کتابیں عدالت میں پیش کیں جن سے عدالت نے پورا استفادہ کیا اور نتیجتاً کیس کا فیصلہ بذات خود ایک انتہائی اہم تاریخی دستاویز بن گیا۔ چنانچہ فیصلے میں جن قانونی تاریخی اور آئینی امور کی وضاحت کی گئی ان کی تعداد 203 تک پہنچ گئی اور آئٹم نمبر 204 کے تحت رِٹ پٹیشن کو منظور کر کے ہدایت جاری کی گئی کہ

(1) آزاد کشمیر گورنمنٹ فوراً شمالی علاقہ جات کا حکومتی نظام سنبھالے اور شمالی علاقوں کو آزاد جموں کشمیر کے علاقوں میں شامل کرے۔

(2) اس مقصد کے حصول کیلئے حکومت پاکستان، آزاد حکومت کی مناسب مدد کرے۔

(3) شمالی علاقوں کے باشندے آزاد جموں کشمیر ایکٹ 1974ء کے تحت حاصل بنیادی حقوق سے استفادہ کریں گے۔ انہیں آزاد کشمیر کی حکومت، اسمبلی، کونسل، سول انتظامیہ اور دوسرے قومی اداروں میں نمائندگی دی جائے۔ نیز آزاد حکومت عبوری آئین کے مندرجات کے مطابق شمالی علاقوں میں انتظامی اور عدالتی سیٹ اپ قائم کرے۔ یہ فیصلہ آزاد کشمیر ہائی کورٹ نے 8 مارچ 1993ء کو سنایا۔ اس فیصلے کے نتیجے میں آزاد کشمیر بھر میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ معلوم ہوتا تھا جیسے آزاد کشمیر والوں کو اپنا اغوا شدہ بھائی مل گیا ہے۔ گلگت بلتستان کے خاصے لوگ بھی اس خوشی میں شامل تھے لیکن حکومت پاکستان کی افسر شاہی اور دوسرے طاقتور حلقوں کیلئے یہ ایک ناقابل برداشت فیصلہ تھا۔ آزاد حکومت نے بھی ایک بار پھر پاکستان کی کٹھ پتلی کا کردار ادا کیا چنانچہ اس فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ آف آزاد کشمیر میں اپیل کی گئی اور سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ دیتے ہوئے کہ اگرچہ گلگت بلتستان کے علاقے ریاست جموں کشمیر کا حصہ ہیں لیکن آزاد کشمیر کے 1974ء کے عبوری آئین کے مطابق یہ علاقے آزاد جموں کشمیر کا حصہ نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں چونکہ یہ بات آزاد کشمیر ہائی کورٹ کے دائرہ اختیار میں نہیں ہے کہ وہ حکومت پاکستان سے کہے کہ وہ گلگت بلتستان کے علاقوں کو آزاد حکومت کے حوالے کرے اسلئے ہم آزاد کشمیر ہائی کورٹ کے 8 مارچ 1993ء کے فیصلے کو غلط قرار دیتے ہیں۔

یاد رہے کہ آزاد کشمیر کا عبوری آئین 1974ء پاکستان کی وزارت امور کشمیر اور وزارت قانون

نے مرتب کیا ہے اور اس میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ آزاد حکومت کا دائرہ عمل اور وہ بھی صرف فروعی معاملات کے بارے میں 4 ہزار مربع میل کے علاقے تک ہی محدود رہے حالانکہ آزاد حکومت کا سرکاری نام آزاد حکومت ریاست جموں کشمیر ہے۔ یعنی پوری ریاست جموں کشمیر کی آزاد حکومت۔ بہرحال گلگت بلتستان سے متعلق ہر معاملہ نرالا ہے۔ گلگت بلتستان کی انتظامیہ کے بارے میں پاکستان کا عالمی سطح پر موقف یہ ہے کہ گلگت بلتستان کی مقامی انتظامیہ اسی علاقے کے لوگوں پر مشتمل ہے۔ پاکستان کے کچھ افسر صرف ان کو مشورے دیتے۔ کیا اس سے بڑا کوئی جھوٹ ہوسکتا ہے؟ کیا یہاں کے اصل حاکم یعنی چیف سیکرٹری، آئی جی پولیس وغیرہ مقامی ہیں؟ اور کیا گلگت بلتستان کے منتخب نمائندوں کے اختیارات ان کے پاکستانی ''مشیروں'' کے عشر عشیر کے برابر بھی ہیں؟ الغرض پاکستان کی افسر شاہی کی غلط بیانیوں بلکہ سفید جھوٹ کے نتیجے میں جہاں مسئلہ کشمیر کے بارے میں خاصے وزنی پاکستانی موقف کا حلیہ ہی بگڑ گیا وہاں گلگت بلتستان کے عوام بھی گزشتہ 57 سال سے اپنے بنیادی حقوق سے محروم ہیں۔

دوسرا اہم فیصلہ

1994ء میں پاکستان کی سپریم کورٹ میں گلگت بلتستان کی آئینی حیثیت کے بارے میں دو کیس دائر ہوئے۔ پہلا کیس الجہاد ٹرسٹ راولپنڈی بذریعہ حبیب الوہاب الخیری ایڈووکیٹ راولپنڈی و دیگر نو افراد (جن کا تعلق گلگت بلتستان سے ہے) نے آئینی درخواست نمبر 11 آف 1994ء اور دوسری محترمہ فوزیہ سلیم عباس سابق ممبر این اے کونسل وغیرہ کی طرف سے آئینی درخواست نمبر 17 آف 1994ء کے تحت دائر کی گئی۔ چونکہ دونوں درخواستوں کا مقصد تقریباً ایک ہی تھا (یعنی چونکہ گلگت بلتستان کے علاقے پاکستان کے آئینی حصہ ہیں اسلئے وہاں کے عوام کو وہی حقوق حاصل ہونے چاہئیں جو پاکستان کے شہریوں کو حاصل ہیں، یعنی پارلیمنٹ میں نمائندگی وغیرہ اور اگر یہ علاقے پاکستان کا حصہ نہیں تو حکومت پاکستان کو گلگت بلتستان کے عوام سے ٹیکس وصول کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں) اسلئے سپریم کورٹ نے دونوں کو اکٹھے کر دیا۔

سائلان نے اپنے دعوؤں میں ایسے ایسے سفید جھوٹ بولے ہیں کہ الامان اور اس سے بھی بڑا تعجب یہ کہ حکومت نے ان جھوٹے دعوؤں پر خاموشی اختیار کر کے گویا الخاموشی نیم رضا کے مصداق ان جھوٹے دعوؤں کو تسلیم کیا ہے۔ مثلاً دعویٰ کیا گیا ہے کہ گلگت بلتستان کے عوام نے نومبر 1947ء میں ان علاقوں کا پاکستان سے الحاق کیا تھا اور پاکستان نے اس الحاق کو تسلیم کیا تھا۔ اسطرح یہ دعویٰ بھی کیا گیا ہے کہ ہنزہ اور نگر کی ریاستوں نے بھی پاکستان سے الحاق کیا ہے اور پاکستان نے انہیں بھی تسلیم کیا ہے۔ حالانکہ پاکستان نے اقوام متحدہ میں بھی یہی موقف اختیار کیا ہے، پاک بھارت مذاکرات کے دوران بھی اور اس نام نہاد الحاق کے سولہ سال بعد 1963ء میں ہونے والے پاک چائنا سرحدی معاہدے میں بھی کہ ہنزہ نگر سمیت پورے گلگت بلتستان کے علاقے متنازعہ ریاست جموں کشمیر کا حصہ ہیں۔

سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے میں واضح طور پر کہا ہے کہ گلگت بلتستان کے علاقے پاکستان کا آئینی حصہ نہیں ہیں۔ البتہ چونکہ یہ علاقے پاکستان کے عملی کنٹرول میں ہیں اور اقوام متحدہ میں بھی پاکستان نے دعویٰ کیا ہے کہ یہاں ان علاقوں کے لوگوں کی ہی حکومت ہے اور پاکستانی حکام صرف ان کی مدد کر رہے ہیں اسلئے ان علاقوں کے عوام کو کم از کم وہ بنیادی حقوق دیئے جائیں جو پاکستان کے عوام کو حاصل ہیں۔ یعنی علاقے پر ان کی اپنی حکومت ہو، انصاف اور اچھی حکومت تک ان کی رسائی ہو اور بااختیار مقامی جمہوری ادارے ہوں۔

سپریم کورٹ نے 28 مئی 1999ء کو اپنے فیصلے کے تحت حکومت پاکستان کو ہدایت کی تھی کہ وہ چھ ماہ کے اندر اندر ایسے اقدامات کرے جن کے نتیجے میں گلگت بلتستان میں ان کے اپنے منتخب نمائندے حکومت چلائیں اور وہاں عوام کو خودمختار عدلیہ کے ذریعے انصاف تک رسائی ہو۔ لیکن آج پانچ سال بعد بھی پاکستان کی افسر شاہی نے ملک کی اعلیٰ ترین عدالت کے بالکل واضح فیصلے کو عملی جامہ پہنانا مناسب نہیں سمجھا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جب مجھے اس بات کا علم ہوا کہ کیس میں سائلان سفید جھوٹ بول رہے ہیں اور حکومت بھی مذموم مقاصد کے تحت ان کی چشم پوشی کر رہی ہے تو میں نے عدالت سے استدعا کی کہ مجھے کیس میں فریق بنایا جائے لیکن عدالت نے بوجوہ میری درخواست پر غور نہیں کیا۔

گلگت بلتستان کے عوام کیلئے آئینی اور سیاسی حقوق کے حصول کیلئے اجتماعات ہوں، قید و بند ہو یا عدالتوں کے دروازوں پر دستک، پاکستان کی افسر شاہی ہر جگہ عوامی کوششوں پر حاوی رہتی رہی ہے۔ خواہ وہ آزاد کشمیر کی سپریم کورٹ کے لنگڑے موقف کی شکل میں ہو، سپریم کورٹ آف پاکستان کے واضح فیصلے کو نظر انداز کئے جانے کی شکل میں ہو، فوزیہ سلیم عباس کے ظاہری غیر ذمہ دارانہ طرز عمل کی شکل میں ہو، آغا رضی الدین صاحب کے بے بنیاد استدلال کی شکل میں ہو یا بیرسٹر سلطان محمود کی ظاہری مصلحت پسندی کے روپ میں۔ لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔

5- گلگت بلتستان

ادب، شاعری اور صحافت

گلگت بلتستان کے عوام کو 1947ء تک ڈوگرہ شخصی راج نے اور اسکے بعد تقریباً ڈھائی عشروں تک حکومت پاکستان نے سیاسی سرگرمیوں سے الگ تھلگ رکھا۔ اولذکر نے اس لئے کہ وہ شخصی راج تھا اور جنگجو قسم کے لوگوں کو سیاسی حقوق دینا اپنے لئے خطرہ تصور کرتا تھا۔ گو 1935ء سے 1947ء تک استور اور بلتستان کو جموں کشمیر اسمبلی میں نمائندگی حاصل تھی لیکن 1947ء کے بعد پورے گلگت بلتستان کو سیاسی

حقوق اور سرگرمیوں سے دور رکھا گیا بجز 1950ء کے عشرے کے ایک مختصر سے عرصے کے جب کشمیری لیڈر چوہدری غلام عباس مرحوم نے آل جموں کشمیر مسلم کانفرس قائم کی تھی جسے یہاں کی پاکستانی افسر شاہی نے چلنے نہیں دیا چنانچہ یہ علاقے ساتویں عشرے تک ہر قسم کے سیاسی اور آئینی حقوق سے محروم رہے۔

کہتے ہیں ہر منفی صورت حال کا ایک چھوٹا سا ہی سہی مثبت پہلو بھی ہوتا ہے اور کبھی کبھی کسی سے ہونے والی ناانصافی کا نتیجہ ایک خیر مستور (Blessing in disguise) کی شکل میں بھی سامنے آتا ہے۔ گلگت بلتستان کے عوام پر سیاسی حقوق اور سیاسی معاملات کے بارے میں اظہار خیال اور تنظیم سازی کے دروازے بند رکھ کر بہت بڑا ظلم کیا جاتا رہا لیکن اس ظلم نے خیر مستور کی شکل میں ان علاقوں کے لکھے پڑھے حساس لوگوں کو ادب اور شاعری کا راستہ دکھایا چنانچہ گزشتہ تقریباً چار عشروں میں یہاں ادیبوں اور شاعروں کی ایک کھیپ تیار ہوئی ہے۔ ان میں سے کچھ مقامی سطح کے، کچھ پاکستان کی سطح کے اور چند ایک تو عالمی سطح کے ہیں۔ علامہ نصیر الدین نصیر ہنزائی اور پیر غلام النصیر آف تھک (چلاس) کی تصوف اور روحانیت پر مبنی تحریریں، ادب اور شاعری معیار میں عالمی سطح پر ہیں۔ کراچی میں برسر روزگار استور کے پروفیسر اشرف خرم کی لکھی کتابیں ایم اے کے نصاب میں شامل ہیں۔ چنانچہ ان قلم کاروں، شعرا اور صحافیوں کے ہاتھوں خاصا مزاحمتی ادب بھی وجود میں آیا ہے۔ کچھ ادیب اور شاعر یہاں کے حالات کی صحیح عکاسی کرتے ہوئے قومی محرومیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے رہے ہیں۔

گلگت بلتستان کی سطح پر سوچنے والے سیاسی لیڈروں، کارکنوں، ادیبوں اور شاعروں کی نظر میں ان کی توجہ کے سب سے زیادہ مستحق تین مسئلے ہیں یعنی (1) علاقوں کی آئینی اور سیاسی حقوق سے محرومی (2) فرقہ وارانہ، نسلی اور علاقائی عصبیت (خاص کر اولذکر) اور (3) افسر شاہی کا آمرانہ طرز عمل۔ چنانچہ گلگت بلتستان کی مزاحمتی شاعری زیادہ تر ان ہی تین موضوعات کے گرد گھومتی ہے۔

سیاسی حقوق سے محرومی کے احساس، حب الوطنی، آئینی حیثیت کے بارے میں کنفیوژن اور حکام وقت کے آمرانہ اور تحکمانہ طرز عمل کی عکاسی مندرجہ ذیل شاعر اور ان کے اشعار کس خوبصورتی سے کرتے ہیں۔

محمد امین ضیاء

میں دستار فضیلت مانگتا ہوں — وہ کہتے ہیں تمہارا سر نہیں ہے

جمشید دکھی

مری دھرتی تو میری آبرو ہے — تیری تصویر پیہم رو برو ہے
تیری رعنائیوں کی خوشبوؤں میں — مرے اسلاف کا شامل لہو ہے
شب ظلمت کا ہوگا کب سویرا — اندھیرا ہی اندھیرا چار سو ہے
پتہ سسرال کا ہو تو خبر لیں — مری ماں! تو بتا کس کی بہو ہے

شمیم بلتستانی

ارض بلتستان تیرے لالہ زاروں کی قسم
عرش رفعت چوٹیوں اور کوہساروں کی قسم
گنگناتی اور مچلتی آبشاروں کی قسم
گل بداماں اور خراماں جوئباروں کی قسم
داغ ہم پڑنے نہ دینگے تیرے عزوشان پر
حرف ہم ہرگز نہ آنے دینگے تیری شان پر
عرض بلتستان اے پروردہ صد رنگ وساز
سرزمین دل نشین ودبستان دل گداز
لوک گیتوں میں ترے پنہا ہے درس زندگی
سادگی، رخشندگی، تابندگی، پائندگی

خوشی محمد طارق

ہر قدم پر اک سفر رکھا گیا
منزلوں سے بے خبر رکھا گیا
شہر میں قحط مسیحائی نہ پوچھ
قاتلوں کو چارہ گر رکھا گیا

اقبال عاصی

یہاں منصف بھی تو وحشی بنا ہے
اُڑا رہتا ہے جو اپنی انا پر

عبدالخالق تاج (مزاحیہ شاعر)

بڑی مشکل سے آزادی ملی ہے
مگر آئین سے خالی ملی ہے
وہ لیکر چلدیئے آئین کے پھل
ہمیں خالی یہاں تھالی ملی ہے
حقوق آئینی کی بات کی جب
ہمیں آگے سے ایک گالی ملی ہے

سید نجم الحسن نجم

مجھ کو قاتل قتل کیسے کرے گا
کہ میرے تن پہ کوئی سر نہیں ہے

مشتاق احمد راہی

کبھی امید کا کوئی کنول کھلا ہی نہیں
ازل سے آج تلک ہیں پسے ہوئے ہم لوگ

ظفر وقار تاج

انہی خوش فہمیوں میں شاد ہیں ہم
سنا تو ہے یہی آزاد ہیں ہم
تبسم خشک ہونٹوں پر ہے لیکن
حقیت میں ظفر برباد ہیں ہم

جمشید دکھی

وہاں کشمیریوں پر ظلم غیروں نے کیئے لیکن
مسلمانوں نے لوٹی ہیں یہاں آزادیاں میری
امیر وقت سے کہہ دو ہمیں آئین دے ورنہ
کسی دن لے کے ڈوبیں گی اسے محرومیاں میری

ہم پر فقط ہے ایک عشا کی نماز فرض
کس کو خبر نہیں کہ تشہد میں رات ہے

فرقہ وارانہ کشیدگی گلگت بلتستان کی سب سے بڑی سماجی بیماری ہے۔ اگر چہ عوام کی اکثریت اس سے بالاتر ہے لیکن دونوں بڑے مذہبی فرقوں (سنی اور شیعہ) کے خود ساختہ قائد انتہائی ہوشیاری سے عوامی جذبات سے کھیل کر اور ایک دوسرے کے مسلکوں کے خلاف طرح طرح کے فتوے دے کر ایسی فضا پیدا کرتے ہیں جس سے مخصوص اداروں کی عید ہو جاتی ہے اور علاقہ بلا جواز کشیدگی کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔ ایسی فرقہ وارانہ کشیدگی کے بارے میں مقامی شاعر فرماتے ہیں۔

محمد امین ضیا

سبھی مومن ہیں میرے دین حق ہیں
کوئی مومن کوئی کافر نہیں ہے

جمشید دکھی

تعصب سے بھرا پیغام یہ ہے — بہاؤ خون درس عام یہ ہے
مسلمانوں کا جب انجام یہ ہے — میں کافر ہوں اگر اسلام یہ ہے
روش لوگوں میں الفت کی نہیں ہے — وطن فردوس سے بڑھ کر حسیں ہے
تعصب نفرتیں اب کاشت کرلو — بڑی زرخیز گلگت کی زمیں ہے

بھارتی مقبوضہ کشمیر میں بھارتی ظلم اور وہاں کے باسیوں کی مظلومیت بھی یہاں کے شاعروں کی نظروں سے اوجھل نہیں۔ کراچی میں مقیم لداخ کے رضا حسرت نکوبادی ''کشمیر ترے باپ کی جاگیر نہیں ہے'' کہہ کر بھارت سے یوں مخاطب ہیں

بے جرم و خطا تم نے ہمیں گھر سے اکھاڑا — اس جنت فردوس کا ہر چپہ اجاڑا
پابند سلاسل کیا ہر گھر کا سہارا — چن چن کے نوجوان ہر اک گھر کا ہے مارا
کشمیر ترے خواب کی تعبیر نہیں ہے — کشمیر ترے باپ کی جاگیر نہیں ہے

شاکر شمیم

یاس و ناامیدی اور پریشاں حالی کے اس وسیع ریگستان میں بلتستان کے شاکر شمیم آزادی و خوشحالی کے ایک نخلستان کی نشاندہی کر کے ختم ہونے والی اندھیری رات کو بھول کر آنے والی متوقع صبحِ کامرانی کے استقبال کیلئے تیار ہونے کی تلقین کرتے ہوئے لوگوں سے کہتے ہیں

اندھیرے چھٹ گئے اب روشنی کے آئے دن — کرو نہ تذکرۂ شب سحر کی بات کرو
اب انتشار و ہزیمت کے دن ہوئے کافور — نشان فتح اٹھاؤ ظفر کی بات کرو

پھر کہتے ہیں

ہر قدم پہ اب نئے برگ و شجر پیدا کر　　رات کا منظر گیا دور سحر پیدا کر

علاقے کے لوگوں کے مابین فرقہ وارانہ علاقائی، لسانی اور نسلی اتحاد فکر و عمل پیدا کرنے کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں

تنگ نظری اور تعصب کے اندھیرے سے نکل　　دیدہ و دل میں محبت کی نظر پیدا کر

نوجوانوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں

قدم سے قدم تم ملا کر چلو　　محبت کی شمعیں جلا کر چلو

محبت کی باتیں محبت کے گیت　　یہی گیت لب پر سجا کر چلو

شاعر ویسے بھی ایک حساس طبیعت کا مالک ہوتا ہے کسی پر ظلم ہوتے برداشت نہیں کرتا۔ گلگت بلتستان کے شعرا بھی اس خوبی کے مالک ہیں۔

27 اپریل 1998ء کو گلگت کی انتظامیہ کی ہدایت پر گلگت پولیس نے جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کی ایک پرامن ریلی پر اچانک اندھا دھند لاٹھی چارج کرنے کے بعد آنسو گیس استعمال کی جس سے میرے علاوہ میرے مقامی اور آزاد کشمیر سے آئے ہوئے کچھ ساتھی بھی زخمی ہو گئے۔ اسی رات ہمیں گلگت بدری کے احکامات سنانے کے بعد نصف رات کو جبراً پولیس گارد میں لے جا کر تقریباً دو سو کلومیٹر دور گلگت بلتستان اور پاکستان کی سرحد پر چھوڑا گیا۔ یہ صورتحال دوسرے حساس لوگوں کی طرح گلگت کے شعرا کیلئے بھی انتہائی تکلیف دہ تھی چنانچہ انہوں نے اس بارے میں مفصل اظہار خیال کیا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جمشید خان دکھی

دشمن یزید وقت کی حق کی زبان ہے　　کیوں بے امان اپنے وطن میں امان ہے

خوشی محمد طارق

اس جیسا بدنصیب بھلا اور ہوگا کون　　جس کو امان اپنے ہی گھر نے نہیں دیا

اقبال عاصی

یزید وقت کا چہرہ بھی دیکھا　　بہت کچھ سن رکھا تھا کربلا پر

گلگت بلتستان کے عوامی حقوق کے بارے میں فدا حسین شمیم بلتستانی فرماتے ہیں

مفاد گلستاں میں ہم شد اُید سہتے آئے ہیں　　مگر کب تک رہیں بے خبر جیب و گریباں سے

شکیب وضبط اور صبر و فا کا یہ نتیجہ ہے　　کہ جمہوریت کی خوشبو آ رہی اب ہے شبستاں سے

ایک چہرہ کی دو آنکھیں کے عنوان سے گلگت بلتستان کے بارے میں لکھتے ہیں

ذائقے مختلف سہی لیکن ہمہ دم خوشگوار ہیں ہم لوگ
ایک چہرے کی ہم ہیں دو آنکھیں گل بدن گل عذار ہیں ہم لوگ
ہم ہیں جانباز ارض قائد کے پھر بھی بے اعتبار ہیں ہم لوگ

مجھے احباب سے گلگت بلتستان کے ادیبوں شاعروں اور صحافیوں کی طویل فہرستیں ملی ہیں جن میں تخفیف یا درجہ بندی کرنا میرے بس کی بات نہیں اسلئے کہ تخفیف اور درجہ بندی کا یہ کلہاڑا غلط گردنوں پر بھی پڑسکتا ہے اور میں اپنے سر خون ناحق اور متاثرین کی ناراضگی لینا نہیں چاہتا۔ گو میرے اس طرز عمل سے بھی کچھ اصحاب متاثر ہونگے جس کیلئے میں ان سے معذرت خواہ ہوں اور پوری فہرست پیش کر رہا ہوں جو ضلع وار ہے۔ البتہ بوجوہ پورے بلتستان کی ایک ہی فہرست ہے۔

ادیب حضرات

(الف) ضلع گلگت : علامہ نصیرالدین نصیر ہنزائی۔ پروفیسر عثمان علی۔ پروفیسر منظوم علی۔ ڈاکٹر عزیز اللہ نجیب۔ وزیرزادہ قدرت اللہ بیگ۔ فدا علی ایثار۔ عبداللہ خان ہنزائی۔ ایف ایم خان۔ کرنل مرزا حسن خان۔ میرزادہ شاہ خان۔ حاجی غلام رسول۔ شیر باز علی برچہ۔ غلام عباس۔ غلام حسین انجم۔ شکیل احمد شکیل۔ انجینئر امان اللہ ہنزائی۔ اکبر حسین اکبر۔ محمد یوسف شگری۔ ہدایت اللہ اختر۔ احمد سلیم سلیمی۔ سید یحییٰ شاہ۔ وزیر غلام عباس۔ عبدالسلام ناز۔ ممتاز نگری۔

(ب) ضلع دیامر : وزیر محمد اشرف خان عالیگ۔ پروفیسر اشرف خرم۔ سرتاج خان۔ حشمت اللہ خان۔ شائستہ شمیم۔ شفیع استوری۔ مولانا شفیع الرحمٰن۔ سید عالم القریشی۔ امان اللہ خان۔

(ج) ضلع غذر : سرفراز خان۔ نواز خان ناجی۔ عبدالحمید۔

(د) بلتستان: فدا حسین شمیم بلتستانی۔ محمد یوسف حسین آبادی۔ محمد حسن حسرت۔ غلام حسن لوبیانگ۔ محمد عباس کاظمی۔ محمد ابراہیم ذاکر۔ شاکر شمیم۔ محمد قاسم نسیم۔ بریگیڈیئر محمد ذاکر۔ محمد نذیر۔ محمد حسن حسنی۔ غلام حسین سہروردی۔ ڈاکٹر محمد نعیم۔ راجہ محمد علی شاہ صاحب۔ وزیر مہتب علی۔ غلام حسن حسنو۔ اختر علی مدرس۔ محمد نذیر۔ انجینئر نذیر حسین۔ ماسٹر محمد تقی۔ میجر محمد اقبال۔ ڈاکٹر مظفر حسین انجم۔

شاعر حضرات

(ا) ضلع گلگت: علامہ نصیرالدین ہنزائی۔ محمد امین ضیاء۔ جمشید دکھی۔ عبدالخالق تاج۔ مشتاق احمد راہی۔ محمد نظیم دیا۔ عبدالحفیظ۔ محمد اسلم ساحل۔ فدا علی ایثار۔ کریم خان عاجز۔ ظفر وقار تاج۔ عبداللہ ملنگ۔ سید نجم الحسن نجم۔ نعیم چشتی۔ ہارون الرشید۔ اعجاز الحق۔ اقبال عاصی۔ غلام نبی وفا۔ صلاح الدین حسرت۔ حسین علی۔ حبیب الرحمٰن مشتاق۔ احسان شاہ۔ ایوب صابر۔ اسماعیل ناشاد۔ نوید نگری۔

حیدر خان حیدر۔ اکبر حسین نحوی۔ غلام عباس نسیم۔

(ب) ضلع دیامر:

وزیر محمد اشرف خان۔ پیر غلام النصیر نصیر۔ عنایت اللہ شمالی۔ خوشی محمد طارق۔ مظفر علی ظفر۔ عبدالولی فراق۔ میر باز علی فراز۔ عیسیٰ حلیم۔ مولانا عبدالباقی مرحوم۔ عبدالمناف عبد۔

(ج) ضلع غذر:

فضل الرحمٰن عالمگیر

(د) بلتستان:

راجہ محمد علی شاہ صباشگری۔ پروفیسر حشمت کمال الہامی۔ سید اسلم حسین سحر۔ فدا حسین شمیم بلتستانی۔ ذاکر شمیم۔ شاکر شمیم۔ قربان علی خیال۔ ذیشان قائد آبادی۔ غلام حسین حسنی۔ سید اسد زیدی۔ سید امجد علی۔ احسان دانش۔ رضا بیگ گھائل۔ مہدی شاہد۔ اخوند محمد حسین حکیم۔ شیخ غلام حسین سحر۔ شجاعت علی شجاع۔ غلام حسن طالب۔ غلام محمد مرغوب۔ غلام محمد بسمل۔ وزیر احمد۔ افضل روش۔ شرافت کاظمی۔ عاشق فراز۔ بشارت ساقی۔ عاشق حسین عشق۔ طالب حسین۔

صحافی حضرات

1- ضلع گلگت

اکبر حسین اکبر۔ سعادت علی مجاہد۔ شیر محمد حیدری۔ ایمان شاہ۔ خورشید احمد۔ اقبال عاصی۔ سعید حسن۔ مشکور علی مغل۔ مبارک خان۔ اعجاز احمد خان۔ بشارت مہند۔ دلدار علی قمر۔ منظور حسین۔ اشفاق افضل۔ قیصر مرزا۔ طارق منیر۔ علی مردان۔ محبوب خیام۔ اکرام اللہ علیگ۔ انور ہنزائی۔ ناصر خان۔ سید فاضل شاہ نقوی۔ احسان شاہ۔ امتیاز علی تاج۔ مجاہد منصوری۔ غلام قادر حقیر۔ روبینہ شاہین۔ عطاء اللہ شہاب۔ صابر حسین۔ اعجاز احمد۔ ولی نگری۔ اسماعیل ندیم خان۔ غزالہ آصف۔ عالمگیر۔ عبدالکریم۔ مظہر علی۔ امتیاز علی سلطان جہانگیر۔ بشیر احمد میر۔

2- ضلع دیامر

سرتاج خان۔ جہانگیر۔ خوشی محمد طارق۔ حبیب الرحمٰن۔ محمد عیسیٰ حلیم۔ شمشاد علی۔ محمد جہاں۔ فاروق احمد۔ ابراہیم شاہد۔ راجہ اشفاق۔ شہاب الدین غوری۔ محمد علی۔ تنزیل ریاض الدین۔ فاروق رانا۔ عبدالبشیر۔ فیصل (جاراللہ)

3- ضلع غذر

دردانہ شیر۔ جہانگیر خان۔ سراج علی شاہ۔ شکور اعظم۔ عبدالحمید خان۔ کرامت اللہ۔ سید راجہ۔ جاوید اقبال۔ اکبر شاہ دکھی۔ محبوب علی شاہ۔

4- بلتستان:

محمد اقبال صاحب (سابق ناظم اطلاعات آزاد کشمیر و گلگت بلتستان)۔ قاسم نسیم۔ راجہ حسین خان مقپون۔ عابد عبداللہ۔ سید میر اسلم حسین سحر۔ وزیر جعفر شگری۔ بہادر علی سالک۔ سید مہدی شاہ۔ وزیر نصرت علی۔ وزیر محمد اقبال۔ محمد حسین آغا۔ سید محمد رضوی۔ شاہد علی شگری۔ نثار عباس۔ غلام عباس مندوق۔ سید اعجاز۔ رضا بگٹی۔ فرمان علی۔ عبداللہ کریم۔ محمد افضل۔ محمد حسین آزاد۔ وزیر مظفر۔ علی محمد وفا۔ محمد صادق۔ شکور عبداللہ۔ باقر حیدری۔ محمد یوسف

گلگت بلتستان کے ادبی ادارے

جیسا کہ ادب شاعری اور صحافت کے عنوان کی ابتداء میں وضاحت کی گئی ہے، گلگت بلتستان میں سیاسی آزادی اور سیاسی تنظیم سازی کی اجازت نہ ہونے کی وجہ سے لکھے پڑھے لوگوں کی توجہ ادب شاعری اور صحافت کی طرف مبذول ہوئی لیکن مدت تک اس سلسلے میں کسی ادارے کا قیام عمل میں نہیں آیا البتہ ایک مرحلے پر مرحوم وزیر غلام مہدی علیگ کے ایما پر بلتستان کے مشہور شاعر اور قلمکار فدا حسین شمیم بلتستانی نے بلتستان اکیڈمی قائم کی جسکے زیر اہتمام اب تک تقریباً دو درجن کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ بلتستان اکیڈمی آج بھی فدا حسین شمیم صاحب کی سرپرستی میں سرگرم عمل ہے۔ اکیڈمی کے دوسرے سرگرم ممبروں میں محمد اقبال صاحب سابق ڈائریکٹر اطلاعات آزاد کشمیر و گلگت بلتستان غلام محمد بسمل، علی محمد باقر، بریگیڈیئر ذاکر شمیم شاکر شمیم، کاچو محمد علی خان واحد اور کاچو الطاف حسین شامل ہیں۔

گلگت میں حلقہ ارباب ذوق سب سے سرگرم ادبی تنظیم ہے۔ یہ تنظیم 1987ء میں گلگت میں تعینات ایک پاکستانی فوجی میجر غضنفر عباس قیصر فاروقی کی کوششوں سے قائم ہوئی۔ اس تنظیم نے کچھ کتابیں جن میں سرفہرست ''شمالی علاقوں کا اردو ادب'' ہے بھی شائع کیں لیکن اسکا اہم کارنامہ گلگت میں موجود فرقہ وارانہ کشیدگی ختم یا کم کرنے کی جدوجہد ہے۔ اس تنظیم کے موجودہ صدر محمد امین ضیاء سینئر نائب صدر عبدالخالق تاج، نائب صدر خوشی محمد طارق، سیکرٹری جنرل و سیکرٹری مالیات جمشید خان دکھی ہیں جبکہ مستقل اراکین میں مشتاق احمد راہی، محمد نظیم دیا، ظفر وقار تاج ظفر۔ حبیب الرحمٰن مشتاق، غلام کریم مطرب، سید فاضل شاہ نقوی، عمران شاہ انجم، صاحبزادہ نسیم چشتی، محمد اقبال عاصی، احسان شاہ اور ہدایت اللہ شامل ہیں۔ ادارے نے اب تک متعدد ادبی کانفرنسیں، سیمینار اور مشاعرے منعقد کئے ہیں۔

حلقہ ارباب ذوق، کے علاوہ گلگت میں قراقرم آرٹس کونسل، دیامر رائٹرز فورم، گلگت آرٹس

کونسل، یونین آف جرنلسٹس گلگت، گلگت پریس کلب، انجمن فکر وسخن نگر (بانی صدر اسماعیل ناشاد)، فکری تحریک اور گلگت سٹیزنز فورم کے علاوہ علامہ ہنزائی کے زیر سرپرستی سرگرم عمل بروشسکی ریسرچ اکیڈمی نامی ادارے قائم ہیں اور ان میں سے کچھ خاصے سرگرم ہیں۔

بلتستان میں بلتستان اکیڈمی کے علاوہ ''حلقہ علم وفن'' غلام حسن حسنی کی زیر سرپرستی اور ایوان ادب جناب محمد اسلم سحر کی زیر نگرانی کام کر رہے ہیں۔ عباس کاظمی صاحب کی زیر سرپرستی اہل فکر فورم شمالی علاقہ جات اسکردو میں قائم ہے۔

قصہ مختصر گلگت بلتستان کی گذشتہ چھ عشروں کی تاریخ پر ایک نظر ڈالی جائے تو یہ بات پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اپنے آئینی، سیاسی، سماجی اور معاشی حقوق کیلئے یہاں کے عوام کی جدوجہد کے باوجود آج بھی یہ علاقے ان حقوق سے بڑی حد تک محروم ہیں اور اس محرومی کے زخموں پر جب اعلےٰ حاکموں کے آمرانہ طرز عمل کی مرچوں کا چھڑکاؤ ہوتا ہے تو اسکے نتیجے میں یہاں کے اہل فکر حلقوں کی فکری پوشیدہ طاقت (Intelectual Potential) پر اسکا منفی اثر پڑنا ایک لازمی امر ہے جسکے نتیجے میں ان علاقوں کا پڑھا لکھا اور دانشور طبقہ اپنی فکری صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ نہیں کر سکا ورنہ ''ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی''۔

انشاء اللہ کتاب کی تیسری جلد میں گلگت بلتستان کے تہذیب وتمدن خاص کر علاقائی زبانوں اور دیگر اہم معاملات کے بارے میں واضح، نیم پوشیدہ اور پوشیدہ حقائق پر روشنی ڈالی جائیگی۔

6- گلگت بلتستان والوں کے شکوے

گلگت بلتستان کے لکھے پڑھے لوگ خاص کر نوجوان اکثر مجھ سے حال ہی تک شکوہ کرتے تھے کہ آپ اپنے آبائی علاقے کو چھوڑ کر کشمیر سے کیوں منسلک ہو گئے ہیں جبکہ گلگت بلتستان کا علاقہ سیاسی، آئینی اور دیگر حقوق سے محروم ہونے کی وجہ سے یہاں کے لکھے پڑھے اور سیاسی ذہن رکھنے والے فرزندوں کی پوری توجہ کا مستحق ہے۔ کچھ نوجوان تو مجھ سے یہ شکوہ بڑے جارحانہ انداز میں کرتے تھے اور مجھے بھی ان کشمیری لیڈروں میں شمار کرتے تھے جنہیں وہ گلگت بلتستان کے عوام کے حقوق کے راستے میں رکاوٹ تصور کرتے ہیں۔

سطحی طور پر دیکھا جائے تو گلگت بلتستان والوں کے اس شکوے میں خاصا وزن ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میرا آبائی علاقہ گلگت بلتستان ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ گلگت بلتستان کے علاقے سیاسی اور آئینی حقوق سے محروم رہے ہیں اور اب بھی ہیں۔ اور اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ گلگت بلتستان کے لکھے پڑھے لوگوں کی ترجیحی توجہ گلگت بلتستان پر ہی ہونی چاہیئے اور اس الزام میں بھی خاصا وزن ہے کہ گلگت بلتستان کو ریاست جموں کشمیر کا حصہ سمجھنے کے باوجود کشمیری لیڈروں نے 56 سال تک ان علاقوں کی طرف جا کر وہاں کے عوام کی مشکلات کو دیکھنا اور ان کے مطالبات سننا گوارا نہ کیا گو اس سلسلے

میں سارے کشمیری لیڈروں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا زیادتی ہے۔

جہاں تک مجھ سے متعلق گلگت بلتستان والوں کے شکوے کا تعلق ہے پہلی بات تو یہ ہے کہ ہر سیاسی شخص کا اپنا ایک دائرہ کار ہوتا ہے کسی کا دائرہ کار اپنے گاؤں یا محلے تک محدود ہوتا ہے کسی کا ضلع یا شہر تک، کسی کا دائرہ کار صوبے تک محدود ہوتا اور کسی کا قومی سطح کا ہوتا ہے جبکہ کچھ لوگ بین الاقوامی سیاست میں حصہ لیتے ہیں۔ میرا دائرہ کار میرے پیدائشی گاؤں پرشنگ یا ضلع استور یا گلگت بلتستان (شمالی کشمیر) کی سطح کا نہیں بلکہ پوری ریاست جموں کشمیر کی سطح کا ہے۔ جس طرح میری طرف سے استور کی سطح کی سیاست میں حصہ لینے پر میرے گاؤں پری شنگ والوں کا یہ شکوہ کہ میں اپنے گاؤں کو چھوڑ کر پورے استور کی سیاست میں کیوں ملوث ہوں یا میری طرف سے گلگت بلتستان کی سطح کی سیاست میں حصہ لینے پر استور والوں کا یہ شکوہ کہ میں اپنے آبائی علاقے استور کو چھوڑ کر گلگت بلتستان کی سیاست پر اپنا وقت کیوں صرف کر رہا ہوں، بے جواز اور کوتاہ نظری پر مبنی قرار پائیں گے اسلئے کہ میرا سیاسی دائرہ کار میرا گاؤں یا میرا ضلع نہیں بلکہ ان سے کہیں زیادہ وسیع ہے اسی طرح میری طرف سے ریاستی سطح کی سیاست سے منسلک ہونے پر ریاست کے شمالی حصے (گلگت بلتستان والوں) کا شکوہ بھی بلا جواز ہے کہ میں گلگت بلتستان کو چھوڑ کر پوری ریاست جموں کشمیر سطح کی سیاست میں ملوث کیوں ہوں اسلئے کہ میرا سیاسی دائرہ کار گلگت بلتستان نہیں بلکہ پوری ریاست جموں کشمیر اور اسکی تحریک آزادی ہے اسلئے گلگت بلتستان والوں خاص کر نوجوانوں سے میری گزارش ہے کہ وہ اس مسئلے کو میری نظر سے بھی دیکھیں۔ میں جب برطانیہ میں تھا تو جنوبی ایشیا، ایشیا اور عالمی سطح کی سیاست میں ملوث میرے بہت سے دوست مجھ سے کہتے تھے کہ میں ایک کشمیر کو لیکر کیوں بیٹھا ہوں۔ عالمی سطح کی یا کم از کم ایشیائی سطح کی سیاست میں حصہ کیوں نہیں لیتا تو میں انہیں بھی یہی کہتا کہ میرا سیاسی دائرہ کار ایشیا یا دنیا نہیں ریاست جموں کشمیر خاص کر اسکی تحریک آزادی ہے اسلئے میرا ایشیائی یا عالمی سیاست (عالمی سوشلزم۔ کمیونزم۔ پان اسلام ازم۔ عالمی حقوق انسانی یا احیائے اخلاقیات) پر زیادہ وقت صرف کرنے کا کوئی جواز نہیں۔

مجھے خوشی ہے کہ اس تاریخی حقیقت کو کہ گلگت بلتستان کے علاقے ریاست جموں کشمیر کا حصہ ہیں گلگت بلتستان نیشنل الائنس نے بھی تسلیم کیا ہے اور اپنی سیاسی سرگرمیوں کو اسی حقیقت کی بنیاد پر استوار کر رہا ہے۔ اور اب تو (25 اکتوبر 2004ء کو) صدر پاکستان نے گلگت بلتستان کو واضح طور پر ریاست جموں کشمیر کا حصہ تسلیم کیا۔ ویسے بھی اس تاریخی حقیقت سے انکار کرنے والے وزارت امور کشمیر کے تخریبی ذہنوں، گلگت بلتستان میں ان کے کچھ بے ضمیر گماشتوں، آئی ایس آئی کے کچھ کل پرزوں، پی ٹی وی محکمہ موسمیات کے کچھ طوطوں اور طوطیوں اور پاکستانی صحافت کی کچھ کالی بھیڑوں تک محدود ہو گئے ہیں، مجھے امید ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کو بھی احساس ہو جائے گا کہ اس تاریخی حقیقت سے انکار خود غرضی، سیاسی اور تاریخی بد دیانتی اور منافقت کی بدترین مثال پیش کرتا ہے۔

میری گلگت بلتستان کی سطح کی سیاست سے منسلک ہونے کی بجائے تحریک آزادیٔ کشمیر سے

منسلک ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ میں پورے خلوص کے ساتھ سمجھتا ہوں کہ جس قسم کے خودمختار کشمیر کیلئے میں اور میری تنظیم جدوجہد کر رہے ہیں اس خودمختار کشمیر کا حصہ بننے کی صورت میں گلگت بلتستان کے موجودہ سیاسی اور آئینی مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے اسلئے خودمختار کشمیر کیلئے میری جدوجہد بالواسطہ طور پر گلگت بلتستان کے حقوق کیلئے بھی ہے۔ اور تیسری اور اہم ترین حقیقت یہ ہے کہ میں گلگت بلتستان کے سیاسی اور آئینی حقوق کیلئے براہ راست کی جانے والی جدوجہد میں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہا جس کے ثبوت آپ کو اسی کتاب میں ملیں گے۔

جہاں تک کشمیری لیڈروں کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں اور میں ان سے کبھی کبھی انتہائی جارحانہ انداز میں بھی کہتا ہوں کہ آپ لوگ گلگت بلتستان کے بارے میں اپنے قومی فرائض انجام نہیں دے رہے لیکن کیا اس حقیقت سے بھی انکار کیا جاسکتا ہے کہ گلگت بلتستان کے لوگوں خاص کر نوجوانوں سے بار بار بڑے جارحانہ انداز میں کہلوایا گیا کہ گلگت بلتستان کے علاقے ریاست جموں کشمیر کا حصہ نہ کبھی تھے نہ ہیں نہ ہونگے۔ گلگت بلتستان کے اکثر نوجوان کشمیری قیادت کے بارے میں بار بار نازیبا زبان بھی استعمال کرتے رہے۔ سردار سکندر حیات خان نے آزاد کشمیر کے صدر کی حیثیت سے کئی بار اخبارات کے ذریعہ اعلان کیا کہ اگر گلگت بلتستان کے بھائی ہم سے ملنا چاہتے ہیں۔ تو میں فوراً ہی اپنا عہدہ انہیں دیدوں گا لیکن گلگت بلتستان سے کسی نے انکا شکریہ تک ادا نہیں کیا۔ آزاد کشمیر کے اکثر لیڈر کہتے ہیں کہ جب گلگت بلتستان والے اپنے آپ کو ریاست جموں کا حصہ ہی نہیں سمجھتے اور ہمیں اپنا دشمن سمجھتے ہیں تو ہم اپنے آپ کو ان پر مسلط کیوں کریں۔

بہر حال دونوں طرف کے اس استدلال سے مرغی پہلے پیدا ہوئی یا انڈا والی صورتحال پیدا ہوگئی ہے۔ اس مسئلے کو الزام تراشی سے نہیں بلکہ افہام وتفہیم کے ذریعے ہی حل کیا جاسکتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ گذشتہ سالوں کے دوران طرفین کے طرز فکر وعمل میں بڑی مثبت تبدیلی آ گئی ہے۔ 2002ء میں گلگت بلتستان نیشنل الائنس کے رہنماؤں کے دورہ آزاد کشمیر اور وہاں ان کے شاندار استقبال کے نتیجے میں خاصی ذہنی تبدیلی آئی ہے اور اسی قسم کی تبدیلی اس سے پہلے گلگت بلتستان کی قانون ساز کونسل کے ممبران کے دورہ آزاد کشمیر اور وہاں ان کے شاندار استقبال کے نتیجے میں آئی تھی۔ مئی 2004ء میں جماعت اسلامی آزاد کشمیر کی طرف سے گلگت میں ہونے والی وحدت کشمیر کانفرنس جس میں آزاد کشمیر کے جملہ معروف سیاسی پارٹیوں کے زعما نے شرکت کی نے ریاست کے دونوں علاقوں کے مابین فاصلے اور کم کر دیے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومتی، سیاسی پارٹیوں اور عوام خاص کر طلبا کی سطح پر آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کے مابین مسلسل اور باقاعدگی کے ساتھ رابطہ رہے تبھی پانچ عشروں کی دوری کے نتیجے میں پیدا ہونے مسائل حل ہوسکتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ گلگت بلتستان کے عوام خاص کر پڑھے لکھے نوجوان اپنے طرز فکر وعمل کے بارے میں میرے درج بالا استدلال پر ٹھنڈے دل سے غور کر کے میرے بارے میں بدگمانیاں دل سے نکال پھینکیں گے۔

7- گلگت بلتستان سے متعلق میری ذاتی کارکردگی

ایک انتہائی مختصر جائزہ

جیسا کہ اس باب کے اوائل میں بیان کر چکا ہوں 1986ء میں برطانیہ سے واپسی سے ماضی قریب تک گلگت بلتستان کے اکثر لکھے پڑھے اصحاب خاص کر نوجوان مجھ سے شکوہ کرتے تھے کہ آپ اپنے آبائی علاقے کو چھوڑ کر کشمیر سے کیوں منسلک ہو گئے جبکہ گلگت بلتستان کے علاقے آپ کی توجہ کے زیادہ مستحق ہیں۔ میں نے اس ظاہراً جائز شکوے کا مدلل جواب پچھلے باب میں دیا ہے۔ آیئے اب گلگت بلتستان کے عوامی، سیاسی، آئینی، سماجی اور معاشی حقوق اور مسائل کے بارے میں میری عملی کارکردگی پر ایک انتہائی سرسری نظر ڈالیں۔

جیسا کہ میں نے کتاب کی پہلی جلد میں تفصیلاً وضاحت کی ہے۔ میں بچپن میں ہی استور سے وادیٔ کشمیر چلا گیا جہاں میں نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی اور جنوری 1952ء میں پاکستان آ گیا جہاں میں نے ایڈورڈز کالج پشاور میں دوبارہ تعلیم شروع کی۔ میں سرینگر میں سیاسی ماحول میں رہتا تھا اس لیے میرا ذہن خاصا سیاسی تھا۔ ایڈورڈز کالج کی طالب علمی کے دوران میں نے پشاور میں زیر تعلیم گلگتی طلبا کو منظم کرنے کا فیصلہ کیا (اس زمانے میں گلگت کے زیادہ تر طالب علم اسلامیہ کالج پشاور میں پڑھتے تھے) اس سلسلے میں مجھے خاصی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا بہرحال میں نے ہمت نہ ہاری اور چند ماہ کی مسلسل کوششوں کے بعد گلگت سٹوڈنٹس فیڈریشن قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا جسکے بعد اسکی شدید مخالفت کرنے والے بھی اس میں شامل ہو گئے۔ اسکے پہلے صدر نگر کے سلطان حمید صاحب جنرل سیکرٹری، میں جوائنٹ سیکرٹری ہنزہ کے غازی جوہر مرحوم (سابق ڈپٹی کمشنر) اور مجلس عاملہ کے ممبروں میں پونیال کے محمد ولی۔ حسین ولی۔ یاسین کے شیر رادخان اور شیر باز خان۔ استور کے محمد اشرف خان۔ (بانی جنرل مینجر چینا ٹریڈ سنڈیکیٹ اور بانی مینجر کوا پریٹو بنک) ڈموٹ سئے کے علی احمد جان مرحوم اور محمد رحیم مرحوم اور گلگت خاص کے مرحوم خالد کاشمیری (لیکچرار) شامل تھے۔ یہ تنظیم گلگت بلتستان کے طلبا کی پہلی تنظیم تھی۔

1952ء کے اواخر میں ہی کراچی منتقل ہونے کے بعد میں کچھ مدت ذاتی مسائل حل کرنے میں مصروف رہا اسکے بعد کراچی میں زیر تعلیم گلگت کے طلبا کی ہر ممکن مدد کی خاص کر پیشہ ورانہ کالجوں میں ان کیلئے نشستیں مختص کرانے اور داخلے کرانے کے سلسلے میں۔ میرے اپنے تعلیمی ادارے مری ڈیل انگلش سکول اور حبیبیہ نائٹ سکول کے قیام کے بعد ان اداروں میں کراچی کے کالجوں اور یونیورسٹی میں زیر تعلیم

گلگت بلتستان اور آزاد کشمیر کے طالب علموں کو کل وقتی یا جز وقتی ملازمت دے کر محنت مزدوری کرنے والوں کو اپنے نائٹ سکول میں بغیر فیس کے پڑھا کر اور بے روزگاروں کو ملازمت دلانے میں مدد کر کے اور ان میں سے بہتوں کو ملازمت ملنے تک اپنے زیر کفالت رکھ کر انکی مدد کرتا رہا۔ (جس کیلئے میری پرانی رہائش گاہ جسے لوگ کمپاؤنڈ کے نام سے جانتے تھے استعمال ہوتی تھی جہاں ان بے روزگاروں کو رہائش کے علاوہ کھانا بھی ملتا تھا) ان تمام حقائق کے عینی گواہ وہ لوگ ہیں جو 1956ء سے 1976ء میں میرے برطانیہ جانے تک کے عرصے کے دوران کبھی کراچی میں زیر تعلیم یا برسر روزگار تھے۔

گلگت بلتستان سٹوڈنٹس فیڈریشن کراچی جو بعد میں گلگت بلتستان سٹوڈنٹس سنٹرل آرگنائزیشن بن کر سارے پاکستان آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان تک پھیل گئی اور جس نے طلبا کے سیاسی معاملات میں اہم کردار ادا کیا، کے قیام اور فروغ میں مرحوم محمد اسحاق آف بلتستان کا اور میرا کلیدی حصہ تھا گو اس میں دوسرے اصحاب کی محنت اور تگ و دو بھی شامل تھی۔ اسی طرح گلگت بلتستان یونائٹڈ آرگنائزیشن کراچی بھی ہماری ہی کوششوں سے بنی تھی۔ تینوں تنظیموں نے گلگت بلتستان کے علاقوں اور انکے عوامی حقوق کو بیرونی دنیا خاص کر پاکستان میں متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔

میں اپنے رسالے ماہنامہ وائس آف کشمیر کے ذریعے بھی گلگت بلتستان کے عوامی حقوق کے لیے جدوجہد کرتا رہا۔ اس میں گلگت بلتستان سے متعلق مضامین شایع ہوتے رہے جن میں وہاں کے لوگوں کی محرمیوں کا تذکرہ ہوتا رہا۔ جنوری 1964 میں میں نے اسکا گلگت بلتستان نمبر (سپلمینٹ) شائع کیا جس میں گلگت بلتستان کے مسائل کے علاوہ وہاں کے عوامی حقوق انکی اقتصادی زبوں حالی اور ترقیاتی منصوبوں کے لئے مختص رقوم کی غیر مقامی افسروں کی طرف سے لوٹ مار کا واضح نقشہ کھینچا جس پر پاکستان کی وزارت امور کشمیر (جو گلگت بلتستان سے متعلق امور کی نگران تھی) میرے خون کی پیاسی ہوگئی اور مجھے اس گستاخی کی بھاری سزائیں بھگتنی پڑیں۔

میں پاکستان اور آزاد کشمیر کے اخبارات اور رسائل میں مضامین اور بیانات اور اپنے تحریر کردہ کتابچوں (اقرار جرم، دستاویز غلامی، گلگت بلتستان میں ایجنسی نظام کیوں؟ وغیرہ) کے ذریعہ بھی گلگت بلتستان کے عوامی حقوق کے حق میں اور وزارت امور کشمیر اور مقامی انتظامیہ کے خلاف آواز اٹھاتا رہا۔ جس کے نتیجے میں گلگت کے ارباب اقتدار سیخ پا ہو گئے۔ ریزیڈنٹ بریگیڈئر حبیب الرحمٰن نے استور میں میری موروثی جائداد نیلام کرنے اور مجھ سے وہاں سات دیہات کی موروثی نمبرداری چھیننے کے احکامات جاری کیے لیکن استور کے اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ حکیم لطیف صاحب نے ایسا کرنے سے یہ کہہ کر انکار کیا کہ ایسا کرنے کا کوئی قانونی جواز نہیں اور ایسا بلا جواز اقدام علاقے میں فسادات کا باعث بھی بن سکتا ہے۔ اس کے بعد سرکاری ملازمتوں میں میرے بزرگوں اور عزیزوں کو میری خطاؤں کی سزا دی جاتی رہی مثلاً میرے

Weekly K-2 Sept 01, 1999

جموں و کشمیر کی مکمل خود مختاری کا گلگت بلتستان کے مفادات میں ہے: امان اللہ

وفاقی حکومت شمالی عوام کو ایسا پیکج دے آئینی حقوق بھی مل جائیں اور مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی پر کوئی

آزاد کشمیر کی طرز پر شمالی علاقوں کو بھی خود مختاری دے کشمیر کو تسلیم نہ کرنے اور آزاد کشمیر پر ہم کو رعایتیں دینے کی مخالفتوں سے کشمیر

گلگت بلتستان میں آزاد کشمیر طرز کی حکومت قائم کرنے کا مطالبہ

مظفر آباد (نمائندہ خصوصی) جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ نے ایک ریزولیشن جاری کیا ہے جس میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ گلگت بلتستان کے لئے آزاد کشمیر طرز پر وہاں حکومت قائم کی جائے جس کی اپنی کابینہ اسمبلی اور انتظامیہ اور منتخب عوامی نمائندوں کو انفرسٹرکچر بالادستی حاصل ہو آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کے لئے مشترک صدر سپریم کورٹ اور پبلک سروس کمیشن ہو صدر ریاست آزاد کشمیر گلگت بلتستان کا بھی ہو۔ گلگت بلتستان کو کشمیر کونسل میں مناسب نمائندگی دی جائے پاکستان نیلی دیزن شمالی علاقوں کو اپنا حصہ دکھانے کے بجائے ریاست جموں و کشمیر کا حصہ دکھائے وہاں پر یونیورسٹی میڈیکل اور انجینئرنگ کالج قائم کئے جائیں بے روزگار ڈاکٹروں اور انجینئروں کو روزگار فراہم کیا جائے ریزولیشن میں کہا گیا ہے کہ گلگت بلتستان کے عوام کے حقوق کے لئے بھرپور جدوجہد جاری رکھی جائے گی۔

Daily Jang 17 Feb. 1998

گلگت و بلتستان کے عوام بھیڑ بکریاں نہیں جن کا سودا کیا جائے۔ امان اللہ

جماعت اسلامی کی کل جماعتی گلگت کانفرنس مجرمانہ حرکت ہے، وہ شمالی علاقوں کے عوام سے معافی مانگے

گلگت و بلتستان سے متعلق کسی بھی اجتماع میں وہاں کے عوام کو شامل نہ کرنا انہیں انسان نہ سمجھنے کے مترادف ہے

گلگت بلتستان کو پاکستان کا کالونی نہ سمجھا جائے، امان اللہ

گلگت بلتستان کے ساتھ یہ ظلم کیوں

برمنگھم برطانیہ سے میری ادارت میں شائع ہونے والے ماہنامہ وائس آف کشمیر کے ستمبر 1979ء کے شمارے کے اداریے کا عنوان۔

Daily Jang 12March 2001

شمالی علاقہ جات میں گلگت بلتستان نیشنل الائنس کا قیام

شمالی علاقوں سے متعلق وفاق کا یکطرفہ فیصلہ تسلیم نہیں کیا جائے گا، اتحاد کا اعلان



روزنامہ جنگ راولپنڈی (8) بمورخہ 23 اپریل 1999ء

گلگت و بلتستان کے عوام کو آئینی حقوق دیئے جائیں، امان اللہ

اردون ایریا کو کونسل کو قانون ساز اسمبلی کا درجہ اور شمالی علاقوں کے لوگوں کو کشمیر کونسل میں نمائندگی دی جائے

کارگل بحران میں بے گھر ہونے والوں کی بحالی کے اقدامات کئے جائیں، نواز شریف کے نام خط

IN THE COURT OF DISTRICT MAGISTRATE GILGIT.

ORDER.

WHEREAS, it has been brought to my notice by the local police that Mr. Amanullah Khan r/o District Distt. is acting in a manner pre-judicial to public safty and the maintenance of public order and peace.

AND WHEREAS, I, Mian Waheed-ud-din, District Magistrate, Gilgit, am satisfied that with a view to prevent Mr. Amanullah Khan from acting in a manner pre-judicial to public safty and maintenance of public order, it is necessary to give a direction hereinafter appearing about the said order.

NOW THEREFORE, I, Mian Waheed-ud-din, District Magistrate, Gilgit, in exercise of the powers conferred upon me under section 5-1(c) of the West Pakistan Maintenance of public Order Ordinance 1960, do hereby direct that the said Mr. Amanullah Khan shall immediately remove himself from within the revenue limits of Gilgit District for a period of 60 days with effect from the date of issuance of this order.

AS REQUIRED BY Section 5-A of the above quoted Ordinance, said Mr. Amanullah Khan is also informed that he is at liberty to make a representation to the Government, against this order. The grounds on which the order has been made are enclosed.

GIVEN UNDER my hand and Seal of the court, this 27th April, 98.

(Mian Waheed-ud-din)
DISTRICT MAGISTRATE, GILGIT.

No. J-65/ 538-43 /98.
Dated 27th April, 1998.
Acopy is forwarded to :-

1. The Chief Secretary, Northern Areas, Gilgit.
2. The Inspector General of Police, Northern Areas, Gilgit.
3. The Senior Superintendent of Police, Special Branch, Gilgit.
4. The S.S.P, Gilgit.
5. The A.C, Gilgit.

(Mian Waheed-ud-din)
DISTRICT MAGISTRATE, GILGIT.

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ گلگت کا حکم نامہ

بھانجے مرحوم محمد نواز نے انجینئرنگ کی ڈگری فسٹ ڈویژن میں حاصل کی تھی لیکن انجینئرنوں کی تین اسامیاں خالی ہونے کے باوجود اسے دو سال تک ملازمت نہیں دی گئی مقدر دیکھیے بالآخر مجھے اپیل کرنا تھا۔ اسی طرح میرے بھائی عطی اللہ خان کی ذاتی فائل میں لکھا گیا کہ یہ امان اللہ کا بھائی ہے جو پاکستان کا مخالف اور خودمختار کشمیر کا حامی ہے مطلب یہ تھا کہ اسے ترقی یا کوئی اہم پوسٹ نہ دی جائے۔ عطی اللہ خان نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا عدالت نے اس کے بارے میں اس ریمارک کو غیر قانونی قرار دیا۔ اس کے باوجود عطی اللہ خان کو بارہ سال تک ایک ہی گریڈ میں رکھا گیا جس دوران اس کے ماتحت اس کے افسر بنتے گئے۔

میں نے اپنے دس سالہ قیام برطانیہ کے دوران بھی گلگت بلتستان کو فراموش یا نظر انداز نہیں کیا اور ان علاقوں کے عوامی اور آئینی حقوق کے حق میں آواز اٹھاتا رہا۔

جیسا کہ کتاب میں کہیں اور بھی ذکر ہوا ہے ستمبر 1970ء میں ہم نے ہفتہ گلگت بلتستان منایا آزاد کشمیر اور پاکستان کے بڑے شہروں میں جلسے کیے اور مطالبہ کیا کہ گلگت بلتستان میں بھی آزاد کشمیر کی طرح انتخابات کرائے جائیں (ان دنوں آزاد کشمیر میں انتخابات ہو رہے تھے) ہم گلگت آئے اور جلسے کا پروگرام بنایا لیکن انتظامیہ نے ہمیں گرفتار کر کے راتوں رات گلگت کی حدود سے باہر پھینک دیا اسی دوران حکومت پاکستان کا ایک اعلیٰ سطحی اجلاس ہوا جس میں ہمارا دورۂ گلگت اور گرفتاریاں بھی زیر بحث آئیں اور آخر گلگت بلتستان والوں کا منہ بند کرنے کیلئے یہاں کیلئے ایک منتخب لیکن بے اختیار مشاورتی کونسل کے قیام کی منظوری دی گئی۔ میں اپنے ایک قریبی دوست اور مرکزی وزیر مملکت معراج محمد خان (جنہیں بھٹو صاحب نے اپنا جانشین نامزد کیا تھا) کے ذریعہ بھی حکومت پاکستان کو گلگت بلتستان کے حالات اور انکے حقوق کے بارے میں حقائق سے آگاہ کرتا رہا اور بھٹو صاحب کی حکومت نے 1974ء میں گلگت بلتستان میں انتہائی دوررس نتائج کی حامل اصلاحات کیں۔ اگر ایسا کہا جائے کہ گلگت بلتستان کو رسوائے زمانہ ایف سی آر اور ایجنسی نظام سے نجات دلانے۔ مشاورتی کونسل کے قیام (جواب قانون ساز کونسل کہلاتی ہے) سرکاری ملازمتوں میں مقامی نوجوانوں کو ترجیح ملنے اور ترقیاتی منصوبوں کیلئے رقوم میں اضافے میں میری ذاتی اور میری تنظیم جموں کشمیر محاذ رائے شماری کی کوششوں کا بھی کچھ ہاتھ ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

میں نے نومبر 1970ء سے فروری 1972ء تک 15 ماہ کی اسیری (جو گلگت بلتستان کے عوامی حقوق کے لئے کاٹی جانے والی اب تک کی طویل ترین قید ہے) کاٹی اور مجھے ستمبر 1970ء اور اپریل 1998ء میں میرے ساتھیوں سمیت جبراً گلگت بدر کیا گیا۔

میری مدت سے خواہش تھی کہ میں گلگت بلتستان سے فرقہ واریت کے خاتمے کیلئے بھی کچھ کروں۔ چنانچہ مئی 2004ء میں اپنے قیام گلگت کے دوران میری درخواست پر 22 مئی 2004ء کو

گلگت کے زعما کی ایک نشست ہوئی جہاں میں نے علاقے سے فرقہ واریت کے خاتمے کیلئے اجتماعی کوششوں کی ضرورت پر زور دیا۔ جملہ معززین خاص کر حاجی غلام رسول صاحب، وزیر سجاد علی صاحب، پروفیسر عثمان صاحب، محمد اکرم خان صاحب، میجر حسین شاہ صاحب، رضی الدین رضوی صاحب، ذوالفقار علی صاحب، جمشید دکھی صاحب، شیر باز علی برچہ صاحب، مالک شاہ صاحب، سیف الدین صاحب، ضیاء الحق صاحب، شیر ولی خان صاحب، خوشی محمد طارق صاحب، ایمان شاہ صاحب، سید فاضل شاہ صاحب، ماسٹر عادل خان صاحب وغیرہ نے میری رائے سے اتفاق کیا آخر میں فیصلہ ہوا کہ ایسی کوشش ضرور کی بجائے اور مجھے کہا گیا کہ اب کے میں اس کوشش کی ابتدا کروں اور اس سلسلے میں مجھے اختیار دیا گیا کہ میں تینوں یعنی سنی۔ شیعہ اور اسماعیلی فرقوں کے اکابرین پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دوں اور کام شروع کروں۔ چنانچہ میں نے احباب کے مشورے سے اہل تشیع سے محمد اکرام خان صاحب ریٹائرڈ کنٹرولر ریڈیو پاکستان گلگت۔ سید فاضل شاہ صاحب ریٹائرڈ چیف انفارمیشن آفیسر گلگت۔ اور محمد انور خان صاحب ریٹرڈ ڈپٹی ڈائریکٹر (ایل بی اینڈ آر ڈی) گلگت۔ سنی فرقے سے مشتاق احمد ایڈوکیٹ امیر جماعت اسلامی آزاد کشمیر گلگت۔ عطاء اللہ شہاب صاحب جنرل سیکرٹری جمعیت العلمائے اسلام (ف) گلگت (شہاب صاحب نمائندگی قبول کرنے اور اجلاسوں میں شریک ہونے کے باوجود نہ وفد میں شامل ہوئے نہ انہوں نے وفد کی مرتب کردہ تجاویز پر دستخط کئے) اور جمشید خان صاحب دکھی جنرل سیکرٹری حلقہء ارباب ذوق گلگت اور اسماعیلی کمیونٹی سے ایمان شاہ صاحب سابق صدر گلگت پریس کلب۔ عرب خان صاحب کنٹریکٹر اور علی خان ایڈوکیٹ صاحب یا ہدایت شاہ صاحب، چیئرمین الصباح ویلفیئر ٹرسٹ پر مشتمل کمیٹی تشکیل دی اور گلگت میں صحت مند فرقہ وارانہ فضا قائم کرنے کیلئے ایک سات نکاتی مسودہ مرتب کر کے اہل تشیع کے مذہبی قائد آغا ضیاء الدین صاحب تنظیم اہلسنت الجماعت کے سربراہ قاضی نثار احمد صاحب اور اسماعیلی کونسل گلگت کے ظفر اقبال صاحب (مینیجنگ ڈائریکٹر ناردرن ایریاز ٹرانسپورٹ کمپنی) سے ملے بلکہ آغا ضیاء الدین صاحب سے دو بار ملے۔ اسماعیلی کونسل کے سربراہ نے ہماری تجاویز پڑھ کر ان سے اتفاق کیا اور دستخط کئے بلکہ مہر بھی لگا دی اور ہمیں یقین دلایا کہ اسماعیلی کمیونٹی ایسی کوششوں میں ہمیشہ پیش پیش رہیگی۔ لیکن ہم پوری کوشش اور انتہائی صبر و تحمل سے کام لینے کے باوجود آغا صاحب اور قاضی صاحب کو مفاہمت پر آمادہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے ادھر افسر شاہی کیلئے بھی ان کا یہ طرز عمل ''نفاق ڈالو اور حکومت کرو'' والے انگریزی نسخے کیلئے موافق فضا پیدا کرتا ہے۔ بہر حال مجھے اپنی اس ناکامی پر انتہائی دکھ ضرور ہوا ہے لیکن یہ ناکامی مجھے اپنے فرائض کے راستے سے نہیں ہٹا سکتی۔

میں متذکرہ بالا جملہ زعما کا بالعموم اور ممبران کمیٹی کا بالخصوص انتہائی مشکور ہوں کہ انہوں نے اس اہم مشن میں میری حوصلہ افزائی کی خاص کر ممبران کمیٹی کا جنہوں نے دونوں فرقوں کے سربراہوں کی انتہائی

تلخ باتیں بھی برداشت کیں۔ میں اسماعیلیہ کمیونٹی خاص کر انکی تنظیم کے سربراہ ظفر اقبال صاحب کا مشکور ہوں کہ انہوں نے نہ صرف ہماری تجویز تحریری طور پر تسلیم کی بلکہ ہمارے ساتھ بھرپور تعاون کا یقین بھی دلایا۔

یہ تھا ایک انتہائی مختصر جائزہ گلگت بلتستان کے عوامی، سیاسی اور آئینی حقوق کیلئے میری کاوشوں کا۔ اس موضوع پر میں نے یہاں اسلئے قلم اٹھایا کہ کچھ لوگ خاص کر لکھے پڑھے نوجوان حقائق سے آگاہ نہ ہونے کی وجہ سے میرے بارے میں غلط فہمیوں کا شکار ہیں۔ میں نے عوامی حقوق کے لئے جدوجہد کر کے اور کچھ لوگوں خاص کر کراچی میں زیرِ تعلیم طلباء کی کچھ مدد کر کے کسی پر کوئی احسان نہیں کیا نہ ہی کسی ذاتی مفاد کے لئے کیا۔ ایسا کرنا ان علاقوں کے ایک لکھے پڑھے فرزند کی حیثیت سے میرا فرض تھا اور اس فرض کی ادائیگی کسی نہ کسی شکل اور مقدار میں انشاءاللہ تاحیات جاری رہیگی۔

8- جموں کشمیر اسمبلی میں گلگت بلتستان لداخ کی نمائندگی

ریاست جموں کشمیر میں 1934ء میں پہلی اسمبلی (پرجا سبھا) قائم ہوئی۔ اسمبلی کے قیام سے پہلے ہی گلگت (بجز علاقہ استور) کو 60 سال کے پٹے پر براہ راست انگریز حکومت کی تحویل میں دینے کا فیصلہ ہوا تھا (اس فیصلے پر عمل مارچ 1935ء سے شروع ہوا) انگریزوں نے ان علاقوں کو ایجنسی کا درجہ دیکر اسکا نام گلگت ایجنسی رکھا۔ 1934ء سے ہی استور اور بلتستان کو کشمیر اسمبلی میں نمائندگی دی گئی جو 1947ء تک قائم رہی۔ یکم اگست 1947ء کو گلگت ایجنسی انگریزوں نے حکومت ریاست جموں کشمیر کو واپس کر دی جس نے ان علاقوں کے ساتھ استور بلتستان اور لداخ ملا کر ریاست جموں کشمیر کا تیسرا صوبہ بنا دیا اور اسکا نام گلگت فرنٹیئر صوبہ رکھا۔ کشمیر گورنمنٹ اس وقت تیسرے صوبے کو کشمیر اسمبلی، فوج اور انتظامیہ میں اسکا حصہ دینے پر غور کر رہی تھی کہ گلگت میں اسکے خلاف بغاوت ہوگئی اور گلگت بلتستان کے علاقے اس سے الگ ہو گئے۔

1934ء سے جموں کشمیر اسمبلی (پرجا سبھا) میں استور بلتستان اور لداخ کو نمائندگی مندرجہ ذیل تھی۔

1934ء سے 1937ء تک کی

1- لداخ وزارت (1) من تھونٹ شاہ
2- لداخ وزارت (2) کالن زانگلو
3- سکردو تحصیل، افتخار علی خان
4- کرگل تحصیل، سید وجاہت علی شاہ،
5- استور تحصیل، وزیر محمد خان۔

1937ء سے 1942ء تک کی اسمبلی

-1	لداخ وزارت (1)	جگمت داد دل
-2	لداخ وزارت (2)	لا بنرنگ چوانگ
-3	اسکردو تحصیل۔	محمد علی شاہ
-4	کرگل تحصیل۔	وجاہت علی شاہ
-5	استور تحصیل۔	راجہ حسن خان

1942ء میں قائم ہونے والی اسمبلی

1-لداخ،(1) جگمت داد دل،2-لداخ،--(2)نونو چنگ انچن،3-اسکردو، فتح علی خان،
4- کرگل احمد علی خان 5۔استور راجہ غلام رضا خان

جنوری 1947ء میں قائم ہونے والی اسمبلی

لداخ (1) چودنگ انچن — لداخ (2) سونم ٹنزن
اسکردو۔ فتح علی خان — کرگل۔ احمد اللہ خان
استور۔ کاچو سلطان محمد شاہ

9- گلگت بلتستان قانون ساز کونسل

فہرست منتخب ممبران

ستمبر 1970ء میں جموں کشمیر محاذ رائے شماری (جس کا میں سیکرٹری جنرل تھا) نے گلگت بلتستان کے عوامی حقوق کے سلسلے میں ''ہفتہ گلگت بلتستان'' منایا اور پاکستان اور آزاد کشمیر کے بڑے بڑے شہروں میں احتجاجی مظاہرے اور جلسے کیے اور اسی سلسلے میں محاذ کا وفد گلگت گیا لیکن انہیں میرے سمیت جبراً گلگت بدر کر دیا گیا البتہ حکومت کو احساس ہو گیا کہ اگر گلگت بلتستان والوں کو کچھ حقوق نہ دیئے گئے تو حالات مزید خراب ہو سکتے ہیں اسلیئے حکومت پاکستان نے یہاں کیلئے ایک بے اختیار مشاورتی کونسل کے قیام کا اعلان کیا جسکے سربراہ وہاں متعین حکومت پاکستان کے نمائندے یعنی ریذیڈنٹ برائے گلگت بلتستان ہونگے اور جو گلگت بلتستان سے منتخب چودہ نمائندوں اور پانچ نامزد (سرکاری افسروں) پر مشتمل ہوگی۔ اس فیصلے اور اس کے متذکرہ بالا پس منظر کی خبر اخباروں میں بھی شائع ہوئی تھی۔

پہلی ٹرم ۔ 1970ء تا 1975ء کیلئے پہلے انتخابات 30 دسمبر 1970ء کو ہوئے جن میں مندرجہ ذیل اصحاب منتخب ہو گئے ۔ گلگت (1) وزیر غلام عباس ۔ گلگت (2) غلام مصطفےٰ ۔ استور (1) امیر حمزہ ۔ استور (2) محمد خورشید خان ۔ چلاس عبدالرؤف ۔ داریل تنگیر ملک محمد مسکین ۔ غذر (1) پیر کرم علی شاہ ۔ غذر (2) سید فضل حسین ۔ روندو راجہ فضل علی خان ۔ سکردو آغا محمد ۔ شگر محمد حسین ۔ خپلو وزیر محمد صادق ۔ خپلو (2) راجہ فتح علی خان اور کھرمنگ سے راجہ امان علی شاہ ۔

دوسری ٹرم ۔ 1975ء تا 1979ء انتخابات 6 نومبر 1975ء کو ہوئے اور مندرجہ ذیل اصحاب منتخب ہوئے ۔ گلگت (1) الطاف حسین ایڈووکیٹ ۔ گلگت (2) رسول میر ۔ نگر قربان علی ۔ ہنزہ عیاش خان ۔ غذر (1) پیر کرم علی شاہ ۔ غذر (2) فدا علی ۔ استور (1) قاری عبدالحکیم ۔ استور (2) عبدالحمید خان خاور ۔ چلاس حاجی عبدالرؤف ۔ داریل تنگیر ملک محمد مسکین ۔ روندو سید شمشاد حسین ۔ اسکردو سید حیدر شاہ ۔ شگر وزیر محمد حسین ۔ کھرمنگ وزیر محمد صادق ۔ بلفار راجہ حامد حسین ۔ خپلو سید محمد کاظمی ۔

تیسری ٹرم ۔ انتخابات 15 اکتوبر 1979ء کو ہوئے اور مندرجہ ذیل ممبر منتخب ہوئے ۔
گلگت (1) جوہر علی خان ۔ گلگت (2) دیدار علی ۔ نگر سید یحییٰ شاہ ۔ ہنزہ میر غضنفر علی خان ۔ غذر (1) پیر کرم علی شاہ ۔ غذر (2) راجہ غلام دستگیر ۔ استور (1) وزیر افلاطون ۔ استور (2) قاری عبدالحکیم ۔ چلاس حنیف اللہ ۔ داریل تنگیر امیر جان ۔ روندو وزیر محمد صادق ۔ اسکردو حاجی جمعہ خان شگر حاجی محمد حسین ۔ کھرمنگ سید محمد علی شاہ ۔ خپلو غلام علی حیدری ۔

چوتھی ٹرم ۔ انتخابات 26 اکتوبر 1983ء کو ہوئے اور مندرجہ ذیل ممبر منتخب ہوئے ۔
گلگت (1) محمد لطیف حسن ۔ گلگت (2) سید جعفر شاہ ۔ نگر میر شوکت علی خان ۔ ہنزہ میر غضنفر علی خان ۔ غذر (1) پیر کرم علی شاہ ۔ غذر (2) سید فضل حسین استور (1) محبوب علی خان ۔ استور (2) حاجی جان محمد ۔ چلاس عبدالقدوس خان ۔ داریل تنگیر حاجی امیر جان ۔ روندو آغا احمد علی شاہ ۔ سکردو حاجی احمد چو ۔ شگر حاجی محمد حسین ۔ خپلو (1) محمد جعفر خپلو (2) محمد اسماعیل ۔ کھرمنگ آغا محمد علی شاہ ۔

پانچویں ٹرم ۔ انتخابات 11 نومبر 1987ء کو ہوئے اور مندرجہ ذیل ممبر منتخب ہوئے
گلگت (1) وجاحت حسن خان ۔ گلگت (2) جعفر شاہ ۔ نگر قربان علی ۔ ہنزہ میر غضنفر علی خان ۔ غذر (1) پیر کرم علی شاہ ۔ غذر (2) سید فضل حسین ۔ استور (1) محمد نصیر ۔ استور (2) صاحب خان ۔ چلاس جانباز خان ۔ داریل تنگیر جان عالم ۔ روندو آغا محمد علی شاہ ۔ اسکردو وزیر فیض محمد ۔ شگر راجہ محمد اعظم خان ۔ خپلو (1) سید طاہر علی شاہ ۔ خپلو (2) محمد جعفر ۔ کھرمنگ سید اسد زیدی ۔

چھٹی ٹرم ۔ 1991ء تا 1994ء ۔ انتخابات نومبر 1991ء میں ہوئے اور درج ذیل ممبر منتخب ہوئے ۔
گلگت (1) سنبل شاہ ۔ گلگت (2) مولوی سعید محمد ۔ ہنزہ میر غضنفر علی خان ۔ استور (1) محبوب علی خان ۔ استور (2) شاہد علی خان ۔ چلاس عبدالقدوس خان ۔ داریل تنگیر مہر داد ۔ سکردو حاجی غلام حیدر ۔ کھرمنگ

سید اسد زیدی۔ شگر راجہ محمد اعظم خان۔ خپلو فدا حسین زیدی۔ خپلو (2) محمد جعفر۔ غذر (1) پیر کرم علی شاہ۔ غذر (2) غلام محمد۔ خواتین نشستوں پر رانی عتیقہ غضنفر گلگت اور فوزیہ سلیم عباس بلتستان۔

ساتویں ٹرم۔ یہ انتخابات اکتوبر 1994ء میں ہوئے اور مندرجہ ذیل اصحاب منتخب ہوئے

گلگت (1) سید رضی الدین۔ گلگت (2) محمد موسیٰ۔ گلگت (3) محمد اقبال۔ گلگت (4) شیخ حیدر گلگت (5)۔ میر شوکت علی خان گلگت (6) نذیر صابر۔ استور (1) نصر اللہ خان۔ استور (2) عبدالحمید۔ چلاس (1) شاہ بیگ۔ چلاس (2) جانباز خان۔ داریل حیدر خان۔ تنگیر حاجی امیر جان۔ اسکردو (1) غلام حسین سلیم۔ اسکردو (2) سید محمد عباس۔ سکردو (3) فدا محمد ناشاد۔ روندو صادق علی۔ کھرمنگ اسد زیدی۔ شگر محمد حسین۔ خپلو (1) فدا حسین زیدی۔ خپلو (2) محمد اقبال۔ مشبروم محمد اسماعیل۔ غذر (1) پیر کرم علی شاہ۔ غذر (2) سید فضل حسین۔ غذر (3) مرتضےٰ خان۔ خواتین کی نشستوں پر پروین اشرف، شائستہ شمیم حمزہ۔

آٹھویں ٹرم۔ یہ انتخابات نومبر 1999ء میں ہوئے اور مندرجہ ذیل اصحاب منتخب ہوئے۔

گلگت (1) دیدار علی۔ گلگت (2) سیف الرحمن / حفیظ الرحمن۔ گلگت (3) سید جعفر شاہ۔ گلگت (4) شیخ غلام حیدر۔ نگر قربان علی۔ ہنزہ وزیر بیگ۔ استور (1) صاحب خان۔ استور (2) محبوب علی خان۔ چلاس (1) حاجی شاہ بیگ۔ چلاس (2) جانباز خان۔ داریل رحمت خالق۔ تنگیر حاجی امیر جان۔ غذر (1) پیر کرم علی شاہ۔ غذر (2) سرفراز شاہ۔ غذر (3) جلال الدین / غلام محمد۔ سکردو (1) سید مہدی شاہ۔ سکردو (2) سید محمد عباس رضوی۔ سکردو (3) فدا محمد ناشاد۔ سکردو (4) وزیر حسین۔ سکردو (5) سید محمد علی شاہ۔ سکردو (6) عمران ندیم۔ گھانچے (1) محمد جعفر۔ گھانچے (2) غلام علی حیدری۔ گھانچے (3) محمد اسماعیل۔ خواتین نشستیں۔ عتیقہ خاتون گلگت۔ شائستہ شمیم حمزہ استور۔ کنیز زہرا غذر۔ ناصرہ بیگم گھانچے۔ فریدہ بتول اسکردو۔

نویں ٹرم۔ 2004ء یہ انتخابات 12 اکتوبر 2004ء کو ہوئے اور مندرجہ ذیل اصحاب منتخب ہو گئے۔

گلگت (1) حمایت اللہ۔ گلگت (2) حفیظ الرحمن۔ گلگت (3) مظفر علی۔ گلگت (4) محمد علی اختر گلگت (5) نگر مرزا حسین گلگت (6)۔ ہنزہ میر غضنفر علی خان۔ استور (1) عبدالحمید۔ استور (2) مظفر ریلے۔ چلاس (1) فدا اللہ۔ چلاس (2) حاجی عبدالقدوس۔ داریل حیدر خان۔ تنگیر ملک محمد مسکین۔ غذر (1) پیر کرم علی شاہ۔ غذر (2) سلطان مدد۔ غذر (3) غلام محمد۔ اسکردو (1) وزیر ولایت علی۔ اسکردو (2) نثار حسین۔ اسکردو (3) فدا محمد ناشاد۔ اسکردو (4) سکندر علی۔ اسکردو (5) سید اسد زیدی۔ اسکردو (6) عمران ندیم۔ گھانچے (1) محمد ابراھیم۔ گھانچے (2) محمد اقبال۔ گھانچے (3) محمد اسماعیل۔

خواتین اور ٹیکنوکریٹس کی نشستوں کیلئے ابھی انتخابات نہیں ہوئے۔

گلگت بلتستان سے متعلق معلوماتی کتابیں

گلگت بلتستان کے جغرافیہ۔ تاریخ۔ سیاسیات۔ آئینی حیثیت۔ تہذیب وتمدن۔ ثقافت۔ شخصیات۔ اقتصادیات اور دیگر متعلقہ معاملات کے بارے میں مندرجہ ذیل کتابیں اور دستاویزات مفید معلومات فراہم کرتی ہیں

Name of the Book	Author
1. Making of a Frontier	Col. Durand
2. The Northern Barrier of India	Frederic Drew
3. The Gilgit Game	John Keay
4. The Last Years of British India	Michael Edwardes
5. Where Three Empires Meet	E.F.Knight
6. Between the Oxus and the Indus	K.C.F.Schausburg.
7. The Jammu Kashmir Territories	Frederic Drew
8. Two Nations and Kashmir	Lord Birdwood
9. A Historical Introduction of Kashmir	J.P.Ferguson
10. Mission with Mountbatten	Campblel Jhonson
11. Tourist Guide to Kashmir, Ladakh, Skardo	Aurther Neve
12. Danger in Kashmir	Joseph Korbel
13. Birth of a Tragedy	Alastair Lamb
14. Kashmir in Conflict	Victoria Schofield
15. The Gilgit Rebellion	Major W.B. Brown
16. Gilgit Before 1947	Brig.Gansara Shingh
17. The Heir Apparent	Dr. Karan Singh
18. Karakuram Hunza	Shahid Hamed
19. Looking Back	Meher Chand Mahajan
20. The Fall of Gilgit	B.L.Kak
21. Raj Tarangni	Pundit Kalhana
22.History of Struggle for Freediom in Kashmir	Prem Nath Bazaz

23. The Azad Kashmir	Prem Nath Bazaz
24. The Founding of Kashmir State	K.M. Panikar
25. An Analysis of Kashmir Conflict	Shaukat Qadir
26. Memories of Jinnah	K.H.Khurshid
27. The Integration of Indian States	V.P. Menon
28. The Hinterland of Asia	Wazir M.Ashraf Khan
29. Gilgit Baltistan	Amanullah Khan Hunzai
30. The Gilgit Spectrum	Dr. K.Nyazai
31. Kashmir From BC to 1991.	Zahurul Haq
32.Constitutional Position of Gilgit Baltistan	AJK High Court Verdict 8-3-93
33. Constt. Position of Gilgit Baltistan	AJK Supreme Court Verdict 1994
34. Rights of People of Gilgit Baltistan	Supreme Court of Pakistan Verdict 28-5-99
35. Pak China Border Agreement	1963
36. UN Security Council Records on Kashmir	1948-1957
37. Pak Govt. Publications on Kashmir	Ministry of Information
38. Kasheer	Dr. M.D. Soofi
39. The Northern Areas of Pakistan	Dr. A.H.Dani
40. Treatries Engagements on Kashmir	C.U.Aitchisxon
41. Free Kashmir	Amanullah Khan
42. Kashmir in the Crossfire	Victoria Schofield
43. The J.K Prime Minister Order of July 17, 1947	

گلگت بلتستان کے بارے میں معلوماتی کتابیں

کتاب کا نام	مصنف
(1) آئینہ بلتستان	فدا حسین شمیم بلتستانی
(2) شمشیر سے زنجیر تک	کرنل حسن خان
(3) گلگت سکاؤٹس	میرزادہ شاہ خان
(4) تاریخ جموں	مولوی حشمت اللہ
(5) بلتستان پر ایک نظر	محمد یوسف حسین آبادی
(6) قراقرم ہندوکش	منظوم علی
(7) بلتستان کی جنگ آزادی	شاکر شمیم
(8) کشمیر کی 5 ہزار سالہ تاریخ	جی ایم میر
(9) گلگت کی روگ کہانی	پروفیسر عثمان علی
(10) تاریخ گلگت	راجہ شاہ رئیس خان
(11) گلگت بلتستان کی تاریخی حقیقت	سعید اسعد
(12) شمالی علاقے عدالت کے کٹہرے میں	عبدالخالق انصاری
(13) قراقرم کے قبائل	پروفیسر عثمان علی
(14) صبح آزادیٔ بلتستان	حشمت اللہ خان

کتاب کا نام	مصنف
(15) شمالی پاکستان	رشید اختر ندوی
(16) آئینہ دیامر	سرتاج خان
(17) جموں کشمیر بک آف نالج	سعید اسعد
(18) شمالی کشمیر کی سیاسی تاریخ	پروفیسر نذیر انجم
(19) آزادی گلگت بلتستان اور حقائق	حاجی غلام رسول
(20) قدیم لداخ	سکندر خان کاچو
(21) جموں کشمیر کی جغرافیائی حقیقتیں	جی ایم میر
(22) گلگت بلتستان کی آئینی حیثیت	سردار اعجاز افضل
(23) خاور مرحوم	حشمت اللہ خان
(24) لاوہ کے دہانے پر	شائستہ شمیم حمزہ
(25) دنیا کا بلند ترین محاذ جنگ	بریگیڈیئر محمد ذاکر
(26) اردو بلتی بول چال	بریگیڈیئر محمد ذاکر
(27) ریاست ہنزہ	فدا علی ایثار
(28) محمد تنظیم خان میر ہنزہ	ترجمہ شیر باز علی برچہ
(29) شمالی علاقوں کی اہم شخصیات	سید عالم

کتاب کا نام	مصنف
(30) جہد مسلسل جلد اول، دوم	امان اللہ خان
(31) بلتستان تاریخ سیاست	محمد قاسم نسیم
(32) تاریخ ادبیات بلتستان	محمد نذیر
(33) ارفعان بلتستان	ماسٹر محمد تقی
(34) مطالعہ بلتستان	محمد نذیر
(35) قدم قدم بلتستان	وزیر قلب علی
(36) بلتی اردو لغت	راجہ محمد علی شاہ صبا
(37) صدائے شمال	محمد قاسم نسیم
(38) بلتستان تہذیب وثقافت	محمد حسن حسرت
(39) تاریخ ادبیات بلتستان	محمد نذیر
(40) عکس بلتستان	محمد نذیر
(41) دیوسائی سے کنکورڈیا تک	مظفر حسن انجم
(42) بلتی لوک گیت	سید عباس کاظمی
(43) شملہ سے بلتستان تک	محمد حسن حسرت
(44) گلگت بلتستان کا مستقبل	امان اللہ خان

حصہ نہم

دلچسپ متفرقات

1- فٹ پاتھ سے عالمی سطح تک
2- پاکستان کے دو وزرائے اعظم سے دو دلچسپ مکالمے
3- جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے
4- تحریک آزادی میں میرے تعلیمی اداروں کا کردار
5- میری گھریلو زندگی
6- بھارت اور پاکستان کا میرے ساتھ سلوک
7- تحریک آزادی میں میرے رشتہ داروں کا حصہ
8- دو دلچسپ سبق آموز حقیقتیں
9- اور زحمتیں رحمتوں میں بدلتی گئیں
10- میری شاعری
11- میری بیٹی اسماء کی تاریخی شادی

1- فٹ پاتھ سے عالمی سطح تک

میں غالباً دنیا کی آبادی کے ایک فی لاکھ سے بھی کم ان خوش نصیبوں میں سے ایک ہوں جو فٹ پاتھ سے اٹھ کر عالمی سطح تک پہنچ گئے۔

میں کراچی میں چھ ماہ تک فٹ پاتھ پر سونے، بارہ آنے (پچھتر پیسے) قرضہ ادا نہ کر سکنے پر بے عزت ہونے اور بارہا بھوکا سونے کی پوزیشن سے اُٹھ کر پارلیمانوں میں، کابیناؤں میں، عالمی ذرائع ابلاغ میں، عالمی اداروں میں یہاں تک کہ عالمی سطح کی شخصیات کے مابین موضوع بحث بنا۔ یہی نہیں بلکہ میرے حق میں عالمی اداروں اور ایوانوں میں قراردادیں منظور ہوئیں اور میں عشروں تک تین براعظموں پر محیط ایک تنظیم کا سربراہ رہا۔ آیئے ذرا دیکھیں کیوں اور کیسے۔

جیسا کہ میں نے ''جہدِ مسلسل'' کی پہلی جلد میں ذکر کیا ہے میرے والد صاحب اپنے علاقے (موضع پریشنگ، استور گلگت) کے معزز ترین انسان تھے لیکن میرے پیدا ہونے سے چند سال بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ میں ان کی واحد نرینہ اولاد اور ان کی بڑی جائیداد اور سات دیہات کی نمبرداری کا وارث تھا اور یہی نمبرداری والد صاحب کی وفات کے بعد میرے لئے وبال جان بن گئی کیونکہ جس انتہائی طاقتور خاندان سے لے کر یہ نمبرداری میرے والد صاحب کو دی گئی تھی وہ پہلے میرے والد کی جان کے پیچھے پڑ گیا تھا اور ان کی وفات کے بعد میری۔ کیونکہ میری موت کے بعد نمبرداری انہیں واپس ملنے کا امکان تھا۔ مجھے زہر دینے اور مار ڈالنے کی کوششیں ہوئیں۔ چنانچہ میرے خاندان کے بزرگوں خاص کر میرے ماموں اور بہنوئیوں نے مجھے میری ہمشیرہ اور بہنوئی کے ساتھ وادیٔ کشمیر کے ضلع کپواڑہ بھیجا اور میں نے وادی میں میٹرک تک تعلیم پائی اور ایس پی کالج سرینگر میں داخلہ لیا لیکن جنوری 1952ء میں پاکستان آنا پڑا اور تقریباً دس ماہ راولپنڈی اور پشاور میں رہ کر اواخر 1952ء میں کراچی چلا گیا جہاں سرینگر کے رہنے والے دو اصحاب غلام محمد اور عبدلاحد کے ہاں رہا۔ چند معمولی سی وجوہات اور اپنی خودداری کی بنا پر میں نے اپنا تعلیمی خرچ استور میں اپنے بزرگوں سے لینا مناسب نہیں سمجھا بلکہ کراچی پہنچنے کے کچھ مدت بعد یکے بعد دیگرے محکمہ مردم شماری۔ ڈاک خانے اور اورینٹ ائرویز میں ملازمت کی۔ یہ ساری ملازمتیں تین سے چھ ماہ تک کی عارضی ملازمتیں تھیں اور بیکاری کے دوران خاصی تکلیف ہوتی۔ اسی دوران (1954ء کے اوائل میں) غلام محمد راولپنڈی منتقل ہو گیا اور عبدالاحد نے شادی کر لی۔ چنانچہ میرے لئے رہائش کا مسئلہ خاصا سنگین ہو گیا۔ میں کرائے پر مکان یا کمرہ لینے کی پوزیشن میں نہیں تھا کیونکہ میں ان دنوں بے روزگار تھا اور ان ہی دنوں کی بات ہے کہ ایک ہوٹل والے نے بارہ آنے کے قرضے کی ادائیگی نہ کرنے پر نہ صرف میری بے عزتی کی تھی بلکہ مزید کھانا دینے سے انکار بھی کیا تھا چنانچہ میں اس رات بھوکا ہی سویا۔

بارہمولہ مقبوضہ کشمیر کے ایک صاحب محمد عبداللہ شیخ کی کراچی میونسپل کارپوریشن کے مرکزی دفتر

کے متصل علی دینا علی محمد روڈ پر پرانے کپڑوں کی ایک چھوٹی سی دکان (دکان نمبر 62) تھی۔ میں نے اس سے اپنے مسئلے کا ذکر کیا تو اس نے غیر سنجیدہ سے کشمیری انداز میں کہا یہاں اکثر دکانداروں کے ملازم دوکان کے سامنے فٹ پاتھ پر سوتے ہیں تم بھی میری دکان کے سامنے سو جایا کرو۔ اس کا یہ کہنا میرے لئے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بن گیا چنانچہ میں نے سنجیدگی سے کہا میرے پاس ایک چھوٹا سا صندوق بھی ہے۔ اس نے کہا دوکان کی چھت کے نیچے جگہ ہے۔ صندوق وہاں رکھو۔ چنانچہ میں اپریل 1954ء سے اکتوبر 1954ء تک رات کو دوکان کے سامنے والی فٹ پاتھ پر سوتا رہا۔ کئی بار کھانا کھائے بغیر سونا پڑا۔ پتلون ایک ہی تھی اور وہ بھی پیچھے سے پھٹی ہوئی۔ چنانچہ میں گرمیوں میں بھی ایک دوست کی دی ہوئی شیروانی پہنتا تھا۔ ان دنوں قمیض شلوار کا رواج بہت کم تھا۔ بحر حال وقت گزرتا گیا۔ اکتوبر 1954ء میں میں (آٹھ سال بعد) اپنے گھر استور گیا۔ وہاں قیام کے دوران بزرگوں کی میرے بارے میں اور میری بزرگوں کے بارے میں غلط فہمیاں دور ہوگئیں اور کراچی واپسی پر میرے پاس خاصی رقم تھی جس سے میں نے کراچی کے علاقے لیمارکیٹ میں ایک کمرہ کرائے پر لیا۔ جہاں پر ڈیڑھ سال بعد میں نے اپنا نائٹ سکول قائم کیا۔ دوسرے سال سکول دوسری جگہ منتقل کرنے کے علاوہ دوپہر کی شفٹ بھی شروع کی اور دونوں کو 1962ء میں میونسپل کارپوریشن کی وسیع بلڈنگ میں منتقل کیا۔ جہاں سکولوں نے دن دوگنی رات چوگنی ترقی کی یہاں تک کہ میں 1963ء تک فکر معاش سے آزاد ہوگیا۔

میں 1947ء سے یعنی اپنے قیام بھارتی مقبوضہ کشمیر سے ہی تحریک آزادی کشمیر سے کسی نہ کسی طرح منسلک تھا۔ جنوری 1962ء میں (جبکہ میں ابھی قانون کا طالب علم تھا) میں نے وائس آف کشمیر کے نام سے ایک انگریزی ماہنامے کا اجراء کیا۔ 1963ء میں میں نے مرحوم جی ایم لون کے ساتھ مل کر کشمیر انڈیپنڈنس کمیٹی کے قیام میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کے بعد 1964ء میں کراچی میں جموں کشمیر محاذ رائے شماری بنا تو اس میں بھی میرا کردار کلیدی تھا۔ 1965ء میں آزاد کشمیر و پاکستان میں کشمیری قوم پرستوں پر مشتمل جموں کشمیر محاذ رائے شماری قائم ہوا۔ جسکے قیام کے سلسلے میں مرحوم میر عبدالقیوم اور مرحوم مجید امجد بٹ نے بہت محنت کی تھی لیکن 4 اپریل 1965ء کو سیالکوٹ میں ہونے والے اس کے پہلے کنونشن میں مجھے متفقہ طور پر محاذ رائے شماری کا سیکریٹری جنرل منتخب کیا گیا۔ اور سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ ہم نے سوچیت گڑھ جا کر مقبوضہ کشمیر (جموں) سے لائی ہوئی مٹی اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنے عہدوں کا حلف اٹھایا اور اس دوران ہم نے اپنے اللہ اور مادرِ وطن سے عہد کیا کہ ہم مادر وطن کی آزادی کے لئے جان کی قربانی سمیت ہر ممکن قربانی دینگے۔

یہ حلف میرے اندر ایک بڑا ذہنی انقلاب لایا اور اس حلف اور دوسرے کچھ واقعات نے ہر مشکل موقع پر مجھے حصول آزادی کی جدوجہد کے راستہ سے بھٹکنے سے روکا۔ چنانچہ میں پرائیوں کے علاوہ اپنوں کے تیروں اور خنجروں کے وار برداشت کرتے ہوئے اور ایک انتہائی غیر مقبول نظریئے کا پرچم اٹھائے آگے بڑھتا گیا۔ 1966ء میں کشمیر کمیٹی برائے افریشیائی عوامی اتحاد کا سیکریٹری جنرل مقرر ہوا۔

میں پاکستان کی اعلیٰ سیاسی، سفارتی، صحافتی اور ریٹائرڈ فوجی قیادت کے اجتماعات میں مہمان مقرر کی حیثیت میں کشمیر کی نمائندگی کرتا رہا ہوں۔



اسلام آباد میں "دی نیوز" کے زیر اہتمام خارجہ پالیسی پر سیمینار سے جاوید جبار، لیفٹیننٹ جنرل (ر) معین الدین حیدر، انعام الحق، الٰہی بخش سومرو، قاضی حسین احمد، اجمل خٹک، اعتزاز احسن، احسان الحق پراچہ، اکرم ذکی، امان اللہ خان، غلام محمد صفی، فرحت اللہ بابر، صدیق کانجو، اسفندیار ولی، اسد بلال صوفی، ڈاکٹر اے ایچ نیئر، اقبال اخوند، تنویر احمد خان، سروش عرفانی، لیفٹیننٹ جنرل (ر) نشاط، شیریں مزاری، لیفٹیننٹ جنرل (ر) اسد درانی، کمال متین الدین، نسیم زہرہ، شہباز، عائشہ جلال، عاصمہ جہانگیر، ڈاکٹر اکمل احمد، ارشاد احمد حقانی، خالد احمد، امتیاز عالم، نجم سیٹھی، اور غیر ملکی مندوبین خطاب کر رہے ہیں..... فوٹو جنگ راولپنڈی 24 فروری 2004ء

1976ء میں میں برطانیہ چلا گیا وہاں سے مشرق وسطیٰ یورپ اور امریکہ جاتا رہا۔

یہ تھی میری فٹ پاتھ پر سونے کی پوزیشن اور اس سے ابھرنے کی تفصیلات۔ آیئے اب آزاد کشمیر اور پاکستان کے علاوہ عالمی سطح پر میرے موضوع بحث بننے اور میرے تعلقات پر ایک نظر ڈالیں۔

آزاد کشمیر اور پاکستان سطح پر اہم حیثیت

میں 1963ء میں بننے والی کشمیر انڈیپنڈنس کمیٹی کے ایک سرگرم ممبر، 65 میں بننے والے جموں کشمیر محاذ رائے شماری کے سیکرٹری جنرل، این ایل ایف کی سیاسی کمیٹی کے سربراہ اور کشمیر کمیٹی برائے افریشیائی عوامی اتحاد کے سیکرٹری جنرل کی حیثیت اور وجہ سے (یہ ساری تنظیمیں دراصل ایک ہی تنظیم کے مختلف ونگ اور ایک ہی مقصد کے حصول کی جنگ کے مختلف محاذ تھے) تحریک آزادئ کشمیر اور آزاد کشمیر کی سیاسی قیادت کی دوسری صف میں شامل ہو گیا۔ 1988ء میں مسلح جدوجہد کے آغاز کے بعد میرا شمار تحریک آزادئ کشمیر کی صف اول کی قیادت میں ہونے لگا حتیٰ کہ مجھے آزاد کشمیر کی تمام سیاسی پارٹیوں کے سربراہوں، صدر اور وزیراعظم آزاد کشمیر پر مشتمل کشمیر لبریشن الائنس کا سیکرٹری جنرل منتخب کیا گیا۔ علاوہ ازیں میں پاکستان میں ہونے والے پاکستان کی صف اول کی سیاسی، سفارتی اور صحافتی قیادت کے اجتماعات میں بھی تحریک آزادئ کشمیر کی نمائندگی کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک بار (اگست 2003ء میں) میں نے بھارت اور پاکستان کے پارلیمنٹیرینز کے ایک بڑے اجتماع (اسلام آباد) میں شدید احتجاج کے ذریعے اپنی بات منوائی۔

عالمی شخصیات سے خط و کتابت اور ملاقاتیں

آنجہانی برٹرنڈ رسل (Bertrand Russell) کو بیسویں صدی کی عظیم ترین عالمی شخصیات میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ انہوں نے قوموں پر قوموں کے تسلط یعنی نوآبادیاتی نظام کے خلاف بھرپور انقلابی جدوجہد کی۔ ویت نام میں امریکہ کے غیر انسانی مظالم کے خلاف ان کی آواز سب سے موثر تھی اور امریکہ کے ویٹ نام سے انخلاء میں برٹرنڈ رسل کا کردار فیصلہ کن تھا۔ انہوں نے اپنی کتاب میں بھارت کی کشمیر پالیسی کی شدید مذمت کی تھی۔ جموں کشمیر محاذ رائے شماری اور کشمیر کمیٹی برائے افریشیائی اتحاد کے سیکریٹری جنرل کی حیثیت سے میری برٹرنڈ رسل سے مسئلہ کشمیر پر باقاعدہ خط و کتابت تھی۔ ان کا میرے نام اپنے (رعشہ زدہ) ہاتھ کا لکھا ہوا طویل خط میری قیمتی دستاویزات میں سے ایک تھا۔ لیکن 1970ء میں میری گرفتاری پر میرے کراچی دفتر کی تلاشی کے دوران وہ خط پولیس لے گئی اور مجھے واپس نہیں دیا۔ برٹرنڈ رسل کی قیادت میں بنی برٹرنڈ رسل فاؤنڈیشن اور خاص کر اسکے موجودہ چیئرمین کین کوٹس (Ken Coates) سے میری آج بھی خط و کتابت ہے کین کوٹس اس سے پہلے یوروپین پارلیمنٹ کے

UNITED NATIONS NATIONS UNIES

2 March 1981

Dear Mr. Khan,

On behalf of the Secretary-General, I should like to acknowledge receipt of your letter of 13 February 1981 containing a copy of the memorandum sent to the foreign ministers of all non-aligned countries.

Your comments have been duly noted and brought to the attention of the Secretary-General.

As I had occasion to explain to you in previous letters, communications are normally circulated among Member States of the United Nations only upon request of a Member State. Your letter, however, will be available for consultation in accordance with established procedure.

Sincerely yours,

Brian Urquhart
Under-Secretary-General for
Special Political Affairs

Mr. Amanullah Khan,
Secretary General
Jamau Kashmir Liberation Front
438 Alum Rock Road
Birmingham 8, U.K.

اقوام متحدہ کے انڈر سیکرٹری جنرل برائن ارکہاٹ کی طرف سے خط

The Bertrand Russell Peace Foundation Ltd

Founding President: the Earl Russell, OM, FRS (1872-1970)

Directors: Michael Barratt Brown, Professor Ken Coates (Chairman), Ken Fleet FCA (Secretary), Regan Scott. *Publishing Manager:* Tony Simpson

20th December, 2002.

Mr. Amanullah Khan,
Chairman,
Jammu Kashmir Liberation Front,
B-144 Satellite Town,
Rawalpindi,
Pakistan.

Dear Friend,

This morning I received your card, and I was very pleased to hear from you. I hope that you work continues without misadventure in these very difficult times.

I wrote to you last year about our plans to bring together a gathering of peace and human rights movements in Europe and the Middle East.

We succeeded up to a point in the Cordoba seminar, which took place at the end of November this year. I am sending you some of the papers, in the hope that they may be of interest to you.

With every good wish, and greetings for the New Year, in the hope that, against all the odds, war might be averted. I fear that the omens are not good!

With every good wish.

Yours sincerely,

Ken Coates

Ken Coates

Enc. Cordoba papers.

From the Chairman, 112 Church Street Matlock Derbyshire DE4 3BZ
Tel: 01629 57159 *Fax:* 01629 580672
e-mail: elfeuro@compuserve.com www.russfound.org
Reg. No 891680 (England)

برٹرنڈ رسل پیس فاؤنڈیشن کے سربراہ کی طرف سے خط

UNITED NATIONS NATIONS UNIES

POSTAL ADDRESS: ADRESSE POSTALE: UNITED NATIONS, N.Y. 10017
CABLE ADDRESS: ADRESSE TELEGRAPHIQUE: UNATIONS NEWYORK

6 November 1980

Dear Mr. Khan,

I wish to acknowledge the receipt of your two communications dated respectively 17 and 28 October and of your telegram of 30 October 1980, in which you requested to be heard by the Special Committee on the Situation with regard to the Implementation of the Declaration on the Granting of Independence to Colonial Countries and Peoples.

In this connexion, I regret to inform you that, as the agenda of the Special Committee is decided upon each year by its parent body, the General Assembly, and in as much as the Committee itself has no authority to discuss an item which is not on its agenda, it will not be possible for you to be heard by the Committee. While the Committee has on its agenda an item entitled "question of the list of Territories to which the Declaration is applicable", any proposal for addition or deletion of Territories from the list would have to be initiated by the Member States of the United Nations.

Yours sincerely,

Frank Abdulah

Frank Abdulah
Chairman
Special Committee on the Situation
with regard to the Implementation
of the Declaration on the Granting
of Independence to Colonial
Countries and Peoples

Mr. Amanullah Khan
Secretary General
Jammu Kashmir Liberation Front
438 Alum Rock Road,
Birmingham 8
United Kingdom

محکوم قوموں کی آزادی سے متعلق اقوام متحدہ کی کمیٹی کے سربراہ کی طرف سے خط

SUPERVISORY BOARD FOR
THE INTERNAL CONTROL
OF INTERPOL'S ARCHIVES
B.P. 6041
69411 LYON CEDEX 06
France

13th December 1995

Our Ref.:
N° B.95/SECOM/110

Subject:
Your letters dated 21st April, 10th October and 15th November 1995

Dear Sir,

Your letters were submitted to the meeting of the Supervisory Board for the Internal Control of Interpol's Archives at its meeting in Lyons on 12th and 13th December 1995.

The Board has checked your file and, in particular, the replies from the Indian and Belgian authorities. The competent Indian authorities have refused to cancel the arrest warrants issued against you by the judicial authorities in Jammu for murder and criminal conspiracy. Consequently, the Board is unable to recommend the cancellation of the red notice issued on the basis of these arrest warrants.

It will only be possible for the Board to recommend cancellation if and when information is received to the effect that the warrants have been withdrawn or that the competent body of the Organization considers that the charges of murder and criminal conspiracy brought against you constitute political offences and thus come within the scope of Article 3 of Interpol's Constitution. Under the terms of the 1984 General Assembly resolution on the application of Article 3, the murder of the Director of the Indian television centre and civilians among the security personnel of the Air Force centre in Srinagar cannot be considered as "offences of a predominantly political character", even if the perpetrators or instigators of these acts were politically motivated.

Secondly, the Board - which is empowered to verify that personal information contained in Interpol's archives is obtained and processed in accordance with the provisions of the Organization's Constitution and the interpretation thereof given by the appropriate organs of the Organization - has made the appropriate checks and has concluded that the criminal information relating the charges against you as contained in the arrest warrant issued by the Indian authorities was obtained in conformity with the Organization's Constitution.

Lastly, the Board also wishes to inform you that the red notice issued by the General Secretariat is to be modified in order to mention that the Belgian authorities, acting in accordance with Belgian law, have refused your extradition, and that you have contested the political nature of the Indian charges, due to the problem over the status of Kashmir and your role as leader of the Liberation Front.

This addendum to the red notice will be circulated to all Interpol member countries so that they can draw the appropriate conclusions from the Belgian authorities' refusal to grant the Indian authorities' extradition request, as well as from your own request, and from the fact that the Indian authorities have maintained the arrest warrants under their own responsibility.

Yours faithfully,

P. Thomas
Chairman of the
Supervisory Board

Mr Amanullah Khan
Chairman
Jammu Kashmir Liberation Front (JKLF)
U-1/4
Satellite Town
Murree Road
RAWALPINDI

انٹرپول ہیڈکوارٹر کی طرف سے خط

COUR INTERNATIONALE DE JUSTICE

PALAIS DE LA PAIX 2517 KJ LA HAYE PAYS-BAS
TÉLÉPHONE: (070) 3022323 TÉLEX: 32323
TÉLÉGR: INTERCOURT LAHAYE
TÉLÉFAX: (070) 3840928

INTERNATIONAL COURT OF JUSTICE

PEACE PALACE 2517 KJ THE HAGUE NETHERLANDS
TELEPHONE: (070) 3022323 TELEX: 32323
CABLES: INTERCOURT THEHAGUE
TELEFAX: (070) 3840928

21 February 1996

Dear Sir,

I have received your letter dated 11 December 1995.

In reply, I regret to inform you that, by virtue of Article 34 of the Statute of the International Court of Justice, "only States may be parties in cases before the Court", and that only international organizations authorized within the meaning of Article 65 of the Statute may request advisory opinions of the Court.

It follows that neither the Court nor its Members may consider applications from private individuals or groups, provide them with legal advice, or assist them in their relations with the authorities of any country.

That being so, you will, I am sure, understand that no action can be taken on your letter.

Yours faithfully,

Deputy-Registrar

Mr. Amanullah Khan
Chairman
Jammu Kashmir Liberation Front
B-144 Satellite Town, Muree Rd.
Chandni Chowk
Rawalpindi
Pakistan

عالمی عدالت انصاف سے خط

ممبر تھے۔ انسانی حقوق کے عالمی سطح کے علمبردار لارڈ ایرک ایوبری (Lord Eric Auebury) سے میرے قریبی مراسم ہیں بلکہ میری کتاب کی پہلی جلد کا پیش لفظ بھی انہوں نے ہی لکھا ہے۔

برٹرنڈ رسل اور لارڈ ایوبری کے علاوہ میری اقوام متحدہ کے مدت تک انڈر سیکریٹری جنرل رہنے والے برین ارکہاٹ (Brian Urquhart) سے طویل مدت تک خط و کتابت رہی۔ موصوف مسئلہ کشمیر کے بارے میں پوری طرح باخبر اور کشمیریوں کے ہمدرد دکھائی دیتے تھے۔ لیکن اقوام متحدہ کا پیچیدہ طریقہ کار ان کے راستے میں حائل تھا۔ میرے نام ان کے بہت سے خطوط میں سے ایک کتاب میں شامل ہے تین خط پہلی جلد میں شامل تھے۔ ان کے علاوہ اسلامک کونسل آف یورپ کے سیکریٹری جنرل جناب سالم عزام۔ سوڈان کے دو دفعہ کے وزیر اعظم اور عظیم مجاہد مہدی سوڈانی کے نواسے ڈاکٹر صادق المہدی۔ بھارت کے آنجہانی جے پرکاش نارائن سے خط و کتابت اور ملاقات تھی۔ پاکستان کے ذوالفقار علی بھٹو اور کشمیر کے دونوں بڑے لیڈروں شیخ محمد عبداللہ اور چوہدری غلام عباس سے میری ملاقاتیں اور خط و کتابت بھی رہی۔ مزید تفصیلات کتاب کی پہلی جلد میں ہیں۔

1984ء میں بھارتی مقبوضہ کشمیر کے وزیر اعلےٰ فاروق عبداللہ کو بہت سے الزامات کے تحت وزارت سے ہٹایا گیا۔ ان الزامات میں سے ایک یہ تھا کہ اس کے لبریشن فرنٹ خاص کر امان اللہ خان سے تعلقات ہیں۔

اندرون و بیرون ملک قید و بند

میں ریاست جموں کشمیر کا پہلا باشندہ ہوں جس نے تحریک آزادیٔ کشمیر اور گلگت بلتستان کے عوامی حقوق کے سلسلے میں اندرون ریاست (گلگت بلتستان میں) سوا سال کی اسیری بشمول شاہی قلعہ لاہور میں دو ماہ اور پاکستان میں درجن بھر گرفتاریوں کے علاوہ سوا سال برطانیہ۔ اڑھائی ماہ بیلجیئم کی جیلوں اور ایک دن اقوام متحدہ کے حوالات میں گزارے۔ اور آزاد کشمیر میں بھی سرکاری مہمان رہا۔

تین براعظموں پر محیط تنظیم کی سربراہی

میں جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کا سربراہ ہوں اور یہ تنظیم ریاست جموں کشمیر کے تینوں حصوں، پاکستان، مشرقِ وسطیٰ کے کئی ملکوں۔ یورپ کے کئی ملکوں اور امریکہ یعنی تین براعظموں میں قائم اور سرگرم ہے۔

میری ذات عالمی شخصیتوں کے مابین موضوع بحث

اپریل 1990ء میں بھارتی وزیر خارجہ مسٹر آئی کے گجرال (I.K. Gujral) اور سویت یونین کے وزیر خارجہ ایڈوارڈ شیواڈ نازے امریکہ میں تھے۔ مسٹر گجرال نے پہلے اقوام متحدہ کے سیکریٹری

جنرل سے شکایت کی کہ ایک کشمیری دہشت گرد امان اللہ اپنی سرگرمیوں کے لئے اقوام متحدہ کے پریس کلب کو استعمال کر رہا ہے جواب ملا کہ کلب اقوام متحدہ کا نہیں اقوام متحدہ میں متعین مختلف ملکوں کے صحافیوں کا آزاد ادارہ ہے۔ اور اس پر ہمارا کوئی کنٹرول نہیں۔ اس کے بعد گجرال صاحب نے کلب کی سربراہ سے ملاقات کی اور مجھے پریس کلب میں پریس کانفرنس کر کے بھارتی حکومت پر کیچڑ اچھالنے کی اجازت دینے پر احتجاج کیا۔ محترمہ نے تجویز پیش کی کہ آپ اور امان اللہ خان اسی ہال میں ایک مشترکہ پریس کانفرنس میں مسئلہ کشمیر کے بارے میں اپنے اپنے موقف بیان کریں۔ لیکن وہ یہ چیلنج قبول نہ کر سکے اور سویت یونین کے وزیر خارجہ سے بات کی جس نے امریکی وزیر خارجہ جیمز بیکر سوم سے بات کی کہ ایک کشمیری دہشت گرد امریکی ویزے پر یہاں آیا ہے اور امریکی سرزمین سے بھارت (کشمیر) میں سرگرم دہشت گردوں کو ہدایات جاری کر رہا ہے۔ اس پر اور کچھ دوسری وجوعات کی بنا پر امریکی وزیر خارجہ نے اپنے خصوصی اختیارات استعمال کر کے میرا ویزا منسوخ کر دیا۔

قومی اور عالمی ذرائع ابلاغ کی شہ سرخیاں

میری ذات سے متعلق معاملات درجن بھر بار پاکستان کے اخبارت کی شہ سرخیاں بن گئے ہیں اور کئی بار بھارتی اخبارات کے بھی۔ ان میں برطانیہ میں میری گرفتاری۔ میری برطانیہ بدری۔ میرے امریکی ویزے کی منسوخی۔ مارچ 1992ء میں میری راولپنڈی میں گرفتاری۔ 18 اکتوبر میں برسلز میں گرفتاری۔ 26 دسمبر 1993ء کو برسلز سے رہائی۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے ہال میں میرے ساتھیوں کی کشمیر سے متعلق نعرے بازی اور فروری 1992ء میں چکوٹھی میں پاکستانی فوج کی طرف سے فائرنگ کے نتیجے میں ہمارے سات ساتھیوں کی شہادت اور پچاس زخمی ہونا شامل ہیں۔ ان میں سے اکثر واقعات کو عالمی پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا خاص کر بی بی سی۔ وائس آف امریکہ۔ وائس آف جرمنی وغیرہ نے بھی کور کیا۔ بہت سے قومی اور عالمی اخبارات، رسالوں ریڈیو اور ٹی وی پر میری ذات اور میری سرگرمیوں پر اداریے، مضامین، کالم، مزاحیہ کالم، تبصرے اور کارٹون شائع اور نشر ہوئے۔ میں نے 20 اپریل 1990ء کو دنیا کے سب سے بڑے پریس کلب، نیشنل پریس کلب واشنگٹن میں مہمان مقرر کی حیثیت سے خطاب کیا۔ یہ پریس کلب یہ حیثیت عالمی سطح کی شخصیات کو ہی دیتا ہے۔ پاک بھارت تعلقات پر بھارتی، پاکستانی اور خاص کر مغربی مصنفوں نے گزشتہ دو عشروں کے دوران درجنوں کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی کتاب ایسی نہیں جس میں میرا اور میری سرگرمیوں کا تفصیلی ذکر کسی نہ کسی شکل میں نہ ہو۔ 18 نومبر 1993ء کو یوروپین پارلیمنٹ نے میری رہائی کے حق میں قرارداد منظور کی۔

اپنے بارے میں میرے دعوؤں کے کچھ تحریری ثبوت اور دستاویزات پچھلے اور اگلے صفحوں میں شامل کئے ہیں۔ موضوع کی طوالت مزید دستاویزات شامل کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔

TEXT OF THE
RESOLUTION ADOPTED BY THE EUROPEAN PARLIAMENT ON NOVEMBER 18, 1993.

4 (f) B3-1609/93

Resolution on the case of Mr Amanullah Khan

The European Parliament.

A. having regard to the arrest and subsequent detention of Mr Amanullah Khan, leader of the Jammu Kashmir Liberation Front, by the Belgian authorities in Brussels on 18 October 1993,

B. aware that Mr Khan was attending a meeting, organised by the Group of the Party of European Socialists, which aimed at making progress towards finding a peaceful solution to the long-standing Kashmir dispute,

C. noting that this dispute has been the cause of several wars between India and Pakistan since 1947 and that, in the recent disturbances, many thousands have been killed and injured as a result of violence perpetrated both by various groups of Kashmiri armed militants and by the Indian security forces,

D. aware that Mr Khan was born in Gilgit in the then autonomous Princely State of Jammu and Kashmir, that since 1948 Gilgit has been under the control of Pakistan and that Mr Khan came to Brussels on a Pakistani passport with a valid visa issued by the Belgian authorities.

1. Deplores the arrest of Mr Amanullah Khan, if only because the Belgian authorities had issued him with a visa;

2. Notes that Mr Khan, in his address to the meeting organised by the Group of Party of European Socialists, called for an end to the use of violence in the Kashmir dispute;

3. Notes that Mr Khan has been remanded in custody pending consideration by the Belgian courts of the request for his extradition;

4. Calls on the Belgian authorities to release Mr Khan at the earliest opportunity and demands that, pending his release, the conditions under which he is being held should be improved, in particular as regards his food and access to English-language news media;

5. Instructs its President to forward this resolution to the Council, the Commission, and the governments of Belgium, India and Pakistan.

APPENDIX II

STATEMENT ON MR. AMANULLAH KHAN

S T A T E M E N T

The Participants at the Round-Table Discussion on Kashmir, held at the European Parliament in Brussels on 18 and 19 October 1993 and organised by the Group of the Party of European Socialists, unanimously express their alarm at the arrest by the Belgian authorities of one of the Participants, Mr. AMANULLAH KHAN, while travelling from the European Parliament to another Socialist Group meeting in a motor car of the European Parliament and in the company of the Chairman of the Round-Table, on the evening of Monday 18 October.

The participants condemn this arrest and the manner in which it was conducted.

They call for the immediate and unconditional release of Mr. AMANULLAH KHAN.

They express their determination that the success of this Round-Table Discussion, in attempting to organise a dialogue on the Kashmir dispute, will not be affected by this regrettable incident.

Moreover, Mr. Elsso HOLTJER, Vice-Chairman of the Socialist Group, Mrs Anita POLLACK, Chairman of the European Parliament's Delegation for relations with the countries of South Asia and Mr. George STEVENSON, Chairman of the Socialist Group's Working Party on South and South-East Asia, on behalf of the Socialist Group, express their shock and deep concern at the treatment meted out to a guest of the Socialist Group who had been issued with a visa by the Belgian authorities.

برسلز کانفرنس کی طرف سے میرے بارے میں 19 اکتوبر 1993ء کو جاری ہوئے اخباری بیان کا متن

امریکی حکومت کی طرف سے "قومی مفاد" میں میرے ویزے کی منسوخی کے بارے میں انڈیا ابراڈ نیویارک کی خبر سے اقتباس

INDIA ABROAD : (N.Y.) April 27, 1990

Visa of Front Leader Revoked

U.S. and India Seek Extradition of Amanullah Khan

By AZIZ HANIFFA

WASHINGTON: American And Indian government lawyers last week began the complicated process of working out the procedures necessary to extradite Jammu and Kashmir Liberation Front leader Amanullah Khan to India.....

Revoked Visa

On April 19, the State Department announced that it had revoked Khan's Visa "based on Mr. Khan's support for terrorist acts."

Khan's visa was revoked under section 221 (i) of the Immigration and Naturalization Act that gives the State Department the authority to revoke any visa "in the national interest."

On April 20, Khan who was the "morning newsmaker" at the National Press Club, said he had not been "officially informed by the State Department or any organ of the U.S. Government," regarding the revocation of his visa and hence would not want to comment on the decision. Asked if he would contest the State Department's action, Khan said, "I'll cross the bridge when I reach the bridge."....

ہفت روزہ راوی بریڈفورڈ

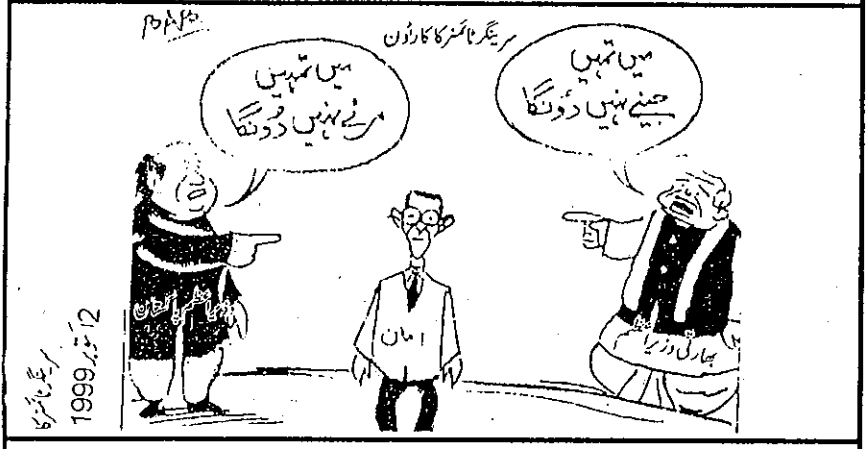
امیگرنٹ لیڈروں میں سب سے زیادہ ووٹ کشمیری رہنما امان اللہ خان نے حاصل کئے

بشیر خان، طارق علی اور صبغت قادری کو بھی بھاری تعداد میں ووٹ ملے

بقیہ لیڈروں میں جیلانی صدیقی، رشید احمد صدیقی اور پیر معروف حسین شاہ کے ووٹوں کی تعداد نسبتاً زیادہ تھی،

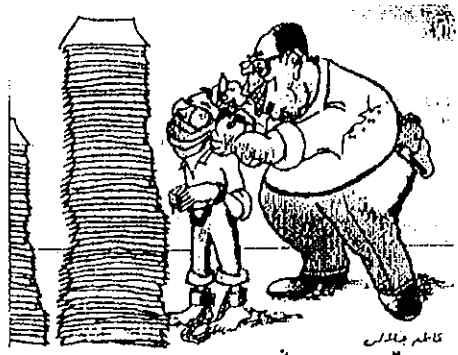
ہفت روزہ راوی بریڈفورڈ کے برطانیہ میں مقیم ایشیائی سیاسی رہنماؤں کے بارے میں سروے کے نتائج

میرے بارے میں پاکستانی اور کشمیری اخبارات کے کارٹون





حریت کانفرنس میری طرف سے تنقید پر اللہ سے پناہ مانگ رہی ہے



ان بھارتی الزامات کا فرانسیسی میں جواب دیں

میرے بارے میں پاکستانی اور کشمیری اخبارات کے کارٹون



سردار قوم مجھے پکڑے ہوئے ہے اور نواز شریف مجھے ہتھوڑا مارنے کی تیاری کر رہا ہے

(فرنٹیئر پوسٹ پشاور)
27 نومبر 1992ء



شطرنج کی بساط پر خود مختار کشمیر کا نظریہ سردار قوم سے جیت رہا ہے

(دی نیوز اسلام آباد)



جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کے چیئرمین امان اللہ خان کے عارضی حکومت کے اعلان کو خود لبریشن فرنٹ نے مسترد کر دیا

(روزنامہ جنگ راولپنڈی)
22 جون 1990ء

'یہ تھا فٹ پاتھ سے عالمی سطح تک کے میرے سفر کی کہانی کا خلاصہ۔ میں نہ تو اپنی اونچی پوزیشن کی وجہ سے کبھی احساس برتری میں مبتلا ہوا یا اپنی پیش قدمی روک دی نہ ہی میری فٹ پاتھ والی حقیقت نے مجھے احساس کمتری میں مبتلا کیا یا میری جہدِ مسلسل میں رکاوٹ بنی۔

جیسا کہ میں نے کتاب کے آخر میں ''قصہ مختصر'' کے عنوان کے تحت لکھا ہے' آپ میں خلوص۔ جہدِ مسلسل کی عادت اور اخلاقی جرأت ہو۔ آپ انصاف اور حق وصداقت کے علمبردار ہوں۔ آپ زمینی حقائق کو سمجھنے اور انہیں جائز طریقے سے اور اپنے جائز مقصد کے حق میں استعمال کرنے کے اہل ہوں اور قسمت بھی تھوڑا سا ساتھ دے تو آپ کو ایک کامیاب اور اچھا انسان بننے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ میں اپنے اس تجزیئے پر پکا یقین رکھتا ہوں اور اسی پر عمل کرنے کے نتیجے میں میں فٹ پاتھ سے عالمی سطح تک پہنچا۔ اسکے باوجود میں اپنے آپ کو اچھا اور کامیاب انسان ہونے یا نہ ہونے کا سرٹیفکیٹ جاری کرنے کا مجاز نہیں۔ یہ کام تاریخ اور متعلقہ معاشرے کا ہے۔

2۔ پاکستان کے دو وزرائے اعظم سے دلچسپ مکالمے

پاکستان کے دو وزرائے اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف سے علی الترتیب 13 مارچ 1990ء کو مظفر آباد میں اور وسط مارچ 1992ء میں پرائم منسٹر ہاؤس اسلام آباد میں میرے دلچسپ بلکہ تاریخی مکالمے ہوئے۔

(ا) محترمہ بے نظیر بھٹو سے مکالمہ

میں 1976ء سے 1986ء تک برطانیہ میں مقیم تھا۔ 1979ء میں پاکستان کے سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی گئی۔ اس کے کچھ مدت بعد بھٹو مرحوم کی بیوہ بیگم نصرت بھٹو اور بیٹی بے نظیر بھٹو پاکستان سے فرانس منتقل ہوگئیں۔ اپنے قیام فرانس کے دوران بے نظیر صاحبہ برطانیہ آتی رہتی تھیں۔ جہاں لبریشن فرنٹ خاص کر میری سیاسی سرگرمیاں اور ہمارا نظریہ خود مختار کشمیر پاکستانی اخبارات خاص کر جنگ لندن کی زینت بنے رہتے تھے۔ 1985ء میں میری برطانیہ میں گرفتاری اور میرے خلاف کیس کی سماعت کی تفصیلات بھی اخبارات کے مسلسل موضوع تھے۔ چنانچہ بے نظیر بھٹو بھی ان اخبارات کے ذریعہ ہمارے نظریئے اور ہماری سرگرمیوں سے باخبر تھیں اور ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ (وہ آکسفورڈ یونیورسٹی کی گریجویٹ ہیں اور یونیورسٹی کی طلباء یونین کی صدر بھی رہی ہیں) ترقی پسند اور سیکولر ذہن کی مالک ایک نوجوان خاتون کی حیثیت سے وہ ہمارے نظریئے خاص کر حقِ خودارادیت کی ہماری تشریح سے متفق

تھیں۔ وہ 1986ء کے وسط میں پاکستان آئیں جہاں ان کا تاریخی استقبال ہوا۔ میں ان دنوں لندن کی برکسٹن جیل میں قید تھا اور اسی سال کے آخر میں برطانیہ بدر ہو کر کراچی پہنچا۔ اسکے کچھ مدت بعد جیس ہوٹل صدر کراچی میں ہونے والی ایک تقریب میں پاکستان پیپلز پارٹی آزاد کشمیر کے سینیر لیڈر صاحبزادہ اسحاق ظفر (جو بعد میں آزاد کشمیر کے سینیر وزیر اور قائم مقام وزیر اعظم بھی رہے) سے ملاقات ہوئی۔ گپ شپ کے دوران صاحبزادہ صاحب نے مزاحاً مجھ سے پوچھا امان صاحب آپ نے برطانیہ میں کہیں بے نظیر بھٹو کو لبریشن فرنٹ کی ممبر تو نہیں بنایا تھا، وہ تو کشمیر کے بارے میں آپ کی زبان بول رہی ہیں۔ میں نے بھی مزاحاً ہی جواب دیا کشمیر کے بارے میں درست، منصفانہ اور جمہوری سوچ رکھنے والا ہر شخص میری ہی زبان بولتا ہے۔ واقعی محترمہ اپنی پاکستان آمد کے ابتدائی دور تک کشمیر کے بارے میں لبرل سوچ کی مالک تھیں لیکن ان کی نظر پاکستان کی اقتدار کی کرسی پر تھی اور اس کرسی تک پہنچنے کے سفر کے دوران انہیں کشمیر پر اپنی لبرل سوچ کرسی تک پہنچنے میں رکاوٹ دکھائی دی کیونکہ پاکستان میں کسی شخص کو اقتدار کی اعلیٰ ترین کرسی تک پہنچنے کیلئے (امریکہ کے علاوہ) پاکستان کے تین اہم اداروں یعنی فوج، افسر شاہی اور میڈیا کی حمایت حاصل ہونی لازمی ہوتی ہے اور یہ تینوں ادارے کشمیر کی خودمختاری کو واحد آپشن تو درکنار تیسرے آپشن کے طور پر بھی تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں تھے چنانچہ محترمہ نے بھی کشمیر کے بارے میں اپنی لبرل سوچ ترک کر کے اپنے آپ کو ان اداروں کی راہ پر ڈال لیا۔

اگست 1988ء میں پاکستان کے صدر جنرل محمد ضیاء الحق کے ہوائی جہاز کے حادثے میں ہلاک ہونے کے تین ماہ بعد ہونے والے عام انتخابات میں بے نظیر بھٹو کی پاکستان پیپلز پارٹی نیشنل اسمبلی میں سب سے بڑی پارٹی بن گئی چنانچہ محترمہ وزیر اعظم بن گئیں۔

1989ء کے اواخر تک لبریشن فرنٹ کی آئی ایس آئی (پاکستان کی اس وقت کی اصل حکمران طاقت) سے ٹھن گئی تھی۔ چنانچہ ہمارے لئے حالات کو سنبھالنا بہت مشکل ہو گیا تھا جبکہ مقبوضہ کشمیر سے عسکری تربیت حاصل کرنے کیلئے آزاد کشمیر آنے والے نوجوانوں کی لائن لگ گئی تھی، میں نے اس سلسلے میں وزیر اعظم بے نظیر بھٹو سے ملنے کی کوشش کی، ان کے دفتر فون کئے، خط فیکس کیا، لیکن وہاں سے کوئی جواب نہیں آیا غالباً آئی ایس آئی والے حائل تھے۔ اسی دوران ہم نے کشمیری نژاد سیاستدان اور راولپنڈی سے قومی اسمبلی کے ممبر شیخ رشید احمد سے رجوع کیا تو انہوں نے ہمارے حریت پسندوں کے طعام و قیام کا انتظام کیا۔ اس سلسلے میں شیخ صاحب نے غالباً پنجاب کے چیف منسٹر اور بے نظیر بھٹو کے کٹر مخالف میاں نواز شریف جو خود بھی کشمیری نژاد اور شیخ رشید کے دوست تھے سے بھی کچھ مالی مدد لی تھی۔

ادھر جب اواخر 1988ء میں بھارت کے وزیر اعظم راجیو گاندھی سارک (SAARC) سربراہی کانفرنس کے سلسلے میں پاکستان آئے تو بے نظیر کی حکومت نے ان کی آؤ بھگت کے سلسلے میں کچھ انتہائی چھچھورے اقدامات بھی کئے، یہاں تک کہ کشمیر ہاؤس اسلام آباد کے سائن بورڈ بھی اُٹھوائے۔ ادھر پریس کانفرنس میں کشمیر میں رائے شماری سے متعلق ایک سوال کے جواب میں راجیو گاندھی نے کشمیر کو

بھارت کا اٹوٹ انگ قرار دیکر وہاں رائے شماری کرانے سے جب صاف انکار کیا تو ساتھ بیٹھی بے نظیر بھٹو جواب دینے کی بجائے مسکراتی رہیں۔ چنانچہ محترمہ کے اس طرزِ عمل کے خلاف آزاد کشمیر کے عوام خاص کر قوم پرست حلقوں میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی اور ہم نے بے نظیر کے اس بھارت نواز طرزِ عمل کے خلاف سخت بیانات دیئے۔ میں ان دنوں کشمیر کی معروف سیاسی پارٹیوں کے اتحاد کشمیر لبریشن الائنس (KLA) کا سیکریٹری جنرل بھی تھا۔

13 مارچ 1990ء کو بے نظیر بھٹو نے وزیرِ اعظم پاکستان کی حیثیت سے پہلی بار آزاد کشمیر کے دارلحکومت مظفر آباد آنا تھا۔ چنانچہ لبریشن الائنس نے فیصلہ کیا کہ الائنس کی ممبر تنظیموں کے سربراہ اور آزاد کشمیر کے صدر اور وزیرِ اعظم ایک وفد کی صورت میں ان سے ملکر مسئلہ کشمیر اور تحریکِ آزادی کشمیر سے متعلق اپنا مؤقف ایک یاداشت کی شکل میں ان تک پہنچائیں۔ یاداشت تیار کرنے کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی۔ چنانچہ میں نے یاداشت تیار کی اور اس پر ممبروں سے دستخط لئے حتیٰ کہ وزیرِ اعظم آزاد کشمیر سردار سکندر حیات خان سمیت کچھ ممبروں سے ہیلی پیڈ پر دستخط لئے جب وہ لوگ وہاں بے نظیر بھٹو، جو ہیلی کاپٹر سے آنے والی تھی کے استقبال کیلئے کھڑے تھے۔ یاداشت میں مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کیلئے کچھ ٹھوس تجاویز دی گئی تھیں اور محترمہ کے والد مرحوم ذولفقار علی بھٹو کی اس تقریر کا حوالہ دیا گیا تھا جو انہوں نے صدر پاکستان کی حیثیت سے 14 جولائی 1972ء کو پاکستان کی قومی اسمبلی میں کی تھی جس میں انہوں نے کہا تھا کہ اگر کشمیری اپنی قومی آزادی اور خودمختاری کے لئے کوئی مؤثر اور نتیجہ خیز عملی جدوجہد شروع کریں تو پاکستان ان کی بھرپور عملی مدد کریگا خواہ اس کے نتیجے میں بھارت سے ہمارے تعلقات پر کتنا ہی منفی اثر کیوں نہ پڑے۔ ہماری یاداشت میں کہا گیا تھا کہ اب جبکہ کشمیری اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں تو بے نظیر بھٹو اپنے والد کا کیا ہوا وعدہ پورا کرے۔

اِدھر آئی ایس آئی نے جو میرے نہ جُھکنے نہ بِکنے نہ رُکنے کی عادت سے نالاں تھی میرے خلاف بے نظیر کے کان بھرے تھے اور اسے باور کرایا تھا کہ میں اس کے خلاف کی جانے والی سازشوں میں نواز شریف اور شیخ رشید کی مدد کر رہا ہوں۔

جب لبریشن الائنس کا وفد جو صدر آزاد کشمیر سردار محمد عبدالقیوم خان، وزیرِ اعظم سکندر حیات خان، سابق صدر آزاد کشمیر سردار محمد ابراہیم خان، سابق صدر جنرل محمد حیات خان اور پارٹی سربراہوں عبدالرشید ترابی، مولانا یونس اثری، مولانا محمد صادق اور مجھ پر مشتمل تھا، بے نظیر بھٹو سے ملا تو میں نے لبریشن الائنس کی طرف سے (بحیثیت اسکے سیکریٹری جنرل) یاداشت پیش کی تو محترمہ نے یاداشت وصول کرتے ہی قدرے کرخت لہجے میں مجھے کہا۔ امان اللہ صاحب آپ اور آپکا لبریشن فرنٹ شیخ رشید اور نواز شریف سے ملکر میرے خلاف سازشیں کر رہے ہیں۔ میں نے کہا محترمہ میں یہاں اس وقت آپ سے لبریشن الائنس کے سیکریٹری جنرل کی حیثیت سے بات کر رہا ہوں لبریشن فرنٹ کے چیئرمین کی حیثیت سے نہیں۔ آپ اس یاداشت کے بارے میں بات کریں خاص کر اپنے والد مرحوم کے اس اعلان کے بارے

میں جوانہوں نے قومی اسمبلی میں کیا تھا۔اس پر محترمہ نے ذرا اور کرختگی سے کہا، میں کہتی ہوں آپ نے نواز شریف اور شیخ رشید سے ملکر میرے خلاف متوازی حکومت بنائی ہے اور پاکستان کی مرکزی حکومت کی اجازت کے بغیر ہی کشمیر کی آزادی کی تحریک چلا رہے ہو اور شیخ رشید اور نواز شریف سے مدد حاصل کر رہے ہو۔ یہ میری حکومت کے خلاف سازش ہے۔ ہمارے درمیان یہ مکالمہ وفد کے دوسرے ممبروں کیلئے ایک معمہ سے کم نہ تھا اور وہ سب انتہائی حیرانگی سے کبھی ہماری طرف اور کبھی ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے کہا محترمہ میں یہاں لبریشن الائنس کے سیکریٹری کی حیثیت سے ہوں، لبریشن فرنٹ کے چیئرمین کی حیثیت سے نہیں اور یہاں بیٹھے ہوئے یہ سب بزرگ لبریشن الائنس کے ممبر ہیں لبریشن فرنٹ کے ممبر نہیں، اگر آپ نے مجھ سے لبریشن فرنٹ کے سربراہ کی حیثیت سے بات کرنی ہے تو کوئی اور وقت مقرر کرلیں۔اس وقت یاداشت کے بارے میں بات کریں، اس پر محترمہ نے خاصی کرختگی سے کہا مسٹر امان اللہ خان آپ میرے سوال کا جواب ہاں یا ناں میں دیں۔اس کرخت لہجے کے نتیجے میں میرا بھی پارہ چڑھ گیا اور میں نے کہا جی ہاں میں شیخ رشید سے مدد لے رہا ہوں اور وہ شاید نواز شریف سے لے رہے ہیں اور اسکی ذمہ دار آپ ہیں شیخ رشید نہیں۔اسلئے کہ میں تحریک آزادی کے سلسلے میں آپ سے ملنا چاہتا تھا آپ نے میرے ٹیلیفون، خطوط اور فیکس کا جواب تک نہیں دیا۔ مجھے تحریک آزادی کو ختم ہونے سے بچانا تھا اسلئے شیخ رشید سے رجوع کیا اور اس نے ایک کشمیری ہونے کے ناطے ہماری مدد کی اور تحریک ختم ہونے سے بچ گئی۔محترمہ نے کہا مجھے آپ کا کوئی پیغام نہیں ملا۔ میں نے کہا یہ آپ کی حکومت کی نالائقی ہے، میرے پاس ٹھوس ثبوت ہیں کہ میں نے شیخ رشید سے رجوع کرنے سے پہلے آپ سے ملنے کی کوشش کی تھی۔اس پر محترمہ کچھ کھسیانی سی ہوگئی اور کہنے لگی اس کے باوجود آپ غلط کر رہے ہیں۔اس کے بعد وفد کے دوسرے ممبروں سے اس کی مختصر سی بات ہوئی اور یاداشت کے بارے میں کہا میں اسے پڑھ کر آپ لوگوں کو جواب دونگی۔اسی اثناء میں پیپلز پارٹی کے جیالے اپنے کلچر کا مظاہرہ کرنے لگے اور ہم وہاں سے چلے گئے۔

اس نشست کے دو ہفتے بعد میں امریکہ چلا گیا۔ایک ماہ بعد واپسی پر پتہ چلا کہ شیخ رشید پر اتنا دباؤ ڈالا گیا کہ اُسے ہمارے حریت پسندوں کا کیمپ ہی بند کرنا پڑا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ محترمہ نے میرے ساتھ اس مکالمے کے فوراً بعد متعلقہ اداروں کو ہدایت کی کہ وہ لبریشن فرنٹ کے پر کاٹ دیں تاکہ یہ اُڑنے کے قابل نہ رہے اور مرے بھی نہیں۔ان اداروں کیلئے یہ حکم ایک انعام تھا چنانچہ انہوں نے اس پر فوری طور پر عمل کیا۔

کتنے افسوس کی بات ہے کہ نواز شریف اور شیخ رشید سے اختلاف اور دشمنی کی سزا محترمہ بے نظیر بھٹو وزیراعظم پاکستان نے مجھے، لبریشن فرنٹ اور تحریک آزادی کو دی جس کے نتیجے میں تحریک آزادی کی سمت ہی بدل گئی اور وہ اب تک اندھیروں میں بھٹک رہی ہے۔اگرچہ اس واقعے کے چند ماہ بعد خود بے نظیر کے تخت کا بھی تختہ ہوگیا لیکن اس وقت تک ہمارے بارے میں اس کی ہدایت پر عمل ہو چکا تھا۔

(ب) میاں نواز شریف سے مکالمہ

میرا دوسرا اہم اور دلچسپ مکالمہ وسط مارچ 1992ء میں پرائم منسٹر ہاؤس اسلام آباد میں پاکستان کے اس وقت کے وزیراعظم میاں نواز شریف سے ہوا۔اس مکالمے اور اسکی روح کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ پہلے اسکے پسِ منظر پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے۔

محترمہ بے نظیر بھٹو کو صدر پاکستان نے اگست 1990ء میں وزارت عظمٰی سے ڈسمس کر دیا تھا اور تین ماہ بعد ہونے والے انتخابات میں میاں نواز شریف کی پاکستان مسلم لیگ بھاری اکثریت سے جیتی اور وہ پاکستان کے وزیراعظم بن گئے۔ادھر لبریشن فرنٹ نے 11 فروری 1992ء کو جنگ بندی لائن کو اجتماعی، اعلانیہ اور غیر مسلح طور پر توڑنے کا پروگرام بنایا تھا جسے اس نے نواز شریف کے کئی پیغامات کے باوجود منسوخ کرنے سے انکار کیا اور 11 فروری 1992ء کو ہزاروں افراد مظفر آباد سے پیدل چل کر چناری میں رات گزار کر دوسری صبح چکوٹھی کی طرف روانہ ہوئے تو پاکستان کی سیکیورٹی فورسز نے ان پر گولیاں برسائیں جس کے نتیجے میں سات افراد شہید اور پچاس سے زائد زخمی ہو گئے۔اور اس واقعہ کو عالمی سطح پر وسیع کوریج ملی اور نواز شریف کو عوام اور میڈیا کی طرف سے شدید مذمت کا سامنا کرنا پڑا۔اسکے بعد وہ سرکاری دورے پر ایران گئے جہاں انہوں نے 18 فروری 1992ء کو تہران میں بی بی سی ریڈیو کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ کشمیریوں کو حق حاصل ہے کہ اگر وہ چاہیں تو ریاست جموں کشمیر کو ایک آزاد و خود مختار ملک بنا سکتے ہیں۔ان کا یہ انٹرویو بی بی سی ریڈیو سے اردو، ہندی اور انگریزی خبروں میں کئی بار نشر ہوا (جس کی آڈیو کیسٹ ہمارے پاس موجود ہے) لیکن اسکے فوراً بعد پاکستان کے دفتر خارجہ نے وضاحت کی کہ پاکستان کی کشمیر پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔وہ کشمیر سے متعلق اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عمل درآمد کا ہی داعی ہے جسکے تحت کشمیر کی خود مختاری کا راستہ بند ہے چنانچہ اس سلسلے میں میاں صاحب کی بڑی سبکی ہوئی اور انہوں نے دوبارہ اس موضوع کو چھیڑا ہی نہیں۔دروغ بر گردن راوی کہا جاتا ہے کہ میاں صاحب کو ایوانِ صدر، جنرل ہیڈ کوارٹرز اور آئی ایس آئی کی طرف سے وارننگ ملی تھی کہ اگر آپ نے دوبارہ اس قسم کی کوئی بات کی تو آپ کی خیر نہیں چنانچہ میاں صاحب نے اسکے بعد اس مسئلے پر مکمل خاموشی اختیار کر لی۔

مارچ 1992ء کے وسط میں ایک شام شیخ رشید احمد (جو اب نواز شریف کابینہ کے وزیرِ اطلاعات تھے) کا فون آیا کہ اسلام آباد جانا ہے تیار رہیں۔میں نے راجہ مظفر سے کہا کہ وہ بھی میرے ساتھ چلیں۔چنانچہ میں اور راجہ صاحب، راجہ صاحب کی گاڑی میں شیخ رشید کے پیچھے پیچھے چلتے وزیراعظم ہاؤس اسلام آباد پہنچے، وہاں راجہ صاحب کو شیخ صاحب نے باہر رکنے کیلئے کہا اور مجھے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گئے، وہاں ہم دونوں خاصی دیر بیٹھے رہے۔یہ کمرہ ایک چھوٹی سی لائبریری تھا اور دیوار پر ایک بڑے سائز کا دنیا کا نقشہ لٹکا ہوا تھا، میں جب بھی ایسے نقشے دیکھتا ہوں، خاص کر باہر کے ملکوں میں

چھپے نقشے کو، تو میں سب سے پہلے یہ دیکھتا ہوں کہ اس میں کشمیر کی کیا پوزیشن دکھائی گئی ہے۔ اس نقشے پر نظر پڑی، یہ غالباً برطانیہ کے اخبار ڈیلی ٹیلیگراف کا شائع کردہ نقشہ تھا جس میں بھارتی مقبوضہ کشمیر کو بھارت کا اور آزاد کشمیر، گلگت بلتستان کو پاکستان کا حصہ دکھایا گیا تھا۔ میرے منہ سے اونچی آواز میں نکلا ''چُوں کفراز کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی'' شیخ صاحب جو کسی کام میں مصروف تھے چونک پڑے اور پوچھا کیا بات ہے۔ میں نے کہا کعبے سے ہی کفر نکلے تو مسلمانی کہاں رہے گی۔ کشمیری نژاد پاکستانی پرائم منسٹر کے دفتر میں وہ نقشہ لٹکا ہو جس میں کشمیر کے بڑے حصے کو بھارت کا آئینی حصہ یعنی اٹوٹ انگ دکھایا گیا ہو تو پاکستان کی طرف سے کشمیریوں کے حق خودارادیت کی حمایت کہاں گئی۔ اس پر شیخ صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا واقعی یہ غلط بات ہے۔

میاں صاحب تقریباً نو بجے وہاں آئے۔ ہمیں وزیراعظم ہاؤس کے باہر کھڑی گاڑیوں سے اندازہ ہوا تھا کہ پاکستان کی بری، ہوائی اور بحری فوج کے سربراہ میاں صاحب کے پاس بیٹھے ہیں۔ بہرحال میاں صاحب نے آتے ہی ادھر اُدھر دیکھ کر کہا، یہاں بیٹھنا ٹھیک نہیں ہے۔ غالباً وہ نہیں چاہتے تھے کہ مجھے کوئی وہاں دیکھے انہوں نے ملازم کو آواز دیکر پچھلی طرف کے لان میں تین کرسیاں ڈلوائیں اور ہم انتہائی دھیمی روشنی میں باہر لان میں بیٹھ گئے۔ سب سے پہلے انتہائی لذیذ کشمیری نمکین چائے سے تواضع ہوئی اور اس دوران میاں صاحب نے بتایا کہ وہ اور شیخ رشید دونوں کے آباؤ اجداد کا تعلق کشمیر سے تھا۔ اگرچہ اس سلسلے میں انہوں نے کوئی واضح بات نہیں کی لیکن مجھے احساس ہو رہا تھا کہ 12 فروری کو جنگ بندی لائن کی طرف ہمارے مارچ کے دوران ہمارے لوگوں پر گولیاں چلوا کر سات افراد کو شہید اور پچاس سے زائد کو زخمی کرانے کے واقعے پر میاں صاحب کا ضمیر ملامت کر رہا تھا اور وہ کسی طرح اس کا مداوا کرنا چاہتے تھے۔ اسی اثناء میں میں نے اپنی سوانح عمری جہدِ مسلسل کی ایک کاپی انہیں دیدی جو انہوں نے ایک سرسری نظر کے بعد ایک طرف رکھ دی۔ اس کے بعد ذرا سنجیدہ ہو کر کہنے لگے امان اللہ صاحب میں تحریک آزادی کے سلسلے میں آپ کی بھرپور مدد کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کو کیا چاہیے (میاں صاحب غالباً مجھے کوئی بڑی رقم دینا چاہتے تھے۔ اخباری خبروں کے مطابق انہوں نے جماعتِ اسلامی پاکستان کے امیر قاضی حسین احمد صاحب کو تحریک آزادی کشمیر کیلئے دس کروڑ روپے دیئے تھے جبکہ 1992ء میں میں نے اور لبریشن فرنٹ نے عملی طور پر ثابت کر دیا تھا کہ تحریک آزادی میں عملی کردار کے سلسلے میں ہم جماعت اسلامی سے کہیں آگے ہیں) میاں صاحب کی اس پیشکش پر میرے ذہن میں نقد رقم لینے یا نہ لینے کے بارے میں جنگ شروع ہوگئی۔ آخر ذہن نے فیصلہ کیا کہ میں میاں صاحب سے نقد رقم کی بجائے نظریئے کے سلسلے میں مدد مانگوں۔ میں سوچ میں گم تھا کہ میاں صاحب نے پھر سوال کیا۔ جس کے جواب میں میں نے کہا۔ میاں صاحب اگر آپ واقعی ہماری مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہماری دو طرح سے مدد کریں۔ ایک یہ کہ بی بی سی پر دیئے گئے بیان کی طرح آپ پاکستان کی پارلیمنٹ سے بھی نظریۂ خودمختار کشمیر کی قرارداد منظور کرائیں جو کہ آپ کیلئے کوئی مشکل نہیں اس لئے کہ آپ کو پارلیمنٹ میں غالب

اکثریت حاصل ہے۔ دوسری مدد آپ یوں کریں کہ ہم 30 مارچ کو جنگ بندی لائن اجتماعی طور پر اور اعلانیہ طور پر توڑنے کی ایک اور کوشش کر رہے ہیں آپ ہماری اس کوشش میں رکاوٹ نہ ڈالیں۔ یہ جواب میاں صاحب اور شیخ صاحب دونوں کے لئے بالکل غیر متوقع تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ امان اللہ خان پندرہ بیس کروڑ روپے کی رقم اور اسلحہ طلب کرے گا۔ جس کے لئے غالباً میاں صاحب تیار تھے۔ چنانچہ میرا جواب سنتے ہی دونوں حیرانگی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے بلکہ شیخ رشید نے خاصے غصے میں میری طرف دیکھا بھی۔ کچھ دیر بعد میاں صاحب نے مجھ سے پوچھا اگر ہم آپ کے مطالبے کو تسلیم کریں تو آپ اس کے بدلے ہمیں کیا دینگے۔ میں نے کہا آپ کو کیا چاہیئے، کہنے لگے اپنا نظریہ یعنی کشمیر کی خودمختاری کا نظریہ چھوڑ دو۔ میں نے کہا میاں صاحب کیا آپ کسی قیمت پر بھی اپنا کلمہ چھوڑ سکتے ہیں۔ کہنے لگے ہرگز نہیں لیکن کشمیر کی خودمختاری کے نظریئے کا کلمے سے کیا تعلق۔ میں نے کہا میں مسلمان کشمیری یا کشمیری مسلمان ہوں۔ مسلمان کی حیثیت سے میرا مذہبی کلمہ لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ (ﷺ) ہے اور کشمیری کی حیثیت سے میرا سیاسی کلمہ کشمیر بنے گا خودمختار ہے۔ جس طرح میں کسی قیمت پر اپنے مذہبی کلمے کو نہیں چھوڑ سکتا اسی طرح میں اپنے سیاسی کلمے کو بھی کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتا۔ پھر میری ایک تنظیم ہے میں اس کے آئین کے تابع ہوں، کہنے لگے آپ کی تنظیم کو اجازت ہوگی وہ اپنا نظریہ قائم رکھے صرف آپ اس نظریئے کو چھوڑ دیں۔ میں نے کہا میاں صاحب میں کسی بھی قیمت پر اپنا نظریہ جو میری روح اور ریاست جموں کشمیر کیلئے ایک روشن مستقبل کی ضمانت ہے نہیں چھوڑ سکتا۔ اس پر میاں صاحب نے کہا امان اللہ صاحب آپ خواب دیکھ رہے ہیں۔ خوابوں کی دنیا سہانی ضرور ہوتی ہے لیکن انسان کو خاص کر آج کی دنیا میں تلخ زمینی حقیقتوں کو تسلیم کرنا چاہیئے۔ میں نے کہا میرے لئے میرے سیاسی کلمے سے زیادہ اہم کوئی تلخ یا شیریں حقیقت نہیں ہے۔ اس پر انہوں نے کہا میں پھر بھی یہی کہونگا کہ اس مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور شیخ صاحب کو اپنے حتمی جواب سے آگاہ کریں۔ میں نے کہا میرا جواب کل بھی وہی ہوگا جو آج ہے۔ میں اپنی اور اپنی تنظیم کی روح سے کسی صورت میں بھی الگ نہیں ہوسکتا۔ اگر آپ نے مدد کرنی ہے تو غیر مشروط مدد کریں۔ اس پر میاں صاحب جواب دیئے بغیر اُٹھے اور مجھے خدا حافظ کہہ کہ اندر کی طرف چل پڑے۔ میری کتاب جہدِ مسلسل ان کے ہاتھ میں تھی۔ میں اور شیخ رشید ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شیخ صاحب میرے جواب پر خاصے غصے میں تھے۔ اتنے میں میاں صاحب واپس آگئے اور مجھ سے پوچھنے لگے۔ امان اللہ صاحب آپ بھارت اور پاکستان دونوں کے لئے دردسر بنے ہوئے ہیں۔ آپ اتنی موٹی موٹی کتابیں کیسے لکھتے ہیں۔ اس کے لئے آپ کو وقت کہاں سے ملتا ہے۔ میں نے کہا میاں صاحب ہمت مرداں مدد خدا (Where there is a will there is a way) میرا جواب سن کر میاں صاحب واپس چلے گئے اور میں اور شیخ رشید باہر آگئے جہاں راجہ مظفر بیتابی سے ہمارا انتظار کر رہا تھا۔

1988ء میں ہماری طرف سے شروع کی گئی مسلح جدوجہد آزادی کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ 1990ء سے ہی سینکڑوں نام نہاد مجاہد میاں صاحب کی طرف سے مجھے کی جانے والی پیشکش کے

ہزارویں حصے سے بھی کم قیمت پر بکتے رہے۔ اگر میں بھی کروڑ ہا روپے کے عوض بک جاتا تو شاید آج تحریک آزادی کی تاریخ بالعموم اور نظریۂ خودمختار کشمیر کی تاریخ بالخصوص کچھ اور ہوتی۔ میں نے اپنے نعرے ''ہم بکنا اور رُکنا نہیں جانتے'' اور اپنے نظریے کی لاج رکھی ورنہ ایسی پیش کش تو بڑوں بڑوں کو ڈانواں ڈول کر دیتی ہے۔

میاں نواز شریف سے متذکرہ بالا ملاقات کے تقریباً نو سال بعد 2001ء میں راولپنڈی پریس کلب کے ہال میں ہمارے ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے شیخ رشید احمد نے میاں نواز شریف سے ہماری 1992ء کی متذکرہ بالا ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ جب امان اللہ صاحب نے اپنے نظریے کے عوض وزیراعظم پاکستان کی اتنی بڑی پیش کش کو ٹھکرا دیا تو مجھے بہت غصہ آیا تھا لیکن آج سوچتا ہوں کہ اگر ہر حریت پسند کشمیری نے امان اللہ خان صاحب کے طرز فکر و عمل کا مظاہرہ کیا ہوتا تو آج کشمیر اور تحریکِ آزادیٔ کشمیر کی صورتحال کچھ اور ہوتی۔

میرے کچھ تنظیمی ساتھیوں اور غیر تنظیمی دوستوں کی رائے ہے کہ اگر میں نے بے نظیر بھٹو سے مفاہمت کی ہوتی اور نواز شریف کی پیشکش قبول کی ہوتی تو ہم تحریک آزادی کو آسانی سے منزل سے ہمکنار کرا سکتے تھے۔ مجھے اس استدلال سے شدید اختلاف ہے۔ جہاں تک بے نظیر صاحبہ کا تعلق ہے ہمارا قصور صرف یہ تھا کہ (ان کی طرف سے ہماری ملاقات کی خواہش کا جواب تک نہ ملنے کے بعد) ہم نے تحریک کو ختم ہونے سے بچانے کیلئے شیخ رشید سے رجوع کیا تھا لیکن بے نظیر نے نواز شریف اور شیخ رشید سے دشمنی کی سزا ہمیں بلکہ تحریک آزادی کو دیدی۔ جہاں تک نواز شریف صاحب کی پیشکش کا تعلق ہے اگر میں اپنے نظریئے کے عوض پندرہ بیس کروڑ روپے وصول کرتا تو یہ میری ذاتی ہی نہیں تنظیم کی بھی سیاسی موت ہوتی۔ اگر میری جسمانی اور سیاسی موت کے عوض قوم کو آزادی کی منزل مل جاتی تو میں یہ قربانی دینے کیلئے بھی تیار تھا لیکن میری اس قربانی کے باوجود قوم کا منزل سے ہمکنار ہونا ناممکن تھا۔ نواز شریف کی رقم ہمارا کچھ مالی بوجھ ضرور کم کرتی لیکن آزادی کی طرف جانے والے ہمارے راستے میں ناقابل عبور رکاوٹیں بھی کھڑی ہو جاتیں۔ یہی نہیں بلکہ نظریہ فروشی کے مجرموں کی حیثیت سے میں اور میری تنظیم محبِّ وطن، آزادی پسند اور باضمیر لوگوں کی نظر میں وطن فروش بن کر عوامی حمایت سے محروم ہو جاتے اور نتیجتاً حصول آزادی محض ایک خواب بن کر رہ جاتی۔ اس کے برعکس آج ہمارا نظریہ خواب بن جانے کی بجائے مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جا رہا ہے صرف اسلئے کہ ہم نظریے اور قومی مفاد کے سلسلے میں بکنے نہیں، جھکے نہیں اور رُکے نہیں۔

3- جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے

جیسا کہ میں نے جہدِ مسلسل کی پہلی جلد میں ''اور میں موت کے منہ سے واپس آتا رہا'' کے عنوان سے درجن بھر ایسے واقعات کا سرسری اور تفصیلی ذکر کیا ہے جب میں واقعی موت کے منہ سے واپس آیا۔ ویسے تو آج کی مشینی زندگی میں انسان کی زندگی ہر وقت ہتھیلی پر ہوتی ہے۔ آپ کہیں بس یا گاڑی میں

یا پیدل جا رہے ہیں اپنی یا دوسرے کی گاڑی کے ڈرائیور کی چھوٹی سی غلطی آپ کے لئے جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے۔ گزشتہ تقریباً 18 سال کے دوران کم از کم دو دفعہ تو میں واقعی موت کے منہ سے واپس آیا ہوں جبکہ ایک اور حقیقت بھی قدرت کے ان کاموں میں سے ہے جو انسان کی سمجھ سے بالاتر ہوتے ہیں۔ پہلے اس تیسری حقیقت کا ذکر مناسب ہوگا۔

1- فروری 1986ء میں لیسٹر (برطانیہ) کے ہائی سیکیورٹی جیل میں میری اسیری کے دوران میرے پھیپھڑوں کا کینسر تشخیص ہوا اور 8 فروری 1986ء کو گروبی روڈ ہسپتال لیسٹر میں میرا چار گھنٹے کا آپریشن ہوا۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ میرے دائیں طرف کے پھیپھڑے پوری طرح کینسر زدہ تھے اور اگر دو چار ماہ تک آپریشن نہ ہوتا تو بائیں طرف والے بھی متاثر ہوتے۔ جس کے نتیجے میں میری موت واقع ہو جاتی۔ یعنی ڈاکٹری تخمینے کے مطابق جون سے اگست 1986ء کے درمیان میری موت متوقع تھی لیکن ایک انتہائی ماہر سرجن کے کامیاب آپریشن کے نتیجے میں میرے سر پر سے کینسر سے مرنے کا خطرہ ٹل گیا۔

اپریل 1986ء میں مجھے لیسٹر جیل سے برکسٹن جیل لندن منتقل کیا گیا اور ستمبر 1986ء میں عدالت سے دہشت گردی کے الزام سے بری ہونے کے ساتھ ہی میری برطانیہ بدری کا فیصلہ ہوا۔ فیصلے کا جواز یہ بتایا گیا کہ برطانیہ میں میری موجودگی برطانیہ کی قومی سلامتی کے لئے خطرہ ہے۔ اور دسمبر 1986ء کے دوسرے ہفتے میں برطانیہ بدری کے حتمی احکامات جاری ہو گئے۔

برکسٹن جیل لندن کی سربراہ مس کنگسلے (Ms Kingsley) ایک انسانیت نواز خاتون تھیں۔ انہوں نے میری برطانیہ بدری سے چند دن پہلے مجھے اپنے دفتر میں بلا کر کہا۔ خان تم واپس پاکستان جا رہے ہو۔ تمہارا ایک میجر آپریشن ہوا ہے۔ معلوم نہیں پاکستان میں تمہیں مناسب طبی سہولتیں میسر ہونگی یا نہیں۔ میں چاہتی ہوں تمہارا ایک بار تفصیلی طبی معائنہ ہو۔ اس لئے میں تمہیں گرابی روڈ ہسپتال لیسٹر (جو لندن سے کوئی ڈھائی سو کلو میٹر دور ہے) اُسی ڈاکٹر سرجن ہیلے (Dr. Healey) کے پاس بھیج رہی ہوں۔ جس نے تمہارا آپریشن کیا تھا۔ وہ تمہیں مناسب طبی مشورہ دے گا۔

دوسرے دن مجھے حسب معمول پولیس کی بھاری گارڈ میں لیسٹر جیل بھیجا گیا۔ سرجن ہیلی کو پہلے ہی اطلاع تھی اسلئے وہ میرے انتظار میں تھا۔ اس نے اچھے یعنی دوستانہ طریقے سے میرا معائنہ کیا۔ اور کچھ دوائیاں لکھ دیں اور آپریشن سے متعلق معاملات کو اطمینان بخش قرار دیا۔ اسکے بعد مسئلہ کشمیر کے بارے میں اس کے چند سوالوں کے میں نے تفصیلی جواب دیئے۔ غالباً یہ سوال بھی لیسٹر جیل ہسپتال کی ڈاکٹر پینٹا (Dr. Penta) کی طرح میرا نفسیاتی علاج تھے۔ جو میرے آپریشن کے کئی روز بعد تک ہر صبح آ کر میرے سرہانے کھڑی ہو کر مجھے کہتی۔ ''خان مجھے ایک مسکراہٹ دے دو۔ مجھے یقین ہے۔ تمہارا کشمیر جلد آزاد ہو جائے گا''۔ یہ ڈاکٹر کی طرف سے میرا نفسیاتی علاج تھا۔ سرجن ہیلے نے مجھے کہا کہ اس نے میرے پھیپھڑوں کے کینسر کو جڑ سے نکال پھینکا ہے۔ اسلئے اسے یقین ہے کہ کینسر دوسری طرف کے پھیپھڑوں تک نہیں پہنچے گا۔ ڈاکٹر ہیلے نے بڑے جوشیلے انداز میں مجھے رخصت کیا۔ دروازے سے باہر نکل کر مجھے پھر

اچانک خیال آیا کہ میں اس سے اہم ترین سوال پوچھنا تو بھول ہی گیا۔ چنانچہ میں واپس اندر چلا گیا اور سرجن سے پوچھا۔ ڈاکٹر مجھے بتائیں میں اور کتنی مدت تک زندہ رہونگا۔ اسکے چہرے پر مسکراہٹ سی آگئی اور اس نے کہا جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے میں نے ایک طرف کے پھیپھڑے کے کینسر کو جڑ سے نکال پھینکا ہے۔ اسلئے ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے میرا اندازہ ہے کہ تم آئندہ پانچ سال کے دوران کم از کم کینسر سے نہیں مرو گے۔ آگے تم اور تمہارا اللہ۔ (اس نے انگریزی میں بات کرتے ہوئے بھی اللہ ہی کا لفظ استعمال کیا تھا۔) ڈاکٹر ہیلے نے یہ بات دسمبر 1986ء میں کی تھی اور آج دسمبر 2004ء ہے۔ یعنی پورے 18 سال ۔یعنی ڈاکٹر کے اندازے کے پانچ سالوں کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مزید 13 سال ملے ہیں۔ آگے اللہ مالک ہے۔ اسے کہتے ہیں جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔

مستقبل قریب میں میرے ترقی پسند دوست اور مستقبل بعید میں کتاب کے اکثر قاری میرے اس طرز فکر کو میری رجعت پسندی قرار دینگے لیکن میں اس کتھا کا آخری تبصرہ واپس لینے کے لئے تیار نہیں۔

2۔ فروری 1992ء میں ہم نے اجتماعی، غیر مسلح ہو کر اور اعلانیہ طور پر کشمیر میں جنگ بندی لائن توڑنے کا فیصلہ کیا اور ہم مظفر آباد سے 11 فروری کو ہزاروں کی تعداد میں پیدل روانہ ہو کر 12 کی دوپہر کو جنگ بندی لائن چکوٹھی سے کوئی تین کلومیٹر پیچھے پہنچ گئے۔ اس وقت تک پاکستان کی نیم فوجی ملیشیا، پی سی (پنجاب کانسٹیبلری) کی فائرنگ سے ہمارے درجنوں نوجوان شدید یا معمولی زخمی ہوئے تھے جنہیں ایدھی فاؤنڈیشن اور انصار برنی ٹرسٹ کی ایمبولینسوں میں مظفر آباد ہسپتال روانہ کیا گیا تھا۔ آخر ہم ایک جگہ پہنچے جہاں پی سی والے بندوقیں تانے سڑک پر بھی اور اوپر پہاڑی تک کھڑے تھے۔ ادھر شدید بارش اور برف باری شروع ہوگئی۔ جس کی وجہ سے ہمارے بہت سے ساتھی واپس چلے گئے اور کچھ جانے کے لئے پر تول رہے تھے۔ ادھر اگلی صفوں میں دونوں طرف لاوا اُبل رہا تھا۔ اتنے میں ایک فوجی افسر نے مجھ سے کہا کہ آپ ہمارے اعلیٰ افسروں سے بات کیوں نہیں کرتے۔ چنانچہ میں نے راجہ مظفر اور چوہدری صدیق کو ان افسروں کی طرف بھیجا۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ افسر میجر جنرل ضیاء الدین آف بھمبر (آزاد کشمیر) اور بریگیڈیر قادر بلوچ تھے جو راجہ مظفر وغیرہ کا انتظار کر رہے تھے۔ میں سڑک کی دیوار کے ساتھ کھڑا تھا کہ ایک نوجوان انتہائی جلدی میں میرے سامنے سے گزرا اور پہاڑی کی طرف سے ایک سنسناتی گولی آکر اُسے لگی اور وہ تڑپ تڑپ کر وہیں شہید ہوگیا۔ اس کے جسد خاکی کو جلد ہی ایمبولینس والے مظفر آباد لے گئے۔ کچھ دیر بعد سڑک پر ہی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی گئی۔ اس وقت تو میں نے اس طرف دھیان ہی نہیں دیا بعد میں میں اپنی پرانی جگہ پر کھڑا ہو گیا تو مجھے اندازہ بلکہ یقین ہو گیا کہ دراصل سردی میں ٹھٹھرنے اور دو دن سے مسلسل چوکس رہنے والے کسی جلے بھنے سپاہی نے گولی مجھ پر چلائی تھی تاکہ اس ساری ''مصیبت'' کی جڑ ہی ختم ہو جائے۔ لیکن عین وقت پر وہ جوان وہاں سے گزرا۔ اور گولی میری بجائے اسے لگ گئی۔ اسے بھی کہتے ہیں جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ یہ غالباً مظفر آباد کا خلیل الرحمان شہید تھا۔ بعد میں مجھے یاد آیا کہ یہ نوجوان راستے میں ہم سے آگے آگے زوردار نعرے لگا رہا تھا۔ ایک جگہ کچھ نوجوانوں نے نعرہ لگایا۔ ''امان

اللہ قدم بڑھاؤ ہم تمہارے ساتھ ہیں''۔تو اس نے انہیں ڈانٹتے ہوئے کہا۔نعرہ لگاؤ''امان اللہ قدم بڑھاؤ، خدا تمہارے ساتھ ہے۔''

3۔ میں گزشتہ بارہ سال کے دوران دو بار گاڑی کے حادثوں سے دوچار ہوا۔ایک بار غالباً 1991ء میں راولپنڈی سے باغ آزاد کشمیر جاتے ہوئے مری کے نزدیک اپر باسیاں میں گاڑی کے حادثے سے دوچار ہوا۔لیکن ڈرائیور شمس الدین آف منز ہاڑ ہائی ہامہ ضلع کپواڑہ مقبوضہ کشمیر نے انتہائی حاضر دماغی سے کام لیکر اور مجھے بچانے کیلئے اپنی جان کو داؤ پر لگا کر مجھے بچایا۔میرے ساتھی حافظ ممتاز آف تھوراڑ پونچھ اور مقبوضہ کشمیر کے الطاف اندرابی نے بھی میری مدد کی۔پھر دوسرا حادثہ 2 دسمبر 2002ء کو مظفر آباد سے راولپنڈی آتے ہوئے مری میں ہوا اور میں یکے بعد دیگرے ہونے والے کم از کم چار معجزوں کی وجہ سے بچ گیا۔اگر ان میں ایک معجزہ بھی نہ ہوتا تو میری خیر نہیں تھی۔ہم جھیکا گلی سے لارنس کالج روڈ سے آرہے تھے جو نیا بنا ہے اور ٹریفک بھی کم ہوتی ہے اور وقت بھی ساڑھے چار بجے کے قریب تھا۔افطار میں تھوڑا سا ہی وقت باقی تھا۔میں حسبِ معمول اپنے خیالوں میں گم تھا کہ مجھے احساس ہوا کہ ہماری گاڑی کی رفتار خاصی تیز ہے اور وہ موڑ کاٹنے کی بجائے سیدھا آگے جا رہی ہے۔ہم سڑک کے کنارے سے چار میٹر سے بھی کم فاصلے پر تھے اور گاڑی کا رخ سڑک سے باہر کی طرف تھا جہاں سے گاڑی کوئی ایک میل گہری کھائی میں گر سکتی تھی۔عین موقع پر نوجوان ڈرائیور منیر نے جو غالباً کوئی خواب دیکھ رہا تھا انتہائی تیزی سے موڑ کاٹا اور غالباً اس کا پیر ایکسیلیٹر پر پڑ گیا چنانچہ گاڑی اچانک دوسری طرف مُڑ کر انتہائی تیزی سے سڑک پار کرتے ہوئے دوسری طرف پہاڑی سے جا لگی اس دوران میرا سر گاڑی کی چھت کی کسی سخت چیز سے لگا۔اتفاق سے گاڑی پہاڑی کی دوسری طرف کے ایک بہت بڑے پتھر سے چند انچ کے فاصلے پر نرم اور گیلی مٹی میں دھنس گئی تھی۔پتھر کی وجہ سے ڈرائیور کی طرف کا دروازہ جام ہو گیا لیکن گاڑی کا سامنے والا بڑا شیشہ محفوظ رہا اور میں مشکل سے گاڑی سے نیچے اترا۔اسی دوران وہاں سے ایک گاڑی انتہائی تیزی سے گزری اور ہمارے پاس پہنچ کر رک گئی۔میرا چہرہ خون سے بھرا اور کپڑے لت پت تھے۔گاڑی والے کسی جنازے میں شرکت کیلئے انتہائی تیزی سے دھیر کوٹ آزاد کشمیر جا رہے تھے۔اتنے میں ان میں سے کسی نے مجھے پہچانا اور انہوں نے مجھے اپنی گاڑی میں ڈالا اور کچی سڑک سے ہوتے ہوئے سی۔ایم ایچ پہنچ گئے۔جب تک میں خون بہنے سے تقریباً بے ہوش ہونے لگا تھا۔بحر حال وہاں میرا علاج ہوا اور میں بچ گیا۔اگر میرے ڈرائیور کو عین موقع پر احساس نہ ہوتا کہ وہ غلط رخ پر جا رہا ہے تو ہماری لاشیں تو درکنار گاڑی بھی خاصی دیر بعد ملتی۔اگر گاڑی کی چھت کی ڈنڈی میرے ماتھے پر ایک انچ نیچے لگتی تو میری آنکھ گئی تھی۔اگر گاڑی تیزی سے جا کر سڑک کے دوسرے کنارے پتھر سے ٹکراتی تو اگلی سیٹ پر بیٹھے میرا بچنا ناممکن تھا اور اگر عین موقعے پر دھیر کوٹ والوں کی گاڑی وہاں نہ پہنچتی یا ان میں سے کوئی مجھے نہ پہچانتا تو تقریباً دو کلومیٹر دور واقع ہسپتال تک پیدل پہنچنے سے پہلے خون بہنے سے میری موت یقینی تھی۔لیکن ان تمام معجزہ نما اتفاقات کے نتیجے میں میں بچ گیا۔اسے بھی کہتے ہیں جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے۔

الغرض میری زندگی میں اور بھی ایسے واقعات پیش آئے ہیں جن پر یہ کہاوت صادق آتی ہے۔ جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے۔

4- تحریک آزادی میں میرے تعلیمی اداروں کا کردار

جیسا کہ میری نجی زندگی کے متعلقہ باب (میرے تعلیمی ادارے) میں وضاحت سے بیان کیا گیا ہے اگست 1956ء میں سٹی نائٹ سکول کراچی میں پیش آنے والے ایک ناخوشگوار واقعے نے مجھے اپنا نائٹ سکول قائم کرنے پر مجبور کیا اور دوسرے سال یعنی 1957ء میں میں نے نائٹ سکول کے لئے کرائے پر لئے گئے کمروں میں دوپہر کے اوقات میں اپنا انگلش میڈیم سکول Merry Dale English School قائم کیا۔ 1962ء میں دونوں سکول کراچی میونسپل کارپوریشن کی وسیع عمارت (جو میں نے کرائے پر لی تھی) میں منتقل کئے۔ 1956ء سے 1962ء تک کے عرصے کے دوران تقریباً دو سال تک روزانہ تقریباً اٹھارہ گھنٹے مسلسل کام کر کے سکولوں کا خسارہ پورا کرتا اور قرضہ ادا کرتا رہا۔ سکول جونہی منافع دینے لگے میں نے اوائل 1962ء میں انگریزی ماہنامہ ''وائس آف کشمیر'' جاری کیا۔ یہ ماہنامہ تقریباً تین سال جاری رہا اس کا بھاری مالی خسارہ بھی میرے سکول ہی پورا کرتے رہے۔ لیکن جونہی وائس آف کشمیر مالی طور پر اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے لگا۔ حکومت پاکستان کی وزارت امور کشمیر نے اسکے اشتہارات بند کرا دئے کیونکہ ماہنامہ نظریۂ خودمختار کشمیر کی وکالت کرتا تھا چنانچہ اسے 1964ء میں بند کرنا پڑا لیکن اپنی بندش سے پہلے اس نے نظریۂ خودمختار کشمیر کو پاکستانی اور کشمیری دانشوروں کے علاوہ سفارتی حلقوں میں بھی خاصا روشناس کرایا تھا۔ تحریک آزادی اور نظریۂ خودمختار کشمیر کے لئے میرے سکولوں کا یہ پہلا عطیہ تھا۔

میں نے کراچی میں 1955ء میں کشمیر سٹوڈنٹس فیڈریشن قائم کی تھی جسکا میں پہلے جنرل سیکرٹری اور بعد میں صدر منتخب ہوا۔ اس تنظیم کے اجلاس میرے سکول میں ہوتے تھے۔ 1962ء میں میری طالب علم کی حیثیت کے اختتام کے بعد بھی میرا سکول تنظیم کا مرکز تھا۔ تنظیم کے ممبر میرے رات یا دن والے سکول میں جز وقتی ملازمت کر کے اپنے تعلیمی اخراجات پورے کرتے تھے۔ 1963ء میں کشمیر انڈیپنڈنس کمیٹی اور 1965ء میں جموں کشمیر محاذ رائے شماری اور جموں کشمیر نیشنل لبریشن فرنٹ کے قیام سے 1976ء تک کے طویل عرصے کے دوران (تقریباً 15 سال) میرے سکول کا دفتر، ٹیلی فون، ٹائپ رائٹر وغیرہ ان تنظیموں اور تحریک آزادی سے متعلق کاموں کیلئے بھی استعمال ہوتے رہے۔ 1976ء میں میری برطانیہ روانگی کے بعد بھی میرے سکول میری مالی مدد کرتے رہے۔ جسکے نتیجے میں میں برطانیہ میں سارا وقت تحریک آزادی سے متعلق معاملات پر صرف کرتا رہا۔ برطانیہ میں دس سال قیام کے دوران میرے کچھ اخراجات میری پارٹی برداشت کرتی تھی۔ تقریباً دو سال میں نے انشورنس کمپنی کی ایجنسی لیکر اس سے خاصی بڑی رقم کمائی جس میں سے کچھ تنظیم کو دیدی باقی ذاتی اخراجات پر خرچ کی۔ اسی دوران کراچی میں اپنے

سکولوں سے آئی رقم اور کچھ بنک قرضے سے میں نے لیوٹن میں 22 ہزار پونڈ سے مکان خریدا جو مکان والے علاقے کی اہمیت بڑھ جانے کے نتیجے میں پانچ سال بعد 55 ہزار پونڈ میں بکا۔ ادھر روپوں میں پونڈ کی قیمت بھی تقریباً دوگنی ہوگئی چنانچہ مجھے روپوں میں ایک بڑی رقم ملی جس سے میں نے کراچی میں اپنا مکان خریدا ایک کار بھی خریدی اور 88-1987ء کے دوران اپنی تنظیم لبریشن فرنٹ پر دو ہزار روپے کم دو لاکھ روپے (Rs1,98,000/-) صرف کئے جس کے نتیجے میں تنظیم مالی طور پر اپنے پاؤں پر کھڑی ہوگئی۔ اس کے بعد بھی میں تنظیم کی مالی مدد کرتا رہا۔ 2003ء میں میں نے کراچی میں اپنا مکان فروخت کیا ادھر تنظیم مالی مشکلات میں مبتلا تھی چنانچہ مکان کی رقم میں سے خاصی رقم تنظیم پر صرف ہوئی گو اس رقم کا بڑا حصہ بعد میں مجھے واپس مل گیا۔ 1990ء کے بعد اکثر اوقات تنظیم میری مقروض رہی ہے۔

الغرض میرے تعلیمی اداروں نے مختلف طریقوں سے تحریک آزادی میں اہم کردار ادا کیا۔ ان اداروں نے (گزشتہ صدی کی چھٹی دہائی کے ابتدائی سالوں تک کی میری غیر معمولی اور مسلسل محنت کے بعد سے) مجھے مالی پریشانیوں سے فارغ کر کے اس قابل بنا دیا کہ میں تقریباً سارا وقت تحریک آزادی پر صرف کروں۔ ان اداروں کی عدم موجودگی کی صورت میں میں تنظیم، نظریئے اور تحریک کو اتنا وقت نہیں دے سکتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ ادارے میری تنظیم کی مالی مدد بھی کرتے رہے۔ علاوہ ازیں میرے سکولوں کا ٹیلی فون دفتر وغیرہ بھی سالہا سال تک تنظیم اور تحریک کے لئے استعمال ہوتے رہے۔ ان سکولوں میں سے ایک (دن والے) کو 2002ء میں بند کر کے عمارت کو گیسٹ ہاؤس میں تبدیل کر دیا البتہ شام والا سکول ابھی چل رہا ہے لیکن میری عدم توجہی کے نتیجے میں مالی طور پر انتہائی کمزور ہو گیا ہے۔

الغرض میرے تعلیمی اداروں کا تحریک آزادیٔ کشمیر میں بلاواسطہ اور بالواسطہ دونوں طریقوں سے خاصا کردار رہا ہے۔

5- میری گھریلو زندگی

تاریخ شاہد ہے کہ کسی مقدس مشن سے سراپا منسلک افراد کی نجی خاص کر گھریلو زندگی عام طور پر دوسرے لوگوں کی زندگی سے خاصی مختلف ہوتی ہے۔ بالغ زندگی میں میرا اوڑھنا بچھونا تحریک آزادیٔ کشمیر رہا ہے اور میں نے بالغ زندگی کا بیشتر حصہ اسی پر صرف کیا ہے جسکے نتیجے میں میری گھریلو زندگی عام زندگی سے خاصی مختلف رہی ہے۔ بلکہ یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ میری نجی زندگی بچپن سے ہی غیر معمولی رہی ہے۔

پیدائش سے ساڑھے تین سال کی عمر تک اپنے آبائی علاقے کی اہم ترین شخصیت کی واحد نرینہ اولاد (وہ بھی آٹھ بیٹیوں کے بعد) کی حیثیت سے میں ایک شہزادے کی طرح پلا۔ لیکن والد صاحب کا سایہ سر سے اٹھ جانے، والدہ کے عقد ثانی اور خاندانی دشمنوں کی طرف سے میری جان پر بار بار کے حملوں

کے نتیجے میں میری حیثیت ایک ننھے قیدی کی سی ہوگئی۔ والد کی وفات کے چند سال بعد مجھے سات دن کی مسافت پر واقع وادیٔ کشمیر کے علاقہ ہائی ہامہ بھیجا گیا۔ ہائی ہامہ میں چند سال ہمشیرہ اور بہنوئی ماسٹر ہاشم علی خان کی سرپرستی رہی اور اس کے بعد یکے بعد دیگرے کاری ہامہ، ہندوارہ اور سرینگر میں طالب علمی کے دوران کبھی کسی کے گھر میں اور کبھی ہوسٹل میں قیام پذیر رہا اور کبھی گھریلو زندگی میسر نہیں آئی۔

1952ء میں پاکستان آنے کے بعد سے 1973ء میں میری شادی تک کے 21 سال کے دوران بھی کراچی میں گھریلو زندگی سے محروم رہا البتہ دو چار سال بعد آبائی گھر جا کر والدہ بہنوں اور دیگر بزرگوں اور عزیزوں کے پیار سے استفادہ کرتا۔

میں بھارتی مقبوضہ کشمیر میں اپنی طالب علمی کے دوران ہی تحریک آزادی سے منسلک ہوگیا تھا بلکہ ایک رات کی اسیری بھی گذاری تھی۔ پاکستان آ کر ابتدائی چند سال ذاتی حالات سدھارنے میں لگے۔ پانچویں دہائی کے اواخر میں الجزائر کی جدوجہد آزادی عروج پر تھی اور میں نے اپنے سکول قائم کر کے ابتدائی طور پر سخت محنت کرنے اور اپنے مالی حالات سدھارنے کے بعد اپنا انگریزی ماہنامہ وائس آف کشمیر جاری کیا تھا۔ اس دوران الجزائر کے قومی محاذ آزادی (FLN) نے قاہرہ میں جلاوطن حکومت قائم کی تھی اور پاکستان میں جناب محمد کلو اس جلاوطن حکومت کے سفیر تھے۔ میں جناب محمد کلو سے بہت متاثر تھا کیونکہ وہ گفتار اور کردار (فکر و عمل) دونوں حیثیتوں سے ایک انقلابی حریت پسند تھے۔ میں نے اپنے پہلے کتابچے ''ایف ایل این، الفتح اور کشمیری نوجوان'' میں الجزائر اور فلسطین کی تحاریک آزادی کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔

جناب محمد کلو نے مجھے الجزائر کی جنگ آزادی کی تفصیلات بتاتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ ایف ایل این کی صف اول کی قیادت کے اکثر افراد غیر شادی شدہ ہیں کیونکہ شادی کرنے کے بعد انسان گھریلو اور سماجی پابندیوں کی وجہ سے تحریک آزادی میں بھرپور کردار ادا نہیں کر سکتا۔ الجزائر کی جدوجہد آزادی کے قائدین کے متعلق اس حقیقت سے آگاہی کے بعد میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں بھی شادی نہیں کرونگا۔ چنانچہ میں شادی کے بارے میں والدہ، بہنوں اور دوسرے بزرگوں کے اصرار کو نظر انداز کرتا رہا۔ اس دوران بزرگوں کا دباؤ بڑھ گیا اور والدہ نے دھمکی دی کہ اگر تم نے شادی نہیں کی تو میں دودھ نہیں بخشوں گی۔ اس اصرار کی وجہ یہ بھی تھی کہ میں والد صاحب کی واحد نرینہ اولاد تھا۔ میری شادی نہ ہونے کی صورت میں والد صاحب کی نسل ہی ختم ہو رہی تھی اسلئے بزرگ میری شادی کو ناگزیر سمجھتے تھے لیکن میں پھر بھی ٹالتا رہا۔

غالباً 1968ء کی بات ہے میں گلگت شہر (جو میرے آبائی علاقے سے تقریباً ایک سو کلومیٹر دور ہے) گیا تھا۔ میری ایک عزیزہ (مسز اشرف جسکا شوہر میرا بھانجا تھا) جن کا مزاح پورے خاندان میں مشہور ہے نے مجھ سے مزاحیہ انداز میں پوچھا ماموں آپ شادی کیوں نہیں کرتے۔ میں نے بھی مذاق میں ہی جواب دیا ''کیا میں خود کسی کے گھر جا کر اس سے اسکی بیٹی کا رشتہ مانگوں؟'' بھانجی نے مجھ سے پوچھا ''تو

کیا ہم آپ کیلئے رشتہ ڈھونڈیں۔'' میں نے اس کا جواب بھی مذاق میں ہی دیا اور بات آئی گئی ہوگئی۔

میرے خالہ زاد بھائی اور مسز اشرف کے بہنوئی مولوی عبدالمنان صاحب ایک انتہائی ہمدرد اور مخلص لیکن جلد باز قسم کے انسان ہیں۔ مسز اشرف نے ان سے میری شادی کے بارے میں خاص کر میرے مزاحیہ جواب کا ذکر کیا تو انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، وہ سیدھا عبدالحمید صاحب خاور اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل پولیس کے ہاں پہنچے اور ان سے میرے لئے رشتہ مانگا۔ خاور صاحب ایک پولیس افسر سے کہیں زیادہ مورخ اور دانشور تھے۔ مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی سے انہیں ذاتی دلچسپی تھی۔ انہوں نے میٹرک سرینگر سے کیا تھا۔ میرے ساتھ وہ اکثر سیاسی موضوعات پر بحث کرتے تھے۔ وہ میرے ماموں زاد بھائی محمد اسماعیل خان (ڈپٹی کمشنر) اور مولوی عبدالمنان کے گہرے دوست بھی تھے۔ خاور صاحب نے مولوی صاحب سے کہا کہ میں سوچ کر جواب دونگا۔ مولوی منان صاحب نے برادرم اسماعیل خان اور اس کے بعد ماموں حاجی عبدالرحیم خان سے بات کی اور آخر خاور صاحب کو ان سب نے رشتہ دینے پر آمادہ کرلیا اور یہ سب کچھ میری پوری علمیت کے بغیر ہی ہوگیا۔

میں 1970ء میں گلگت میں گرفتار اور فروری 1972ء میں رہا ہوگیا۔ اور رہائی کے فوری بعد بھارتی جہاز گنگا کی ہائی جیکنگ کے سلسلے میں گرفتار اپنے ساتھیوں مقبول بٹ، جی ایم لون، میر عبدالقیوم، میر عبدالمنان، اشرف قریشی اور ہاشم قریشی پر چلنے والے مقدمے کی پیروی کے لئے لاہور پہنچ گیا۔ اور 1972ء کا پورا سال لاہور میں گزارا۔ جہاں میرے ساتھیوں پر مقدمے چل رہے تھے۔

عبدالحمید خان صاحب خاور سئے گلگت کے اہم شین قبیلے کے سرپرست تھے۔ شین قبیلے کے بارے میں اکثر مؤرخین کا کہنا ہے کہ یہ لوگ ان علاقوں کے اصل اور قدیمی قبائل میں سے ہیں اور قدیم روایات خاص کر غیرت، خودداری، بہادری، دوستی اور دشمنی دونوں میں انتہاپسندی اور کسی حد تک احساس برتری کے حامل ہیں۔ یہ ساری خوبیاں ایک حد سے بڑھ جائیں تو جہالت کی سرحدوں کو چھو لیتی ہیں۔ چنانچہ ان سے رشتہ داری یا دوستی قیمتی اثاثہ بھی ثابت ہوسکتی ہے اور مصیبت بھی۔ میں ایک معتدل مزاج انسان اور وہ بھی ایک خطرناک کھیل (جدوجہد آزادی) میں مصروف جس سے بجز خود خاور صاحب کے اس قبیلے کے کسی فرد کو کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اس لئے میرے لئے یہ شادی پریشان کن بھی ثابت ہوسکتی تھی چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ میں خاور صاحب سے خود بات کروں تاکہ بعد میں کوئی مسئلہ کھڑا نہ ہوجائے۔

میں گنگا کیس کے دوران ہی (1973ء) میں لاہور سے راولپنڈی آیا اور یہاں میں نے عبدالحمید خان خاور صاحب سے ملاقات کی جو پونچھ ہاؤس میں پیر مقبول گیلانی صاحب (آف خانیار سرینگر) کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میرا رشتہ تقریباً طے ہو چکا تھا۔ میں نے اکیلے میں خاور صاحب پر واضح کیا کہ میں جدوجہد آزادی کے جس راستے کا مسافر ہوں اور جس پر سفر جاری رکھنے کا میں نے کئی بار حلف اٹھایا ہے اس سفر کے دوران میں قتل ہوسکتا ہوں۔ مجھے پھانسی پر لٹکایا جاسکتا ہے۔ لمبے عرصے تک قیدی رہ سکتا ہوں۔ اور مجھے مالی طور پر بھی مفلوج کیا جاسکتا ہے۔ اور آپ کی بیٹی سے شادی ہونے کی

صورت میں ان حقائق کے پیش نظر وہ شادی کے کچھ مدت بعد ہی بیوہ ہوسکتی ہے۔ میرے زندہ رہنے کے باوجود وہ بیوہ کی سی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوسکتی ہے۔ یہاں تک کہ تنگدست ہوکر محنت مزدوری کرنے پر مجبور ہوسکتی ہے۔ اس لئے رشتے کی بات بالکل پکی کرنے سے پہلے آپ ان تلخ حقائق اور تکلیف دہ امکانات پر ایک نظر ڈالیں۔ تاکہ کل کوئی تلخی پیدا نہ ہو۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں تحریک آزادی کے بارے میں اپنا راستہ کسی صورت ترک نہیں کرسکتا نہ اس کی سمت تبدیل کرسکتا ہوں۔ انہوں نے کہا مجھے ان تمام باتوں کا علم اور اندازہ ہے۔ اور میں نے ان کے علاوہ بہت سے اور عوامل بھی مدنظر رکھ کر ہی رشتے کی حامی بھری ہے جسے اب تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔

گنگا کیس کا فیصلہ 5 مئی 1973ء کو سنایا گیا۔ بجز ہائی جیکر ہاشم قریشی میرے جملہ ساتھیوں کو اسی دن رہا کر دیا گیا اور میں جون 1973ء میں استور چلا گیا جہاں ستمبر 1973ء میں میری شادی عبدالحمید خان خاور کی بیٹی زاہدہ پروین سے ہوگئی۔

میرے اس دعوے میں کہ تحریک آزادی ہی میرا اوڑھنا بچھونا ہے کوئی غلط بیانی یا مبالغہ نہیں۔ دولت جمع کرنی ہوتی تو آج کم از کم کروڑ پتی ہوتا۔ اقتدار میری منزل ہوتا تو وہ بھی کسی نہ کسی سطح کا مل ہی جاتا لیکن میں نے ایک بار مقبوضہ کشمیر کی مٹی ہاتھ میں لیکر کئی بار اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جانتے ہوئے، ایک بار اپنے خون سے اور کئی بار اپنے ضمیر کو گواہ رکھ کر حلف اٹھایا ہے کہ میں ریاست جموں و کشمیر کی آزادی کی جدوجہد کو ہر دوسری چیز پر ترجیح دونگا۔ یہاں تک کہ اس سلسلے میں جان کی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کرونگا۔ میں نے زندگی میں اپنے قول و فعل اور ظاہر و باطن میں مکمل ہم آہنگی قائم رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے جسکا ایک ثبوت یہ ہے کہ 1973ء میں اپنی شادی سے 2004ء تک کے 31 سالوں میں سے میں نے مجموعی طور پر دس سال سے زیادہ کا عرصہ اپنی بیوی بچی کے ساتھ نہیں گذارا ہوگا۔ باقی مدت تحریک آزادی اور تنظیمی معاملات کے سلسلے میں یا کسی اور وجہ سے گھر سے باہر گذارے ہیں۔

1973ء میں ہماری شادی ہوئی۔ 1974ء میں بیٹی اسماء پیدا ہوئی۔ ستمبر 1973ء سے جون 1976ء کے درمیانی عرصے میں میں نے تحریک اور تنظیم سے متعلق معاملات کے سلسلے میں ایک طویل عرصہ کراچی میں اپنے گھر سے باہر (آزاد کشمیر اور گلگت میں) گذارا۔ جون 1976ء میں برطانیہ میں مقیم اپنے تنظیمی ساتھیوں کی دعوت پر برطانیہ چلا گیا تو بیوی اور بچی کراچی میں رہ گئیں۔ تقریباً اڑھائی سال بعد وہ برطانیہ آ گئیں۔ مجھے خاصا وقت برطانیہ کے مختلف شہروں یورپ، امریکہ مشرق وسطیٰ، پاکستان اور آزاد کشمیر کے تحریکی اور تنظیمی دوروں پر صرف کرنا پڑا۔ ستمبر 1985ء میں برطانیہ میں گرفتار ہوکر پندرہ ماہ کی اسیری کے بعد برطانیہ بدر ہوا تو بیوی بچی برطانیہ میں رہ گئیں۔ کچھ مدت بعد وہ بھی کراچی آ گئیں۔ 1990ء میں تحریک اور تنظیم کے بہترین مفاد میں مستقلاً راولپنڈی منتقل ہوگیا۔ تو بیوی اور بیٹی کراچی میں رہیں کیونکہ مکان کراچی میں تھا اور سکولوں کی نگرانی بھی خاصی ضروری تھی کیونکہ سکول ہی میرے ذریعہ معاش تھے۔ نومبر 2000ء میں بیٹی کی شادی ہوگئی اور وہ سرینگر چلی گئی۔ بہرحال میری اس عدم توجہی کو

میری بیوی نے بخوشی برداشت کیا جو تحریک آزادی کیلئے اس کی بالواسطہ قربانی ہے۔ اگر چہ میری بیوی اور بچی نے تحریک اور تنظیم سے متعلق معاملات میں براہ راست حصہ نہیں لیا (بلکہ مناسب اور مطلوبہ اہلیت کی حامل ہونے کے باوجود میں نے انہیں خاص کر بچی کو تنظیمی معاملات سے دور رکھا تا کہ تنظیم خاندانی وراثت نہ بن جائے اور دوسرے زیادہ اہل لوگوں کی حق تلفی نہ ہو۔) لیکن میرے لئے مشکلات بھی کھڑی نہیں کیں۔

گو طبیعتوں اور خاندانی پس منظر میں واضح فرق کی بناء پر کبھی کبھی گھریلو فضا مکدر ہو جاتی ہے لیکن مجموعی طور پر میری اہلیہ نے میری زندگی کے مشن کے لئے بڑی قربانی دی ہے۔ مجھے اس بات کی بھی خوشی ہے کہ میری بیٹی پر میری عدم توجہی کا کوئی زیادہ منفی اثر نہیں پڑا۔ اس میں موافق حالات سے پورا استفادہ کرنے اور مخالف حالات کا بھرپور مقابلہ کرنے کی پوری صلاحیت ہے۔ چونکہ تحریک آزادی سے متعلق میرا مشن میری زندگی کے ہر دوسرے پہلو پر حاوی ہے اور میں اپنی تحریکی زندگی سے متعلق اپنی جہدِ مسلسل سے (گو اس کے نتائج سے نہیں) بڑی حد تک مطمئن ہوں اس لئے میرے ذہن پر میری زندگی کے دیگر پہلوؤں کا کوئی گہرا اثر نہیں پڑا ہے۔

الغرض میری گھریلو زندگی ایسی نہیں جسے معمول کی گھریلو زندگی قرار دیا جا سکے۔

6- بھارت اور پاکستان کا میرے ساتھ سلوک

جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہوا ہے مسئلہ کشمیر سے متعلق بھارت اور پاکستان کے موقف کے دوسرے پہلو حال ہی تک ایک دوسرے کی ضد رہے ہیں البتہ دونوں میں واحد قدر مشترک نظریۂ خودمختار کشمیر خاص کر اسکے علمبردار میری سربراہی میں قائم جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کی مخالفت ہے۔ دونوں نے ہر ممکن طریقے سے نظریۂ خودمختار کشمیر کو دبایا۔ دونوں کو احساس ہے کہ بھارت کے اٹوٹ انگ اور پاکستان کی شہ رگ کے دعوؤں کے مقابلے میں ریاست کی خودمختاری کا مطالبہ کشمیری عوام میں بھی زیادہ مقبول ہو سکتا ہے اور عالمی سطح پر بھی۔ اسلئے اس نظریئے اور اسکے متحرک علمبرداروں کو بھی ابھرنے ہی نہ دیا جائے کیونکہ اس نظریئے کی کامیابی سے دونوں ملک ان کے زیرِ تسلط ریاستی علاقوں سے محروم ہو جائینگے خواہ یہ تسلط ریاستی عوام کی مرضی کے سراسر خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ یہ دونوں کی بدترین نوآبادیاتی سوچ ہے۔ دنیا بھر کے متعدد اکابرین پر مشتمل انٹرنیشنل کرائسس گروپ (ICG) کی 4 دسمبر 2003ء کی رپورٹ میں تسلیم کیا گیا ہے کہ بھارت اور پاکستان دونوں ڈر رہے ہیں کہ کہیں خودمختار کشمیر کی تحریک ایک ناقابلِ تسخیر طاقت نہ بن جائے۔

اتفاق سے نظریہ خودمختار کشمیر کے سلسلے میں اندرون ریاست اور عالمی سطح پر سب سے نمایاں

میری اور میری تنظیم کی سرگرمیاں ہی رہی ہیں اور دنیا ہمیں ہی اس نظریہ کے بے لوث اور نڈر داعی اور علمبردار سمجھتی ہے چنانچہ بھارت اور پاکستان دونوں کا نزلہ زیادہ تر ہم پر ہی گرتا ہے۔

بھارتی اخبارات نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے اور کچھ نے تو اس پر اداریئے بھی لکھے ہیں کہ بھارتی فوج اپنے مقبوضہ حصے میں سب سے زیادہ وحشیانہ برتاؤ لبریشن فرنٹ کے بندوق برداروں خاص کر کمانڈروں کے ساتھ کرتی رہی ہے۔ علاوہ ازیں 1991ء سے 1994ء کے دوران جب مقبوضہ کشمیر میں کشمیری عسکری تنظیمیں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھیں تو بہت سے موقعوں پر بھارتی فوج نے ہماری مخالف عسکری تنظیموں کو ہم پر وار کرنے کے مواقع فراہم کئے۔ بھارت نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ میرے یورپ اور امریکہ کے دورے کشمیر کی خودمختاری کے حق میں عالمی رائے عامہ ہموار کر رہے ہیں، مجھے بے دست و پا کرنے کیلئے مؤثر اقدامات کئے۔ ایک طرف نیویارک میں مقیم بھارتی صحافیوں نے اقوام متحدہ کے سیکریٹریٹ کے اندر میری پریس کانفرنس کو توڑ مروڑ کر پیش کر کے بھارتی حکومت کو میرے خلاف اس الزام کے لئے مواد فراہم کیا کہ میں امریکی سرزمین پر سے سرینگر میں اپنے ساتھیوں کو دہشت گردی کی ہدایات دے رہا ہوں اور دوسری طرف بھارتی مقبوضہ کشمیر کے گورنر جگ موہن نے ایک ''مجاہد'' شوکت بخشی کے اس اقبالی بیان کو کہ اس نے میری ہدایت پر کشمیر میں متعین بھارت کے سرکاری ٹی وی دوردرشن کے ڈائریکٹر لسہ کول اور بھارتی ایئر فورس کے افسروں کو قتل کیا، امریکی حکومت پر دباؤ ڈالا کہ وہ مجھے گرفتار کر کے بھارت کے حوالے کرے (میں ان دنوں یعنی اپریل 1990ء میں امریکہ کے دورے پر تھا) اور اس سلسلے میں اس نے اپنے دوست ملک روس کے وزیر خارجہ ایڈورڈ شیورڈ ناڈزے جو ان دنوں امریکہ کے دورے پر تھا سے بھی مدد حاصل کی اور بالآخر امریکہ کے وزیر خارجہ جیمز بیکر سوم کو مجبور کیا کہ وہ اپنے خصوصی اختیارات کو بروئے کار لا کر میرا امریکہ کا ملٹی پل (Multiple) ویزا منسوخ کرے۔ اسکے ساتھ ہی بھارتی حکومت نے میری گرفتاری کے احکامات جاری کرنے کیلئے نیویارک کی عدالت سے بھی رجوع کیا لیکن عدالت کی طرف سے احکامات جاری ہونے سے پہلے ہی میں اپنے پروگرام کے مطابق امریکہ چھوڑ چکا تھا اسلئے گرفتار نہ ہو سکا۔

بھارت نے متذکرہ بالا بے بنیاد الزامات کے تحت ہی میرے خلاف انٹرنیشنل پولیس (انٹرپول) سے انٹرنیشنل وارنٹ گرفتاری (Red Notice) جاری کروائے جس کی وجہ سے اسلام آباد میں دنیا کے کسی ملک کا سفارتخانہ مجھے ویزا جاری نہیں کرتا۔ جس کے نتیجے میں میں عالمی سطح پر اپنی تحریک اور نظریہ کے لئے کوئی موثر کام نہیں کر سکتا۔ اکتوبر 1993ء میں یورپین پارلیمنٹ کے سوشلسٹ گروپ نے مجھے برسلز میں ہونے والی کشمیر کانفرنس میں شرکت کیلئے مدعو کیا اور بیلجیئم کے سفارتخانے نے (غالباً سہواً) مجھے ویزا جاری کیا۔ میں نے کانفرنس میں مسئلہ کشمیر کو پرامن، منصفانہ اور مستقل طور پر حل کرنے کیلئے ٹھوس تجاویز پیش کیں اور ساتھ ہی بھارتی مقبوضہ کشمیر کے سابق وزیر اعلےٰ فاروق عبداللہ سے اکیلے میں تفصیلی ملاقات کی تو برسلز میں بھارتی سفارتخانہ حرکت میں آ گیا اور اس نے اسی رات (18 اکتوبر 1993ء کو)

میرے خلاف بھارتی حکومت کے اقدامات کی چند مثالیں

The News Int. Nov. 6, 1993

India asks Belgium to extradite Amanullah

Dawn March 26, 1998

UK refuses to revoke deportation order against JKLF chief

The News Int. Nov. 6, 1993

India Warns Pak on Amanullah's move

Irate India blasts Belgian release of JKLF leader

SAUDI GAZETTE Dec. 31, 1993

NEWS INDIA! N.Y. June 2, 1990

Nations Urged to deny entry to Amanullah

NEW DELHI. June 1: India has formally requested several coun-tries not to allow entry to Amanullah Khan. Chief of the outlawed Jammu and Kashmir Liberation Front (JKLF) reports UNI.

Official sources said here today that the external affairs ministry had recently approached more then 12 countries most of them developed nations, where Khan was likely to go for mobilizing international opinion and funds to further his secessionist objectives.

Khan is presently in Pakistan from where he has issued several inflammatory statements during the past one week.

The countries approached by the external affairs ministry include Canada, West Germany, France, the Netherlands and a west Asian country.

The sources pointed out that the response of the United States and the United Kingdom, is already "very positive" in this regard.

DAILY NAWA-I-WAQT, SUNDAY, FEBRUARY 13, 1994

نوائے وقت

اتوار، 9 ذوالقعدہ الحرام، 1424، 20 جنوری 2003ء

ایمان اللہ خان کے

شدرا ہے

پاسپورٹ کی تنسیخ

ایل او سی کی ایک خبر کے مطابق جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ کے چیئرمین امان اللہ خان کو حکومت پاکستان نے نہ صرف "ایگزٹ کنٹرول لسٹ" پر رکھا ہوا ہے اور انہیں ملک سے باہر جانے کی اجازت بھی نہیں، بلکہ گذشتہ دنوں ان کے پاکستانی پاسپورٹ کی مدت ختم ہو گئی تو نیا پاسپورٹ بھی جاری نہیں کیا گیا۔ ہم نے مسئلہ کشمیر پر امان اللہ خان کے موقف کی ہمیشہ تائید کی ہے کیونکہ خود مختار کشمیر کا نعرہ پاکستان اور کشمیری عوام کے مفاد میں نہیں، لیکن ایک کشمیری لیڈر کی حیثیت سے انہیں پاکستان میں آزادانہ طور پر سیاسی حقوق حاصل ہیں، ان پر یہ پابندی عائد کرنا دستور اور قانون کے خلاف ہے۔ بھارت جب آئل ہائی جیکنگ کیس میں کشمیری لیڈروں کو پاکستان آنے کی اجازت نہیں دیتا تو ہم اس کی کھلی نکتہ چینی کرتے ہیں۔ ایل او سی میں بھارت نے سردار عبدالقیوم اور امان اللہ خان کے وفد کو فی سبیل پاکستان جانے کی اجازت دے دی لیکن جنیوا طائے ہوئے وفد کو جس کی تجارت جنیوا سے روانہ ہونے والے تھے، پاکستان آنے کی اجازت نہیں دی۔ بھارت کا رویہ کشمیریوں کے علاوہ اس کی مسلمان دشمنی پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے لیکن پاکستان نے آپ سردار امان اللہ خان کے مسئلے میں اختیار کیا ہے وہ ہے ہر لحاظ سے قانون اور پاکستان کی کشمیر پالیسی اور عمل قرنی کے خلاف قرار دیا جائے گا۔ امان اللہ خان تحریک کشمیر کے ایک اہم لیڈر ہیں، ان کے خیالات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن انہیں بلا وجہ "ایگزٹ کنٹرول لسٹ" کا بہانہ بنا کر نیا پاسپورٹ جاری نہ کرنا، حکومت کی ہر اپابندی ہے، جس کا فوری نوٹس ضروری ہے۔ بہتر ہے کہ نئے پاسپورٹ کے اجراء کو "ایگزٹ کنٹرول لسٹ" کے ساتھ منسلک کر دیا جائے جبکہ پاسپورٹ حاصل کرنا ہر شہری کا حق ہے۔ حکومت فی الفور امان اللہ خان کو پاسپورٹ جاری کرے اور ایگزٹ کنٹرول لسٹ سے ان کا نام خارج کرے۔

JKLF chief's name put on ECL

RAWALPINDI (Online): The government has put the name of Amanullah Khan Chairman Jammu Kashmir Liberation Front (JKLF) on Exit Control List (ECL) banning his travel abroad, a press release issued by the Front Friday said.

It may be recalled that the government of India also got Red Notice (International warrant of arrest) issued against him by Interpol in 1990 under which Amanullah Khan was arrested in Belgium in October 1993 where he had been invited by European Parliament to participate in a Round Table Discussion on Kashmir arranged by a group in EP.

Indian government asked for his extradition to India but the Belgian Court rejected Indian demand and sent him to Pakistan after he had spent about two and a half months in prison in Brussels.

Expecting an invitation for the participation in Kashmir Conference to be held in Washington on July 24-25, Amanullah Khan realized that his passport was to expire on July 19, 2003 so he paid urgent fee of Rs 4000 on July 16, applied for a new passport and was asked to take it the next day, the press release said.

On July 17, he was told by the passport office authorities that since the government of Pakistan had put his name on the ECL, he could not get a passport. His current passport had also been cancelled, it added.

بروں ہیڈ کشمیر لبریشن فرنٹ کے چیئرمین امان اللہ خان نے کہا ہے کہ یہ پاکستان کی خود غرضی ہے جو کشمیر کو اپنا حصہ بنا کر رکھنا چاہتا ہے۔ حالانکہ کشمیری اپنے ملک کو خود مختار دیکھنا چاہتے ہیں۔

جناب امان اللہ خان نے تھرڈ آپشن کا نعرہ لگا رکھا ہے حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ برصغیر پاک و ہند کے مستقبل کا فیصلہ ٹو نیشن تھیوری کے اصول پر ہوا تھا۔ سب سے پہلے تھرڈ آپشن کا نعرہ خان عبدالغفار خان نے لگایا تھا جسے بھارت کی حمایت بھی حاصل تھی لیکن قائد اعظم نے اسے ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ امان اللہ خان اگر خود مختار کشمیر کے حامی ہیں تو وہاں جا کر رہیں وہ کہاں کے پتے تو پاکستان کا ہیں لیکن نعرہ خود مختار کشمیر کا لگاتے ہیں وہ تھرڈ آپشن کا نعرہ لگا کر اہل پاکستان کے لئے بد آستین ثابت ہو رہے ہیں۔ خدانخواستہ اگر ان کا خواب شرمندہ تعبیر ہو گیا تو یہ خود مختار کشمیر کے شیخ عبداللہ ثابت ہوں گے۔ کیا وہ پاکستان کی بین الاقوامی سرحد کی لائن آف کنٹرول کو مستقل کرنا چاہتے ہیں؟

جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ کے چیئرمین جناب امان اللہ خان نے جو عید کارڈ جاری کیا ہے اس میں اہل کشمیر اور اہل پاکستان کو مختلف طریقے سے عید مبارک لکھا گیا ہے۔ عید کارڈ کے ایک طرف وہ لکھتے ہیں کہ ہم بھارتی مقبوضہ کشمیر آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان میں مقیم اپنے ہموطنوں کو خلوص کی ایک گہری عید مبارک پیش کرتے ہیں دوسرے صفحے پر وہ کہتے ہیں کہ ہم مملکت پاکستان کی سلامتی کے لئے دست بدعا ہیں اور اپنے پاکستانی بھائیوں کو عید مبارک کہتے ہوئے ان سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ کشمیریوں کے لئے خود اذیت کوشی تک جدوجہد کر کے دنیا کی نظروں میں اپنے آپ کو بھارتیوں کی سطح پر نہ لائیں۔ اس میں پاکستانیوں کی بھلائی بلکہ کشمیریوں کی بھی۔

خدا کا شکر ہے کہ انہوں نے آزاد کشمیر کو بھارتی مقبوضہ کشمیر کی طرح پاکستانی مقبوضہ کشمیر نہیں لکھا ورنہ آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان والوں کو خلوص کی عید مبارک دینے کا مطلب یہی ہے کہ بھارت کی طرح پاکستان نے بھی کشمیر کے ایک حصے پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جناب امان اللہ خان پاکستان میں رہتے اور اس کے وسائل سے مستفید ہوتے ہیں اور نعرے بھی ایسے ہی دیتے ہیں۔ اہل پاکستان کی مہمان نوازی کے وارے والے بائیں جنہوں نے اپنی آستین میں نہ صرف سانپ پال رکھے ہیں بلکہ انہیں دودھ بھی

نظریہ خود مختار کشمیر کا علمبردار ہونے کی پاداش میں جن حالات سے گزرنا پڑا ان کی ایک جھلک

مجھے انٹرپول سے گرفتار کروایا اور میں تقریباً اڑھائی ماہ برسلز جیل میں رہا۔ اسی دوران بھارت نے بیلجیم حکومت سے مطالبہ کیا کہ مجھے بھارت کے حوالے کر دیا جائے لیکن بیلجیئم کی عدالت نے انٹرپول کے ہاتھوں میری گرفتاری اور مجھے بھارت کے حوالے کرنے کے بھارتی مطالبے کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ میرے خلاف بھارت اور انٹرپول کے استدلال انتہائی کمزور ہیں اور مجھے رہا کر کے کراچی آنے والے جہاز پر بٹھا دیا گیا۔

کراچی واپس پہنچنے کے بعد میں نے بیلجیئم کی عدالت کے فیصلے اور مقبوضہ کشمیر کے گورنر جگ موہن کی کتاب (My Frozen Turbulance in Kashmir) کے مندرجات کی روشنی میں (جگ موہن نے لکھا ہے کہ کس طرح انہوں نے شوکت بخشی سے اقبالی بیان حاصل کیا تا کہ امریکہ میں بھارت کے خلاف آگ اگلنے اور زہر پھیلانے والے امان اللہ خان کی زبان بند کی جائے) جو اس بات کا اعتراف تھا کہ میرے خلاف بھارتی اقدامات سیاسی بنیاد پر تھے اور سیاسی بنیاد پر لگائے گئے الزامات کو انٹرپول کسی شخص کے خلاف وارنٹ گرفتاری کے اجراء کی بنیاد نہیں بنا سکتی اسلئے میں نے انٹرپول سے مطالبہ کیا کہ میرے خلاف بے بنیاد الزامات کی بنیاد پر جاری کئے گئے وارنٹ منسوخ کئے جائیں تو انٹرپول نے بھارت، پاکستان اور بیلجیئم کی حکومتوں کو میری درخواست پر رائے دینے کیلئے لکھا تو بیلجیئم کی حکومت نے اسے لکھا کہ ہم نے امان اللہ خان کو بھارت کے حوالے اسلئے نہیں کیا کہ بھارت کا کیس انتہائی کمزور تھا اور ساتھ ہی یہ خطرہ بھی تھا کہ اسے بھارت میں پھانسی دے دی جائے گی۔ بھارتی حکومت نے میرے خلاف دہشت گردی اور قتل و غارت کے بے شمار الزامات لگا کر اور ان کی بھارت کی سپریم کورٹ سے تصدیق کرا کے انٹرپول کو بھیجے۔ پاکستان سے جواب کا کئی ماہ انتظار کرنے اور یاد دھانیاں کرانے کے باوجود جب کوئی جواب نہیں ملا تو انٹرپول نے صورت حال سے دنیا بھر کی حکومتوں کو آگاہ کر دیا کہ بھارت نے میرے خلاف وارنٹ واپس لینے سے انکار کیا ہے۔

اگر پاکستان انٹرپول کے خط کا مناسب جواب دیتا تو میرے وارنٹ منسوخ ہو سکتے تھے لیکن پاکستان نے ایسا نہیں کیا چنانچہ وارنٹ نافذ رہے۔ میرے ساتھ پاکستان کی ایجنسیوں کا برتاؤ بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں رہا۔ جنرل محمد ضیاء الحق کی وفات کے بعد خاص کر پیپلز پارٹی کی حکومت کی آمد کے بعد آئی ایس آئی کا رویہ بالکل بدل گیا۔ سب سے پہلے تو اس نے مقبوضہ کشمیر سے تربیت کے لئے آزاد کشمیر آنے والے مذہبی ذہن اور پاکستان سے عقیدت رکھنے والے نوجوانوں کو یہ تاثر دیا کہ امان اللہ خان پاکستان مخالف ہے، دھریہ ہے، کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا، ملاقات کے خواہشمندوں کو دو دو گھنٹے انتظار کراتا ہے، تحریک سے مخلص نہیں اور تحریک کے نام پر اس نے خوب جائیداد بنائی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس بات کے مجھے ثبوت بھی ملے۔ ایک بار مقبوضہ کشمیر کا ایک نوجوان مجھ سے ملنے آیا۔ پہلے کمرے میں حجازی صاحب ملے اس نے مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ حجازی صاحب نے مجھ سے کہا پار کا ایک نوجوان ملنے آیا ہے۔ میں نے کہا اسے اندر بھیج دیں۔ نوجوان اندر آیا تو میں اُٹھ کر گلے ملا اور اسے بیٹھنے کو کہا لیکن وہ

کھڑا رہا اور ٹکٹکی باندھ کر مجھے دیکھتا رہا جیسے اسے کسی بات کا یقین نہ آ رہا ہو۔ میں نے اس سے پھر بیٹھنے کو کہا اور حیرانگی کی وجہ پوچھی (کشمیری زبان میں) تو اس نے کہا ہمیں تو بتایا گیا تھا کہ آپ ملاقات کے لئے دو دو گھنٹے انتظار کراتے ہیں۔ کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتے، شراب میں دھت رہتے ہیں جبکہ میں نے یہاں ان میں سے کوئی بات نہیں دیکھی۔ میرے خلاف یہ زہریلا پروپیگنڈا نوجوانوں کو مجھ سے اور نتیجتاً میرے نظریئے سے متنفر کرنے کیلئے کیا جاتا رہا۔ ابتداء میں حزب المجاہدین والوں اور بھارتی مقبوضہ کشمیر کی جماعت اسلامی نے بھی میرے خلاف یہ پروپیگنڈا کیا۔ کئی عسکری تنظیموں پر مشتمل اور آئی ایس آئی کے زیر اثر شورائے جہاد (سرینگر) نے وادیٔ کشمیر کے اخباروں کو دھمکی دی کہ اگر انہوں نے امان اللہ خان یا اس کی تنظیم کا کوئی بیان شائع کیا تو شورائے جہاد اس کے خلاف کارروائی کریگا۔ یہاں تک کہ آئی ایس آئی کی ماؤتھ پیس دختران ملت نے بھی اس دھمکی کی تائید کی۔ چنانچہ تقریباً سوا سال (98-1997ء) تک ہمارا کوئی بھی بیان یا خبر سرینگر کے اخبارات میں شائع نہیں ہوئے۔

مجھے پاکستان کے سرکاری ذرائع ابلاغ (ٹی وی، ریڈیو) نے 1992ء سے ہی بلیک لسٹ کیا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ میاں نواز شریف کی حکومت کے دوران ایک بار انہوں نے کشمیری سیاسی تنظیموں کے سربراہوں کو ملاقات کے لئے بلایا۔ میں نے شیخ رشید احمد جو ان کے وزیر اور میرے شناسا تھے کے ذریعہ میاں صاحب سے کہلوایا کہ دوسروں کو ان سے آزاد کشمیر کی اقتداری سیاست کے بارے میں بات کرنی ہوگی۔ میں تحریک آزادی کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں اسلئے مجھے الگ ملاقات دیں۔ پہلے تو آئی ایس آئی نے تین بار میرا نام مدعوئین کی فہرست سے خارج کرایا۔ جب بالآخر میں میاں صاحب سے ملنے میں کامیاب ہو گیا تو وزیر اطلاعات کے بار بار کے اصرار کے باوجود پی ٹی وی نے (ظاہر ہے آئی ایس آئی کے حکم پر) وزیر اعظم سے میری ملاقات کو بلٹن سے خارج کر دیا جبکہ دوسری تمام پارٹیوں کے سربراہوں کی ملاقات کی رپورٹ تفصیل سے دکھائی۔ مجھ سے متعلق خبر غلطی سے یا لاعلمی سے ٹیلی کاسٹ کرنے پر ایک بار پی ٹی وی کے کچھ اہلکار ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھنے سے بال بال بچے۔ بہرحال بارہ سال بعد پی ٹی وی نے مجھے وسط دسمبر 2004ء میں ایک پروگرام میں شرکت کی دعوت دی۔

میرے اور میری تنظیم کے چند اقدامات خصوصاً مسلح جدوجہد آزادی کے آغاز، کشمیر میں جنگ بندی لائن پر چار جرأت مندانہ اور اعلانیہ حملوں اور میری بیلجیئم میں گرفتاری نے مسئلہ کشمیر کو عالمی سطح پر اتنا اونچا اجاگر کیا تھا جتنا پاکستان کی وزارتِ خارجہ اربوں کھربوں روپے خرچ کر کے بھی نہ کر سکی تھی۔ بھارت اس بات پر بضد تھا کہ مسئلہ کشمیر کوئی بین الاقوامی مسئلہ نہیں بھارت اور پاکستان کے مابین ایک دوفریقی مسئلہ ہے لیکن فروری 1992ء میں تقریباً پندرہ ہزار افراد کے ساتھ جنگ بندی لائن کی طرف ہمارے مارچ نے بھارت کو مجبور کیا کہ وہ بڑی طاقتوں سے مدد مانگ کر خود ہی مسئلے کو انٹرنیشنلائز کرے۔ 1993ء میں بیلجیئم میں پاکستان کے سفیر جناب رفعت مہدی کا کہنا تھا کہ میری برسلز جیل میں اسیری کے دوران بھارتی سفیر سفارت خانوں کی تقریبات میں بھی شرکت نہیں کرتا تھا اسلئے کہ ان اجتماعات کے دوران

سفارتکار اس سے پوچھتے کہ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہونے کے دعویدار بھارت نے ایک کشمیری کو وہ آزادی مانگنے پر جسکے کشمیری مستحق ہیں اور جسکا ان سے پاکستان اور عالمی برادری کے علاوہ خود بھارت نے بھی وعدہ کیا تھا، دہشت گردی کا الزام دیکر انٹرپول سے گرفتار کرایا ہے آزادی مانگنے والے حریت پسندوں پر اس قسم کے الزام لگانا تو سابقہ نوآبادیاتی طاقتوں کا شیوہ تھا۔

درج بالا حقائق کے باوجود حکومت پاکستان نے (آئی ایس آئی کے ایما پر) دوبار میرا نام ان لوگوں کی فہرست میں شامل کر دیا جس پر پاکستان سے باہر جانے پر پابندی عائد ہوتی ہے۔ یہ پابندی ان لوگوں پر لگائی جاتی ہے جنہوں نے حکومت پاکستان کے کسی سطح کے اہلکار کی حیثیت سے یا کسی کے ذریعے رقوم خرد برد کی ہوں یا سرکاری خزانے کو نقصان پہنچایا ہو۔ میں نصف صدی قبل یعنی 54-1953ء کے دوران چند ماہ محکمہ مردم شماری اور چند ماہ محکمہ ڈاک میں کلرک کے عہدے کے علاوہ کبھی بھی حکومت کا کسی سطح کا ملازم نہیں رہا اس لئے کرپشن کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مجھ پر یہ پابندی صرف اس لئے لگائی گئی کہ میں بیرون ملک جا کر اپنے نظریئے کا پرچار نہ کر سکوں مجھ پر پہلی بار یہ پابندی غالباً 1992ء میں یا اس سے پہلے لگی لیکن مجھے اس کا علم اکتوبر 1993ء میں ہوا جب میں نے یورپین یونین کی دعوت پر کوپن ہیگن جانے کے لئے اپنے پاسپورٹ کی تجدید کرانی چاہی تو مجھے بتایا گیا کہ میرا نام ایگزیٹ کنٹرول لسٹ پر ہے۔ اس لئے مجھے پاسپورٹ جاری نہیں کیا جا سکتا۔ جس پر میں نے پاکستان کے عبوری وزیر خارجہ جناب عبدالستار سے رجوع کیا۔ عبدالستار صاحب کشمیر میں مسلح جدوجہدِ آزادی کے ابتدائی دور میں بھارت میں پاکستان کے ہائی کمشنر تھے اس لئے وہ تحریک آزادی میں میرے کردار سے خاصے واقف تھے۔ چنانچہ انہیں یہ سن کر بہت تعجب بلکہ دکھ ہوا کہ مجھ سے پاکستان میں یہ برتاؤ ہو رہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے کوشش کر کے مجھ سے یہ پابندی ہٹوائی (بعد میں وہ بھی خاصی حد تک پاکستان کی افسر شاہی کے رنگ میں رنگے گئے)۔ جولائی 2003ء میں امریکہ میں مسئلہ کشمیر پر ایک اہم سیمینار ہونے والا تھا اور مجھے امید تھی کہ اس میں میں بھی مدعو ہونگا لیکن میرے پاسپورٹ کی میعاد ختم ہونے والی تھی چنانچہ میں نے پاسپورٹ کی تجدید کے لئے ارجنٹ فیس (چار ہزار روپے) ادا کی۔ مجھے دوسرے دن پاسپورٹ لینے کے لئے کہا گیا لیکن جب میں دوسرے دن پاسپورٹ لینے کیلئے گیا تو پاسپورٹ آفیسر کے پاس سول کپڑوں میں ایک فوجی (آئی ایس آئی والا) بیٹھا تھا جس کے ہاتھ میں میرا نیا پاسپورٹ تھا۔ اس نے مجھے کہا کہ آپ پاکستانی پاسپورٹ کے حقدار نہیں ہیں کیونکہ آپ کا نام ان لوگوں کی فہرست (Exit Control List) پر ہے جنکے پاکستان سے باہر جانے پر پابندی ہے۔ اس افسر نے یہ بتانے سے انکار کیا کہ مجھ پر یہ پابندی کب اور کیوں لگی۔ پاسپورٹ ضبطی کی وجہ سے میں 11 سے 14 دسمبر 2004ء تک کھٹمنڈو میں ہونے والی انٹرا کشمیر کانفرنس میں مدعو ہونے کے باوجود شرکت نہ کر سکا۔

یہ ہے وہ برتاؤ جو حکومت پاکستان خاص کر اس کی آئی ایس آئی مجھ سے کرتی رہی ہے۔ اگر میں چاہتا تو اس سلوک کو عالمی سطح پر اجاگر کر سکتا تھا۔ لیکن میں نے ایسا نہیں کیا اس لئے کہ اس سے عالمی سطح پر

مملکت پاکستان کی ساکھ داغدار ہو جاتی جبکہ میرے خلاف یہ سیاہ کاری صرف اس ایجنسی کا کام ہے جس نے اپنی حماقتوں سے افغانستان کو تباہ کرایا اور اب تحریکِ آزادی کشمیر کو تباہی کے دہانے پر لے آئی ہے۔ پاکستان کے عوام کا جو مملکت پاکستان کا اہم ترین ستون ہیں اس میں کوئی دوش نہیں۔ اگر آزاد کشمیر کے کسی اور لیڈر یا حریت کانفرنس والوں کے خلاف پاکستان کا آئی ایس آئی اور اس کے سرکاری ذرائع ابلاغ وہ برتاؤ کرتے جو میرے ساتھ کرتے رہے ہیں تو معلوم نہیں وہ کیا کچھ کرتے۔ آئی ایس آئی ذرا آزما کر تو دیکھے۔

الغرض بھارت اور پاکستان کی ایجنسیوں کا مجھ سے سلوک انتہائی ناروا رہا ہے۔ میرا قصور صرف یہ ہے کہ میں خلوص دل سے یہ سمجھتا ہوں کہ بھارت، پاکستان اور کشمیریوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ منقسم ریاست جموں کشمیر کو دوبارہ متحد کر کے ایک ایسی آزاد اور خودمختار مملکت بنایا جائے جسکے بھارت اور پاکستان دونوں سے دوستانہ تعلقات ہوں۔ اسطرح تینوں کے سر پر لٹکتی تیسری پاک بھارت جنگ کی تلوار ہٹ جائے گی اور ان کیلئے ایک پرامن اور خوشحال مستقبل کا دروازہ بھی کھل جائے گا لیکن بھارت اور پاکستان کی ایجنسیاں شاید یہی چاہتی ہیں کہ کشمیری پستے رہیں اور بھارت اور پاکستان بھی ایک دوسرے کے خلاف صف آراء رہیں۔

7- تحریک آزادیٔ کشمیر میں میرے رشتہ داروں کا کردار

تحریک آزادیٔ کشمیر کے سلسلے میں اگرچہ میرے خاندان اور عزیز و اقارب میں سب سے طویل کردار خود میرا رہا ہے لیکن میرے عزیز و اقارب نے بھی اس میں مقدور بھر حصہ لیا ہے جبکہ دو نے تو تحریک پر اپنی جانیں بھی قربان کر دیں۔ ان میں سے پہلے میرے چچازاد بھائی شہید عبدالجمیل تھے جو 1948ء میں گریز میں بھارتی فوج کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔ عبدالجمیل کا نام گلگت کے چنار باغ میں قائم یادگار شہدا پر کندہ کئے گئے 1948ء کے شہدائے آزادی کے ناموں میں شامل ہے۔ شہید عبدالجمیل میرے چچا اکبر خان کے تیسرے بیٹے اور مجھ سے چند سال بڑے تھے۔

دوسرے شہید آزادی میرے بھانجے شہید الطاف علی خان آف ہائی ہامہ ضلع کپواڑہ (بھارتی مقبوضہ کشمیر) ہیں جنہیں بھارتی فوج نے اپریل 1990ء میں اپنے گاؤں میں شہید کیا بھارتی فوج کی نظر میں الطاف علی خان کا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ وہ میرا بھانجا تھا اور اسی رشتہ داری کی وجہ سے الطاف علی خان کے پورے خاندان پر عتاب نازل ہوتا رہا اور الطاف علی خان کی شہادت کے موقع پر بھی خاندان والے شدید عتاب سے گذرے۔ اس سے قبل 1966ء میں وہ اور ان کے بہنوئی رستم علی خان ہماری تنظیم نیشنل لبریشن فرنٹ (این ایل ایف) کے مقبول بٹ اور میجر امان اللہ خان (میجر امان اللہ خان بھی الطاف علی خان کے بہنوئی تھے) کے ساتھی ہونے کے الزام میں گرفتار ہو کر تقریباً چار سال تک سرینگر اور ریاست کے دوسرے جیلوں میں پابند سلاسل رہے تھے۔ 48-1947ء کی جنگ آزادی میں میرے بہنوئی ماسٹر

ہاشم علی خان کے خاندان والوں خاص کر میجر امان اللہ خان نے (جو دوسری جنگ عظیم کے دوران سبھاش چندر بوس کی انڈین نیشنل آرمی (INA) میں شامل ہو گئے تھے 1947ء میں آزاد فورسز میں شامل ہوئے 1964ء میں میجر کے عہدے سے ریٹائر ہو کر ہماری تنظیم این ایل ایف کے عسکری شعبے کے پہلے سربراہ بنے) اپنے علاقے ہائی ہامہ سے تحریک مزاحمت شروع کی اور یہ علاقہ خاصی مدت تک ان کے کنٹرول میں اور بھارتی فوج سے آزاد رہا لیکن بعد میں بوجوہ بھارتی فوج کا قبضہ ہو گیا۔

میرے خاندان کے دوسرے افراد نے بھی تحریک آزادی میں بھرپور کردار ادا کیا۔ میرے ماموں زاد بھائی محمد اسماعیل خان جو ریاستی پولیس کے ایک اہم عہدے پر سرینگر میں تعینات تھے نے ڈوگرہ شخصی راج سے بغاوت کر کے استور کی سول انتظامیہ سنبھالی جس نے حریت پسندوں کے لئے ضروریات خاص کر خوراک بار برداری کا انتظام کیا اس کام میں میرے سسر عبدالحمید خان خاور جو استور میں پولیس کے سربراہ تھے، میرے بہنوئی گرداور نعمت خان ریٹائرڈ آفیسر عبدالغنی، منشی نعمت خان، ماسٹر فرض خان، منشی عنایت خان، چچازاد بھائیوں افضل خان، عنایت خان، حاجی صاحب خان، بھانجے مولوی محمد صدیق، ہرچو کے صفت خان اور مراد خان میرے پھوپھی زاد محمد عبداللہ، عبدالخالق اور ہوپک کے ماموں محمد عیسیٰ نے اہم کردار ادا کیا۔ میرے سسر عبدالحمید خاور کے ساتھ ان کے دوست اور رشتہ دار وزیر علی رضا مرحوم نے بھی بھرپور مدد کی۔ میرے خالہ زاد بھائی مولوی عبدالمنان مقامی حریت پسندوں کے ساتھ محاذ جنگ پر رہے اور انہیں جہاد کی اہمیت اور اس سے متعلق اسلام کے مقرر کردہ قواعد وضوابط سمجھاتے رہے۔ 1971ء میں گلگت جیل میں میرے ساتھ قید 48-1947ء کی جنگ آزادی کے ایک ہیرو مرحوم صوبیدار صفی اللہ بیگ نے مجھے بتایا کہ اگر 48-1947ء میں استور کی عوامی سول انتظامیہ (جس کے سربراہ میرے ماموں زاد بھائی محمد اسماعیل خان تھے) اور وہاں کے عوام مجاہدین آزادی کی وہ مدد نہ کرتے جو انہوں نے کی تو یقیناً سارا علاقہ 1948ء میں ہی بھارت کے قبضے میں چلا جاتا۔ میرے اپنے خاندان کے افراد کے علاوہ اکتوبر 1947ء میں گلگت میں ڈوگرہ راج کے خلاف کامیاب بغاوت میں میرے سسر کے بڑے بھائی ڈاکٹر نگین آف ڈموٹ اور میری بھانجی کے شوہر محمد ظل اللہ خان آف بونجی نے اہم کردار ادا کیا۔ میرے ایک قریبی عزیز میجر عبدالوہاب نے فوجی ملازمت کے دوران اپنی قابل رشک عسکری کارکردگی کا مظاہرہ کرنے کے علاوہ 1999ء میں کرگل کے محاذ پر مثالی بہادری اور پیشہ ورانہ مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے جام شہادت نوش کیا جس کی بنیاد پر متعلقہ حلقے اُسے پاکستان کے سب سے بڑے فوجی اعزاز ''نشان حیدر'' کا پوری طرح مستحق قرار دے رہے تھے لیکن ایک ٹیکنیکی نقطہ آڑے آیا۔ ہوسکتا ہے میری رشتہ داری بھی آڑے آئی ہو۔ چنانچہ اسے نشانِ حیدر سے کم تر ستارۂ جرأت کا ہی اعزاز دیا گیا۔ شہید پہلے بھی میرا عزیز ہونے کی خاصی قیمت ادا کر چکا تھا۔

الغرض میرے خاندان کے افراد اور دوسرے عزیز واقارب نے بھی تحریک آزادیٔ کشمیر میں اہم کردار ادا کیا ہے اور قربانیاں دی ہیں۔

8- دو دلچسپ اور سبق آموز حقیقتیں

ریاست جموں کشمیر اور تحریک آزادئ کشمیر سے متعلق دو حقیقتیں خاصی دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔ پہلی حقیقت یہ ہے کہ ہماری تحریک آزادی کی طویل تاریخ میں درجنوں ایسے واقعات شامل ہیں جہاں کسی شخص یا اشخاص کی لمحوں، گھنٹوں، دنوں یا ہفتوں پر محیط غفلت، غلط اندازے یا خودغرضی پر مبنی اقدامات نے کشمیر کی تاریخ کو ایک خاص رخ دیدیا۔ دوسری حقیقت یہ ہے کہ جس کسی بھی صاحب اختیار شخص نے خواہ وہ ریاستی باشندہ تھا یا غیر ریاستی، کشمیریوں کی حق تلفی کی یا کرنے کی کوشش کی اس کا انجام عبرتناک ہوا۔ آیئے ذرا تفصیل میں جائیں۔

(ا) لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی

1- برصغیر کی تقسیم اور کشمیر کے بھارت اور پاکستان کے مابین ایک مسئلے کی شکل اختیار کرنے کے کچھ مدت بعد ہی بھارت کے طاقتور نائب وزیراعظم سردار پٹیل نے پیش کش کی تھی کہ اگر پاکستان ہندو اکثریتی ریاستوں حیدرآباد دکن اور جونا گڑھ کے مسلمان نوابوں کی بھارت مخالف سرگرمیوں (حیدرآباد کا نواب مکمل خودمختاری کا اعلان کرنا چاہتا تھا اور جونا گڑھ کا نواب پاکستان سے الحاق کرنا چاہتا تھا جبکہ ان میں سے کوئی ریاست پاکستان سے ملحق بھی نہیں تھی) میں ان کی حوصلہ افزائی کرنا ترک کرے تو بھارت ریاست جموں کشمیر پر اپنے دعوے سے دستبردار ہونے کو تیار ہے۔ لیکن پاکستان کے اس وقت کے انتہائی طاقتور۔ خودغرض اور ضدی وزیرخزانہ ملک غلام محمد (جس نے بقول مرحوم سردار محمد ابراہیم خان ایک بار قائدِ اعظم محمد علی جناح کی صدارت میں ہونے والے ایک اجلاس میں کسی بات پر غصے میں فائل میز پر دے ماری تھی اور بڑبڑاتا ہوا کمرے سے نکل گیا تھا) ریاست حیدرآباد سے منسلک اپنے ذاتی مالی مفاد کی وجہ سے بھارتی پیشکش مسترد کرادی۔ اگر یہ بھارتی پیشکش مسترد نہ ہوتی تو کشمیر (اور پاکستان دونوں) کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔

2- پاکستان کے قبائل جن کے ساتھ خاصی تعداد میں پاکستانی فوج کے افسر اور جوان بھی (سول کپڑوں میں) تھے 26 اکتوبر 1947ء کو (بھارتی فوج کے سرینگر ہوائی اڈے پر اترنے سے ایک دن پہلے) سرینگر ائرپورٹ سے صرف چند میل کے فاصلے تک پہنچ گئے تھے۔ اگر وہ اسی دن صرف چند میل مزید آگے بڑھ کر خالی ائرپورٹ پر قبضہ کر کے اسے ناقابل استعمال بنا دیتے تو بھارتی فوج سرینگر نہیں اتر سکتی تھی جسکے نتیجے میں کشمیر کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔

3- 18 جولائی 1947ء کو آل جموں کشمیر مسلم کانفرنس کی مرکزی مجلس عاملہ نے اپنے اجلاس

منعقدہ سرینگر میں قائداعظم محمد علی جناح اور تنظیم کے اسیر صدر چوہدری غلام عباس کی ہدایات اور مشورے کے مطابق پوری ریاست کی مکمل خودمختاری کے حق میں قرارداد منظور کی۔ لیکن دوسرے دن یعنی 19 جولائی 1947ء کو کچھ جوشیلے لیکن کوتاہ اندیش نوجوانوں نے قائم مقام صدر چوہدری حمیداللہ کو دھمکیاں دیکر جنرل کونسل کے اجلاس سے ریاست کے پاکستان سے الحاق کی قرارداد منظور کرائی (ان دھمکیوں کی تصدیق آزاد کشمیر کے سابق سیکریٹری تعلیم مشہور سکالر اور گولڈ میڈلسٹ جناب یعقوب ہاشمی نے 2003ء میں مجھ سے بات چیت کے دوران کی۔ وہ خود 19 جولائی 1947ء کے اجلاس میں موجود تھے۔) اس کے ساتھ ہی مہاراجہ کشمیر کو اخبارات کے ذریعہ دھمکیاں دی گئیں کہ اگر اس نے ریاست کا پاکستان سے الحاق نہ کیا تو ریاست کے مسلمان اس کے خلاف مسلح بغاوت کرینگے۔ مہاراجہ ہری سنگھ اور اس کا وزیراعظم رام چندر کاک ریاست کی مکمل خودمختاری اور بھارت اور پاکستان دونوں سے دوستانہ تعلقات رکھنے کے حامی تھے۔ لیکن مسلم کانفرنس کی قرارداد الحاق پاکستان اور بعد کی دھمکیوں کی وجہ سے مہاراجہ کو ریاست کی خودمختاری کے بارے میں اپنا ارادہ تبدیل کرکے الحاق بھارت کا فیصلہ کرنا پڑا کیونکہ ریاست کا پاکستان سے الحاق خود اس کی اور اسکے حکمران ڈوگرہ خاندان کی سیاسی موت ہوتا۔ اس طرح مسلم کانفرنس نے مہاراجہ کشمیر کو بھارت کی گود میں ڈال دیا۔ اگر مسلم کانفرنس والے اس کوتاہ اندیشی کا مظاہرہ کرنے کی بجائے قائداعظم اور چوہدری غلام عباس کے مشورے اور ہدایات پر عمل کرتے تو کشمیر کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔

4- اگر 26 اکتوبر 1947ء کو کشمیری لیڈر شیخ محمد عبداللہ بھارتی فوج کشمیر بھیجنے سے متعلق بھارت کے وزیراعظم پنڈت نہرو کی غیر مشروط حمایت کرنے کی بجائے اس سے مطالبہ کرتے کہ وہ ریاست جموں کشمیر کو ایک خودمختار مملکت تسلیم کرے (جو آئینی طور پر اس وقت تھی اور پنڈت نہرو اس وقت شیخ صاحب کا یہ مطالبہ تسلیم کرنے پر مجبور تھے) اور اس مملکت اور بھارت کے درمیان ایک دفاعی معاہدے کے تحت اپنی فوج کشمیر بھیجے تو کشمیر کی حیثیت آج بالکل ہی مختلف ہوتی۔

5- اگر پاکستان جنوری 1948ء میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں کشمیر میں اپنی فوج کی موجودگی کے بارے میں غلط بیانی نہ کرتا تو کشمیر کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔

اگر پاکستان کے وزیر خارجہ سر ظفراللہ خان 25 دسمبر 1948ء کو اقوام متحدہ کے کمیشن برائے بھارت و پاکستان سے خط کے ذریعے یہ مطالبہ نہ کرتے کہ کشمیریوں کے حق خودارادیت کو ریاست کے بھارت اور پاکستان سے الحاق تک محدود کیا جائے تو کشمیر کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔

6- بھارتی عوام اور لیڈروں کی بھاری اکثریت یہ سمجھتی ہے کہ اگر پنڈت جواہر لعل نہرو مسئلہ کشمیر کے بارے میں اقوام متحدہ سے رجوع نہ کرتے تو دنیا آج تک حیدرآباد اور جوناگڑھ کی طرح کشمیر کو بھی بھول چکی ہوتی اور کشمیر واقعی بھارت کا اٹوٹ انگ بن گیا ہوتا لیکن پنڈت نہرو کی ''فاش غلطی'' نے مسئلہ کشمیر کو ایک بین الاقوامی مسئلہ بنا دیا۔ اقوام متحدہ نے ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق مہاراجہ کشمیر

سے لے کر کشمیری عوام کو دے دیا اور بھارت کو کشمیر میں رائے شماری کرانے اور اس کے نتیجے کو تسلیم کرنے کا پابند کر دیا۔ مسئلے کی وجہ سے بھارت کو شدید جانی اور مالی نقصان ہونے کے علاوہ عالمی سطح پر اس کی شبیہ بھی مسخ ہوگئی۔ اگر پنڈت نہرو مسئلہ کشمیر کے بارے میں اقوام متحدہ سے رجوع نہ کرتے تو کشمیر کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔

اگر چہ اندرون ریاست علاقائی اور عالمی سطح پر مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی سے متعلق موجودہ صورت حال اور رجحانات خاص کر 6 جنوری 2004ء کا مشترکہ بیان کشمیر کی جبری بندر بانٹ اور ایک تاریک مستقبل کی طرف اشارہ کرتے ہیں لیکن میری چھٹی حس کہتی ہے کہ عین ممکن ہے کہ متذکرہ بالا تمام تلخ وشیریں واقعات بالآخر کشمیر کیلئے ایک درخشاں مستقبل کا باعث بن جائیں گے کیونکہ اگر یہ سب واقعات مسئلہ کشمیر کے مستقل حل کے راستے میں رکاوٹ نہ بنتے تو مسئلہ کشمیر حل تو ہوتا لیکن ایک قابل اطمینان شکل میں نہیں۔ عین ممکن ہے کہ خود میری ذات کے سلسلے میں جس طرح بہت سی زحمتیں بالآخر رحمتوں میں تبدیل ہوگئیں (دیکھئے باب ''اور زحمتیں رحمتوں میں بدلتی گئیں'') اسی طرح متذکرہ بالا رکاوٹیں بھی بالآخر ریاست کے عوام کیلئے ایک خوشحال اور اطمینان بخش مستقبل پر منتج ہونگی۔ گو موجودہ علاقائی اور عالمی حالات ورجحانات کے پیش نظر میری یہ امید خاصی (اور بے جا) خوش فہمی دکھائی دیتی ہے لیکن آج کی انتہائی تیزی سے بدلتی دنیا میں کچھ بھی ہوسکتا ہے۔

(ب) کشمیریوں کے ساتھ زیادتی کرنے والوں کا حشر

ریاست جموں کشمیر اور مسئلہ کشمیر کی گزشتہ ساٹھ سال کی سیاسی تاریخ پر ایک نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت صاف نظر آتی ہے کہ جس کسی با اختیار شخص نے کشمیریوں کے ساتھ زیادتی کی خاص کر انہیں انکے حق خود ارادیت سے محروم کرنے کوشش کی اس کا انجام انتہائی عبرت ناک ہوا خواہ وہ ریاستی باشندہ تھا یا غیر ریاستی۔ اس حقیقت کی سینکڑوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن میں سے صرف دس پیش خدمت ہیں۔

1- مہاراجہ ہری سنگھ برصغیر کی سب سے وسیع ریاست جموں کشمیر کا بلاشرکت غیرے مالک تھا لیکن اس نے ریاستی عوام کی اجتماعی مرضی کے خلاف ریاست کا بھارت سے الحاق کر کے کشمیری عوام کے ساتھ زیادتی کی۔ اسے قدرت کی طرف سے اس زیادتی کی سزا اس طرح ملی کہ وہ ریاست بدر ہو کر اپنی ریاست کو پھر سے ایک بار دیکھنے کیلئے سولہ سال تک تڑپتے رہنے کے بعد بمبئی میں گمنامی کی موت مر گیا۔

2- مرحوم شیخ محمد عبداللہ نے کشمیری عوام کو خواب غفلت سے جگانے اور ان میں سیاسی شعور اور جرأت پیدا کرنے کیلئے سالہا سال تک جدوجہد کی تھی اور مجموعی طور پر تقریباً پندرہ سال کی قید اور جلاوطنی بھی کاٹی تھی۔ 1947ء تک اسے کشمیر کا بے تاج بادشاہ اور بڈشاہ ثانی کہا جاتا تھا۔ لیکن اس نے 1947ء میں کشمیری عوام کے جذبات کو نظر انداز کر کے ریاست کے بھارت سے الحاق کی حمایت کی اور 1975ء

میں دہلی اکارڈ کے ذریعے ریاست کو بھارت کا آئینی حصہ تسلیم کر کے کشمیری عوام کیساتھ زیادتی کی۔ اگر وہ یہ زیادتی نہ کرتا تو وہ کشمیر کی تاریخ میں بڈشاہ ثانی کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہتا۔ لیکن ان غلطیوں کا نتیجہ ہے کہ آج اسکی قبر پر فوجی پہرہ ہے اسلئے کہ اکثر لوگ اسکے غلط فیصلوں کو ہی کشمیریوں کے مصائب کا ذمہ دار گردان کر اسکی قبر کی بے حرمتی کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

3- بخشی غلام محمد شیخ محمد عبداللہ کا دست راست اور نائب وزیر اعظم تھا اس نے اپنے محسن کے ساتھ ہی غداری نہیں کی بلکہ کشمیر پر بھارت کے غاصبانہ تسلط کی جڑیں مضبوط کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ قدرت کی طرف سے اسے یہ سزا ملی کہ اسے انتہائی تضحیک اور تذلیل کے ساتھ اقتدار سے علیحدہ کیا گیا۔ یہی نہیں اکثر لوگوں نے بھی اسکی تجہیز و تکفین میں حصہ لینے سے بھی انکار کیا۔

4- 22 سال کی جدوجہد اور طویل قید و بند کے بعد جدوجہد آزادی کو ''سیاسی آوارہ گردی'' قرار دینے والے صف اول کے کشمیری لیڈر مرزا محمد افضل بیگ زندگی کے آخری سالوں میں اپنوں ہی کے ہاتھوں ذلیل ہو گئے۔

5- بھارتی مقبوضہ کشمیر میں کشمیری حریت پسندوں کو غیر انسانی جسمانی سزائیں (پیٹ اور پیٹھ پر گرم استری پھیرنا، نامرد کر دینا، بجلی کے جھٹکے دینا وغیرہ) دینے والے بدنام زمانہ پولیس آفیسر قادر گاندربلی کے آخر دور زندگی میں (مبینہ طور پر) اسکے بدن میں کیڑے پڑ گئے اور وہ اسی عبرت ناک حالت میں مر گیا۔

6- بھارت کے پہلے طاقتور نائب وزیر اعظم سردار پٹیل نے 1947ء کے اواخر میں ہی پاکستان کو پیشکش کی تھی کہ اگر وہ ریاست حیدرآباد دکن اور جونا گڑھ کے بھارت مخالف حکمرانوں کی حمایت ترک کرے تو بھارت کشمیر سے دستبردار ہو سکتا ہے۔ لیکن پاکستان کے طاقتور وزیر خزانہ ملک غلام محمد (جو بعد میں سازشوں کے ذریعے پاکستان کا گورنر جنرل بھی بن گیا تھا) کے ریاست حیدرآباد میں ذاتی مالی مفادات تھے۔ اسلئے اس نے اس پیشکش کو مسترد کرا دیا جس کے نتیجے میں کشمیر کے بڑے حصے پر بھارت کا قبضہ مضبوط ہو گیا۔ غلام محمد کو اس خودغرضی کی سزا یہ ملی کہ وہ عمر کے آخری حصے میں ہوش و حواس کھو بیٹھا اور اقتدار سے بھی انتہائی تضحیک اور تذلیل کے ساتھ محروم ہو گیا۔

7- پاکستان کے وزیر خارجہ ظفر اللہ خان نے اقوام متحدہ کے کمیشن برائے بھارت و پاکستان (UNCIP) کے نام اپنے 25 دسمبر 1948ء کے خط اور کمیشن کی 5 فروری 1949ء کی قرارداد کے ذریعے کشمیریوں کے حق خودارادیت کو ریاست کے بھارت یا پاکستان سے الحاق تک محدود کرا کے انہیں انکے جائز حق خودمختاری سے محروم کرا دیا۔ کشمیریوں کے ساتھ کی جانے والی اس زیادتی کی سزا سر ظفر اللہ کو یہ ملی کہ وہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے صدر اور عالمی عدالت انصاف کے سربراہ جیسی اعلیٰ حیثیتوں سے گر کر گمنامی کی موت مر گیا۔

8- 2 جولائی 1972ء کا معاہدہ شملہ کشمیر پر بھارت اور پاکستان کے مابین پہلا معاہدہ تھا جس میں نہ تو کشمیریوں کے حق خودارادیت کا کوئی ذکر تھا نہ ہی کشمیریوں کو مسئلہ کشمیر کا فریق تسلیم کیا گیا تھا۔ حتیٰ

کہ ڈیڑھ کروڑ کشمیریوں کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق بھارت اور پاکستان کے حکمرانوں کو دیا گیا تھا جو کشمیریوں کے ساتھ بہت بڑی زیادتی تھی۔ اس زیادتی کی سزا اس معاہدے پر دستخط کرنے والی اندرا گاندھی کو یہ ملی کہ اسکے جسم کو اسکے اپنے باڈی گارڈز نے چھلنی کر دیا اور دوسرے دستخطی ذوالفقار علی بھٹو کو اپنے ہی پروردہ نے تختہ دار پر چڑھا دیا۔

9- 1999ء کے اعلان لاہور کے ذریعہ 1972ء کے بدنام زمانہ معاہدہ شملہ کو عملی جامہ پہنانے کا اعلان کرنے والا میاں نواز شریف بمعہ اہل خانہ جلاوطنی کی قابل رحم زندگی بسر کر رہا ہے۔

10- 6 جنوری 2004ء کے پاک بھارت مشترکہ اعلان میں کشمیریوں کے پیدائشی، عالمی سطح پر تسلیم شدہ اور موعود حق خودارادیت کا کوئی ذکر نہیں۔ انہیں مسئلہ کشمیر کا فریق تک تسلیم نہیں کیا گیا۔ الغرض اس اعلان میں کشمیریوں کو ڈیڑھ کروڑ بھیڑ بکریاں تصور کیا گیا ہے۔ تینوں باتیں کشمیریوں کے ساتھ سراسر ظلم ہیں۔ چنانچہ اس انتہائی ظالمانہ مشترکہ بیان کے ایک دستخط کنندہ سابق بھارتی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی (جو خواب دیکھ رہے تھے کہ وہ دوبارہ وزیراعظم بن کر اور مسئلہ کشمیر کو 6 جنوری کے بیان کے مطابق حل کرا کے تاریخ میں یہ بات نوٹ کرائیں گے کہ جو کام گاندھی اور نہرو جیسے بڑے لیڈر نہ کر سکے وہ کام واجپائی نے کر دکھایا اسلئے وہ ان دونوں سے بڑا لیڈر ہے۔ لیکن کشمیریوں سے ہونے والی زیادتی رنگ لائی اور واجپائی جی) کا نہ صرف وہ خواب چکنا چور ہو گیا بلکہ اقتدار سے بھی محروم ہو گئے۔ اس مشترکہ اعلان کے شریک معمار راجیش مشرا گمنامی میں چلے گئے اور دبنگ وزیر خارجہ یشونت سہنا پارلیمنٹ کی نشست سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس اعلان کے دستخطی اور معمار پاکستانیوں کا کیا انجام ہوتا ہے وقت ہی بتائے گا۔

الغرض جس کسی نے بھی کشمیری عوام سے ان کے اجتماعی حق کے بارے میں زیادتی کی یا آئندہ کریگا اسکا انجام ماضی میں بھی عبرتناک ہوا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔ انشاء اللہ۔ بہرحال ہم تو فرزندِ کشمیر علامہ اقبال کی اس دعا کا ہی ورد کرتے رہینگے۔

تو زاس دست جفاکش کو یارب جس نے
روحِ آزادیٔ کشمیر کو پامال کیا

9- .....اور زحمتیں رحمتوں میں بدلتی گئیں

غالباً ہر شخص کی زندگی میں کبھی کبھی ایسے واقعات پیش آتے ہیں جو اُس وقت تو ایک بڑی مصیبت دکھائی دیتے ہیں لیکن بعد میں ان کے نتائج اس کے لئے انتہائی مفید ثابت ہوتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی واقعہ وقتی طور پر تو انتہائی فائدہ مند اور خوش آئند دکھائی دیتا ہے لیکن بعد میں اس کے نتائج انتہائی پریشان کن ثابت ہوتے ہیں۔

مجھے زندگی میں اولذکر قسم کے کئی واقعات سے واسطہ پڑا ہے جن کا ذکر میں نے کتاب کی پہلی

جلد میں ''واقعات جنہوں نے میری زندگی کے رُخ موڑ دیئے'' کے عنوان سے کیا ہے۔یعنی 1949ء میں حاضری کم ہونے کی وجہ سے میٹرک کا امتحان دینے کی اجازت نہ ملنا۔کراچی میں نائٹ سکول کے ہیڈ ماسٹر سے تو تو میں میں، ایڈورڈ کالج پشاور میں وائس پرنسپل سے جھگڑا، کسطرح افغان نژاد زعماء کی تعلیمی سوسائٹی کے سربراہ سے جھگڑا والے مسائل اور برطانیہ میں میری گرفتاری کے واقعات پیش آتے وقت چھوٹے بڑے سانحے نظر آتے تھے لیکن بعد میں یہ سارے واقعات میرے لئے رحمت ثابت ہوئے۔خاص کر آخر الذکر نے تو مجھے نئی زندگی بخشی یعنی دوران اسیری میرے پھیپھڑوں کے کینسر کا علاج ہوگیا جو میں ذاتی طور پر کرانے کی مالی پوزیشن میں بالکل نہیں تھا۔اگر یہ علاج نہ ہوتا تو ڈاکٹروں کے بقول مجھے اگست 1986ء میں یعنی آج سے اٹھارہ سال پہلے کینسر سے مرنا تھا۔

میری زندگی میں متذکرہ بالا واقعات کے علاوہ بھی بہت سے ایسے واقعات پیش آئے ہیں جو ظاہری طور پر ادروقوع پذیر ہوتے وقت باعثِ زحمت اور انتہائی تکلیف دہ ہونے کے باوجود بالآخر میرے لئے باعثِ رحمت بن گئے۔آیئے ان واقعات میں سے کچھ پر ایک نظر ڈالیں۔

1۔ جیسا کہ میں نے اس کتاب کے نجی زندگی کے حصے میں لکھا ہے کہ میرے والد صاحب کی وفات کے بعد میرے خاندانی دشمن میری جان کے پیچھے پڑ گئے۔انہوں نے مجھے زہر دیکر مارڈالنے کی بھی ناکام کوشش کی۔چنانچہ میرے خاندان والوں نے مجھے اپنے بہنوئی کے ساتھ سات دن کے سفر کے فاصلے پر ہائی ہامہ (وادیٔ کشمیر) بھیجدیا جسکے نتیجے میں میری جان بچ جانے کے علاوہ میرے لئے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے اور تحریکِ آزادی میں سرگرم حصہ لینے کیلئے راستے کھل گئے۔اگر میرے خاندانی دشمن میری جان کے پیچھے نہ پڑتے تو شاید مجھے ہائی ہامہ نہ بھیجا جاتا نہ ہی میرے لئے یہ راستے کھلتے۔بالفاظ دیگر میری جان کو لاحق خطرہ بالآخر میرے لئے باعثِ رحمت بن گیا۔

2۔ 1951ء میں میں سرینگر میں زیرِ تعلیم تھا۔16 اکتوبر 1951ء کو پاکستان کے وزیراعظم لیاقت علی خان راولپنڈی میں قتل ہوگئے۔ان دنوں میں ایک زیرِ زمین پاکستان نواز طلباء تنظیم سے وابستہ تھا۔چنانچہ ہم نے کالج میں چھٹی کا مطالبہ کیا۔مطالبہ مسترد ہونے پر ہم نے پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے جلوس نکالا، ہمارا لیڈر میرا ایک ہم نام اور سرینگر کے کسی بااثر گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ہم دس بارہ لڑکوں کی گرفتاری کے لئے وارنٹ جاری ہوئے لیکن میرے ہم نام لڑکے کے بزرگوں نے ہماری ولدیت تبدیل کر کے مجھے ملزم نمبر ایک بنوادیا۔اتفاق سے میں نے چند ماہ قبل ایک سکھ پولیس ہیڈ کانسٹیبل کو ڈس مِس ہونے سے بچایا تھا اور میرے وارنٹ گرفتاری تعمیل کے لئے اسی سکھ ہیڈ کانسٹیبل کو ملے جس نے مجھے فوراً وادیٔ کشمیر چھوڑنے کے لئے کہا کیونکہ دوسری صورت میں میں کئی سال کی سزا پاتا۔چنانچہ میں سرینگر سے غائب ہوکر بالآخر ایک قافلے کے ساتھ پاکستان آ گیا۔اگر میرے خلاف وارنٹ نہ نکلتے اور مجھے غلط طریقے سے ملزم نمبر ایک نہ بنایا جاتا تو میرا اس وقت پاکستان آنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا کیونکہ اس سلسلے میں میری کوششیں ناکام ہوچکی تھیں لیکن اس واقعے نے میری زندگی تبدیل کردی ورنہ میں اب تک

وہاں ہی کسی مڈل سکول کے ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے ریٹائر ہو چکا ہوتا۔

3۔ پاکستان آنے کے بعد میں نے پشاور میں داخلہ لیا۔ مجھے مدت سے پائلٹ بننے کا شوق تھا۔ایک دن اخبار میں جی ڈی پائلٹ کی تربیت کے لئے ابتدائی امتحان سے متعلق اشتہار دیکھا اور فارم جمع کرایا۔تحریری اور زبانی امتحان میں سے ایک میں میں پورے سینٹر میں اول آیا اور دوسرے میں بھی اچھے نمبر لئے چنانچہ مجھے میڈیکل ٹیسٹ کے لئے بلایا گیا میڈیکل ٹیسٹ میں مجھے ان فٹ قرار دیا گیا۔ کچھ مدت کے بعد مجھے خصوصی خط ملا کہ آپ کا میڈیکل معائنہ دوبارہ ہوگا لیکن اس دوران میں نہایت دل برداشتہ ہو گیا تھا۔ادھر ان ہی دنوں گلگت میں ایک بڑا ہوائی حادثہ ہوا تھا جسکی بناء پر میرے بزرگوں نے ائر فورس میں جانے سے سختی سے منع کیا چنانچہ میں نے پائلٹ بننے کا ارادہ ہی ترک کیا۔اگر میڈیکل افسر مجھے ان فٹ قرار نہ دیتا تو میں جدوجہدِ آزادی سے ملنے والے ذہنی سکون اور اطمینان قلب سے محروم رہ جاتا۔

4۔ جہاں برطانیہ میں سوا سال کی اسیری نے مجھے پھیپھڑوں کے مہلک کینسر سے نجات دلائی اور گلگت کی سوا سال کی قید نے مجھے اپنے پیدائشی علاقے کے عوامی حقوق کے لئے متوقعہ مقدار کی قربانی نہ دینے کے احساس کے کرب سے نجات دلائی وہاں بیلجیم کی اسیری نے بھی مجھے شدید سگریٹ نوشی اور چہرے اور گردن پر نمودار ہونے والے انتہائی تکلیف دہ اور بدنما پھوڑوں سے نجات دلائی۔

5۔ انسانی خاص کر مشرقی معاشرے میں بیٹا ایک خاص اہمیت رکھتا ہے چنانچہ ہر شخص بیٹے کی خواہش کرتا ہے تاکہ اسکے ذریعہ اس کا نام زندہ رہے، وہ اسکے بڑھاپے میں اس کیلئے سہارا اور اسکی جائیداد کا وارث بنے۔چنانچہ اس لحاظ سے میں ظاہراً ایک بدقسمت آدمی ہوں اسلئے کہ میرا اپنا کوئی بیٹا نہیں صرف ایک بیٹی ہے۔لیکن میرے حالات وضروریات پر گہرائی میں جا کر اور سنجیدگی سے غور کیا جائے تو یہ صورتحال میری بدقسمتی نہیں خوش قسمتی ثابت ہوئی ہے۔اسلئے کہ اگر میرے بہت سے بچے ہوتے تو میں یقیناً تحریک آزادی کو فل ٹائم نہیں دے سکتا تھا۔پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ میرے بیٹے میرے ہی نقش قدم پر چلتے۔وہ میرے لئے میرے مشن میں رکاوٹ کے علاوہ ذہنی اذیت کا باعث بھی بن سکتے تھے۔اسکے مقابلے میں میری ایک ہی لیکن ذہین، خوددار، بااعتماد، جرأت مند اور دوراندیش بیٹی ہے اور سب سے اہم یہ کہ وہ تحریک سے میری وابستگی کو سمجھتے ہوئے میری حتی الامکان مدد اور معاونت بھی کرتی رہی ہے۔لیکن اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ لبریشن فرنٹ، سٹوڈنٹس لبریشن فرنٹ (ایس ایل ایف) اور نیشنل لبریشن آرمی (این ایل اے) کے نوجوانوں کی شکل میں میرے ہزاروں نظریاتی بیٹے ہیں جو میرے ایک اشارے پر گولیاں کھانے اور جان دینے کے لئے بھی تیار ہو جاتے ہیں جیسا کہ انہوں نے 1992ء اور 1999ء میں جنگ بندی لائن پر ہمارے چار اجتماعی، اعلانیہ اور جرأت مندانہ حملوں کے دوران کیا۔شاید میرے جسمانی بیٹے میرے کہنے پر اس پائے کی قربانی دینے کے لئے تیار نہ ہوتے۔الغرض اور ان حقائق کے پیش نظر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ نرینہ اولاد نہ ہونے کی میری ظاہری بدقسمتی بھی عملاً میرے لئے خوش قسمتی ثابت ہوئی ہے۔

بحرحال میں شاید معاشرے کے ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہوں جن پر نازل ہونے والی

اکثر مصیبتیں بالآخر رحمتیں ثابت ہوتی رہیں لیکن یہ بات بھی غلط نہیں کہ زحمتوں کا رحمتوں میں بدلنے کا درمیانی عرصہ مسلسل امتحانوں کا عرصہ رہا ہے اور ان امتحانوں میں میری کامیابیوں (جو میری مستقل مزاجی کی مرہونِ منت ہیں) کے نتیجے میں ہی یہ زحمتیں رحمتوں میں بدلتی گئیں۔

10- میری شاعری

اگرچہ مادیت پرستی اور نفسانفسی کے اس دورِ جدید میں شاعری کو عام طور پر وقت کا ضیاع۔ ذہنی عیاشی وغیرہ قرار دیا جاتا ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ زندگی کے مختلف پہلوؤں اخلاقیات تلخ وشیریں سیاسی تاریخی اور سماجی حقائق اور پند ونصائح پر مبنی اشعار انسان کو روحانی غذا، زندگی کی تلخ وشیریں حقیقتوں سے آگاہی اور اپنے مقصد کے حصول کی جدوجہد کے لئے نفسیاتی زادِراہ فراہم کرتے ہیں چنانچہ میں اس نوعیت کے اشعار سے استفادہ کرتا رہا ہوں۔ میری خوش قسمتی کہ میں نے میٹرک تک فارسی پڑھی ہے اور فارسی شاعری درج بالا قسم کے اشعار کا خزانہ ہے۔ بایں ہمہ میں اردو اشعار سے نسبتاً زیادہ استفادہ کرتا رہا ہوں یہاں تک کہ میں اکثر اکیلے میں، خاص کر پسِ دیوار زنداں (جیل کی کوٹھڑی میں) ایسے اشعار گنگناتا رہا ہوں جو میرے دل سے نکلنے والی دعا کے آئینہ دار اور میرے لئے مشعلِ راہ ہوں۔ مثلاً اقبال کا یہ شعر:۔

تو زاس دستِ جفاکش کو یارب جس نے — روحِ آزادیٔ کشمیر کو پامال کیا

عرفی کا یہ شعر:۔

عُرفی تو میندیش زغوغائے رقیباں — آوازِ سگاں کم نہ کُند رزق گدارا

اقبال کا اسی معنی کا شعر:

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب — یہ تو چلتی ہے تجھے اُونچا اُڑانے کیلئے

اقبال ہی کا یہ شعر:

نگاہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُرسوز — یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کیلئے

اور فیض کا یہ شعر:

زندگی کیا؟ کسی مفلس کی قبا ہے جس میں — ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں

جوش کا یہ شعر:

سنو اے ساکنانِ بزمِ گیتی — ندا یہ آرہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا اِک لمحہ ہے بہتر — غلامی کی حیاتِ جاوداں سے

کسی نامعلوم شاعر کا یہ شعر:

دریں دنیا کسے بے غم نباشد اگر باشد بنی آدم نہ باشد

انگریزی کا یہ قول بھی میرے لئے مشعل راہ بنتا رہا ہے

Those only live who dare. یعنی جرأت مند لوگ ہی دنیا میں کامیاب رہتے ہیں۔

درج بالا اقسام کے اشعار کے لئے پسندیدگی کے باوجود میں خود شاعری کے کھیل کا کھلاڑی نہیں البتہ انتہائی اشد ضرورت کے وقت مسئلہ کشمیر، تحریکِ آزادی اور نظریہء خودمختار کشمیر سے متعلق معاملات کے بارے میں میں نے اب تک تین بار ٹوٹی پھوٹی نظموں کی شکل میں اپنے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔

پہلی بار میں نے 'اقبالِ جرم' کے عنوان سے ایک نظم 18 مئی 1986ء کو برکسٹن جیل لندن میں لکھی تھی۔ یہ نظم کتاب کی پہلی جلد میں شائع ہوئی تھی اسے دوسری جلد میں بھی شامل کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

''اقبالِ جرم''

اپنا قصور قوم کی عظمت کی بات کی — آزادیٔ وطن کی، امم کی نجات کی
اپنا جرم کہ غیر کے آگے نہ جھک سکے — اپنی خطا ہے فکرِ وطن کی حیات کی
اپنا قصور طوقِ غلامی نہیں قبول — ملتی رہی ہے ہم کو سزا اس ہی بات کی
اک جرم یہ بھی ہے مرا کشمیر ایک ہو — باقی نہ کوئی راہ ہے اسکے ثبات کی
بڈشاہی دور کی تمنا بھی تو جرم ہے — پر جستجو تو ہم نے اسکی دن و رات کی
اقوام متحدہ کی صفوں میں جگہ ملے — یہ تو ہمارا حق ہے تبھی ڈٹ کے بات کی
پرچم ہمارا پھر سے بلند دنیا بھر میں ہو — گو جہد اسکی جرم ہے پر دن و رات کی
کرسی پرست درس اہنسا کا دیتے ہیں — بٹ نے تو دار پر بھی عقابوں کی بات کی

یہ قید کیا ہے پھانسی بھی منظور ہے امان
ضامن بنے گر اہلِ وطن کی نجات کی

دوسری بار میں نے آزاد کشمیر کے انتخابات منعقدہ 1996ء کے دوران (جب بھارتی مقبوضہ کشمیر میں ظلم و استبداد عروج پر تھا) آزاد کشمیر اور بھارتی مقبوضہ کشمیر کی صورتحال کی عکاسی مندرجہ ذیل نظم میں کی تھی۔

اُدھر (مقبوضہ کشمیر) اور اِدھر (آزاد کشمیر)

اُدھر لاشہ بھی بے گور و کفن ہے — اِدھر ہر سو الیکشن کا جشن ہے
ہے قدغن رائے آزادی کے حق پر — وہاں عملی یہاں فکری رسن ہے
عوام الناس مظلوم دونوں جانب — مگر ہر کس پرستارِ وطن ہے

وہاں ماتم یہاں لیڈر ہیں شاداں　　یہی کیا شیوۂ حُب وطن ہے؟
وہاں ہیں جان آزادی پہ دیتے　　یہاں کرسی، پجارو اور دھن ہے
وہاں پر آگ برساتا ہے دشمن　　یہاں پر ہار، نعرے، بانکپن ہے
یہ تحریک مانگتی سنجیدگی ہے　　یہاں ہر کام کارِ لڑکپن ہے
ہے کوڑی کوڑی کی محتاج تحریک　　خزانہ یاں برائے الیکشن ہے!
لُٹیرے ہیں بہت یاں بھی اور واں بھی　　انہی کے رحم پر میرا وطن ہے
وہاں گلشن پہ قابض حاکمِ ہند　　یہاں گلگت و بلتستاں رہن ہے
میرے مولا بچا ان سب سے اِس کو　　کہ نرغے میں ہمارا یہ چمن ہے

میں نے تیسری اور اب تک کی آخری نظم ستمبر 2003ء میں ساحر لدھیانوی کی مشہور نظم ''وہ صبح کبھی تو آئیگی'' کی زمین پر لکھی اور اپنے بروشر بعنوان ''عالم ارواح اور خیالی دنیا میں کشمیر کانفرنسیں'' کے آخری صفحے پر ایک خاص روپ اور انداز میں شائع کی۔ نظم کچھ یوں ہے۔

وہ صبح کبھی تو آئیگی

جب طاقت، دھوکے یا دھن سے　　دھرتی نہ خریدی جائے گی
غیروں میں بٹی میری دھرتی　　جب ایک وطن بن جائے گی
وہ صبح کہ یہ اجڑی دھرتی پھر ایک چمن بن جائیگی
وہ صبح کبھی تو آئیگی وہ صبح کبھی تو آئیگی

وہ صبح کہ جب بیتیں گے دن　　مکّاری کے غدّاری کے
وہ صبح کہ جب ٹوٹیں گے بُت　　طاقت کے، اجارہ داری کے
جس صبح کسی کی حرکت پر بندش نہ لگائی جائیگی
وہ صبح کبھی تو آئیگی وہ صبح کبھی تو آئیگی

ہیبت کے لئے جب ماؤں کی　　عظمت کو نہ کچلا جائے گا
محلے نہ جلائے جائیں گے　　فصلوں کو نہ مسلا جائے گا
آزادی مانگنے والوں پر گولی نہ چلائی جائیگی
وہ صبح کبھی تو آئیگی وہ صبح کبھی تو آئیگی

میرپور، جموں، گلگت، وادی　　سب ایک بدن کے اعضا ہیں

لداخ، پونچھ مل کر یہ سب ملت کے لئے یدبیضا ہیں
یہ قوم میری یکجا ہوکر جب قومی نغمے گائیگی
وہ صبح کبھی تو آئیگی وہ صبح کبھی تو آئیگی

وہ صبح کہ جب کوئی آقا باہر سے نہ لایا جائے گا
ہر مسند پر اپنا ہی اک فرزند بٹھایا جائے گا
جب قوم مری اس دھرتی کی واحد مالک بن جائیگی
وہ صبح کبھی تو آئیگی وہ صبح کبھی تو آئیگی

اس صبح کو ہم ہی لائیں گے وہ صبح ہمیں سے آئیگی
اس صبح کو ہم ہی لائیں گے وہ صبح ہمیں سے آئیگی

میری بیٹی اسماء کی تاریخی شادی

میری واحد اولاد اسماء 10 جولائی 1974ء کو کراچی میں پیدا ہوئی۔ ان دنوں ہم میرے بھانجے ڈاکٹر محبوب عالم کے ساتھ رہتے تھے۔ ایک سال بعد ہم نے رہائش تبدیل کی اور پہلے لی مارکیٹ میں ہی اور بعد ازاں ناظم آباد میں رہنے لگے۔ جون 1976ء میں میں برطانیہ چلا گیا تو اس وقت ننھی اسماء دو سال سے بھی کم عمر کی تھی۔ 1978ء میں اسماء اور اسکی ماں بھی برمنگھم پہنچ گئیں۔ 1979ء میں اسماء نیزبی سکول (Naizbi School) برمنگھم میں داخل ہوئی۔ 1982ء میں ہم لیوٹن منتقل ہو گئے۔ اور اسماء وہاں Denbeigh Junior School میں داخل ہوگئی۔ میں ستمبر 1985ء میں گرفتار ہوا۔ اسماء کبھی کبھی ماں کیساتھ مجھے ملنے جیل آ جاتی۔ اسے اس عمر میں بھی معلوم تھا کہ قومی آزادی کی جدوجہد میں اور بہت سے مصائب کے علاوہ قید و بند بھی شامل ہے بلکہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اوائل ستمبر 1985ء سے اواخر دسمبر 1986ء کے پندرہ ماہ کی اسیری اور عدالت سے بری ہوجانے کے باوجود برطانوی حکومت نے مجھے ''برطانیہ کی قومی سلامتی کیلئے خطرہ'' قرار دیکر برطانیہ بدر کر دیا تو کچھ مدت بعد اسماء اور اسکی ماں کو بھی پاکستان آنا پڑا۔ گو قانوناً وہ وہاں مستقلاً رہ سکتی تھیں لیکن میں نے انکے واپس آنے کو ہی ترجیح دی۔ اس سے پہلے بھی اسماء کچھ مدت کراچی میں ڈاکٹر محبوب عالم کے ہاں رہی تھی۔ 1987ء میں اسماء اور اسکی ماں مستقلاً پاکستان منتقل ہونے لگیں تو لیوٹن میں اسماء کے سکول کے ہیڈ ماسٹر نے اسماء کے سکول چھوڑنے کے سرٹیفکیٹ میں خصوصی نوٹ لکھا کہ اسماء ہر حیثیت سے ایک مثالی طالب علم تھی جسے ہم کھو رہے ہیں جسکا ہمیں انتہائی افسوس ہے۔ کراچی واپسی پر اسماء نے پھر سے تعلیم شروع کی اور 1990ء میں میٹرک اے گریڈ میں پاس کیا۔ 1992ء میں ایف اے اور 1994ء میں بی اے پنجاب یونیورسٹی سے

پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت سے کیا۔ اسکے بعد قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد میں داخلہ لیا اور 1997ء میں وہاں سے ڈیفنس اینڈ سٹرٹیجک سٹڈیز (Defence And Strategic Studies) میں ایم ایس سی کیا۔ کچھ مدت کراچی میں میرے سکول (Merry Dale English School) کی نگرانی کرتی رہی اور 2000ء کے ابتدائی چھ ماہ اس نے (Institute Of Strategic Studies) اسلام آباد میں ریسرچ ایسوسی ایٹ (Research Associate) کی حیثیت سے کام کیا۔ اسی دوران یعنی 20 جنوری، 13 فروری اور 28 مئی 2000ء کو پاکستان کے صف اول کے انگریزی روزنامے دی نیوز (The News International) کے پولیٹیکل اکانومی کے سیکشن میں اسما کے مسئلہ کشمیر کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی مضامین شائع ہوئے۔ 10 ستمبر 2000ء کو اسماء کی منگنی بھارتی مقبوضہ کشمیر کی پیپلز کانفرنس کے سربراہ خواجہ عبدالغنی لون کے بیٹے سجاد غنی لون سے ہوئی۔ منگنی کے دن ہی شادی کی تاریخ 19 نومبر 2000ء مقرر ہوئی۔

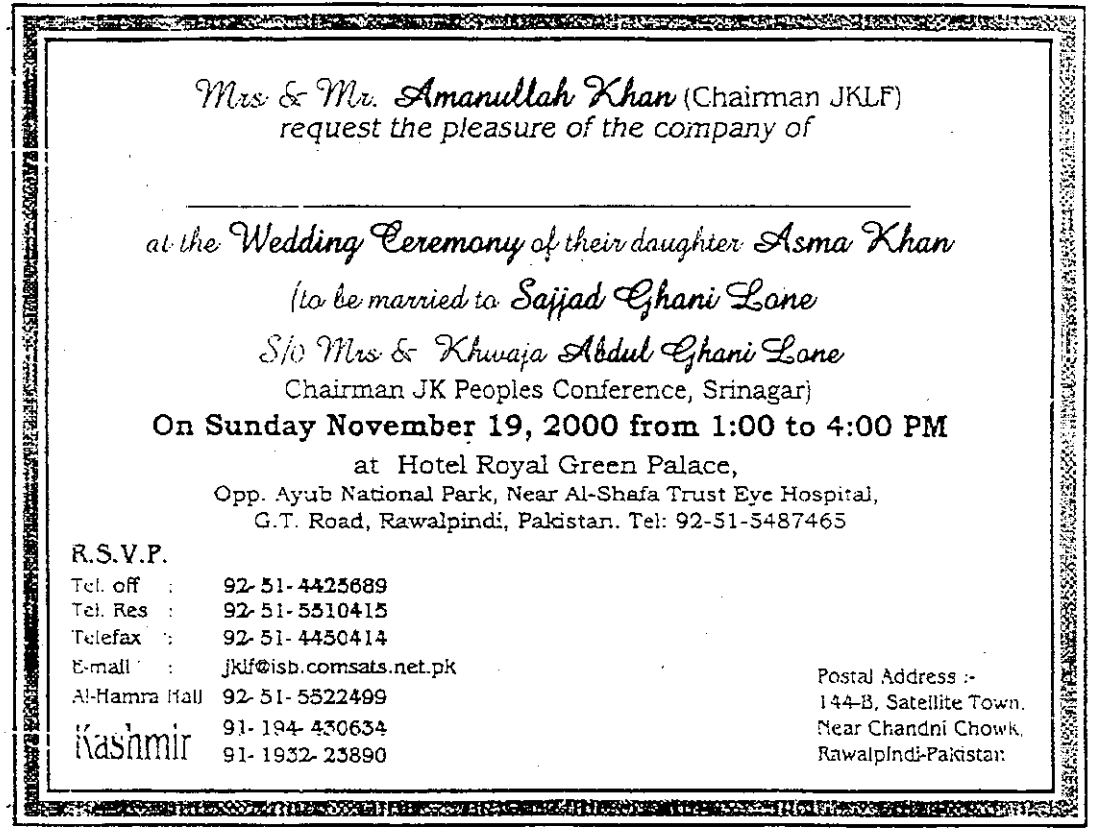
اسماء اور سجاد کا یہ رشتہ کرانے میں ایس ایم افضل (سینئر وائس چیئرمین لبریشن فرنٹ، جو 1987ء میں لبریشن فرنٹ میں شامل ہونے سے پہلے لون صاحب کی پیپلز کانفرنس کے سرگرم رکن تھے اور لون فیملی سے انکے گھریلو تعلقات ہیں) مسٹر اینڈ مسز یوسف نسیم آف پیپلز کانفرنس، منظور احمد خان آف ہائی ہامہ پائر پورہ (لبریشن فرنٹ) جناب و بیگم ارشاد ملک ڈیموکریٹک فریڈم پارٹی، جناب محمود احمد ساغر نائب صدر ڈی ایف پی اور لبریشن فرنٹ کے حافظ انور سماوی نے اہم کردار ادا کیا۔ اس رشتے کیلئے مجھے اپنے عزیزوں کی رضامندی حاصل کرنے کیلئے خاصی محنت کرنی پڑی کیونکہ وہ دوسری وجوہات کے علاوہ ریاست کی غیر یقینی سیاسی صورتحال کے باعث اس رشتے کے بارے میں خاصے متذبذب تھے خاص کر اسلئے کہ اسماء میری واحد اولاد ہے۔ میری شفقت پدری اور ارفع قومی مفاد کے مابین خاصی مدت جنگ رہی آخر قومی مفاد اور دوسری کچھ حقیقتوں نے شفقت پدری کو قائل کر دیا اور میں نے لون صاحب کی طرف سے رشتہ طلب کرنے کے خاصی مدت بعد ہاں کر دی اور اس ہاں میں میری بیوی اور بیٹی خاص کر موخر الذکر کی ہاں بھی شامل تھی۔ میں نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ اسماء سے متعلق ہر اہم قدم اسکی رضامندی سے اٹھاؤں۔ میری طرح اسماء کو بھی اس رشتے کے بارے میں اسکے بیشمار پہلوؤں پر گہرائی میں جا کر سوچنا پڑا۔ آخر ماضی کے دوسرے بہت سے اہم معاملات کی طرح اس اہم معاملے میں بھی باپ بیٹی ایک ہی نتیجے پر پہنچے اور اسکی ماں نے بھی اتفاق کیا۔

میں مالی طور پر اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ اسماء کی شادی کے انتہائی ضروری اخراجات بھی برداشت کر سکوں چنانچہ میں نے جنگلوٹ گلگت میں اپنی زمین کا آدھا حصہ فروخت کر دیا۔ علاوہ ازیں 10 ستمبر 2000ء کو منگنی کے موقع پر میرے بہت سے عزیز و اقارب جن میں سے اکثر کی تعلیمی کفالت میں نے کی تھی۔ میرے ہاں جمع ہو گئے جنکی باتوں سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ شادی کے موقع پر مجھے ان کی طرف سے خاصی مدد ملے گی۔ میرے بھانجے ڈاکٹر محبوب عالم نے تو اسی موقع پر خاموشی سے اور دوسروں کو بتائے

بغیر پچاس ہزار روپے دیدیئے۔ اپنے عزیزوں کی ان باتوں کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ یہ شادی اس طرح ہونی چاہیئے کہ اس سے قومی کاز کو بھی فائدہ پہنچے، منقسم ریاست کی یکجہتی کم از کم ذہنی یکجہتی کو تقویت ملے، مسئلہ کشمیر اور تقسیم کشمیر سے پیدا شدہ سوشل مسئلہ عالمی برادری کے نوٹس میں آئے۔ چنانچہ میں نے شادی کا دعوت نامہ اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی چھپوایا اور اسکی پشت پر مسئلہ کشمیر کے مختلف پہلوں کو اجاگر کر کے برصغیر کے سوا ارب انسانوں کے مفاد میں مسئلہ کشمیر کے حل کی ضرورت پر زور دیا اور یہ کارڈ (دعوت نامہ) بہت بڑی تعداد میں ریاست کے جملہ حصوں کے علاوہ بھارت اور پاکستان کے سیاسی اور صحافتی زعماء حکمرانوں (مرکزی وزیروں، سفیروں) اور انسانی حقوق کے علمبرداروں کے علاوہ قومی اور عالمی میڈیا کے نمائندوں کو بھی بھیج دیا۔ رشتہ داروں اور ذاتی اور سیاسی دوستوں کی فہرست اسکے علاوہ تھی۔ ایک شادی کو قومی آزادی کی تحریک اور قومی یکجہتی کے فروغ کیلئے استعمال کئے جانے کا یہ ایک منفرد تاریخی واقعہ تھا کم از کم کشمیر کی سیاسی تاریخ کا۔

نومبر 2000ء کے وسط سے ہی متعلقہ لوگ راولپنڈی پہنچنا شروع ہو گئے۔ میرے رشتہ داروں کا بھی تانتا بندھ گیا۔ اکثر کے ساتھ انکے اہل خانہ بھی تھے۔ 16 نومبر کو خواجہ عبدالغنی لون ایک بڑے قافلے کے ساتھ بذریعہ ہوائی جہاز سرینگر سے براستہ دھلی راولپنڈی پہنچ گئے۔ قافلے میں جموں کے مشہور دانشور کرشن دیو سیٹھی (جنکا تعلق میرپور آزاد کشمیر سے ہے لیکن 1947ء کے بعد جموں میں مقیم ہیں) روزنامہ کشمیر ٹائمز جموں کے چیف ایڈیٹر وید بھسین، مشہور صحافی پشپ صراف اور انکے بھائی ونے صراف، وادیٔ کشمیر کے بھوشن بزاز (یہ کشمیر کے مشہور صحافی، دانشور، مصنف اور نظریۂ خودمختار کشمیر کے ابتدائی علمبردار آنجہانی پریم ناتھ بزاز کے بیٹے ہیں اور دھلی میں مقیم ہیں) ظہور وٹالی، جماعت اسلامی کے علی محمد شیخ ہفت روزہ چٹان کے مدیر طاہر محی الدین، پیپلز کانفرنس کے جنرل سیکرٹری حفیظ اللہ مخدومی، روزنامہ سرینگر ٹائمز کے مدیر اعلیٰ صوفی غلام محمد، مشہور صحافی آشا کھوسہ، ڈاکٹر محمودہ، بھوشن لعل ایڈووکیٹ، عبدالمجید لون، ڈاکٹر جمی کا بیٹا شبیر احمد، مسز ایس ایم افضل، زبیر افضل اور مسز حفیظ شامل تھے۔ بیگم عبدالغنی لون، بلال لون، فرحت بلال لون اور انکی دو بچیاں ماریا اور ادا پہلے ہی یہاں پہنچ گئی تھیں۔ مجھے ان دنوں ہی پتہ چلا کہ 1947ء میں ہائی سکول ہندواڑہ میں میرے استاد غلام احمد گنائی صاحب جوان ہی دنوں تحریک آزادی سے وابستگی کی بناء پر گرفتار ہو گئے تھے میرے داماد کے نانا ہیں۔

سجاد اور اسماء کا نکاح 18 نومبر 2000ء کو میری رہائش گاہ پر ایک انتہائی سادہ مگر پروقار تقریب میں ہوا۔ (جبکہ 10 ستمبر کو منگنی کی رسم خاصے اہتمام سے ہوئی تھی) جسکے مہمان خصوصی میر واعظ کشمیر مرحوم محمد یوسف شاہ کے فرزند میر واعظ محمد احمد تھے جنہوں نے رسم کے بعد دعا پڑھی جبکہ نکاح مقبوضہ کشمیر کی جماعت اسلامی کے نائب امیر اور سابق ممبر کشمیر اسمبلی مولانا غلام نبی نوشہری نے پڑھا۔ نکاح کی تقریب میں دو خاندانوں کے افراد اور انکے بہت ہی قریبی دوست ہی شامل تھے۔ البتہ رسم نکاح کے بعد مہندی کی



Mrs & Mr. **Amanullah Khan** (Chairman JKLF)
request the pleasure of the company of

---

at the **Wedding Ceremony** *of their daughter* **Asma Khan**

(to be married to **Sajjad Ghani Lone**

S/o Mrs & Khwaja **Abdul Ghani Lone**

Chairman JK Peoples Conference, Srinagar)

On Sunday November 19, 2000 from 1:00 to 4:00 PM

at Hotel Royal Green Palace,

Opp. Ayub National Park, Near Al-Shafa Trust Eye Hospital,
G.T. Road, Rawalpindi, Pakistan. Tel: 92-51-5487465

R.S.V.P.

Tel. off : 92-51-4425689
Tel. Res : 92-51-5510415
Telefax : 92-51-4450414
E-mail : jklf@isb.comsats.net.pk
Al-Hamra Hall 92-51-5522499
Kashmir 91-194-430634
91-1932-23890

Postal Address :-
144-B, Satellite Town,
Near Chandni Chowk,
Rawalpindi-Pakistan

جموں کشمیر لبریشن فرنٹ (جے کے ایل ایف) کے چیئرمین امان اللہ خان کی صاحبزادی اسما خان کی شادی کا دعوت نامہ

جلد دوم مسلسل

YOUR ATTENTION PLEASE

South Asia and its over one and a quarter billion people badly need and fully deserve a peaceful, respectable and prosperous future. This all-important goal can be achieved surely and easily if only the people, governments, political parties, journalists and intellectuals of India, Pakistan and Kashmir (including both Indian and Pakistani controlled parts) make concerted, sincere and selfless efforts to change Kashmir from its present position of a poisonous bone of contention into a bridge of friendship between India and Pakistan. But if they don't do so, all the three will have to pay far more and un-imaginably heavy a price for the folly. As such, we all, Indians, Pakistanis and Kashmiris, owe it to our future generations to rise to the occasion and do the needful without wasting more time and before it is too late.

Amanullah Khan, Chairman JKLF

ہماری تاریخ کے دو عظیم ناکامیوں پر مشتمل پاکستانی اور کشمیری دوستوں سے کی گئی یہ اپیل

رسم جو اسلام آباد میں واقع این اے ہاؤس (ناردرن ایریاز ہاؤس) میں ادا ہوئی خاصی دھوم دھام سے ہوئی۔ دولہے کی طرف سے خواتین کشمیری زبان میں اس رسم سے متعلق لوک گیت گاتے ہوئے اور ہاتھ اور تھالیوں میں شمعیں لئے جب این اے ہاؤس کے احاطے میں داخل ہوگئیں تو وہاں عجیب سا سماں بندھ گیا۔ این اے ہاؤس کا ہال اور کچھ کمرے میرے بھائی عطی اللہ خان سیکرٹری قانون ساز کونسل گلگت نے اپنے نام پر بک کرائے تھے۔

شادی پہلے الحمرا ہال پونچھ ہاؤس میں ہونی قرار پائی تھی لیکن بعد میں اندازہ ہوا کہ جگہ کم ہوگی اسلئے شادی کا مقام جی ٹی روڈ ایوب نیشنل پارک کے نزدیک گرین پیلس انٹرنیشنل ہوٹل میں منتقل کیا گیا۔ یہ نیا ہوٹل پونچھ آزاد کشمیر کے سردار رشید صاحب کا ہے اور اس میں اتنی بڑی تقریب پہلی بار ہو رہی تھی عمارت کے گراؤنڈ فلور کے دو اطراف میں دو بڑے ہال اور درمیان میں کھلی جگہ بھی ہے چنانچہ ہم نے انہیں مردانہ اور زنانہ ہالوں میں تقسیم کر دیا۔

19 نومبر کو برات کی آمد کے مقررہ وقت سے کوئی ڈیڑھ گھنٹہ پہلے میں انتظامات پر آخری نظر ڈالنے ہوٹل پہنچا تو لوگ آنا شروع ہو گئے تھے۔ (میں نے آزاد کشمیر میں لبریشن فرنٹ کے ہر یونٹ کے سربراہ اور سنٹرل کمیٹی کے ممبروں کو مدعو کیا تھا اسطرح ذاتی دوست اور تحریکی ساتھی ملا کر تین سو سے زیادہ افراد تو صرف آزاد کشمیر سے مدعو تھے۔) دروازے پر درجن بھر لڑکے کھڑے تھے۔ جن میں سے میں صرف ایک کو جانتا تھا وہ ہمارے ضلع کوٹلی آزاد کشمیر کے ایک سرحدی یونٹ کا صدر تھا۔ میں نے زبانی کچھ کہا تو نہیں البتہ انہوں نے شاید میرے چہرے پر سوال پڑھ لیا تو کہنے لگے ہم مدعو نہیں ہیں اور نہ ہی دعوت کھانے آئے ہیں۔ ہم اتنی دور سے (تقریباً دو سو میل سے) صرف اپنی بہن کو رخصت کرنے آئے ہیں۔ ہم اندر ہال میں بھی نہیں آئیں گے۔ میں ان لوگوں کی باتوں سے بہت متاثر ہوا اور انہیں اندر ہال میں بیٹھنے کو کہا۔ میرے خیال میں ان جیسے ہزاروں دوسرے لوگ بھی اپنی بہن کو رخصت کرنا چاہتے تھے لیکن ایسا نہ کر سکے اسلئے کہ آزاد کشمیر میں دعوت کے بغیر شادی میں جانا معیوب تصور ہوتا ہے اور میں مالی طور پر اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ ان ہزاروں افراد پر سوا سو روپے فی کس خرچ برداشت کر سکتا۔

ڈیڑھ بجے بارات آ گئی اس سے پہلے ہی دونوں ہال تقریباً بھر چکے تھے۔ بھارتی مقبوضہ کشمیر سے خواجہ عبدالغنی لون صاحب کے ساتھ آئے ہوئے مہمانوں کے علاوہ آزاد کشمیر سے آزاد کشمیر کے تین سابق صدور سردار عبدالقیوم خان، سردار سکندر حیات خان، اور میجر جنرل محمد حیات خان۔ (صدر سردار ابراہیم خان علالت کی وجہ سے نہیں آ سکے۔ انکی نمائندگی انکے بیٹے سردار خالد ابراہیم نے کی۔) ان میں دو اصحاب (وزیراعظم بھی رہے ہیں) وزیراعظم بیرسٹر سلطان محمود چوہدری، سینئر وزیر (نائب وزیراعظم) صاحبزادہ اسحاق ظفر، آزاد کشمیر کی سیاسی پارٹیوں کے سربراہ (سردار عبدالقیوم خان مسلم کانفرنس اور بیرسٹر سلطان محمود پیپلز پارٹی کے صدر بھی تھے) جماعت اسلامی کے عبدالرشید ترابی، لبریشن لیگ کے جسٹس عبدالمجید ملک، جموں کشمیر پیپلز پارٹی کے سردار خالد ابراہیم، محاذ رائے شماری کے مرحوم سعید شاہ نازکی،

لبریشن فرنٹ یاسین ملک گروپ کے ڈاکٹر فاروق حیدر، غلام احمد بٹ، رفیق ڈار، داؤد میر۔ نیشنل لبریشن فرنٹ کے شوکت مقبول بٹ اور جی ایم میر، تحریک فقہ جعفریہ کے غلام رضا نقوی، لبریشن فرنٹ روؤف گروپ کے سردار نسیم اقبال شامل تھے۔ لبریشن فرنٹ، اسکے سٹونٹ ونگ ایس ایل ایف اور عسکری ونگ این ایل اے کے تقریباً تمام سینئر ساتھی شریک ہوئے۔ دیگر کشمیری معززین میں سے اقوام متحدہ کے سابق اسسٹنٹ سیکرٹری جنرل محمد یوسف بچھ، آزاد کشمیر کے سابق سینئر وزیر محمد یوسف چوہدری، بزرگ رہنما عبدالخالق انصاری ایڈووکیٹ، ڈاکٹر غلام احمد جراح آف جموں، محمد اقبال صاحب آف لداخ انکے فرزند احمد، رائٹرز کے راجہ اصغر، ڈاکٹر اسد اللہ لون، حاجی فخر الدین، کرنل علی محمد میر، پروفیسر مقصود جعفری، میر عبدالعزیز، عبدالصمد وانی، ڈاکٹر نسیم جوگزئی، حریت کانفرنس آزاد کشمیر چیپٹر کے سارے ممبر بشمول سید یوسف نسیم کنوینر، غلام محمد صفی سیکرٹری اور ممبران الطاف قادری، مسعود میر، پروفیسر اشرف صراف اور صدیق گنائی کے علاوہ محمد شفیع قادری غلام نبی نوشہری، محمود احمد ساغر، ارشاد ملک، فاروق رحمانی، شہید کشمیر مقبول بٹ کے بھائی ظہور بٹ، بابر ریشی پروفیسر خالد محمود، ارشاد محمود، معروف اختر عباسی، میجر رفیق جعفری، حاجی غلام سرور کوٹلی، ڈاکٹر شیخ ابرار احمد، وقاص شہید کے والدین، مصنف سعید اسعد، ڈاکٹر محسن شکیل، صابر انصاری ایڈووکیٹ، شیخ تجمل حسین، پروفیسر نذیر احمد شال، پروفیسر شفیق، سردار محمد صدیق سیکرٹری آزاد گورنمنٹ، مزمل حسین جعفری، صلاح میر، ڈاکٹر کفیل، یوسف زرگر، عنایت اللہ خان آفریدی، آغا صلاح الدین، عتیق اللہ آفریدی، عبدالرزاق، عزیز بھٹی مرحوم، ابرار الحق، فاروق سہیل، شفیع پیرزادہ، پرویز میر اور ساتھی، اسحاق شریف بیگ وغیرہ شامل تھے۔ ان میں سے اکثر کے ساتھ ان کی بیگمات بھی تھیں۔

گلگت سے میرے درجنوں قریبی رشتہ داروں کے علاوہ جنرل نجم خان، حاجی عبدالقدوس سابق ممبر این اے کونسل، حاجی امیر جان ممبر این اے کونسل، جسٹس محمد خورشید، میجر احسان ولی، میر اخلاق ایڈووکیٹ اور کرنل حبیب اللہ پاکستانی زعماء میں پاکستان کے سابق وزیر خارجہ گوہر ایوب خان اور ریٹائرڈ جنرل حمید گل قابل ذکر تھے۔ پاکستان کے کچھ مرکزی وزیر اور گورنر سرحد وعدے کے باوجود نہیں آئے۔ کشمیری مجاہد تنظیموں کے بہت سے کمانڈروں اور مجاہدوں نے بھی شادی میں شرکت کی۔ سفارتی دنیا سے انڈونیشیا، نائیجیریا اور ایران کے سفیروں نے شرکت کی۔ انڈونیشیا کے نمائندے ایک بہت خوبصورت گلدستہ لائے تھے۔

میرے نام خطوط، فیکس، ٹیلی گراموں اور ای میل کے ذریعہ جن لوگوں نے میری بیٹی اور اسکے شریک حیات کیلئے نیک خواہشات کا اظہار کیا تھا ان میں پاکستان کے صدر مملکت محمد رفیق تارڑ، سابق وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو (انہوں نے لنڈن سے خط کے ساتھ ایک خوبصورت گلدستہ بھی بھیجا تھا) بھارت کے دو سابق وزرائے اعظم اندر کمار گجرال اور ایچ ڈی دیوگوڑا۔ مہاراجہ کشمیر کے بیٹے اور مقبوضہ کشمیر کے سابق صدر ریاست ڈاکٹر کرن سنگھ (وزیر اعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے پریس کانفرنس میں اعلان کیا تھا کہ اگر بھارت، پاکستان سے اجازت ملی تو میں امان اللہ خان کی بیٹی کی شادی میں ضرور شرکت کروں گا

THE PRESIDENT
Islamic Republic of Pakistan

Muhammad Rafiq Tarar

Islamabad
1198/2/PRESIDENT
20 Shaban 1421
17 November, 2000

Mr. Aman Ullah Khan,
144-B, Satellite Town,
Near Chandni Chowk,
Rawalpindi.

My dear Mr. Aman Ullah Khan,

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

Thank you for inviting me to the marriage ceremony of your daughter on 19th November, 2000.

It would have given me immense pleasure to join you on this happy occasion but, owing to my pre-scheduled engagements, I will not be able to do so.

I take this opportunity to extend my heartiest felicitations to you and the members of your family and my best wishes to the newly weds for a long and happy married life.

With regards,

Yours sincerely,

M. Rafiq Tarar

(Muhammad Rafiq Tarar)

صدر پاکستان جناب محمد رفیق تارڑ کی طرف سے خط

Benazir Bhutto
Former Prime Minister
Islamic Republic of Pakistan

November 15, 2000

Dear Mr. & Mrs. Amanullah,

Senator Zardari and I offer you our congratulations on the joyful occasion of your daughter Asma Khan's marriage with Mr. Abdul Ghani Lone's son Sajad on November 19, 2000. We thank you for the invitation to attend the wedding.

This wedding unites the two families from across the border in Kashmir which is a welcome sign.

Although we are unable to attend the marriage, your family shall be in our thoughts. We wish Asma and Sajad a happy married life.

Please convey our good wishes to other members of the family.

Sincerely,

Benazir Bhutto.

(Benazir Bhutto)

Mr Amanullah Khan
Chairman JKLF
144-B Satellite Town,
near Chandni Chowk,
Rawalpindi

House No. 8, Street 19, Sector F-8/2, Islamabad-Pakistan. Tel: (92-51) 2282781, 2255264, Fax: 2282741
E-mail: ppp@isb.compol.com

پاکستان کی سابق وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کا خط

एच डी देवे गौड़ा
H.D. DEVE GOWDA

November 11, 2000

Dear Shri Amannullah Khan ji,

I wish Chi. Sow. Asma Khan and Chi. Sajjad Ghani Lone a happy and prosperous married life.

With regards,

Yours sincerely

(H.D. DEVE GOWDA)

Shri Amannullah Khan
144-B, Satellite Town
Near Chandni Chowk
Rawalpindi
Pakistan

5, सफदरजंग लेन, नई दिल्ली - 110 011 दूरभाष : 3794499 टेलीफैक्स : 3794899
5, Safdarjung Lane, New Delhi-110 011 Ph. : 3794499 Telefax : 3794899

سابق بھارتی وزیراعظم ایچ ڈی دیوے گوڑا کا خط

Dr. KARAN SINGH

3, NYAYA MARG,
CHANAKYAPURI
NEW DELHI - 110 021

3 November 2000

Dear Amanullah Khan Sahib,

I have received the invitation to your daughter's wedding later this month. On this occasion I send you and other members of the family my warm greetings. Please convey to the young couple my blessings for a long and very happy married life.

With kind regards,

Yours sincerely,

Karan Singh

Jenab Amanullah Khan
144 B, Satellite Town
Near Chandni Chowk
Rawalpindi (Pakistan)

TEL. : (011) 611-5291 611-1744, FAX : (91-11) 687-3171

سابق صدر ریاست جموں کشمیر ڈاکٹر کرن سنگھ کا خط

Ahmad Faraz

No 119 NIOPS/IP/2339

مکرمی جناب لبان اللہ خان صاحب

وعلیکم اسلام

آپ کے دعوت نامے کا بہت شکریہ۔ مجھے بے حد مسرت ہوتی کہ میں آپ کی بیٹی کی رخصتی میں مورخہ ۱۹ نومبر کو حاضر خدمت ہوتا مگر چونکہ اسی تاریخ کو پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق مجھے ایک اہم سرکاری میٹنگ کے سلسلہ میں کراچی جانا ہے جس کی بدنا پر میں شرکت کرنے سے قاصر ہوں جس کے لئے معذرت قبول کریں۔ میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ دلہن اور دولہا کو خوشگوار اور کامیاب مستقبل عطا کرے۔

تمام تر نیک خواہشات کے ساتھ

آپکا مخلص

(احمد فراز)

14-2-2000

مکرمی جناب لبان اللہ خان صاحب

(چیئرمین جموں کشمیر لبریشن فرنٹ)

Fax No: 92-51-4450414

H.No. 4, St. 9, F-6/3, Islamabad. Tel: 9203563, 825797, 9221777 Fax 264283 E-mail:fyle@hotmail.com
Mobile Phone: 0300-551133

مشہور شاعر احمد فراز کا خط

ALTAF HUSSAIN
Founder & Leader
Muttahida Quami Movement, Pakistan
Permanent Address:
494/8 Azizabad, Karachi-Pakistan
Tel: 92-21-631 3690 / 632 9900

الطاف حسین
بانی و قائد متحدہ قومی موومنٹ
494/8 عزیزآباد فیڈرل بی ایریا کراچی نمبر 38
فون ۔ 6329690 ۔ 6313690

13 November 2000

Mr & Mrs Amanullah Khan
Chairman JKLF
144-B, Satellite Town
Near Chandni Chowk
Rawalpindi
Pakistan

Dear Mr & Mrs Amanullah Khan

Thank you very much for your invitation on the happy occasion of marriage of your daughter Asma with Sajjad Ghani. Regretfully, I would not be able to join you on this happy occasion, but I pray for a long, happy and prosperous life of the couple. Please convey my and MQM members heartiest congratulations to the bride and the bridegroom, and their family members.

Yours sincerely

Altaf Hussain
Founder and Leader
Muttahida Quami Movement (MQM)

متحدہ قومی موومنٹ کے قائد الطاف حسین صاحب کا خط

M. FAROOQ KATHWARI
Chairman, President and
Chief Executive Officer

Ethan Allen Drive
Danbury, CT 06811

Tel 203.743.8437
Fax 203.743.8524

FAX 92 51 445 0414 and MAIL

ETHAN ALLEN INC.

November 15, 2000

Dear Amanullah:

I was very happy to learn of the marriage of Asma with Sajad Lone. Our heartfelt congratulations to you and to your entire family.

I am particularly very happy having met Asma during my last visit to Islamabad. She is a very refined, intelligent young woman. Please give her my regards and very best wishes.

Again, Farida joins me in wishing you many congratulations and may God give long life and happiness to the couple.

Please also pass on our regards and felicitations to Lone Sahib and his family.

With kind regards.

Sincerely,

M. Farooq Kathwari

Mr. Amanullah Khan
Chairman, Jammu & Kashmir Liberation Front
144-B Satellite Town, near Chandni Chowk
Rawalpindi, Pakistan

کشمیر سٹڈی گروپ امریکہ کے سینئر رکن فاروق کاٹھواری کا خط

لیکن بوجوہ شرکت نہیں کر سکے) شبیر احمد شاہ صدر جموں کشمیر ڈیموکریٹک فریڈم پارٹی۔ مقبوضہ کشمیر کے سابق وزیر اعلیٰ عوامی نیشنل کانفرنس کے صدر اور مرحوم شیخ عبداللہ کے داماد جی ایم شاہ (شاہ صاحب اپنے بہت سے ساتھیوں کے ہمراہ شادی میں شرکت کیلئے آنے کے مقصد سے دہلی پہنچے تھے لیکن وقت پر ویزا نہ ملنے کی وجہ سے نہ آ سکے) عبدالاحد وکیل سپیکر قانون ساز اسمبلی، عبدالرشید چیئرمین لیجسلیٹو کونسل سرینگر، واشنگٹن سے غلام نبی فائی، لنڈن سے ڈاکٹر ایوب ٹھاکر، جناب غلام محمد بٹ امیر جماعت اسلامی مقبوضہ کشمیر، ڈاکٹر شیخ غلام مصطفےٰ کمال وزیر مقبوضہ کشمیر (فرزند شیخ محمد عبداللہ، انہوں نے دو صفحوں کے خط میں دعوت نامے کی پشت پر مسئلہ کشمیر سے متعلق میرے تبصرے کا تفصیلی اور مثبت جواب بھی دیا) فاروق کاٹھواری اہم ترین رکن کشمیر سٹڈی گروپ امریکہ، نذیر احمد مسعودی (برادر اصغر مولانا محمد سعید مسعودی شہید) عبدالرشید لون، غلام حسن کلو ایڈیٹر روزنامہ MIRROR سرینگر، مشہور صحافی غلام نبی خیال، سیف الدین لون اور اہلخانہ سرینگر، پروفیسر بھیم سنگھ، سربراہ جموں کشمیر پنتھر پارٹی، بھارت سے ہفت روزہ آؤٹ لک (OUTLOOK) کے ایڈیٹر انچیف ونود مہتہ، او۔ پی۔ شاہ کلکتہ، انسانی حقوق کے علمبردار راوی نیئر نئی دہلی، دہلی ہی سے پی۔ ایچ خان اور نیانا بوس (NAYANA BOSE) سرینگر سے صحافی علی عمران اور پاکستان میں بوسنیا ہرزگوینا کے سفیر شامل تھے۔

پاکستان سے جن اصحاب نے خطوط لکھے ان میں مشہور شاعر احمد فراز، جمیعت العلماء پاکستان کے سربراہ مولانا شاہ احمد نورانی مرحوم، متحدہ قومی موومنٹ کے سربراہ اور بانی جناب الطاف حسین، سابق صدر آزاد کشمیر مرحوم کے ایچ خورشید کی اہلیہ ثریا خورشید، پاکستان میں انسانی حقوق کی علمبردار محترمہ عاصمہ جہانگیر (انہوں نے اسماء کیلئے تحفہ بھی بھیجا تھا) امریکہ سے راجہ مظفر اور انکے اہلخانہ، لاہور سے جسٹس نسیم حسن شاہ سابق چیف جسٹس آف پاکستان، کراچی سے خواجہ نور محمد، خواجہ محمد یوسف اور خواجہ لیاقت آف کشمیر آرٹ ایمپوریم صدر اور اہلخانہ، برطانیہ میں مہاترے قتل کیس کے سلسلہ میں پابند سلاسل راجہ قیوم اور ملک ریاض، لاہور سے شیخ شمیم حسین آف کٹھوعہ، گلگت سے مصنف شیر باز خان برچہ اور پروفیسر عثمان علی، کراچی سے احسان خواجہ، لیوٹن برطانیہ سے ملک لطیف اور راجہ ظفر خان برطانیہ ہی سے ایم اے حسین، بشیر بہزام، شبیر چوہدری اور عظمت خان، اسلام آباد سے مرکزی وزیر عطیہ عنایت اللہ (ذاتی حیثیت میں اور خط کے ذریعہ مبارکباد دینے والی محترمہ مشہور کشمیری مورخ محمد دین فوق کی عزیزہ ہیں) برمنگھم سے محمد امین مرزا، لاہور سے انسانی حقوق کی علمبردار حنا جیلانی، اخبارِ جہاں کراچی کے مدیر جناب اخلاق احمد اور پورا عملہ، اودھے پور بھارت سے منور راہی اور لاہور سے شیخ عبدالقیوم نے خطوط، فیکس، ای میل اور ٹیلیگراموں کے ذریعہ مجھے مبارکباد دی اور سجاد اور اسماء کیلئے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ مجھے یقین ہے کہ شادی میں شریک اور خطوں وغیرہ کے ذریعہ مبارکباد دینے والوں میں اور بہت سے احباب بھی شامل تھے لیکن اس وقت یاد نہیں آ رہے ان سے دل کی گہرائیوں سے معافی چاہتا ہوں۔

رواج کے مطابق شادی میں شریک لوگ نقدی رقم اور تحفے دیتے ہیں (یہ مشرقی خاص کر مسلم معاشرے کا ایک انتہائی قابل قدر رواج ہے) چنانچہ اسماء کی شادی میں شریک جملہ خواتین واصحاب نے ایک بڑی رقم کے علاوہ بڑی تعداد میں تحفے بھی دیئے۔شادی میں شریک خاندان سے باہر کے کچھ مہمانوں نے پانچ پانچ ہزار روپے تک کی دست بوسی کی اور باقی اصحاب نے ایک سو سے تین ہزار تک کی کی۔میرے جن سیاسی اور ذاتی دوستوں نے میری بھاری مالی مدد کی ان میں برطانیہ خاص کر لنڈن اور لیوٹن کے احباب سرفہرست ہیں۔انکے علاوہ ناروے سے فاضل مغل، لیوٹن سے حاجی منظور، نارتھمپٹن سے چوہدری شبیر احمد، بیڈفورڈ برطانیہ سے حاجی فضل الٰہی، ہرڈلز فیلڈ سے چوہدری حنیف اور راسب کشمیری، جدہ سے خواجہ رشید، ابوظہبی سے محمد حمید خان، دہران سے راجہ حنیف اور سردار شریف، کراچی سے لطیف کاشمیری، کبیر بٹ، راجہ حاکم منہاس اور غلام محمد پہلوان، باغ سے راجہ ذوالفقار حیدر اور سردار شعیب، ارشد زرگر، کوٹلی کے امتیاز حسین کھوکھر، لنڈن سے ظفر شریف (مشترکہ مدد کے علاوہ) مانچسٹر سے محمد اقبال صاحب، آزاد کشمیر سے میرے دوسرے ذاتی اور تنظیمی احباب نے بھی خاصی مدد کی۔

میرے جن عزیزوں اور رشتہ داروں نے میری (میری توقعات سے کہیں زیادہ اور علاقائی رسم ورواج کے مطابق) مدد کی ان میں ڈاکٹر محبوب عالم (جنکا ذکر پہلے آیا ہے) کے علاوہ میرے (ایک ماں) بھائی عطی اللہ خان، کرنل نیاز اور محمد لطیف، چچازاد بھائی ڈاکٹر نور جلیل، بھانجے مولوی محمد صدیق، محبوب علی خان، سیف اللہ خان، جمشید علی، عبدالرحمٰن، ڈاکٹر رشید، بھتیجے انجینئر قدم خان، ایس پی محمد سلیم، برادران نسبتی بریگیڈیئر برکت علی خان، عبدالوحید ایگزیکٹو انجینئر، ایس ایس پی شوکت رشید، کرنل احمد سعید، انجینئر شاہد حمید، ڈاکٹر محمد نظیم، انجینئر طارق عزیز، انجینئر سعود خان، ڈاکٹر عثمان، ڈی ایف او عبدالقیوم، ڈی ایف او محمد ایوب، مشتاق احمد ایڈووکیٹ، اسلم عبداللہ، انجینئر رشید، امتیاز احمد جنگلوٹ، مرحوم مولوی محمد رضا، مولوی عبدالمنان، انجینئر محمود عالم اور ایکسی این رشید ڈموٹ شامل ہیں۔لیڈیز کی طرف سے نقد اور تحفے اس کے علاوہ تھے۔

جن عزیزوں نے شادی کے انتظامات کے سلسلے میں بہت دوڑ دھوپ کی ان میں میرے بھانجوں، بھتیجوں اور برادران نسبتی کے علاوہ ایس ایم افضل، منظور احمد خان، ارشاد ملک، محمود احمد ساغر، آغا صلاح الدین، امتیاز حسین کھوکھر، اعجاز احمد لون، انجینئر محمود عالم، رفیق لون، فاروق احمد، عبدالرحمٰن ساقی، افضل میر کے علاوہ سردار انیس اور لیاقت علی شامل ہیں۔باغ کے ارشد زرگر نے زیورات تیار کرنے کے سلسلے میں بڑی مدد کی۔

میرا داماد سجاد غنی لون جموں کشمیر پیپلز کانفرنس کے بانی چیئرمین شہید خواجہ عبدالغنی لون کا چھوٹا بیٹا ہے۔شہید لون صاحب جن کے آباؤاجداد ریاست جموں کشمیر کے شمالی علاقوں سے ہجرت کر کے ضلع کپواڑہ کے قصبہ ترہگام کے قرب وجوار میں آباد ہوئے تھے، ایک Selfmade انسان تھے۔انہوں نے بڑی محنت کر کے وکالت کی ڈگری حاصل کی اور سرینگر میں وکالت کے پیشے کے علاوہ سیاسیات کشمیر

سے بھی منسلک ہو گئے اور دو بار ریاستی کابینہ کے ممبر رہے۔ انہوں نے اپنی تنظیم پیپلز کانفرنس قائم کی اور مرحوم شیخ محمد عبداللہ کے نامزد امیدوار کو شکست دیکر اسمبلی کے ممبر بنے اور اسمبلی کے اندر بھی شیخ صاحب سے الجھنے کی جرأت کرنے والے وادیٔ کشمیر کے پہلے سیاسی لیڈر تھے۔ لون صاحب سے میری شناسائی 1976ء سے تھی۔ شہید مقبول بٹ ہم دونوں کے مشترکہ دوست تھے۔ لون صاحب نے 1988ء میں شروع ہونے والی مسلح جدوجہد میں بھی ابتدائی دور میں گو بالواسطہ طور پر بھرپور حصہ لیا لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ حریت کانفرنس کا قیام تھا جس میں انہوں نے کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ وہ ایک انتہائی صاف گو اور اعلےٰ اخلاقی جرأت کے مالک سیاستدان تھے۔ اور یہی دو خصوصیات بالآخران کیلئے جان لیوا ثابت ہوئیں اور وہ 21 مئی 2002ء کو کچھ بندوق برداروں کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔ بیگم لون ایک حوصلہ مند خاتون ہیں اور 1947ء میں ہندوارہ سکول میں میرے استاد غلام احمد گنائی صاحب کی صاحبزادی ہیں۔ شہید لون صاحب کے بڑے صاحبزادے بلال غنی لون بزنس مین ہیں جن کی دو بیٹیاں ماریا اور ادا ہیں ان کی بیگم فرحت بلال لون ایک انتہائی ملنسار اور سنجیدہ خاتون ہیں جبکہ شہید کی صاحبزادی شبنم غنی لون سرینگر ہائی کورٹ اور بھارتی سپریم کورٹ کی معروف وکیل ہیں۔

میرے داماد سجاد غنی لون نے تعلیم سرینگر اور برطانیہ میں حاصل کی ہے۔ وہ کچھ مدت سعودی عرب اور دبئی میں بزنس بھی کرتے رہے اس سے پہلے تحریک آزادی سے منسلک ہونے کی بناء پر وہ اگست 1990ء میں گرفتار بھی ہوئے تھے۔ نومبر 2000ء میں شادی کے بعد سے کشمیر میں ہی ہیں اور مئی 2002ء میں اپنے والد کی شہادت کے بعد انہیں پارٹی نے پیپلز کانفرنس کا چیئرمین منتخب کیا۔

سجاد غنی لون ایک بیدار مغز تحریک آزادی سے متعلق دور جدید کے تقاضوں اور زمینی حقائق سے پوری طرح باخبر اور مضبوط اخلاقی جرأت اور مقناطیسی (Charismatic) شخصیت کا مالک ایک نوجوان ہے اسکے باوجود اسکا سیاسی راستہ انتہائی کٹھن ہے اور اس کی چھوٹی سی سیاسی غلطی بھی اسکی مشکلات میں بے حد اضافہ کر سکتی ہے۔

شادی سے متعلق کچھ دلچسپ واقعات وحقائق

1- بھارت اور پاکستان کی حکومتوں میں حال ہی تک ہمارے نظریۂ خودمختار کشمیر اور ہماری تنظیم کی مخالفت واحد قدر مشترکہ تھی یعنی دونوں ان کی مخالفت کرتے تھے چنانچہ میری بیٹی کی شادی میں بھی انہوں (بھارت اور پاکستان کی حکومتوں) نے باہمی یکجہتی کا مظاہرہ کیا۔ میں نے دونوں کے اہم ستونوں کو مدعو کیا تھا۔ پاکستان کے وزیر خارجہ اور گورنر سرحد نے مجھ سے وعدہ بھی کیا تھا کہ وہ خود شرکت کریں گے لیکن کسی نے نہیں کی۔ یہاں تک کہ بجز صدرِ پاکستان دونوں حکومتوں کے کسی فرد نے رسمی خط لکھنے کی تکلیف بھی نہیں کی۔ یہی نہیں بلکہ دونوں کی سرکاری الیکٹرانک میڈیا نے بھی شادی کا نام تک نہیں لیا۔ جبکہ دونوں ملکوں کے پرائیویٹ اور پرنٹ میڈیا کے علاوہ عالمی میڈیا نے بھی اسے فل کوریج دیدی۔

2- میں نے جملہ مجاہد لیڈروں کو مدعو کیا تھا کچھ خود آئے کچھ نے تحفے اور دستبوسی بھیجی لیکن اکثر 'اوپر والوں' کی ناراضگی کے ڈر سے نہیں آئے۔

3- نظریہ خودمختار کشمیر کے بزرگ علمبردار عبدالخالق انصاری ایڈووکیٹ آف میرپور ضعیفی اور علالت کے باوجود ہوٹل کے دروازے پر کھڑے تھے۔ میں نے اندر نشست پر بیٹھنے پر اصرار کیا تو برہم ہو کر کہنے لگے میں یہاں داماد کا استقبال کرنے اور بیٹی کو رخصت کرنے آیا ہوں بیٹھنے کیلئے نہیں آیا۔

4- میرے تنظیمی ساتھی باغ آزاد کشمیر کے ارشد زرگر شادی سے چند دن پہلے زیورات سے متعلق ایک معاملے کے بارے میں مشورہ اور مدد دینے میرے گھر آئے۔ انکے معمر والد خواجہ فتح محمد صاحب بھی انکے ساتھ تھے۔ چائے پیتے ہوئے مجھ سے کہنے لگے امان صاحب آپ کے سینے میں دل کی بجائے پتھر تو نہیں۔ میں نے پوچھا کیوں؟ کہنے لگے ایک ہی بیٹی اور اسے بھی سرحد پار پھینک دیا ایسا کوئی پتھر دل والا ہی کر سکتا ہے۔

5- میں ابتداء میں شادی کے انتہائی ضروری اور بنیادی اخراجات بھی پورے کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا ادھر عبدالغنی لون صاحب سرینگر سے رشتے کے بارے میں جلد از جلد مثبت جواب دینے کیلئے پیغام پر پیغام بھیج رہے تھے۔ آخر ہم نے خاصی سوچ بچار کے بعد مثبت جواب دینے کا ہی فیصلہ کر لیا اور اسکی اطلاع فون کے ذریعہ لون صاحب اور انکی بیگم کو دیدی۔ ابھی فون چھوڑے چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ انتہائی غیر متوقعہ طور پر ہماری جنگلوٹ گلگت والی زمین کیلئے خریدار (میرے ماموں زاد بھائی مرحوم محمد اسماعیل خان کی بیٹی) کا فون آیا اور انہوں نے خاصی معقول آفر دی۔ چند دن بعد ہمیں زمین کی مناسب قیمت مل گئی اور میری جان میں جان آ گئی۔ مجھے اس سے قبل بھی کئی بار خاص کر اپنی شادی کے موقع پر بھی ایسے ہی خوشگوار واقعات پیش آئے جب عین موقع پر اور انتہائی غیر متوقع طور پر میری مشکل کشائی ہوتی رہی۔

6- لبریشن فرنٹ کے ایک شہید غضنفر جنجوعہ آف کوٹلی آزاد کشمیر (وہ 1993ء میں ترہگام کپواڑہ میں شہید ہوئے تھے) کی نابینا والدہ کوٹلی سے شادی میں شرکت کیلئے راولپنڈی آئیں اور اسماء کو تحفے میں ایک خوبصورت انگوٹھی دیدی۔

7- پاکستان ہائی کمیشن نئی دھلی نے میرے مہمانوں کو ویزا جاری کرنے میں غیر ضروری تاخیر کی جسکی وجہ سے وہ ناامید ہو کر واپس چلے گئے۔ البتہ سرینگر کے انجینئر ہلال احمد وار شادی کے دو دن بعد یہاں پہنچے لیکن میں انتہائی مصروفیت کی وجہ سے انکی مناسب مہمان نوازی نہ کر سکا۔ کلکتہ کی مشہور شخصیت او۔ پی۔ شاہ سمیت میرے اور بہت سے مدعوین کو بھی ویزا نہیں ملا۔

8- میں نے برمنگھم برطانیہ میں چھ سال گزارے تھے اور وہاں میرے ساتھیوں نے میرا بہت خیال رکھا تھا ان میں سے اکثر کا تعلق میرپور آزاد کشمیر سے ہے۔ 1982ء میں ان میں سے بہت سے اصحاب سیاسی طور پر مجھ سے الگ ہو گئے اسکے باوجود میرے دل میں ان کے لئے (ذاتی طور پر) خاصا احترام ہے اور میں نظریہ خودمختار کشمیر کیلئے انکی خدمات کا معترف ہوں۔ میں نے ان سب اصحاب کیلئے دعوت نامے

ایک ساتھ برمنگھم کے محمود نظامی صاحب مرحوم کے ایڈریس پر بھیجے لیکن ایڈریس غلط ہونے کی وجہ سے انہیں دعوت نامے وقت پر نہیں ملے جسکا علم مجھے شادی کے بعد ہوا۔ ایسے کچھ دوسرے اصحاب کو میں مدعو نہ کر سکا جنہیں مدعو کرنا ضروری تھا۔ ان دونوں واقعات کا مجھے بہت افسوس ہوا۔

9- شادی میں دنیا بھر کے میڈیا کے نمائندے معہ اپنے کیمروں کے حاضر تھے۔ بارات کی آمد پر کوئی ٹی وی CREW کیمرہ چلانے کے ساتھ ساتھ کمنٹری بھی کر رہا تھا غالباً کوئی چینل اسے LIVE ٹیلی کاسٹ کر رہا تھا۔ ہال میں سٹیج کے سامنے تقریباً آدھ گھنٹے تک کیمرہ والوں کا قبضہ رہا۔ انہیں بڑی مشکل سے وہاں سے ہٹایا جا سکا۔ اکثر بڑے میڈیا خاص کر نشریاتی اداروں کے اسلام آباد میں متعین بیورو چیف آئے تھے۔ بی بی سی کی سوزانے پرائس (Suzzane Price) نے میرا تفصیلی انٹرویو کیا اور تقریبات اور سرگرمیوں پر کمنٹری بھی ریکارڈ کرتی رہی۔ این ڈی ٹی وی کی برکھا دت بہت سرگرم تھی وہ تو ایک دن پہلے صحافیوں کیلئے سخت ممانعت کے باوجود نکاح کے موقع پر نکاح والے کمرے میں معہ اپنے کیمرے کے زبردستی گھس آئی تھی۔ بھارت کے ایک ٹی وی چینل نے ہمارے دو ساتھیوں حافظ انور ساوی اور کمانڈر فاروق جنکے قد اونچے اور داڑھیاں خاصی لمبی ہیں کو بار بار دکھایا۔ مقصد شاید یہ بتانا تھا کہ لبریشن فرنٹ میں بھی بہت سے دہشت گرد (جہادی) ہیں۔

10- شادی کی خبر بھارت اور پاکستان کے اخبارات میں پہلی، دوسری یا تیسری لیڈ الغرض نمایاں طور پر شائع ہوئی۔ اسلام آباد کے روزنامہ اوصاف نے اسماء کی (شادی کی) تصویر میگزین کے پہلے صفحے پر شائع کی۔ ہفتہ بھر اخبارات اور رسائل میں شادی پر تبصرے شائع ہوتے رہے۔ بی بی سی، وائس آف امریکہ، ریڈیو جرمنی، ریڈیو تہران میں خبر اور اس پر تفصیلی تبصرے نشر ہوئے۔

الغرض یہ شادی ہر حیثیت سے ایک تاریخی شادی تھی۔



(اوپر) سجاد اور اسما اپنے والدین نسبتی کے ساتھ (درمیان) سجاد اور اسما اپنی خوشدامنوں
کے ساتھ (نیچے) میں اسما مسز لون، سرینگر کی ایک خاتون اور بچیوں کے ساتھ



(اوپر) دولہا اور عبدالغنی لون صاحب آزاد کشمیر کے سابق وزرائے اعظم کے ساتھ (درمیان) پہلی صف جسٹس مجید ملک، سردار سکندر حیات خان، پنڈت بھوشن بزاز اور یوسف بچھ (اقوام متحدہ کے سابق اسسٹنٹ سیکرٹری جنرل) (نیچے) گوہر ایوب خان سابقہ وزیر خارجہ پاکستان، میر واعظ محمد احمد اسحاق ظفر، فاروق رحمانی۔







میرے عزیز و اقارب شادی سے متعلق مختلف تقریبات میں



(اوپر) اسما (1) اپنی بڑی اور منجھلی خالہ اور کچھ اور خواتین کے ساتھ (2) لیزا عابدہ اور سائمہ کے ساتھ (3) چچازاد نسیم، یاسمین، چچی صفیہ اور بچوں کے ساتھ (نیچے) درمیان میں اسما کے جڑواں بیٹے عدنان اور عماد جنوری 2005ء دو ماہ کی عمر میں۔ (دائیں طرف) رومانہ نیر بچوں کو لیے ہوئے (بائیں) رشتہ دار اسما کے نکاح کے موقع پر

حصہ دہم

قِصّہ مختصر

1- کشمیریوں کی طویل غلامی کا ذمہ دار کون
2- بھارت اور پاکستان کی کشمیر پالیسیوں کے نتائج
3- نظریۂ خودمختار کشمیر۔ کیا یہ قابل عمل ہے؟
4- مسئلہ کشمیر کے جمہوری حل تک پہنچنے کا مختصر ترین راستہ
5- مسئلہ کشمیر کا بہترین قابل عمل حل
6- ہمارے جرأت مندانہ اقدامات
7- ہماری مسلح جدوجہد آزادی کامیاب ہوجاتی اگر.....
8- کشمیریوں کی نظریاتی تقسیم
9- متضاد سیاسی کلچر
10- نظریۂ خودمختار کشمیر اور پاکستان کے حکمران
11- کشمیر میں مسلح جدوجہد آزادی کے مخالفین کی خدمت میں
12- بھارت کے وزیراعظم کے گلے میں پھندا
13- زندہ امان اللہ اور اسکی لاش
14- بیلجیئم جیل کے دلچسپ واقعات
15- گلگت بلتستان
16- میری زندگی کے نشیب و فراز
17- زحمتیں رحمتوں میں بدلتی گئیں
18- اپنی جدوجہد سے مطمئن ہوں۔ نتیجے سے نہیں
19- تاریخ کے دو اہم سبق
20- میری وصیت

قصّہ مختصر

قارئین کرام ! کتاب کے اس آخری باب میں میں نے پوری کتاب میں درج اہم حقائق اور واقعات کا خلاصہ اوران کے بارے میں میرا اپنا تجزیہ پیش کیا ہے وہ بھی مختلف عنوانوں کے تحت تا کہ آپ کے سامنے ان حقائق وواقعات کی بھی ایک واضح تصویر آجائے اور اس تصویر سے حاصل ہونے والے اسباق کی بھی۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ کتاب میں بیان کئے گئے اکثر واقعات کا ماخذ میرا اپنا حافظہ ہے اور تجزیوں کا ماخذ میرا ذہن جس نے غیر جانبدارانہ مشاہدے، تنقیدی مطالعے، گہری جانچ پڑتال اور ذاتی معائنوں کے ذریعے یہ نتائج (تجزیئے) اخذ کئے۔

میرا عام روایات سے ہٹ کر یہ جسارت کرنے کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ 23 صفحات پر مشتمل (قصہ مختصر کے زیر عنوان) یہ خلاصہ اور تجزیہ پڑھ کر آپ لوگوں کے ذہن میں تقریباً چار سو صفحات پر مشتمل کتاب میں درج اہم معاملات اور حقائق کے بارے میں ایک واضح شبیہہ ابھر آئے اور آپ لوگ اس سے پورا استفادہ کرسکیں لیکن یہ استفادہ اسی صورت میں بہترین استفادہ ثابت ہوسکتا ہے جب آپ اس باب سے پہلے پوری کتاب ایک بار (سرسری طور پر ہی سہی) پڑھ چکے ہوں اور آپ کے ذہن میں اس خلاصے اور تجزیے کے پس منظر کی تفصیلات بھی ہوں۔ میری دلی خواہش ہے کہ آپ لوگ کتاب اور اس کے مندرجات سے پورا استفادہ کریں۔ یہی میری محنت کا بہترین صلہ ہوگا۔

امان اللہ خان

1- کشمیریوں کی طویل غلامی کے ذمہ دار کون

1945ء میں انجمن اقوام متحدہ کے قیام کے وقت اسکے ممبروں (دنیا کی خودمختار قوموں) کی تعداد 50 تھی (اکاونواں ممبر متحدہ ہندوستان تھا لیکن وہ اس وقت خودمختار نہیں تھا بلکہ آزادی کی منزل کے حصول کے آخری مرحلوں میں تھا) اور آج 2004ء میں اسکے رکن ممبروں کی تعداد 191 ہے یعنی گزشتہ 59 سال کے دوران دنیا کی 140 محکوم قومیں آزاد ہوگئیں لیکن کشمیری (جنکی جدوجہدِ آزادی ان آزاد ہونے والی قوموں میں سے اکثر کی جدوجہد سے کہیں زیادہ ہے اور جو تعلیم، سیاسی شعور وغیرہ میں ان آزاد قوموں میں سے اکثر سے کہیں آگے ہیں) آج بھی بقول اقبال ''محکوم ومجبور واسیر'' ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کشمیریوں کے ساتھ ہونے والے اس ظلم اور ناانصافی کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔

میں نے اس اہم سوال کا جواب ریاست جموں کشمیر کی تاریخ، مسئلہ کشمیر اور جدوجہد آزادی کی

تاریخ، بھارت، پاکستان اور عالمی برادری کی مسئلہ کشمیر سے متعلق پالیسی اور طرز فکر و عمل، ریاست کے ہر علاقے کی ماضی کی اور موجودہ قیادت کے طرز فکر و عمل اور موجودہ زمینی حقائق میں ڈھونڈا اور اس کا غیر جانبدارانہ اور حقیقت پسندانہ تجزیہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کشمیریوں کی اس مسلسل غلامی کی 30 فیصد ذمہ داری بھارت (کی وعدہ خلافیوں۔ دروغ گوئیوں۔ سفاکی اور نوآبادیاتی طرز عمل) پر، 20 فیصد پاکستان (کی حماقتوں، دروغ گوئیوں، کشمیر پالیسی میں بار بار کی تبدیلیوں جن میں درجن بھر یوٹرن بھی شامل ہیں، معذرت خواہانہ طرز عمل، وعدہ خلافیوں اور نوآبادیاتی طرز عمل) پر، 10 فیصد عالمی برادری (کی فرض ناشناسی۔ حق و انصاف کو بڑی طاقتوں کے قومی مفادات پر قربان کرنے اور بھارت اور پاکستان کی ناراضگی سے بچنے کیلئے کشمیریوں کے مفاد کو نظر انداز کرنے) پر اور 40 فیصد ذمہ داری ریاست کے تمام حصوں کی ماضی اور حال کی قیادت (کی فرض ناشناسی۔ ذاتی اور گروہی مفاد پر قومی مفاد کو قربان کرنے، اپنے (کشمیری) قومی مفاد پر بھارت یا پاکستان کے مفاد کو ترجیح دینے، حصول و تحفظ اقتدار اور مالی مفادات کیلئے قومی مفاد کو قربان کرنے اور اتحاد فکر و عمل کے فقدان) پر عائد ہوتی ہے۔ مختصر الفاظ میں کشمیریوں کی غلامی کی 30 فیصد ذمہ داری بھارت پر 20 فیصد پاکستان پر 10 فیصد عالمی برادری پر اور 40 فیصد ذمہ داری جنگ بندی لائن کے دونوں طرف کی سابقہ اور موجودہ سیاسی قیادت پر عائد ہوتی ہے۔

2- بھارت اور پاکستان کی کشمیر پالیسیوں کے نتائج

مسئلہ کشمیر کو بھارت ہی اس مطالبہ کے ساتھ اقوام متحدہ میں لے گیا تھا کہ پاکستان کو کشمیر میں جارحیت کا مرتکب قرار دیا جائے۔ بھارت نے اپنے اس دعوے کے باوجود کہ مہاراجہ کا بھارت سے الحاق قانونی اور آئینی حیثیت سے مکمل ہے 15 جنوری 1948ء کو سلامتی کونسل میں اعلان کیا کہ بھارت کشمیریوں کے اس حق کو تسلیم کرتا ہے کہ کشمیر میں حالات معمول پر آتے ہی کشمیری عوام یہ فیصلہ کریں کہ آیا کشمیر کو بھارت کے ساتھ رہنا چاہیئے، پاکستان کا حصہ بننا چاہیئے یا آزاد ہو کر اقوام متحدہ کا ممبر بننا چاہیئے۔ لیکن اقوام متحدہ نے پاکستان کو جارح قرار دینے کی بجائے ریاست میں رائے شماری تجویز کی جس پر بوجوہ عمل نہ ہو سکا۔ پاکستان شروع سے ہی MIS- REPRESENTATION OF FACTS (حقائق کو غلط طریقے سے پیش) کرتا رہا اور وہ بھی انتہائی بھونڈے طریقے سے۔ جبکہ بھارت MIS-INTERRETATION OF FACTS (یعنی حقائق کی غلط تشریح) کرتا رہا وہ بھی ٹھوس منصوبہ بندی کے تحت۔ مسئلہ کشمیر پر بھارت عام طور پر جارحانہ انداز اپناتا رہا اور پاکستان معذرت خواہانہ۔ اس ساری صورتحال کا نتیجہ یہ ہے کہ مسئلہ کشمیر سے متعلق بھارت اور پاکستان کی موجودہ پوزیشن آج سے پچاس سال پہلے کی پوزیشن کے بالکل الٹ ہے۔ آج سے پچاس سال پہلے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں پاکستان کے موقف کو کونسل کے گیارہ میں سے دس ووٹ ملتے تھے جبکہ آج پاکستان سلامتی کونسل کا ممبر ہونے کے باوجود اس ڈر سے اس مسئلے پر کونسل میں بحث کا مطالبہ بھی نہیں کرتا کہ ایسا نہ ہو کہ

پاکستان کے موقف کے خلاف ہی کوئی قرارداد منظور ہو جائے۔ آج سے پچاس سال پہلے دنیا پاکستان کو کشمیریوں کا صحیح ہمدرد اور انکی خواہشوں کا ترجمان سمجھتی تھی اور آج عالمی سطح پر اور خاصی حد تک کشمیریوں میں بھی (بجز تینوں حصوں کے اقتدار پرستوں کے) عام تاثر یہی ہے کہ بھارت کی طرح پاکستان کو بھی کشمیریوں کے مفادات اور جذبات کی بجائے سرزمین کشمیر کی ملکیت میں ہی دلچسپی ہے۔

3- نظریۂ خودمختار کشمیر۔ کیا یہ قابل عمل ہے؟

کشمیر جسکی سرحدیں وقفے وقفے سے بڑھتی اور گھٹتی رہی ہیں اپنی تاریخ کے بڑے حصے کے دوران ایک آزاد خودمختار مملکت رہا ہے۔ مسلمانوں کے اس کے سیاسی منظر پر آنے سے پہلے یہاں 21 خاندانوں نے حکومت کی تھی جن میں سے 18 خاندانوں کی حکومت کے دوران یہ ایک آزاد خودمختار ملک تھا۔ 1947ء سے پہلے مسلمانوں نے کشمیر پر 480 سال (1339ء سے 1819ء تک) حکومت کی جس میں نصف سے زیادہ مدت (246 سال) تک وہ ایک خودمختار ملک تھا۔ کشمیر کی تاریخ اس بات کا واضح ثبوت پیش کرتی ہے کہ جب بھی وہ خودمختار رہا قومی زندگی کے ہر میدان میں عروج پر رہا اور جب بھی وہ دوسروں کے ماتحت رہا خواہ اس کے آقا مسلمان تھے، ہندو تھے، سکھ تھے یا انگریز، وہ پستیوں میں گرتا رہا۔ یہاں تک کہ انگریزوں نے 1846ء میں اسے اسکی آبادی سمیت بھیڑ بکریوں کی طرح ایک حقیر رقم کے عوض بیچ ڈالا۔

بھارت اور پاکستان کے سب سے اہم لیڈروں نے کشمیریوں کے حق خودمختاری کو تسلیم کیا ہے۔ بھارت نے تو اس حق کو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں بھی تسلیم کیا ہے۔ پاکستان کے اکثر حکمران ذاتی طور پر اور نجی محفلوں میں اسکی حمایت کرتے رہے ہیں لیکن فوج۔ افسر شاہی اور میڈیا کے ڈر سے اعلانیہ طور پر اسکی حمایت نہیں کر سکتے۔

جہاں تک اس نظریئے کے قابل عمل ہونے کا تعلق ہے یہ سو فیصد قابل عمل ہے۔ کشمیر آبادی کے لحاظ سے دنیا کے (191 میں سے) 132 خودمختار ملکوں سے اور رقبہ کے لحاظ سے 102 سے بڑا ہے۔ اسکی شرح خواندگی دنیا کے اکثر ملکوں سے کہیں زیادہ ہے۔ کشمیر کے دریاؤں سے اتنی بجلی پیدا ہو سکتی ہے کہ ہم اسے بڑی مقدار میں برآمد کر سکتے ہیں۔ ہمیں سیاحت اور اپنی مصنوعات (قالین، شال، دیگر دستکاریوں، گھڑیوں اور جڑی بوٹیوں وغیرہ) کی برآمد سے اپنی ضرورت سے کہیں زیادہ زرمبادلہ مل سکتا ہے۔ یہاں بڑے بڑے کارخانے قائم ہو سکتے ہیں۔ زراعت اور جنگلات کو بہت ترقی دی جا سکتی ہے۔ اسلئے ماہرین معاشیات کا یہ کہنا غلط نہیں کہ ایک آزاد و خودمختار کشمیر اپنی آزادی کے پندرہ بیس برس کے اندر اندر جنوبی ایشیا کا خوشحال ترین ملک بن سکتا ہے اسلئے کسی کو اسکی معیشت سے متعلق کوئی فکر نہیں ہونی چاہیئے۔

جہاں تک خودمختار کشمیر کے دفاع کا تعلق ہے ہمارے پاس دو راستے ہیں۔ پہلا راستہ یہ ہے کہ ہم اپنے تمام ہمسایوں سے معاہدہ کریں کہ ہم اپنی سرزمین کو ان میں سے کسی کے خلاف استعمال ہونے

نہیں دینگے۔ نہ وہ ہمارے اندرونی معاملات میں دخل دیں اور نہ ہی ہماری سرحدوں کو چھیڑیں۔ اسطرح ہم اپنے دفاع کے بارے میں بے فکر ہو سکتے ہیں۔ اگر اس راستے میں مشکلات کھڑی ہوگئیں تو پھر اپنے ہمسایوں میں سے کسی ایک یا دو سے دفاعی معاہدہ کر کے اپنے دفاع کو نا قابل تسخیر بنا سکتے ہیں۔

الغرض نہ صرف یہ کہ بھارت پاکستان اور عالمی برادری کشمیریوں کو خودمختاری دینے کی اخلاقی طور پر پابند ہیں بلکہ نظریۂ خودمختار کشمیر معاشی اور دفاعی لحاظ سے بھی پوری طرح قابل عمل ہے۔

4- مسئلہ کشمیر کے جمہوری حل تک پہنچنے کا مختصر ترین راستہ

مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کا مختصر ترین طریقہ تو یہی ہے کہ 14 اگست 1947ء والی ریاست جموں کشمیر کے تمام حصوں کے سیاسی رہنما اپنی علاقائی، مذہبی اور نظریاتی حیثیت کے علاوہ بھارت اور پاکستان سے اپنی وابستگی کو ایک طرف رکھ کر صرف ریاستی باشندے بنیں اور ''ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق صرف ریاستی عوام کو حاصل ہے'' کے یک نکاتی فارمولے پر متفق ہو کر اس حق کے حصول کے لئے سیاسی، مسلح اور سفارتی سطح پر بھرپور تحریک چلائیں تو مجھے یقین ہے کہ بھارت اور پاکستان دونوں سال دو سال کے اندر اندر کشمیریوں کے اس متفقہ مطالبے کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں گے اور اگر وہ نہ ہوئے تو عالمی برادری انہیں ضرور مجبور کرے گی۔ لیکن ماضی اور حال کے تلخ حقائق اور تجربے اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ کشمیری قیادت کا اس حد تک متحد ہونا تقریباً ناممکن ہے کیونکہ ان میں سے اکثر کی اقتداری مجبوریاں، مالی مفادات اور بھارت اور پاکستان سے ذہنی یا مالی وابستگی انہیں کشمیریت کے اس ارفع مقام تک پہنچنے کی اجازت نہیں دیتیں چنانچہ مسئلہ کا یہ حل بہترین اور آسان ترین ہونے کے باوجود ناقابل عمل معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال اسکی کوشش ضروری ہونی چاہیئے۔

5- مسئلہ کشمیر کا بہترین قابل عمل حل

ماضی اور حال کے تلخ اور شیریں تجربوں اور ریاستی، بھارتی، پاکستانی اور عالمی سطح کے زمینی حقائق کی روشنی میں مسئلہ کشمیر کا قابل عمل، پرامن، منصفانہ، آبرومندانہ، جمہوری اور مستقل حل یہ ہے کہ ارفع مقام اور مضبوط کردار کی حامل عالمی شخصیات پر مشتمل ایک 11 رکنی انٹرنیشنل کشمیر کمیٹی کے زیر اہتمام منقسم ریاست جموں کشمیر کو پانچ پرامن مرحلوں میں دوبارہ متحد کر کے وہاں ایک ایسی آزاد و خودمختار مملکت قائم کی جائے جس کا طرز حکومت جمہوری، وفاقی اور غیر فرقہ ورانہ ہو اور جسکے بھارت اور پاکستان دونوں کے ساتھ لازمی دوستانہ تعلقات ہوں۔ 15 سال بعد عالمی برادری کے زیر اہتمام ایک صاف اور شفاف ریفرنڈم ہو جس میں کشمیری عوام یہ فیصلہ کریں کہ ریاست کی خودمختاری کو ہی مستقل شکل دی جائے، اسے بھارت یا پاکستان کا حصہ بنایا جائے یا مسئلے کا کوئی اور متفقہ یا اکثریتی حل نکالا جائے۔ (پہلے آپشن کو 50 فیصد سے زیادہ ووٹ نہ ملنے کی صورت میں یہ ریفرنڈم دو یا دو سے زیادہ بار کرانا پڑے گا تا آنکہ کسی

ایک حل کو 50 فیصد سے زیادہ ووٹ ملیں) اور اس عوامی فیصلے کو مسئلے کے تمام فریق اس کا حتمی حل تسلیم کر کے اسے عملی جامہ پہنائیں۔

یہ حل مسئلہ کشمیر کا واحد ممکنہ حل ہے جسکے نتیجے میں نہ بھارت یا پاکستان کی قومی انا مجروح ہوتی ہے کیونکہ کسی ایک فریق کو بھی اسکے زیر انتظام کشمیر دوسرے کے حوالے کرنے کیلئے نہیں کہا گیا۔ نہ دونوں کے جائز مفادات خاص کر قومی سلامتی کو کوئی خطرہ لاحق ہو جاتا ہے کیونکہ کشمیر کے دونوں کے ساتھ لازمی دوستانہ تعلقات ہونگے۔ اسکے علاوہ نہ اسکے نتیجے میں کسی قسم کی خونریزی کا خطرہ ہے نہ بڑے پیمانے کی انتقال آبادی کا اور سب سے اہم بات یہ کہ اس مسئلے کا حتمی حل کشمیری عوام کی آزادانہ طور پر ظاہر کی گئی خواہشات پر مبنی ہوگا۔

6- ہمارے جرأت مندانہ اقدامات

میں نے زندگی میں تحریک آزادئ کشمیر کو تقویت دینے، گلگت بلتستان کے آئینی، سیاسی اور معاشی حقوق اور ریاست کے تینوں حصوں کے عوام کو ایک دوسرے کے نزدیک لانے اور نظریۂ خود مختار کشمیر کو تقویت دینے کیلئے بڑی تعداد میں انتہائی جرأت مندانہ اقدامات کئے ہیں جن میں سے کچھ کی مختصر تفصیلات پیش خدمت ہیں

(الف) میں نے 27 نومبر 1970ء کو گلگت میں (جلسہ عام کرنے کی اجازت نہ ملنے کے بعد) ایک جیپ پر لاؤڈ سپیکر لگا کر تقریر کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں کے ساتھ گلگت شہر کے دو چکر لگائے۔ میں تقریر میں وہاں کے عوام کو ان کے آئینی، سیاسی اور معاشی حقوق سے آگاہ کرنے، ان کے ساتھ ہونے والے مظالم کا احساس دلانے کے علاوہ یہ بھی اعلان کرتا رہا کہ ریذیڈنٹ (گلگت بلتستان کا پاکستانی حاکم جو اپنے آپ کو وہاں کی ہر چیز کا مالک اور قانون سے بالاتر سمجھتا تھا) تم لوگوں کا خدا نہیں نوکر ہے۔ اسے تمہاری خدمت کرنے کیلئے ہی تنخواہ ملتی ہے اسے اپنا خدا نہیں اپنا نوکر سمجھو۔ اس علاقے میں اس قسم کی تقریر موت کو دعوت دینے کے مترادف تھی اور مجھے اس بات کا پورا احساس بھی تھا لیکن میرے قومی فرض کے احساس نے مجھے ایسا کرنے کی جرأت عطا کی تھی۔ حسب توقع مجھے تیسرے راؤنڈ پر گرفتار کیا گیا اور 15 ماہ تک قید رکھا گیا۔ میرے خلاف ایف۔سی آر اور تعزیراتی قانون کی اتنی دفعات لگائی گئیں جس کی کل سزا تین سزائے موت اور 191 سال قید ہوتی تھی۔ بہر حال میرے اس اقدام نے عوام میں سیاسی بیداری لانے اور اپنے حقوق کا احساس دلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ جسکا نتیجہ دو ماہ بعد یعنی جنوری 1971ء کی عوامی تحریک کی صورت میں نکلا۔

(ب) 13 اکتوبر 1980ء کو میں نے اپنی تنظیم کی نیویارک شاخ کے چار ممبروں سلطان محمود بھٹی، محمود احمد، مشتاق خان اور محمد یاسین جنجوعہ کو اقوام متحدہ کے جنرل اسمبلی ہال کی وزیٹرز گیلری کے چاروں کونوں میں بٹھا دیا جنہوں نے بھارتی وزیر خارجہ کی تقریر شروع ہوتے ہی یکے بعد دیگرے آزادئ کشمیر

سے متعلق نعرے لگائے اور پمفلٹ نیچے پھینکے جو ہال میں جا کر چاروں طرف پھیل گئے۔ نعرے بازی کا یہ سلسلہ پندرہ بیس منٹ جاری رہا کیونکہ ایک ساتھی کی گرفتاری کے بعد ہی دوسرا دوسرے کونے سے نعرے بازی شروع کرتا اس طرح اس جرأت مندانہ اقدام نے ہمارے نظریات اور مطالبات کو دنیا کے 155 ملکوں کے وزرائے خارجہ، سینئر سفارتکاروں اور عالمی میڈیا تک پہنچا دیا۔

(ج) جموں کشمیر لبریشن فرنٹ نے میرے بنائے ہوئے منصوبے کے تحت کشمیر میں جنگ بندی لائن پر چار جرأت مندانہ حملے کئے۔ پہلی بار 12 فروری 1992ء کو کئی ہزار افراد اور بڑی تعداد میں عالمی میڈیا کے نمائندوں کی معیت میں (جبکہ بی بی سی ٹی وی والے ہیلی کاپٹر سے ساری کارروائی کور کر رہے تھے) ہم مظفر آباد سے تقریباً پچاس کلومیٹر کا سفر پیدل طے کر کے جنگ بندی لائن کے نزدیک پہنچے۔ گو پاکستانی فوج نے ہمیں جنگ بندی لائن پر پہنچنے نہیں دیا اور ہمارے سات ساتھیوں کو شہید اور پچاس کو زخمی کر دیا لیکن ہم اپنے ثانوی مقصد (یعنی مسئلہ کشمیر، تحریک آزادیٔ اور نظریۂ خودمختار کشمیر کو عالمی سطح پر اجاگر کرنے اور بھارتی مقبوضہ کشمیر کے عوام کو یہ یقین دلانے میں پوری طرح کامیاب رہے کہ آزاد کشمیر کے عوام ان کے ساتھ ہیں) ہماری اس سلسلے کی دوسری، تیسری اور چوتھی کوشش کے نتیجے میں بھی مسئلہ کشمیر، ہماری تحریک، ہمارے نظریئے اور ہماری تنظیم عالمی سطح پر اجاگر ہوئے۔ ہمارے ان اقدامات کی تفصیل کتاب کی تیسری جلد میں شامل ہوگی۔

(د) لبریشن فرنٹ نے 1988ء میں بھارتی مقبوضہ کشمیر میں مسلح جدوجہد آزادی شروع کرنے کا جرأت مندانہ قدم اٹھا کر مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادیٔ کشمیر کو نئی زندگی دیدی۔

(ر) میں نے جون 1990ء میں خودمختار ریاست جموں کشمیر کے لئے ایک عبوری حکومت کے قیام کا جرأت مندانہ اعلان کیا اور اس میں ریاست کے ہر علاقے، ہر مذہب، ہر نسلی اور لسانی طبقے اور ہر نظریئے کو نمائندگی دی لیکن ہمارے کچھ کم جرأت ساتھیوں کی طرف سے میرے خلاف بغاوت اور زہریلے بیانات نے اس انقلابی اقدام کے بارے میں عوامی ذہنوں میں کنفیوژن پیدا کیا چنانچہ اس انتہائی جرأت مندانہ اقدام کا تحریک کو وہ فائدہ نہیں پہنچا جو بصورت دیگر پہنچ سکتا تھا۔ بھارت اور پاکستان کی حکومتوں نے بھی میرے اس اقدام کو ناکام بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

(س) بھارت نے میرے خلاف انٹرنیشنل وارنٹ گرفتاری جاری کر رکھے ہیں اور حکومت پاکستان نے میرا پاسپورٹ ضبط کر کے میرے پاکستان سے باہر جانے پر پابندی لگا رکھی ہے۔ میرے خلاف ان دونوں اقدامات کا مطلب مجھے تحریک آزادیٔ کشمیر کے سفارتی محاذ سے دور رکھنا ہے لیکن میں نے جرأت سے کام لیکر پاکستان کی حکومتوں کی خواہش کے خلاف اسلام آباد میں سفارتکاروں کو اجتماعی بریفنگ دینے کا سلسلہ شروع کیا اور گزشتہ سترہ سال میں سفارتکاروں کو چھ بریفنگز دی ہیں اس سلسلے میں بھی ہماری تنظیم دوسری کشمیری تنظیموں سے کہیں آگے ہے۔

(ش) میں نے مارچ 1992ء میں پاکستان کے وزیراعظم میاں نواز شریف کی طرف سے پندرہ بیس

کروڑ روپے کی بالواسطہ اور مشروط پیشکش ٹھکرا کر جس اخلاقی اور نظریاتی جرأت کا مظاہرہ کیا اسکی مثال شاید ہی تحریک آزادئ کشمیر کے کسی اور حلقے میں ملے۔ تفصیلات کیلئے دیکھئے ''دلچسپ متفرقات'' کے باب کے عنوان ''پاکستان کے دو وزرائے اعظم سے دلچسپ مکالمے''۔

(ص) پاکستان میں مخصوص مفادات نے مسئلہ کشمیر کے بارے میں نصف درجن بھر مفروضات عوام کے ذہنوں میں بٹھائے تھے جو وقت گزرنے کے ساتھ عوام کے ذہنوں سے چپک گئے تھے اور ان پر انگلی اٹھانا اپنی سیاسی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا کیونکہ عوام کی غالب اکثریت انکے بارے میں بہت حساس تھی۔ ان مفروضات نے ہمارے راستے میں مضبوط دیواریں کھڑی کر دی تھیں۔

ان مفروضات میں پہلا مفروضہ یہ تھا کہ نظریۂ خودمختار کشمیر پاکستان کے دشمنوں کا پیدا کردہ ہے اور اسکا مقصد پاکستان کو کشمیر خاص کر اسکے دریاؤں سے محروم کرنا ہے۔ چنانچہ اس نظریئے کی تشہیر و تبلیغ پاکستانی عوام، حکومت خاص کر میڈیا کے غیض و غضب کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ لیکن ہم نے خاص کر خود میں نے ہمت نہیں ہاری۔ غداری کے الزام برداشت کئے اور سیاسی گالیاں کھائیں لیکن پیش قدمی جاری رکھی۔ دوسرا مفروضہ یہ تھا کہ دوقومی نظریئے کے تحت مسلم اکثریتی ریاست جموں کشمیر کو پاکستان کا حصہ بننا چاہیئے اسلئے خودمختاری کا نظریہ پاکستان دشمنی ہے۔ لیکن ہم نے انتہائی شدید مخالفت کے باوجود اپنا مشن جاری رکھا۔ زبان اور قلم کو مسلسل استعمال کیا۔ اور بالآخر پاکستانی عوام اور میڈیا کے بڑے حلقے سے یہ بات تسلیم کرانے میں کامیاب ہو گئے کہ دوقومی نظریئے کا اطلاق صرف برٹش انڈیا پر ہوتا تھا ریاستوں پر نہیں۔

تیسرا اعتراض یہ تھا کہ قانون آزادئ ہند میں ریاستوں کی خودمختاری کا کوئی ذکر نہیں کشمیر کیسے خودمختار ہو سکتا ہے اس سلسلے میں ہم نے قائداعظم محمد علی جناح کے 17 جون، 11 جولائی اور 30 جولائی 1947ء کے پالیسی بیانات کو دلیل کے طور پر پیش کیا۔ ان بیانوں میں قائداعظم نے ٹھوس دلائل کے ساتھ واضح کیا تھا کہ برصغیر کی شخصی ریاستوں کو بھارت یا پاکستان سے الحاق کرنے کے علاوہ مکمل خودمختاری کا حق بھی حاصل ہے۔

پاکستانیوں کی چوتھی دلیل یہ تھی کہ کشمیر سے متعلق اقوام متحدہ کی قراردادوں کے تحت کشمیریوں کو ریاست کے بھارت یا پاکستان میں سے کسی ایک سے الحاق کرنا ہے۔ اس میں خودمختاری کی گنجائش ہی نہیں۔ اس سلسلے میں ہماری دلیل یہ ہے کہ اقوام متحدہ کے کمیشن کے 5 جنوری 1949ء کی قرارداد (جو پاکستان کے وزیرخارجہ سر ظفراللہ خان کے 25 دسمبر 1948ء کے خط کے ذریعے کی جانے والی درخواست اور بھارت کی طرف سے اسکی مخالفت نہ کرنے پر منظور کی گئی تھی۔) جسکے تحت کشمیریوں کے حق خودارادیت کو بھارت یا پاکستان سے الحاق تک محدود کیا گیا۔ خود اقوام متحدہ کے چارٹر اور حق خودارادیت کی عالمی طور پر تسلیم کی گئی تشریح کے منافی ہے جس میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ کسی محکوم قوم کے حق خودارادیت کو محدود یا مشروط نہیں کیا جا سکتا۔ علاوہ ازیں کشمیریوں سے اقوام متحدہ کی اس قرارداد سے پہلے

کوئی مشورہ نہیں کیا گیا نہ ہی ہم نے اسے رسمی طور پر تسلیم کیا ہے۔ یہی نہیں یہ قرارداد کشمیریوں کی قومی غیرت کی تضحیک وتذلیل ہے۔ اسلئے کوئی بھی غیرت مند کشمیری اسے تسلیم نہیں کرسکتا۔

ایک اور اعتراض یہ تھا کہ قائداعظم محمد علی جناح نے کشمیر کو پاکستان کی شہ رگ قرار دیا تھا۔ آپ خودمختاری کا مطالبہ کر کے قائداعظم کی تضحیک کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں میں نے اعلانیہ چیلنج کیا بلکہ تین بار پاریئویٹ ٹی وی چینل (جیو GEO اور اے آر وائی ARY) پر پروگراموں کے دوران کہا کہ جو شخص 11 ستمبر 1948ء (قائداعظم کے یوم وفات) سے پہلے شائع ہوئے کسی اخبار، کتاب یا رسالے کے ذریعے ثابت کرے کہ قائد نے کشمیر کو پاکستان کی شہ رگ قرار دیا تھا تو جو چور کی سزا وہ میری۔ اسکے مقابلے میں میں خود حکومت پاکستان کی طرف سے شائع کی گئی کتاب کے ذریعے ثابت کر رہا ہوں کہ انہوں نے کہا تھا کہ ریاستوں کو خودمختاری کا حق حاصل ہے۔ 11 جولائی 1947ء کے بیان میں تو انہوں نے خاص طور پر مہاراجہ کشمیر کو مشورہ دیا تھا کہ وہ ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کرتے وقت وہ اپنی ذات کا ہی نہیں ریاستی عوام کے مفادات کا بھی خیال رکھے۔ جسکا واضح مطلب خودمختاری تھا۔ کیونکہ پاکستان سے الحاق ایک ہندو مہاراجہ کیلئے خودکشی کے مترادف ہوتا اور بھارت سے الحاق کشمیریوں کی اکثریت کیلئے قابل قبول نہیں تھا۔ علاوہ ازیں قائداعظم جیسا شخص ایک ہی وقت دو متضاد تجاویز کیسے پیش کرسکتا تھا۔

میں پاکستان میں پہلا شخص تھا جس نے کشمیر میں مسلح جدوجہد کے عروج کے دنوں ہی یہ کہنے کی جرأت کی تھی کہ پاکستانیوں کی یہ امید کہ بھارتی مقبوضہ کشمیر جلد یا بدیر پاکستان کی جھولی میں آ گرے گا احمقوں کی جنت میں رہنے کے مترادف ہے۔

متذکرہ بالا معاملات میں ہمارا خاص کر میرا ہر موقف ایسا تھا جو پاکستان کے عوام، حکومت اور میڈیا کے غیض وغضب کو دعوت دے سکتا تھا۔ لیکن ہم نے اسکی پرواہ نہیں کی۔ ہمیں اپنے اس طرز عمل کی خاصی قیمت بھی دینی پڑی۔ پاکستان کے سرکاری میڈیا (ریڈیو، ٹی وی، اخبارات) نے گذشتہ چودہ سال سے مجھے بلیک لسٹ کیا ہوا ہے۔ مجھے دوبار کوئی وجہ بتائے بغیر ایگزٹ کنٹرول لسٹ پر رکھا گیا اور آخر جولائی 2003ء میں میرا پاسپورٹ ہی ضبط کیا گیا تا کہ میں باہر جا کر اپنے نظریئے کا پرچار نہ کرسکوں۔

ہمارے ان جرأت مندانہ اقدامات اور طرز فکر وعمل کا ہی نتیجہ ہے کہ ہمارے نظریئے کے بارے میں رائے عامہ میں بہت بڑی تبدیلی آئی۔ جہاں کچھ ہی مدت پہلے نظریۂ خودمختار کشمیر کو پاکستان اور کشمیریوں سے غداری قرار دیا جاتا تھا وہاں آج پاکستان کا صدر بھی کشمیر کی مکمل خودمختاری کو مسئلہ کشمیر کا ایک حل تسلیم کرتا ہے اور مقبوضہ کشمیر میں بھی آزادی (خودمختاری) کے نعرے لگ رہے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہہ رہے کہ یہ انقلابی تبدیلی صرف ہماری کوششوں کا نتیجہ ہے اس میں بہت سے اور عوامل بھی شامل ہیں البتہ اس بات سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ اس تبدیلی میں لبریشن فرنٹ کی جرأت مندانہ جدوجہد کا بڑا حصہ ہے۔

الغرض ہماری تنظیم نے بالخصوص میں نے تحریک آزادی اور اپنے نظریئے کیلئے کسی بھی جرأت

مندانہ اقدام سے دریغ نہیں کیا جسکے نتائج سب کے سامنے ہیں۔

7- ہماری مسلح جدوجہد آزادی کامیاب ہوجاتی اگر.....

ہماری (جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کی) 1988ء میں شروع کی ہوئی مسلح جدوجہد آزادی صحیح معنوں قومی آزادی کی مسلح تحریک تھی اور اس حقیقت کی تصدیق عالمی میڈیا بلکہ خود بھارتی سیاستدان، فوج اور میڈیا بھی کرتے رہے ہیں۔ جنوبی ایشیا کے آزاد پریس کی تنظیم SAFMA کی اگست 2003ء میں اسلام آباد میں ہونے والی کانفرنس جس میں بھارت اور پاکستان کے چوٹی کے سیاستدانوں اور صحافیوں نے شرکت کی، کے دوران مسئلہ کشمیر پر بولنے والے بھارتی مقرروں نے اس حقیقت کو تسلیم کیا کہ کشمیر میں جاری مسلح جدوجہد ابتدائی چند سال کے دوران (جب اس میں لبریشن فرنٹ کو کلیدی حیثیت حاصل تھی) صحیح معنوں میں قومی آزادی کی تحریک تھی۔ میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر آئی ایس آئی ہماری پیٹھ میں چھرا نہ گھونپتی۔ اگر کشمیری قیادت وہ کردار ادا نہ کرتی جو اس نے کیا، اگر بھارت سفا کی کے ریکارڈ نہ توڑتا اور اگر ہمارے بہت سے ساتھی خاص کر بندوق بردار تنظیم کی پالیسی، حکمت عملی اور ضابطہ اخلاق پر کاربند رہتے تو ہم پندرہ بیس ہزار افراد کی قربانی اور آٹھ دس سال کی جہدِ مسلسل کے نتیجے میں اپنی قومی آزادی کی منزل ضرور پالیتے۔ اگر چہ مسلح جدوجہد آزادی درج بالا وجوہات کی بناء پر ابھی تک قومی آزادی حاصل نہ کرسکی ہے۔ اسکے باوجود اسکی دو نمایاں کامیابیوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اولاً اس مسلح جدوجہد نے نیم مردہ مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی کو نئی زندگی دیدی۔ ثانیاً وادیٔ کشمیر والوں کے ماتھے پر لگا بزدلی کا سیاہ داغ دھوڈالا۔

8- کشمیریوں کی نظریاتی تقسیم

ریاست جموں کشمیر کے عوام ریاست کے مستقبل کے بارے میں کم از کم چار حصوں میں بٹے ہوئے ہیں یعنی

(1) پوری ریاست کے پاکستان سے الحاق کو آزادی تصور کرنے والے۔
(2) پوری ریاست کے بھارت سے الحاق کو آزادی تصور کرنے والے۔
(3) پوری ریاست کی مکمل خودمختاری کو آزادی گردانے والے۔ اور
(4) ریاست کی کسی قسم کی تقسیم کو مسئلے کا حل تصور کرنے والے

لیکن ان میں سے کسی بھی طبقے کو ابھی تک اسکی آزادی نہیں ملی۔ پہلے طبقے کو اسلئے نہیں کہ ریاست کا بڑا حصہ بھارت کے جبری قبضہ میں ہے دوسرے طبقے کو اسلئے نہیں کہ ریاست کا ایک حصہ پاکستان کے زیر اثر ہے۔ مکمل خودمختاری چاہنے والوں کو ان کی آزادی اسلئے نہیں ملی کہ ریاست کا ایک انچ بھی خودمختار نہیں اور تقسیم کو مسئلے کا حل سمجھنے والے کسی ایک قسم کی تقسیم پر متفق نہیں۔

9- متضاد سیاسی کلچر

بھارتی مقبوضہ کشمیر اور آزاد کشمیر کے سیاسی کلچر میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ جہاں آزاد کشمیر کے باہمی متصادم سیاسی نظریات کے حامل رہنما کسی ایک رہنما کی کال پر جمع ہو کر تحریک آزادی اور مسئلہ کشمیر کے بارے میں دوستانہ ماحول اور لہجے میں تبادلہ خیال کرتے ہیں۔ متفقہ قراردیں منظور کرتے ہیں یہاں تک کہ اتحاد بھی قائم کرتے ہیں وہاں بھارتی مقبوضہ کشمیر کے سیاسی کلچر میں یہ ضروری اور صحت مند عنصر تقریباً بالکل ہی مفقود ہے لے دے کے ایک حریت کانفرنس بنی تھی وہ بھی منتشر ہوگئی۔

10- نظریۂ خودمختار کشمیر اور پاکستان کے حکمران

جیسا کہ اس کتاب میں کئی حوالوں سے ذکر ہوا ہے بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کشمیر کی خودمختاری کے حامی تھے۔ جس کا ثبوت ان کے 17 جون۔ 11 جولائی اور 30 جولائی 1947ء کے پالیسی بیانات سے ملتا ہے۔ جن کا متن اس زمانے کے اہم اخباروں اور سرکاری طور پر شائع کی گئی کتابوں میں شائع ہوا ہے۔ جبکہ لیاقت علی خان۔ ظفر اللہ خان اور بعد کے مسلم لیگی، ریپبلکن پارٹی کے اور فوجی حکمران اس نظریئے کے سخت مخالف تھے۔ بھٹو صاحب نے بھی بجز 14 جولائی 1972ء کو قومی اسمبلی میں کی ہوئی تقریر کے کبھی اعلانیہ طور پر اسکی حمایت نہیں کی جبکہ ان کے اور بھارتی وزیراعظم مسز اندرا گاندھی کے دستخطوں سے جاری ہونے والے معاہدہ شملہ میں کشمیریوں کے حق خودمختاری تو درکنار محدود حق خودارادیت کا بھی کوئی ذکر نہیں۔ نہ ہی کشمیریوں کو مسئلہ کشمیر کا فریق تسلیم کیا گیا ہے۔ یہی حال نواز شریف اور اٹل بہاری واجپائی کے دستخطوں سے ہونے والے 1999ء کے اعلان لاہور اور واجپائی اور جنرل پرویز مشرف کے 6 جنوری 2004ء کو اسلام آباد میں جاری ہونے والے مشترکہ بیان کا ہے۔ جنرل ضیاء الحق معاہدہ شملہ کو عملی جامہ پہنانے کا مطالبہ کرتے رہے البتہ نظریۂ خودمختار کشمیر کیلئے نرم گوشہ رکھتے تھے۔ منتخب وزرائے اعظم بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کے علاوہ عبوری وزرائے اعظم غلام مصطفےٰ جتوئی۔ معین قریشی۔ بلخ شیر مزاری اور مرحوم ملک معراج خالد ذاتی طور پر اس نظریئے کے خلاف نہیں تھے البتہ طاقتور حلقوں (فوج۔ افسر شاہی اور میڈیا) کی طرف سے اس نظریئے کی مخالفت کی وجہ سے وہ بھی اسکی حمایت کرنے سے احتراز کرتے تھے البتہ مرحوم ملک معراج خالد اس نظریئے کے کٹر حامی تھے اور اس کا اظہار برملا کرتے تھے۔ 1989ء میں میں قومی اسمبلی میں حزب اختلاف کے رہنما غلام مصطفےٰ جتوئی سے ملا اور اپنے نظریات کی وضاحت کی تو جتوئی صاحب کا تبصرہ تھا

"For The first time I have met a Kashmiri who talks sense"

(میں پہلی بار ایک ایسے کشمیری سے ملا ہوں جو عقل کی بات کرتا ہے۔)

لیکن عبوری وزیراعظم بننے کے بعد وہ خاصے بدل گئے۔ سابق صدر چوہدری فضل الٰہی پالیسی سے متعلق معاملات پر بوجوہ تبصرہ کرنے سے گریز کرتے تھے جبکہ جنرل یحییٰ خان کے پاس ایسے معاملات پر سوچنے کا وقت نہیں ہوتا تھا البتہ جنرل پرویز مشرف کے بارے میں یہ تاثر تھا کہ وہ نظریۂ خودمختار کشمیر کے سخت مخالف ہیں بلکہ بقول کسے خودمختار کشمیر کا نام تک سننا نہیں چاہتے۔ لیکن انہوں نے اپنے 25 اکتوبر 2004ء کو پیش کی گئی تجاویز میں ریاست یا اسکے کسی حصے کی خودمختاری کو ایک آپشن کے طور پر تسلیم کیا ہے۔

11- کشمیر کی مسلح جدوجہد کے مخالفین کی خدمت میں

2000ء کے بعد جب کشمیر میں مسلح جدوجہد اپنی غلط کاریوں اور غلط سمت کی وجہ سے بڑی حد تک مقبولیت کھو بیٹھی تو اسکے خلاف وہ لوگ بڑے زور وشور سے آواز اٹھانے لگے جو اب تک اسکے خلاف دھیمی سی آواز میں بول رہے تھے اور جب یہ جدوجہد عوام میں خاصی مقبول تھی تو یہ لوگ بالکل خاموش تھے۔ اگر یہی مسلح جدوجہد حصول آزادی میں کامیاب ہو جاتی تو میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ آج اسکے خلاف کانفرنسیں کرانے والوں میں سے بھی کچھ لوگ اس کامیابی کا سہرا اپنے سر باندھنے کی کوشش کرتے۔

آج جو لوگ کشمیر میں مسلح جدوجہد کی مخالفت کر رہے ہیں وہ اپنے استدلال میں صرف اس حد تک حق بجانب ہیں کہ جن مقاصد کے حصول کیلئے اور جس طریقہ کار کے تحت آج کشمیر میں بندوق اور بموں کا استعمال ہو رہا ہے اسے کسی صورت میں بھی کشمیریوں کی جنگ آزادی نہیں کہا جا سکتا۔ یہ مسلح کارروائیاں جنگ آزادی کی نسبت دہشت گردی کے کہیں زیادہ نزدیک ہیں۔ اپنے ہی لوگوں کو اپنی گولیوں اور بموں کا نشانہ بنانا کونسا جہاد اور کونسی حریت پسندی ہے۔ البتہ یہ کہنا کہ مسلح جدوجہد شروع کرنا ہی غلط اقدام تھا سراسر غلط ہے۔

1988ء میں جب ہم (لبریشن فرنٹ) نے کشمیر میں مسلح جدوجہد آزادی شروع کی تو اس وقت مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی آخری ہچکیاں لے رہے تھے اور عالمی سطح پر یہ تاثر خاصا مضبوط تھا کہ دونوں طرف کے کشمیری وہاں کی صورتحال سے مطمئن ہیں اسلئے کہ وہاں آزادی کی کسی تحریک کا کوئی وجود نہیں۔ 1983ء میں نیویارک میں ایک اہم عرب سفیر نے مجھے صاف کہا کہ کشمیر میں آزادی کی کوئی تحریک نہیں اسلئے آپ مہربانی کر کے ہمارا وقت ضائع نہ کریں۔ اسی طرح پاکستان نے اسلامی کانفرنس کے ایک اہم ممبر ملک ایران کے کہنے پر انسانی حقوق کے عالمی کمیشن سے کشمیر پر اپنی پیش کردہ قرارداد واپس لی تھی کیونکہ قرارداد کے مسترد ہونے کا خطرہ تھا۔ اسلئے میں پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر 1988ء میں کشمیر میں مسلح جدوجہد آزادی شروع نہ کی گئی ہوتی تو مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی کب کے ہمیشہ کیلئے دم توڑ چکے ہوتے اور آج دنیا انہیں بھی اسی طرح بھول چکی ہوتی جس طرح ریاست حیدرآباد

(دکن) اور جوناگڑھ کو بھول چکی ہے۔

جب ہم نے مسلح جدوجہد آزادی شروع کی اس وقت ہمارے سامنے قومی آزادی کی ایک واضح منزل، دنیا کی کامیاب تحاریک آزادی کی طرح کی حکمت عملی اور اخلاقیات اور جدوجہد آزادی کے اصولوں پر مبنی ایک ضابطہ اخلاق تھا۔ جب تک میدان عمل میں ہماری پوزیشن کلیدی رہی ان پر عمل ہوتا رہا۔ آج بھارت کے سیاستدان۔ میڈیا یہاں تک کہ فوجی افسر بھی اعلانیہ کہتے ہیں کہ کشمیر میں عسکریت پہلے چند سال کے دوران صحیح معنوں میں مسلح جدوجہد آزادی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ابتدائی چند سالوں کے بعد عسکریت کی سمت بھی تبدیل ہوگئی اور طریقہ کار بھی اور اس سے بھی اہم بات یہ کہ تحریک کمرشلائز ہوگئی جسکے نتیجے میں تحریک آزادی کو نا قابل تلافی نقصان پہنچا اور اس تبدیل شدہ عسکریت کی واقعی مذمت ہونی چاہیئے۔

جیسے کہ کتاب میں کہیں اور تفصیلاً لکھا گیا ہے کہ ہماری شروع کردہ مسلح جدوجہد کے نتیجے میں ایک طرف کشمیریوں (وادی والوں) کے ماتھے سے بزدلی کا سیاہ داغ دھل گیا اور دوسری طرف مسئلہ کشمیر زندہ ہوگیا یہاں تک کہ آج عالمی برادری کے علاوہ خود بھارت اور پاکستان بھی اسے ہمیشہ کیلئے حل کرنے کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کشمیری قیادت اس صورتحال سے مناسب استفادہ کرنے کیلئے ضروری اتحاد فکر و عمل، بردباری جذبہ حب الوطنی اور جذبہ حریت پسندی سے محروم ہے اور بیرونی طاقتوں کے مفادات کے تحفظ میں مصروف ہے۔

12- بھارتی وزیراعظم کے گلے میں پھندا

دسمبر 1991ء میں لبریشن فرنٹ نے میری تجویز پر فیصلہ کیا کہ وہ 11 فروری 1992ء (شہید کشمیر مقبول بٹ کی برسی کے موقع پر) جنگ بندی لائن کو اجتماعی غیر مسلح اور اعلانیہ طور پر عبور کرنے کی کوشش کرینگے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ہمیں احساس ہونے لگا کہ ہمارا یہ اقدام تو بھارتی حکومت کیلئے ایک پھندا ثابت ہوسکتا ہے۔ اگر بھارت جنگ بندی لائن پر ہمارے ہزاروں ساتھیوں پر جنکے ساتھ عالمی میڈیا کے نمائندوں کی ایک پوری فوج متوقع تھی گولیاں برساتا تو دنیا بھر کے سامنے اسکی سفاکی ننگی ہوجاتی اور اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو جنگ بندی لائن کا عملاً خاتمہ تھا۔ لیکن یہاں بھی بھارت نے انتہائی چالاکی اور منصوبہ بندی سے کام لیا اور حکومت پاکستان نے حسب دستور بیرونی دباؤ میں آکر احمقانہ حرکت کی۔ بھارت کے سیکرٹری خارجہ مسٹر جے این ڈکسٹ نے اندھیری رات میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے مستقل ممبروں امریکہ، روس، فرانس اور برطانیہ کے سفیروں کے دروازوں پر دستک دیکر ان سے اپیل کی اور مطالبہ کیا کہ ان کی حکومتیں پاکستان پر دباؤ ڈالیں کہ لبریشن فرنٹ والوں کو 11 فروری کو جنگ بندی لائن تک پہنچنے ہی نہ دے۔ یاد رہے کہ یہ وہی بھارت تھا جو پاکستان کی طرف سے عالمی سطح پر مسئلہ کشمیر کا صرف ذکر ہونے پر یہ کہہ کر سیخ پا ہوجاتا تھا کہ مسئلہ کشمیر ایک دوفریقی مسئلہ ہے اسے بین الاقوامی مسئلہ نہیں

بنایا جاسکتا اور لبریشن فرنٹ نے اسی بھارت کو عالمی برادری سے مدد کی بھیک مانگنے پر مجبور کر دیا تھا۔ بہر حال بڑے ملکوں کے دباؤ کے سامنے پاکستان کی حکومت نے حسب روایت گھٹنے ٹیک دیئے اور ہم پر گولیاں برسا کر ہمیں جنگ بندی لائن تک پہنچنے سے روک دیا۔ اسطرح جو پھندا ہم نے بھارتی وزیر اعظم نرسہاراؤ کے گلے میں ڈال دیا تھا وہ پاکستان کے وزیر اعظم نواز شریف نے اس کے گلے سے اتار کر اپنے گلے میں ڈال دیا۔ مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادیٔ کشمیر کی تاریخ ایسے بیشمار واقعات سے عبارت ہے۔

13- زندہ امان اللہ اور اسکی لاش

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ وادیٔ کشمیر کے عوام خاص کر نوجوانوں میں مسلح جدوجہد آزادی کا جذبہ پیدا کرنے میں دیگر عوامل کے علاوہ شہید کشمیر مقبول بٹ کی پھانسی نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کے پیشرو نیشنل لبریشن فرنٹ کے مسلح ونگ کے سربراہ مقبول احمد بٹ کو بھارتی حکومت نے مجموعی طور پر دس سال کی قید کے بعد 11 فروری 1984ء کو دہلی کے تہاڑ جیل میں تختہ دار پر لٹکا دیا تھا جسکے نتیجے میں کشمیری نوجوانوں میں حصول آزادی کیلئے بڑی سے بڑی قربانی دینے کا جذبہ پیدا ہو گیا جس سے ہم نے استفادہ کر کے 1988ء میں مسلح جدوجہد آزادی شروع کی جس کے نتیجے میں نیم مردہ مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادیٔ کشمیر میں نئی جان پڑ گئی۔

میں چاہتا تھا کہ 12 فروری 1992ء کو جنگ بندی لائن پر میرے ہزاروں ساتھیوں اور عالمی میڈیا کی فوج کی موجودگی میں میرا بدن بھارتی گولیوں سے چھلنی ہو جائے کیونکہ اس صورت میں امان اللہ کی لاش تحریک آزادی، مسئلہ کشمیر اور نظریہ خودمختار کشمیر کو زندہ امان اللہ سے ہزاروں گنا زیادہ فائدہ پہنچا سکتی تھی اسی طرح جسطرح زندہ مقبول بٹ کی نسبت مقبول بٹ کی لاش نے پہنچایا۔ اسی مقصد اور پروگرام کے پیش نظر میں نے چکوٹھی سے جنگ بندی لائن کی طرف روانہ ہونے سے پہلے ہی اپنے جانشین کا اعلان بھی کیا تھا۔ لیکن بھارت نے غالباً ایسے ہی احساس کے تحت پاکستان پر دباؤ ڈالکر مجھے، میرے ساتھیوں اور میڈیا والوں کو جنگ بندی لائن تک پہنچنے ہی نہیں دیا جسکے نتیجے میں میری یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔

اس مقصد کے حصول کیلئے کی جانے والی دوسری کوشش (30 مارچ 1992ء) سے پہلے ہی مجھے اور میرے سینکڑوں سینئر ساتھیوں کو مختلف مقامات سے گرفتار کیا گیا۔ تیسری کوشش (24 اکتوبر 1992ء) کو مجھے اور میرے ساتھیوں بیرسٹر سلطان محمود چوہدری، خواجہ فاروق کو جنگ بندی لائن پر پہنچنے سے پہلے ہی گرفتار کیا گیا اور چوتھی کوشش (4 اکتوبر 1999ء) کو مجھے مدار پور کی جنگ بندی لائن تک پہنچنے سے پہلے ہی ہجیرہ میں گرفتار کیا گیا۔

اس طرح میری وہ انوکھی خواہش پوری نہیں ہو سکی۔ ممکن ہے اسی میں میرے نصب العین (حصول آزادی) کی بھلائی ہو۔

14- بیلجیم جیل کے دلچسپ واقعات

15 اکتوبر 1993ء کو میں یورپین پارلیمنٹ کے سوشلسٹ گروپ کی دعوت پر اسکے زیر اہتمام ہونے والی کشمیر کانفرنس میں شرکت کرنے برسلز پہنچا۔ 18 اکتوبر کو شروع ہونے والی اس کانفرنس میں آزاد کشمیر کے سابق صدر اور وزیر اعظم سردار عبدالقیوم خان اور بھارتی مقبوضہ کشمیر کے سابق چیف منسٹر ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے علاوہ دونوں حصوں کے کشمیریوں، بھارتیوں اور پاکستانیوں کے علاوہ عالمی تنظیموں کے نمائندوں کی ایک بڑی تعداد شریک تھی۔ ایک دلچسپ بات یہ تھی کہ آزاد کشمیر سے تعلق رکھنے والے شوکت کشمیری اور ان کے ساتھی افضل طاہر اور خالد پرویز بھارتیوں اور بھارتی مقبوضہ کشمیر والوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے اور مسئلہ کشمیر اور متعلقہ معاملات میں بھی ان ہی کی زبان بول رہے تھے۔ فاروق عبداللہ نے کہا میں پاکستانی بننا نہیں چاہتا تو میں نے اپنی باری پر ان سے مخاطب ہو کر کہا کہ میں بھی نہیں چاہتا کہ آپ پاکستانی بنیں لیکن کشمیری تو بنیں۔ میں نے کہا کہ اگر آپ اور سردار عبدالقیوم سمیت ہم سب قولاً اور فعلاً کشمیری بن جائیں تو آدھا مسئلہ کشمیر اسی وقت حل ہو جائے گا۔ میری اس بات کو پارلیمنٹ کے وہاں موجود ممبروں اور ممبروں سمیت سب لوگوں نے پسند کیا۔ اجلاس کے بعد میری فاروق عبداللہ سے اکیلے میں تفصیلی بات ہوئی اور فیصلہ ہوا کہ دوسرے دن پھر ملیں گے میں نے فیصلہ کیا کہ دوسرے دن اس ملاقات میں سردار عبدالقیوم خان کو بھی شامل کرونگا لیکن دوسرا دن آنے سے پہلے ہی یعنی اسی رات میں بھارت کی ایما پر انٹرپول کی طرف سے جاری ہوئے وارنٹ گرفتاری کے تحت گرفتار ہو گیا۔ تیسرے دن مجھے عدالت سے جس جیل میں منتقل کیا گیا وہ پاکستان کے فورسٹار ہوٹل سے کم نہ تھا۔ سیل کے اندر فون، ٹی وی اور اپنی مرضی کا کھانا (جو میں نے کبھی نہیں کھایا کیونکہ اس میں سور کا گوشت ہوتا تھا) میں نے جب اپنے وکیل کو میری طرف سے ضمانت کی درخواست دینے سے منع کیا تو وہ مجھے پاگل سمجھا (تفصیل کیلئے متعلقہ عنوان دیکھئے) ادھر اخبارات نے میری گرفتاری کو خوب اچھالا اور بھارت کی نام نہاد جمہوریت پر خوب تنقید ہوئی۔ ڈیڑھ ماہ بعد مجھے دوسرے جیل منتقل کیا گیا جو پاکستانی جیلوں سے بھی زیادہ تکلیف دہ تھا۔ کمرے میں ایک عرب لڑکا تھا میں نے اس سے ماچس مانگی تو اس نے منہ بنایا۔ تھوڑی دیر کے بعد کھانا آیا جو سور کے گوشت کا تھا میں نے لڑکے سے اشاروں میں کہا یہ سور کا گوشت ہے تم مسلمان ہو نام بھی محمد ہے مسلمان سور کا گوشت نہیں کھاتے لیکن اس نے میرے حصے کا کھانا بھی کھا ڈالا۔ میری طبیعت خراب ہو گئی میں نے سگریٹ پینے کیلئے اس سے پھر ماچس مانگی تو اس نے عجیب سا منہ بنایا ادھر پہلے والے جیل میں پڑے میرے پیسے ایک ہفتہ بعد یہاں منتقل ہونے تھے اسلئے سوال پیدا ہوا کہ کیا میں ایک ہفتے تک اس لڑکے سے ماچس مانگتا رہوں؟ چنانچہ میری خودداری اور اندر کے مسلمان نے سور کا گوشت کھانے والے مسلمان سے بار بار ماچس مانگنے سے سختی سے منع کیا۔ اور میں نے (جو چالیس سال سے زیادہ مدت سے روزانہ کم از کم چالیس سگریٹ پیتا تھا) سگریٹ نوشی کو ہمیشہ کیلئے طلاق دی اور آج تک سگریٹ کو منہ نہیں لگایا۔

دوسرے دن ایک نوجوان انگریز ڈاکٹر سیل میں آئی میں نے اس سے انگریزی میں بات کی تو بہت خوش ہوئی۔ میں نے اس سے دوسرے کمرے میں منتقل کرانے اور دوسرے جیل سے پیسے جلدی منتقل کرانے کیلئے کہا جو اس نے دوسرے ہی دن کر دیا۔ اسکا نام ڈاکٹر مس ہیلی تھا وہ ڈیوٹی سے فارغ ہونے کے بعد کچھ دیر میرے پاس بیٹھ کر گپ شپ کرتی۔ تقریباً سات آٹھ سال پہلے سے میرے بائیں جبڑے کے باہر اور دائیں طرف گردن پر وقفے وقفے سے پھوڑے ظاہر ہوتے تھے جن سے کبھی خون اور کبھی پانی رستا تھا جس سے مجھے تکلیف کے علاوہ دوسروں کے سامنے شرمندگی بھی ہوتی تھی میں نے اس کا ذکر ڈاکٹر ہیلی سے کیا تو اس نے میرے چہرے اور گردن کا تفصیلی معائنہ کیا اور دوسرے دن ایک ٹیوب لے آئی جس سے میرے یہ پھوڑے ہمیشہ کیلئے غائب ہو گئے۔ کچھ دن کے بعد ڈاکٹر مس ہیلی پھر نظر نہیں آئی۔

ہیگیئم کی حکومت نے بھارت کے اس مطالبے کو کہ مجھے اسکے حوالے کیا جائے مسترد کر کے مجھے اڑھائی ماہ کی اسیری کے بعد رہا کر کے پاکستان بھیج دیا اور میں اس دوران سگریٹ نوشی کی لت اور انتہائی تکلیف دہ پھوڑوں سے ہمیشہ کیلئے نجات پا چکا تھا۔ اسطرح یہ اسیری بھی میرے لئے ایک خیر مستور (BLESSING IN DISGUISE) ثابت ہوئی۔

15- گلگت بلتستان سے متعلق

ریاست جموں کشمیر کے شمالی حصے میں واقع اور تقریباً 71 ہزار مربع کلومیٹر رقبے میں پھیلے گلگت بلتستان کے علاقے جنہیں پاکستان کی افسر شاہی نے شمالی علاقوں کا نام دیا ہے ریاست جموں کشمیر کا حصہ اسلئے بھی ہیں کہ اس حقیقت کو پاکستان نے اقوام متحدہ سے ہونے والی خط و کتابت میں بھی یہاں تک کہ 1963ء کے پاک چین سرحدی معاہدے میں بھی تسلیم کیا ہے۔ ابتداء میں کہا گیا کہ شمالی علاقے کا مطلب ریاست جموں کشمیر کے شمالی علاقے ہے لیکن اب افسر شاہی اور وزارت اطلاعات کی نوآبادیاتی فکر ان علاقوں کو پاکستان کے شمالی علاقے گردانتی ہے۔ میں نے کتاب میں ان علاقوں سے متعلق ایک الگ باب اسلئے رکھا ہے کہ ان علاقوں سے متعلق خاص کر اسکی آئینی پوزیشن کے بارے میں باہر کی دنیا بہت کم جانتی ہے۔

گلگت بلتستان کے آئینی حقوق کے سلسلے میں اجتماعات ہوتے رہے ہیں البتہ ان میں سے تین خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔ پہلا اجتماع میریٹ ہوٹل اسلام آباد میں جموں کشمیر لبریشن لیگ کے زیر اہتمام اپریل 1993ء میں، دوسرا کشمیر قراقرم جرنلسٹس فورم کے زیر اہتمام اکتوبر 1996ء میں ہالیڈے ان اسلام آباد میں اور تیسرا جماعت اسلامی آزاد کشمیر کے زیر اہتمام مئی 2004ء میں گلگت میں ہوا جس میں پہلی بار آزاد کشمیر کی تقریباً تمام سیاسی پارٹیوں نے شرکت کی۔ اپنے آئینی حقوق کیلئے گلگت بلتستان والوں نے آزاد کشمیر اور پاکستان کی عدالتوں کے دروازے بھی کھٹکھٹائے لیکن یہ عدالتیں

انہیں ابھی تک عملاً کچھ نہیں دے سکی ہیں۔ ادھر تقریباً تین عشروں تک سیاسیات پر عملاً پابندی کے نتیجے میں گلگت بلتستان کے لکھے پڑھے لوگوں کی توجہ شعروشاعری کی طرف گئی چنانچہ اس دوران شاعروں اور ادیبوں کی ایک کھیپ پیدا ہوئی جس سے خاصا مزاحمتی ادب وجود میں آیا۔

گلگت بلتستان کے لوگوں کی مجھ سے شکایت تھی کہ میں گلگت بلتستان کو چھوڑ کر کشمیری سیاست کا کیڑا کیوں بنا ہوں۔ میں نے متعلقہ باب میں اسکی وجوہات بیان کرنے کے علاوہ علاقے کیلئے اپنی کچھ خدمات کا بھی ذکر کیا ہے۔ ساتھ ہی ان کتابوں کی فہرست بھی منسلک کی ہے جن میں گلگت بلتستان سے متعلق خاصی معلومات ہیں۔

16- میری زندگی کے نشیب وفراز

میری ذاتی اور سیاسی زندگی نشیب وفراز کی انوکھی مثالیں پیش کرتی ہے۔ علاقے کی معروف اور معزز شخصیت کی واحد نرینہ اولاد کی حیثیت سے میں نے اپنی زندگی کے ابتدائی ساڑھے تین سال کے دوران (اپنے والد کی زندگی میں) ایک شہزادے کی سی زندگی گذاری لیکن والد صاحب کی وفات کے بعد میری زندگی تبدریج یکسر بدل گئی حتیٰ کہ بیس سال بعد یعنی پچاس کے عشرے کے پہلے نصف کے دوران میں چھ ماہ تک فٹ پاتھ پر سوتا رہا اور کئی بار بھوکا سویا یہاں تک کہ ایک روپے سے بھی کم قرضہ ادا نہ کر سکنے پر گالیاں کھائیں۔ دو سال تک تقریباً اٹھارہ گھنٹے روز کام کرتا رہا اور 1980ء اور 1990ء کے عشروں کے دوران عالمی شہرت کا مالک بن گیا۔ میرا تعلیمی کیریئر بھی ایک دلچسپ تصویر پیش کرتا ہے۔ میں نے پرائمری کے خصوصی امتحان میں پوری تحصیل ہندواڑہ کے مسلمان طلبا میں پہلی پوزیشن حاصل کر کے وظیفہ (دو روپے ماہوار) حاصل کیا۔ مڈل کے امتحان میں پورے ضلع بارہمولہ میں دوسری پوزیشن حاصل کی اور میٹرک کے امتحان میں پوری یونیورسٹی (کشمیر یونیورسٹی سرینگر) میں مسلمان امیدواروں میں اول پوزیشن حاصل کی لیکن ایف ایس سی میں فیل ہو گیا۔ بی اے میں اچھی سیکنڈ ڈویژن حاصل کی۔ سیاسی مصروفیات کی وجہ سے ایم اے کا امتحان دے ہی نہ سکا اور ایل ایل بی قسطوں میں پاس کیا۔

ذاتی کی طرح میری سیاسی زندگی میں بھی نشیب وفراز آتے رہے ہیں میں کئی بار بوجوہ سیاسی طور پر پس منظر میں چلا گیا جسکی مختلف وجوہات ہیں ایک وجہ یہ کہ بھارت اور پاکستان دونوں کی حکومتیں مجھے غیر پسندیدہ شخص (Persona-Non-Grata) تصور کرتی ہیں۔ اور مجھے سیاسی طور پر ابھرنے نہیں دیتیں ہیں۔ میں عالمی سطح پر ہی سب سے زیادہ موثر ثابت ہوتا ہوں۔ تفصیل کیلئے دیکھئے 20 اپریل 1990ء کو نیشنل پریس کلب واشنگٹن میں امریکی بوڑھے کا تبصرہ۔ لیکن بھارت اور پاکستان دونوں نے میرے لئے عالمی سطح کے سارے دروازے بند کر رکھے ہیں۔ علاوہ ازیں میرے اپنے ساتھیوں کے ساتھ سیاسی اختلافات بھی تنظیم میں بحران اور عارضی طور پر میرے پس منظر میں جانے کا موجب بنتے رہے ہیں لیکن وقفے وقفے سے میرا کوئی اقدام یا مجھ سے متعلق کوئی بڑا واقعہ مجھے اچانک عالمی سطح پر پہنچا دیتا رہا ہے۔ ایسا

میری زندگی میں نصف درجن سے زیادہ بار ہوا ہے۔ چونکہ میرا سیاسی اور نظریاتی ایمان مضبوط ہے اسلئے :-

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

17- زحمتیں رحمتوں میں بدلتی گئیں

میری زندگی زحمتوں کے رحمتوں میں بدلنے کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ بچپن میں میری زندگی کو لاحق خطرہ میرا مستقبل تابناک کر گیا۔ میٹرک کے امتحان میں سکول کے ہیڈ ماسٹر کی چھوٹی سی غفلت میرے امتحان ہال سے اخراج پر منتج ہوئی اور میرا اس سال امتحان نہ دے سکنا میرے لئے باعث رحمت بن گیا۔ میرے والد صاحب کی واحد نشانی جیبی گھڑی کا غیر قانونی طور پر ایک سکھ پولیس افسر کی جیب میں جانا میرے لمبی قید سے بچاؤ کا باعث بن گیا۔ ایڈورڈ کالج پشاور کے وائس پرنسپل سے جھگڑا میری کراچی منتقلی کا باعث بنا جس نے میری زندگی کی سمت ہی بدل ڈالی۔ سٹی نائٹ سکول کراچی کے سربراہ سے جھگڑے نے مجھے اپنا سکول قائم کرنے پر مجبور کیا اور میری یہ مجبوری میرے لئے باعث رحمت بن گئی۔ گلگت میں 72-1970ء کی اسیری نے میرے ضمیر پر سے ایک بھاری بوجھ ہٹا دیا۔ 1971ء میں شاہی قلعہ لاہور میں اسیری کے دوران دیئے جانے والے بجلی کے جھٹکوں نے حصول آزادی کیلئے جہدِ مسلسل جاری رکھنے کے میرے عزم کو کئی گنا بڑھا دیا۔ 86-1985ء میں برطانیہ میں اسیری کے دوران میرے پھیپھڑوں کے کینسر کا آپریشن کے ذریعہ علاج ہوا ورنہ ڈاکٹروں کے اندازے کے مطابق مجھے اگست 1986ء میں مرنا تھا۔ 1993ء میں تہاڑ میں اسیری کے دوران مجھے سگریٹ نوشی کی لت اور چہرے اور گردن پر بار بار نمودار ہونے والے انتہائی تکلیف دہ پھوڑوں سے نجات ملی۔ الغرض میری زندگی زحمتوں کے رحمتوں میں بدلنے کے بیشمار واقعات سے عبارت ہے۔

18- اپنی جدوجہد سے مطمئن ہوں۔ نتیجے سے نہیں

میں مسئلہ کشمیر۔ تحریک آزادیٔ کشمیر۔ نظریۂ خودمختار کشمیر اور اپنی تنظیم لبریشن فرنٹ سے متعلق اپنی کارکردگی سے تقریباً پوری طرح مطمئن ہوں اسلئے کہ میں نے نہ تو کبھی انکے بارے میں اپنے فرض سے قصداً کوئی غفلت برتی نہ کبھی اپنے ذاتی مفاد کو ان میں سے کسی ایک کے مفاد پر ترجیح دی۔ نہ کبھی ایسا کرنے کا سوچا بھی اور نہ ہی کبھی اپنی تنظیمی پوزیشن سے تنظیم۔ تحریک یا نظریئے کے مفاد کی قیمت پر کوئی ناجائز ذاتی فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ اس سلسلے میں میرا ضمیر صاف ہے اور میں نظریئے، تحریک اور تنظیم کے سلسلے میں اپنی کارکردگی سے پوری طرح مطمئن ہوں۔ البتہ اگر سہواً یا میرے کسی غلط اندازے کی وجہ سے نظریئے۔ تحریک یا تنظیم کو کبھی کوئی نقصان پہنچا ہے تو میں اس سے انکار نہیں کر سکتا چنانچہ میں اگر آج مر جاؤں تو کم از

کم اپنی سیاسی کارکردگی کے بارے میں اطمینان سے مروں گا۔ البتہ میں اپنی کارکردگی کے نتیجے سے بالکل مطمئن نہیں۔ میں پورے خلوص کے ساتھ سمجھتا ہوں کہ میں نے نظریئے، تحریک اور تنظیم کیلئے جتنی محنت، تگ و دو اور جدوجہد کی اس سے میرے نظریئے۔ تحریک اور تنظیم کو جتنا فائدہ پہنچنا چاہیئے تھا اس کا آدھا بھی نہیں پہنچا۔ غالباً میری جدوجہد پر بھی ''کسی کا ایک آنسو بھی ثریا کو رلاتا ہے۔ کسی کا عمر بھر رونا یونہی برباد جاتا ہے'' کی روایت کا کچھ اطلاق ہوتا ہے بہرحال یہ کوئی نئی بات نہیں۔ تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ مولانا محمد علی جوہر اپنے مقصد کیلئے عمر بھر جدوجہد کرتے رہے سالہا سال کی قید بامشقت کاٹی لیکن وہ اپنی منزل تک نہ پہنچ سکے۔ اسکے برعکس قائداعظم محمد علی جناح ایک دن کی بھی قید کاٹے اور کسی لمبی جدوجہد کے بغیر حصول پاکستان جیسے بڑے مقصد کے حصول میں کامیاب ہوگئے۔

اگرچہ میں اپنی جدوجہد کے نتیجے کے بارے میں مطمئن نہیں لیکن اسکا مطلب یہ بھی نہیں کہ میری محنت بالکل ضائع گئی ہے۔ یہ میری اور میرے ساتھیوں اور دوسرے ہم نظریہ لوگوں کی جدوجہد کا ہی نتیجہ ہے کہ بھارت اور پاکستان کی حکومتوں (خاص کر ان کی افواج اور افسر شاہی) اور ذرائع ابلاغ کے علاوہ پاکستان نواز اور بھارت نواز کشمیریوں کی شدید مخالفت کے باوجود ہمارا نظریہ کمزور ہونے کی بجائے مقبول ہوتا جارہا ہے اور آج ہمارے نظریہ خودمختار کشمیر کا ہر علمبردار فخر سے سر اونچا کر کے چلتا ہے۔ ہاں اگر ہمیں ہماری محنت اور جدوجہد اور قربانیوں کے تناسب سے پھل ملتا تو کشمیر کب کا ایک آزاد و خودمختار ملک بن گیا ہوتا۔

19- تاریخ کے دو اہم سبق

اگرچہ نظریہ خودمختار کشمیر کے علمبردار کی حیثیت سے مجھے امید ہے اور میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش بھی یہی ہے کہ میرا مادر وطن ریاست جموں کشمیر ایک آزاد و خودمختار مملکت بن کر دنیا کی آزاد اور معزز قوموں کی صف اول میں کھڑا ہو جائے لیکن ایک حقیقت پسند انسان اور تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں اس تلخ تاریخی حقیقت کو بھی کلیتاً نظر انداز نہیں کر سکتا کہ ضروری نہیں کہ ہر شخص کی ہر خواہش پوری ہو جائے۔

برصغیر کے دو عظیم لیڈر مہاتما گاندھی اور قائداعظم محمد علی جناح برصغیر کے مستقبل کے بارے میں دو متضاد نظریوں کے علمبردار تھے۔ مہاتما گاندھی کی خواہش تھی کہ برصغیر تقسیم نہ ہو یہاں تک کہ انہوں نے کہا تھا کہ ہندوستان میری لاش پر ہی تقسیم ہو سکتا ہے لیکن برصغیر تقسیم ہو کر رہا۔ اسکے برعکس قائداعظم قیام پاکستان کے داعی تھے۔ اور ان کے خواب کے مطابق پاکستان میں پورا کشمیر۔ پورا پنجاب اور پورا بنگال شامل تھے لیکن انہیں مطلوبہ پاکستان کے دو تہائی سے بھی کم ملا اور 25 سال بعد اس پاکستان سے بھی مشرقی پاکستان الگ ہو گیا۔ اس طرح گاندھی اور جناح جیسے عظیم قائدین کی بھی خواہشیں پوری نہیں ہوئیں

اس تلخ حقیقت کے برعکس ہم اس میٹھی حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے اور نہ کرنا چاہیئے کہ تاریخ ایسی بے شمار مثالیں بھی پیش کرتی ہے جب افرد بلکہ قوموں کو بھی ان کی بہترین توقعات سے بھی کہیں زیادہ ملا۔ صرف 1960ء میں دنیا کی 20 محکوم قومیں آزاد ہو گئیں۔ ان میں سے اکثر کی آزادی خود ان کی بہترین توقعات سے بھی کہیں زیادہ تھی۔ کیونکہ اسکے لئے انہوں نے خون کا ایک قطرہ بھی نہیں بہایا تھا۔

تاریخ ہمیں (کشمیریوں کو) کس طبقے میں شامل کریگی وقت ہی بتائے گا البتہ ہمیں اپنے نصب العین کے حصول کیلئے اپنی جہدِ مسلسل جاری رکھنی بلکہ تیز تر کرنی چاہیئے اسکا ہمارے بارے میں تاریخ کے حتمی فیصلے پر ضرور مثبت اثر پڑے گا۔

20- میری وصیت

24 اگست 2004ء کو میری عمر 73 سال ہو گئی جو دنیا کے اس حصے کے لوگوں کی اوسط عمر سے کہیں زیادہ ہے۔ اسلئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنے قارئین خاص کر لبریشن فرنٹ (بشمول سٹوڈنٹس لبریشن فرنٹ اور این ایل اے) کے ممبروں (بالخصوص نوجوانوں) اور ذاتی دوستوں سے چند ضروری باتیں (نصیحتیں) کروں۔ چونکہ میں آج کا کام کل پر چھوڑنے کا قائل نہیں اسلئے میں ان نصیحتوں کو کتاب کی تیسری جلد کیلئے چھوڑنے کی بجائے اسی جلد کا حصہ بنا رہا ہوں۔ ان میں سے کچھ حقائق عام زندگی سے متعلق میرے مطالعے، مشاہدے اور ذاتی تجربے کا نچوڑ ہیں اور کچھ (ایٹم نمبر 4 اور 5) ہماری تنظیم سے متعلق۔ عام قارئین چاہیں تو اولذکر باتوں کو میری وصیت بھی تصور کر سکتے ہیں البتہ میرے موجودہ اور مستقبل کے تنظیمی اور نظریاتی ساتھی انہیں میری وصیت ہی تصور کر کے ان پر عمل کرنے کی کوشش کریں۔ یہ میری ذاتی خواہش ہے کیونکہ اسی میں ہم سب کی اور ہماری آئندہ نسلوں کی انفرادی اور اجتماعی بھلائی ہے۔

آیئے اب مذکورہ حقائق کی طرف

(1) انسان کیلئے سکون قلب اور نیک نامی سب سے بڑی دولت ہیں۔ اولذکر سے انسان کی دنیاوی زندگی جنت بن جاتی ہے جبکہ موخرالذکر سے انسان کو زندگی میں بھی احترام ملتا ہے اور مرنے کے بعد بھی اسے احترام سے یاد کیا جاتا ہے۔ دونوں کے حصول کا آسان ترین طریقہ بے لوث خدمت خلق ہے۔

(2) آپ میں خلوص، جہدِ مسلسل کی عادت، اخلاقی جرأت، بے غرضی اور ملنساری ہو، آپ انصاف اور حق و صداقت کے علمبردار ہوں۔ آپ زمینی حقائق کو سمجھنے اور ان سے جائز استفادہ کرنے کے اہل ہوں اور قسمت بھی تھوڑا سا ساتھ دے تو آپ کو ایک کامیاب اور اچھا انسان بننے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

(3) کسی انسان کا بڑا آدمی (صاحب اقتدار۔ دولت مند۔ دانشور مشہور) ہونا اچھی بات ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ اچھی بات یہ ہے کہ وہ اچھا انسان (انصاف پسند۔ باضمیر اور با اخلاق) بھی ہو۔

(4) آج سے تقریباً 55 سال پہلے جب میں میٹرک پاس کر کے ہائی سکول ہندواڑہ (وادیٔ کشمیر) سے ہمیشہ کیلئے رخصت ہو رہا تھا تو میرے ایک انتہائی مشفق استاد مجھے رخصت کرنے باہر بڑے گیٹ تک

آئے اور وہاں میرے کان کھینچ کر مجھے نصیحت کی جسکا لب لباب یہ تھا کہ انسان اس دنیا میں صرف ایک بار آتا ہے جبکہ اسکے سامنے بہت سے راستے ہوتے ہیں یعنی دولت کمانے کا راستہ، اقتدار کا راستہ، شہرت حاصل کرنے کا راستہ، عیش وعشرت کا راستہ اور خدمت خلق کا راستہ۔ ان میں سے بہترین راستہ خدمت خلق کا راستہ ہے اور ایک محکوم قوم کے ایک تعلیم یافتہ نوجوان کیلئے خدمت خلق کی بہترین شکل حصول آزادی کیلئے مسلسل جدوجہد ہے۔ میں نے استاد محترم کی نصیحت گرہ سے باندھ لی اور حالات موافق ہوتے ہی ان کے دکھائے ہوئے راستے پر چل پڑا۔ گزشتہ نصف صدی کے دوران اس خاردار راستے پر سفر کے دوران بیشمار موڑ ایسے آئے جب جی چاہا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس راستے سے بھاگ جاؤں۔ لیکن فرار کا یہ خیال آتے ہی استاد محترم کی سالہا سال پہلے والی نصیحت یاد آتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ابھی بھی میرے کان کھینچ رہے ہیں اس طرح ان کی اس نصیحت اور کان کھچائی کیساتھ کچھ اور واقعات (خاص کر 4 اپریل 1965ء کو سوچیت گڑھ میں اور 13 اگست 1965ء کو پشاور میں اٹھائے ہوئے حلف) نے مجھے اس خاردار راستے سے فرار ہونے سے روکے رکھا ہے۔ چنانچہ میں آج 55 سال بعد بھی استاد محترم کے بتائے ہوئے راستے کا راہی ہوں۔ چونکہ میں گذشتہ نصف صدی سے زیادہ مدت کے دوران اپنے استاد محترم کی نصیحت پر کاربند رہا اور اس طویل عرصے میں اپنے نظریاتی فرائض کی ادائیگی میں بھی قصداً کوئی کوتاہی نہیں کی اسلئے میں (باوجود اس کے کہ ابھی ہم اپنی منزل تک نہیں پہنچے) آج اطمینان قلب کی متاع بے بہا سے مالا مال ہوں۔ میری خواہش ہے کہ اس کتاب کے کاری خاص کر میرے موجودہ اور مستقبل کے ہمسفر بھی میرے استاد کی اس نصیحت پر عمل کر کے تحریک کی رفتار کو بھی تیز تر کر دیں اور سکون قلب کی نعمت سے بھی مستفید ہوں۔

(5) جموں کشمیر لبریشن فرنٹ ایک نظریاتی خاندان ہے جس کا نصب العین پوری ریاست جموں کشمیر کی مکمل خودمختاری کا حصول ہے۔ قومی آزادی کی اس منزل تک پہنچنے کیلئے تنظیم کے ممبروں کی حب الوطنی، حریت پسندی، ان کی جہد مسلسل اور ان کے مابین اتحاد و اتفاق اور نظم وضبط اور ان کے قائدین کی قائدانہ صلاحیتیں تنظیم کی سفری ضروریات (زادِراہ اور اپنے دفاع کا سامان) ہیں۔ تنظیم کے ممبروں میں نظم وضبط کا اور اہم عہدہ داروں میں خلوص اور قائدانہ صلاحیتوں کا فقدان، ممبروں میں علاقائی، نسلی اور فرقہ وارانہ تعصبات اور بغیر استحقاق قیادت اور عہدوں کا شوق تنظیم کے اندرونی دشمن ہیں جبکہ ریاست کے خودغرض اور اقتدار پرست سیاسی لیڈر اور بھارت اور پاکستان کی نوآبادیاتی کشمیر پالیسیاں ہمارے بیرونی دشمن ہیں۔ بھارت کی طرف سے اٹوٹ انگ اور پاکستان کی طرف سے شہ رگ کی رٹ کے علاوہ ہمارے لئے حق خودمختاری کا راستہ ہی بند کر دینا، دونوں کے مابین ہونے والے معاہدہ شملہ، اعلان لاہور اور 6 جنوری 2004 کے اسلام آباد کے مشترکہ بیان میں کشمیریوں کے پیدائشی، تسلیم شدہ اور موعود حق خودارادیت کا ذکر تک نہ کرنا اور انہیں مسئلہ کشمیر کا فریق تک تسلیم نہ کرنا بھارت اور پاکستان کا نوآبادیاتی طرز عمل نہیں تو اور کیا ہے۔ البتہ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دونوں کی کشمیر پالیسیوں میں خاصا عملی فرق ہے

پاکستان کی طرف سے کشمیریوں کے ساتھ ہونے والی اکثر زیادتیاں اس کے حکمرانوں کے غلط اندازوں اور غیر ذمہ دارانہ طرزِ عمل کا نتیجہ ہیں جبکہ بھارت کی اکثر زیادتیاں ان کے منصوبوں کا حصہ ہیں۔ حصول آزادی کے اس سفر کے دوران ہمیں اپنے نظریئے کی قربانی دیئے بغیر اپنے حامیوں کی تعداد میں اضافہ اور مخالفین کی تعداد میں کمی کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ ہمیں تحریک کے نتائج کے سلسلے میں بہترین کی امید رکھنی چاہئے اور بدترین کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

6 کسی بڑے اجتماعی مقصد کے لئے ذاتی انا کی قربانی دینے والا انسان واقعی عظیم اور ذاتی مفاد کو اجتماعی مفاد پر ترجیح دینے والا انسان انتہائی چھوٹا ہوتا ہے۔ طوطا چشمی اور خود غرضی بھی انتہائی چھوٹے پن کی نشانیاں ہیں۔

7 بڑائی اسی میں ہے کہ انسان دوسروں کی خطاؤں کو بھول جائے اور احسانات کو یاد رکھے۔ اچھے انسان کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ اسے دوسروں کی اچھائیاں ہی نظر آتی ہیں جبکہ بُرا آدمی تقریباً ہر شخص کو بُرا گردانتا ہے۔

8 انسان کو کسی ایک موضوع/ہنر کے بارے میں پوری معلومات ہونی چاہئیں اور ہر موضوع/ہنر کے بارے میں تھوڑا بہت جاننا چاہئے۔

9 انسان کو فکر اور عمل میں نہ تو انتہائی رجعت پسند ہونا چاہئے نہ الٹرا ماڈرن۔

10 انسان کو تاریخ میں مقام اس کی دولت یا عہدے کے تناسب سے نہیں اس کے کردار اور کارناموں Achievements یا کسی اہم کاز کیلئے اس کی جہدِ مسلسل یا قربانی کے تناسب سے ملتا ہے۔ شہید مقبول بٹ نہ دولت مند تھا نہ وہ کسی اعلےٰ عہدے پر فائز رہا۔ وہ آزادی کے لئے اعلےٰ قربانی کے نتیجے میں ہی تاریخ کشمیر کا ایک اہم باب بن گیا۔ ہمیں اس حقیقت سے سبق حاصل کرنا چاہئے۔

یہ تھیں وصیت کی شکل میں اپنے موجودہ اور مستقبل کے ساتھیوں اور کتاب کے دیگر کارئین سے میری کچھ گذارشات۔ امید ہے وہ خاص کر نوجوان ان پر عمل کرینگے۔ مسئلہ کشمیر، تحریک آزادی اور اپنی ذات سے متعلق دیگر معاملات انشاء اللہ کتاب کی تیسری جلد میں۔ فی الحال اجازت دیجئے۔ خدا حافظ۔

راولپنڈی،
جنوری 2005ء

آپ کا مخلص
امان اللہ

یہ کتاب بھی اس کی پہلی جلد (مطبوعہ 1992ء) کی طرح بنیادی طور پر میری خودنوشت سوانح حیات ہے لیکن عملاً یہ میری نجی زندگی اور میرے خاندان سے کہیں زیادہ مسئلہ کشمیر، تحریک آزادی کشمیر، نظریہ خودمختار کشمیر اور گلگت بلتستان اور ان کے بارے میں بھارت، پاکستان، عالمی برادری اور کشمیری قیادت کے طرز فکر و عمل کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔ اس میں ہماری تنظیم جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کے نظریات، اس کی تنظیمی ساخت، اس کے موجودہ حجم اور اس کی اب تک کی کارکردگی کا خلاصہ بھی شامل ہے اور مسئلہ کشمیر کے حل کے بارے میں اس کے پیش کردہ روڈ میپ کا متن بھی۔ کچھ اور اہم موضوعات کتاب کی تیسری جلد میں شامل ہونگے۔

اگرچہ کتاب (خاص کر اس کے دو اہم باب 'دلچسپ متفرقات' اور 'قصہ مختصر') حال اور مستقبل کے اولوالعزم اور ارفعہ خواہشات کے حامل نوجوانوں کے لیے بڑے قیمتی سبق اور محققوں کے لیے اہم معلومات کی حامل ہے جن سے وہ مشعل راہ کا کام لے سکتے ہیں لیکن میری نظر میں کتاب کا اہم ترین باب 'کشمیریوں کو ابھی تک آزادی کیوں نہیں ملی' (ساتواں حصہ) کا باب ہے جس میں اس جانکاہ حقیقت کی وضاحت کے بعد کہ جہاں گذشتہ تقریباً ساٹھ سال کے دوران دنیا کی ایک سو چالیس محکوم قومیں، جن کی بھاری اکثریت سیاسی شعور، جدوجہد آزادی اور قربانیوں کے لحاظ سے کشمیریوں سے بہت پیچھے تھی، آزادی کی متبرک اور عظیم منزل سے ہمکنار ہوگئیں، وہاں کشمیری اپنی طویل جدوجہد اور عظیم قربانیوں کے باوجود آج بھی بقول اقبالؒ 'محکوم و مجبور و اسیر ہیں' اس انتہائی تکلیف دہ صورت حال کی وجوہات بیان کرتے ہوئے اس کے ذمہ دار حلقوں کی نشاندہی کی گئی ہے بلکہ اس بات کی بھی مدلل وضاحت کی گئی ہے کہ کشمیریوں کے اس طویل ابتلا کی کتنے فیصد ذمہ داری کس حلقے پر عاید ہوتی ہے۔ ہمارے قومی مرض کی نوعیت کی اس واضح تشخیص کے بعد اسکا علاج نسبتاً آسان ہو جاتا ہے جس کی نشاندہی بالواسطہ اور بلاواسطہ طور پر کتاب کے مختلف ابواب میں کی گئی ہے۔ مجھے امید ہے قارئین کرام اس باب کو غور سے پڑھیں گے اور آزادی کے متمنی ریاستی قارئین اس سلسلے میں اپنے فرائض بھی انجام دینگے۔

کتاب میں کئی جگہ 'قسمت' کا لفظ استعمال ہوا ہے جس سے میری مراد متعلقہ شخص سے متعلق وہ عوامل (حالات و واقعات) ہیں جن پر اس کا کوئی کنٹرول نہیں لیکن وہ اس کی زندگی پر گہرا یا سطحی، مثبت یا منفی اثر ڈالتے ہیں۔

مجھے امید ہے قارئین کرام کتاب کو دلچسپ اور مفید پائیں گے اور اس سے پورا استفادہ کریں گے۔

(امان اللہ خان)